

شاعر

فروری [illegible]

تصویریت : ل۔ احمد اکبر آبادی

مقالات

کہانیاں

طنز و مزاح

نظمیں

غزلیں

شاعر جمیل

ہمارا فرض

● کوئی شخص اپنا حق پہلے ہی چھوڑ دے، لیکن فرض کو چھوڑ کر وہ ہماری خطا کا مرتکب ہوگا ●

مہاتما گاندھی

آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔ ... مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ان کی پرورش کس طرح کرتے ہیں۔
آئیے آج ہم اپنے بچوں کے تئیں اپنا فرض نبھانے کا عہد کریں۔ یہ ہمارا قومی فرض بھی ہے۔



[illegible] نمبر میں ایک معنی خیز و بامقصد [illegible]

شاعر

کا نہایت ضخیم شاندار اور چونکا دینے والا

قومی یکجہتی نمبر

موجودہ انتشار و اضطراب کے دور میں ایک زبردست

انقلاب آفریں، فکر انگیز قومی دستاویز

ممتاز ادیبوں، دانشوروں، ماہرین تعلیم اور مختلف الخیال سیاست دانوں کے خیالات اور مفکرانہ مضامین،

فرقہ پرستی کی آگ

کو ٹھنڈا کرنے اور ملکی تجربات و فلاح کیلئے

اوّلین صحیفۂ یکجہتی

نسخۂ کیمیا، جس کی تلاش میں ادارۂ شاعر ایک سال سے مصروف ہے

> جس میں ہندوستان کے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کا قومی یکجہتی مشورہ اُن کے دستخطوں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے،

مئی ۱۹۷[illegible]ء میں

• [illegible] طباعت [illegible] وغیرہ کے ساتھ۔

[illegible] سے زیادہ [illegible] صفحات

[illegible]

ڈاکٹر [illegible]   ڈاکٹر [illegible]

ڈاکٹر [illegible] انصاری   بی حسن شہاب الدین [illegible]

ڈاکٹر گیان چند   ایل جیتو

مولانا سید احمد اکبر آبادی   ٹی [illegible] ریڈی

ڈاکٹر سید محمد عقیل   سریش چندر مصرا

ڈاکٹر سید حامد حسین   ڈاکٹر محمد حسن

علی جواد زیدی   امرت رائے

بے زی ٹر سنہا راؤ   ہرکشن ملسیانی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ   ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

ڈاکٹر رام چند تیواری   ڈاکٹر شاداب رد‌ولوی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ   شہاب سرمدی

ڈاکٹر سی ٹھاکر   آغا رشید مرزا

پروفیسر سرنیش سنگھ   ساحل مانک پوری

ڈاکٹر رام آسرا راز   عظمت حسین خان [illegible]

افسانے

کوثر چاند پوری   قاضی عبدالستار   رام لعل

کشمیری لال ذاکر   کے۔ آر۔ کے موہن   جوگندر پال

اکرام جاوید   ابراہیم شفیق

ڈرامے

ابراہیم یوسف   اظہر افسر

نظمیں

سلام مچھلی شہری مرحوم   برج کومل   حرمت الاکرام

ڈاکٹر وحید اختر   ضیا فتح آبادی   کرشن موہن

فصیح اکمل قادری   ظہیر غازی پوری   تنہا تماپوری

رونق دکنی   سلام سندیلوی   حمید الماس

رفعت نیم   حیدر تاباں   [illegible]

ظفر شیلی   رحمٰن جامی   اختر بستوی

شاہد کوکب [illegible]   فیض نظام پوری   [illegible]

مظہر محی الدین   [illegible]   [illegible]

• اور دوسرے ملکی دانشور، ادباء، شعراء، افسانہ نگار اور سیاست داں

اے صاحبانِ فکر و قلم

تم نے ۱۸۵۷ء کے غدر سے لیکر ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی جیتنے تک اپنے قلموں سے تلوار کا کام لیا۔ جہاں سے تم گزرے تمہارے قلم کی [illegible] اور سنگینوں کی یلغار رہی ہے۔ تم نے زندان کے اندھیروں میں اپنی فکر کے چراغ روشن رکھے۔ تم نے اتحاد و اتفاق اور آزادی کے نغمات [illegible] عام کیا، جب زبانوں پر جبر و استبداد کے تالے ڈالے جا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کے سوداگروں کو تم نے اس وقت نشانہ بنایا جب وہ اپنی [illegible] عروج پر تھے۔ تمہارے قلموں نے تمام ہندوستان کی دھرتی کو اپنی فکر اور اپنے جذبوں کا اسیر اس طرح بنایا کہ وہ گلنار ہوگئی۔ بھارت کے گلستان میں [illegible] کے خوشنما گلاب کھل اٹھے۔

اور جب ان گلابوں سے خوشبو تازہ ہو رہی تھی، ہر طرف خوشبو کے میلے سجنے لگے، رخصت ہونے والے اقتدار نے انتقاماً اپنی سیاسی چال [illegible] سے ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا تو اس خون آشام دور کے بعد بھی تم نے مرثیے لکھے۔ تقسیم کے زخموں کے اندمال کے لئے پھر تمہارے قلم چلتے گئے۔ قلم چلتے رہے، آزادی کے خواب کی واضح تعبیر پانے کے لئے تمہارے ذہن مسلسل کام کرتے رہے۔

اور پھر تین بار جب جنگ کے نقارے بجے تو تم نے اپنے قلموں کو تلوار بنالیا۔ "ہم ایک ہیں" کا وہ نعرہ بلند کیا کہ پوری دنیا تمہارے جذبۂ یکجہتی کی قائل ہوگئی۔ تم نے پوری دنیا کو امن کا پیغام دیا ہے اور جنگ کے خلاف اپنے قلموں سے جہاد کیا ہے۔ بڑی طاقتوں کی لالچی [illegible] تباہیوں پر تم ہمیشہ [illegible] جنگ کے مخالف رہے ہو۔ تم نے مظلوموں کی حمایت کی ہے۔ چنگیز اور ہلاکو، ہٹلر اور مسولینی کی بربریت کے خلاف تم نے اپنے قلم کی قوت سے [illegible] ناگاساکی، ویت نام اور حالیہ عرب اسرائیل جنگ پر تمہارے افکار و خیالات نے زبردست اثر کیا ہے۔

میرے ہم قلمو!

ماضی کی وہ تمام خوں آشامیاں، جبر و دستیاں اور ہلاکت سامانیاں، ان حالات کے سامنے محض گرد ہیں جن سے آج ہمارا ملک [illegible] گزر رہا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں اور خود ہماری زمین پر ہونے والی تین جنگوں کے وقت بھی حالات اتنے نہیں بگڑے تھے جتنے اب [illegible] ہمارے نام نہاد لیڈر اپنی اپنی سیاسی جماعتوں سے چپکے ہوئے، محض اپنے جماعتی وقار کی خاطر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیکر ملک کے سنگین مسائل [illegible] اور سنگینی پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ خانہ جنگی کی آگ ہر طرف بھڑکی ہوئی ہے۔ ہم سب ایک مادرِ وطن کی آغوش کے پالے ایک دوسرے سے انتہائی نفرت برت رہے ہیں۔ ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔

تم اپنے قلموں کو ایک بار پھر تلوار بنالو اور ملک کے اندرونی مسائل کی اس جنگ میں بے خطر کود پڑو۔ [illegible] ہر طرف اڑ رہی ہیں۔ [illegible] عوام میں ضبط و حوصلہ پیدا کرو۔ سرمایہ داروں کو سربازار ننگا کرو اور [illegible] سیاسی رہنماؤں کے دماغوں سے ان جالوں کو صاف کر دو جو ان کی مصلحت پسندی نے تان دئیے ہیں۔

یہ ہماری اپنی دھرتی کا سوال ہے۔ ساری دنیا کے سوالوں اور مسائل سے اہم۔ اگر یہ تخریب کاریاں [illegible] تو ملک [illegible] اور خوشحالی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گا۔ یہ وقت سیاست دانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور عوام کی غیرتِ نفس کو بیدار کرنے کا ہے۔

تسکیں سے ہیں مجھ ممکن خالی — جاتا نہیں قوتوں سے کوئی بھی خالی
یہ حال ہے فی الحال وطن والوں کا — ظاہر پُر شور اور باطن خالی

اٹھو میرے ہم قلمو، پورے ملک کے باطن میں وطنیت کی آگ بھر دو۔



اثاثۂ بے خبری

[illegible] نہیں

آئینہ ساں کائنات اور میرا سراپا
[illegible] میں کس [illegible] یہ کیا!
[illegible] پردہ
[illegible] شیشے [illegible] سرخ، سبز
[illegible] جاسکتے ہیں
[illegible] کے گرد [illegible] ہیں
[illegible] سے [illegible] کو
[illegible] جبیں [illegible] تبوں میں
[illegible] ہے؟
[illegible] کوئی [illegible] پردہ
[illegible] کی طرح [illegible]
[illegible] سرا [illegible] کی
[illegible] منزل [illegible] کی
[illegible] ہے۔
[illegible] — [illegible] ہے کیا؟
[illegible] — [illegible]!

[illegible] — [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] کی دھانی پہ دل بھرے
[illegible] زندگی بھی پیارے ہوئے
[illegible] روح لرزے [illegible] کے تازیکا اعلائی سے،
[illegible]
[illegible] تماشائی [illegible]
مجھے اک [illegible] چلنے والا
[illegible] سے توڑ کر (اک پھول سا) مجھ کو

لکیروں میں ہم آہنگی نہ رنگوں میں تعاون کا کوئی جذبہ!
نہ منظر کی رفق تابی نہ پس منظر کی شادابی!
مگر — اتنی کشش کیسی
یہ کس انداز کی تصویر ہے۔
کوئی اس میں بیٹھا ہے چھپا (یہ ماجرا کیا ہے؟)
بڑے وحشی بڑے سرکش سوالوں میں گھرا ہوں
[illegible] سوچ کی سنسان لمبی رہگزر پر (نخل آسا) چپ کھڑا ہوں
[illegible] کتنا عشوہ گر ہے!
میں کیا ہوں؟ — مجھ کو بھی یہ کیا خبر ہے!

مقالہ

ل۔ احمد اکبر آبادی

ترجمہ اور قومی ثقافت

بین الاقوامی مترجمینِ علم و ادب کی تیسری کانفرنس ستمبر [illegible] میں ماسکو میں منعقد ہوئی جس میں سوویت روس کے علاوہ انتیس ملکوں کے چھیاسی نمائندے شریک تھے۔ اس کانفرنس میں مترجمین کے علاوہ ایسے ناشر بھی شریک تھے جو بیشتر سوویت ادب کے ترجمے شائع کرتے ہیں۔

یہ کانفرنس ۱۱ سے ۱۶ ستمبر تک اجلاس کرتی رہی اور بلند پایہ مترجمینِ عالم نے نہایت عالمانہ مقالے پیش کیے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس کانفرنس میں اردو زبان کا کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا۔ بالکل ممکن ہے اردو زبان و ادب کے اساطین کو اس کانفرنس کے انعقاد بلکہ اس کے وجود کا بھی علم نہ ہو۔

صورتِ حال جب یہ ہو تو کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو زبان و ادب کا کوئی ادارہ ان تمام مقالوں کو جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے یا ان میں سے بعض اہم تر مقالوں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کرے گا؟

اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے ان میں سے چند سوویت ادباء و مترجمین کے مقالے سوویت لٹریچر[1] شمارہ [illegible] میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مقالہ بعنوان مذکورہ بالا LEVON MKRTCHYAN کا ہے جسے حذف و اضافے کے ساتھ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میں امید ہی کر سکتا ہوں کہ ہمارے ادیبوں بالخصوص نئے ادیبوں کے لیے اس کا مطالعہ خرد افروز اور سبق آموز ثابت ہوگا۔

"تمام اہم [illegible] شعرائے عالم ایک [illegible] منسلک ہیں۔"

[illegible] مشہور قول جس طرح شعرائے عالم کو باہم [illegible] کہا جاتا ہے اسی طرح یہ قول مترجمینِ عالم پر بھی صادق آتا ہے۔ [illegible] علمی و ادبی تصانیف کے ترجمے ہوتے رہنا تہذیب و ثقافتِ انسانی کے حصول و ترسیل کی بنیاد [illegible] سے ایک شکل ہے [illegible] انسانی ثقافت ہے اور ترجمہ کے [illegible] ثقافت کے [illegible]

[illegible] VASSILY [illegible] [illegible] کا ایک [illegible] تھا۔ لیکن [illegible] تھا [illegible] سکتا تھا [illegible] سبب [illegible] کہ مصنف [illegible] کہا؟

---

[1] سوویت لٹریچر [illegible] KOMMUNIST [illegible]

[illegible]

[illegible] ادبی [illegible] سے ایک موثر ذریعہ ترسیل ہے! بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ [illegible] فطرت کا جزو ہے۔ بنا بریں انسانی معاشرے کے ارتقاء کا مظہر اول اور اس طرح ثقافتوں کے مابین ذرائع و وسائل کو [illegible] و کثرت [illegible] ہے۔

ہمارا زمانہ علم صنعت و حرفت یعنی ٹکنالوجی کا عہد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ماہر طبیعیات اور پرستار نغمہ و تغزل کی باہمی [illegible] برابر چلی جا رہی ہے۔

مسلمہ طور پر اس زمانے میں سائنس اور علم حرفت نے بے اندازہ اور نہایت تیز ترقی کی ہے لیکن JOHANNES BECHER کے بقول اس عہد کو عہد ٹکنالوجی کہنا اس عہد کی بنیادی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے صحیح تعریف نہیں ہے۔ ہم اس عہد کو عہد انسان البتہ کہہ سکتے ہیں۔ میں بیچر کے اس قول کی اہمیت کی قدر کرتا ہوں۔ وہ اس کی توضیح میں آگے چل کر کہتا ہے کہ:

"عظیم سوشلسٹ انقلاب اکتوبر اور اس کے نتائج نے ہمیں اس کا مجاز بنا دیا ہے کہ ہم ایسی اصطلاحیں وضع و استعمال کر سکیں کیونکہ انقلاب ۱۹۱۷ء نے تاریخ کو یکلخت ختم یا قطع کر دیا اور اس وقت سے انسان کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔

علم حرفت یا ٹکنالوجی کی تیز ترقی سے انسانی ثقافت کو کسی قسم کا صدمہ یا نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ثقافت انسانی کی اخلاقی صحت مندی کی ایک صورت یا کیفیت ہے۔ اور یہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ اگر علم حرفت کی ترقی یا پرواز انسانی اخلاقیات میں پستی و زوال کا موجب ہوئی تو ایسی صورت حال کیسے المناک نتائج کا موجب ہوگی۔

یہ خیال سراسر غلط ہے کہ ایک مترجم ادب صرف دو قوموں کے ادب کو ایک دوسرے کے قریب لاتا اور ایک دوسری قوم کی ثقافتی کامرانیوں کو اپنی قوم کے خزانۂ ثقافت میں شامل کر دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ یہ کام انجام دیتا ہے مگر اسی کے ساتھ مترجم ادب سے پڑھنے والے اس سے جو اثر قبول کرتے ہیں مترجم اس اثر پذیری کو دوچند کر کے اسے وسعت بھی بخشتا ہے۔ اور اس طرح مترجم ادب کے قاری انسانی ثقافت کو ڈھالنے میں عملی طور پر بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک مترجم انسانی سعی و جہد حیات میں بھی [illegible] ہوتا ہے۔ فی الحال وہ جتنا کچھ نظر آتا ہے اس سے بہت زیادہ کام کرتا ہے جس کا احصار کر سکنا کار دشوار ہے۔

اس باب میں KORNEI CHUKOVSKY کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کتب مینی کے اثر سے یا اس کے نتیجے میں آدمی کے عضویات متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی ساخت میں فرق رونما ہونے لگتا ہے۔ خط و خال بلکہ خون بھی متاثر رہتا ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جنگ اور امن" (WAR + PEACE) پڑھنے والے کی آنکھوں کی رنگت میں تبدیلی نہیں آجاتی ہے کیا؟ اور کیا اس کے ہونٹوں کی وضع میں فرق پیدا نہیں ہو جاتا ہے؟"

یہ مسلم حقیقت ہے کہ مترجمین ادب کی جانفشانیوں ہی کا صدقہ ہے کہ "جنگ اور امن" یا اسی پایہ کی اور بہت سی کتابیں صرف کسی ایک زبان میں نہیں بلکہ دنیا کی اکثر زبانوں کے ادب میں متعدد ترجمات ہیں۔

حال ہی میں میری نظر سے ایک کتاب گذری جس کا نام ہے [illegible] IN THE WORLD TODAY اس کتاب میں ایک قابل اعتراض اظہار خیال پڑھ کر مجھے رنج ہوا۔ صاحب تصنیف نے لکھا ہے کہ شیکسپیر آٹھ کروڑ آدمیوں کی زبان انگریزی کا ادیب ہے۔ [illegible] مترجم [illegible] شامل ہیں۔ [illegible] کے خلاف ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شیکسپیر [illegible] مقام کے ادیب سے [illegible] ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے [illegible] اس مصنف نے [illegible] کی کتابوں کے ترجمے کئے جاتے [illegible]

[illegible] ہے۔ وہ [illegible]

شاہد حسین

ایسے ترجمے ادب عالیہ کی سرزمین میں جڑ نہیں پکڑ پاتے اور جلد ہی مرجھا جاتے ہیں۔ آرمینیا کے دیہاتوں میں یہ بات مشہور [illegible] ہے کہ کوئی زبان بیکار نہیں ہوتی اور اگر کوئی نالائق اور گندی تصنیف یا ترجمہ وجود میں آ بھی جاتا ہے تو اس کا شمار اس زبان کے [illegible] میں نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ خارج از ادب یا رد کر دی جاتی ہے۔ ایسی پست اور رکیک تصانیف کے ترجمے کے باب میں کسی نے ضابطہ صحیح تعریف اس طرح کی ہے کہ یونانی زبان میں TRANSLATION کا ابتدائی مفہوم کوشش کر کے ایک قبر سے نکال کر دوسری میں دفنانا تھا۔ یہ مفہوم گندے ویسے تراجم پر بھی صادق آتا ہے۔"

کسی زبان میں تصانیف کس تعداد میں لکھی گئیں اور ترجمے کس قدر ہوئے ایسا تقابل ایک لاحاصل کوشش ہوگی۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ دنیا کے ادب میں اہم اور قابلِ قدر کتابیں کس قدر تصنیف ہوئیں اور کس زبان میں ان کے ترجمے کس تعداد میں ہوئے۔ دنیائے ادب میں قابلِ قدر کتابیں جتنی زیادہ تعداد میں تصنیف ہوں گی اتنا ہی زیادہ امکان ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں (جن کا اپنا سرمایۂ ادب بھی وقیع ہو) ترجمہ کی جائیں گی۔

ایک اعتبار سے ترجمے کو تصنیف پر فضیلت بھی ہے۔ ایک ماہر مترجم کے لئے ترجمہ کرنا اعلیٰ تصنیف کرنے سے کچھ برتر کام ہوتا ہے۔ مصنف کے ذہن میں خیالات و جذبات الفاظ کا لباس پہن کر نازل ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف مترجم کو دوسرے کے خیال و تصور کے لئے جسم و لباس وضع کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں۔

معمولی قابلیت کے آدمی کو ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے اس لئے کہ وہ محض ناقل ہو سکتا ہے۔ مگر جوہر قابل ادیب کو تصنیف کرنے پر ترجمہ کرنے کو ترجیح دینا چاہیے۔

اس کے باوجود کہ فنِ ترجمہ تخلیقی کام تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ بحث کہیں کہیں اب بھی چھڑ جاتی ہے کہ فنِ ترجمہ تخلیقی کام کا اعلیٰ و ارفع صورت ہے یا نہیں۔ اس بحث کو بہرحال کورنی چوفسکی نے یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے کہ ترجمہ تخلیقِ ادب کی اعلیٰ و ارفع صورت ہے۔

اس حقیقت کو سوویت یونین میں علمی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ادبی انسائیکلوپیڈیا کی جلد پنجم میں ترجمے کی تعریف و توضیح پر PAVEL TOPEE کا مقالہ شامل ہے جس میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ترجمہ تخلیقی صناعت ہی کی ایک صورت ہے جس کی تخلیق (PROCESS) کرتے وقت مترجم ایک زبان کے تخلیقی ادب پارے کو اپنی زبان میں مکرر تخلیق کرتا ہے۔" جہاں تک میرا علم ہے۔ دنیا بھر میں پہلی بار سوویت یونین کے اندر بکثرت اور متنوع صورتوں میں ہونے والے ادبی تجربوں کو اس طرح علمی طور پر جامع اور مانع شکل میں ایک عالمانہ و فاضلانہ تالیف کے اندر جگہ دی گئی ہے۔

ہمیشہ اور ہر ملک و قوم میں مترجم سے وہی مطالبہ کیا جاتا ہے جو ایک مصنف سے کیا جاتا ہے اور یہ مطالبہ منصفانہ بھی ہے۔ مگر کامل انصاف اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ مترجم کو مصنف سے کم درجہ نہ دیا جائے (جیسا کہ بعض قوموں میں سمجھا جاتا ہے) اور اس لئے کہ ترجمہ بجائے خود تخلیقی کام ہے۔ مترجم اپنی جگہ ایک مصنف ہی ہوتا ہے اور وہ اسی بنا پر کہ قومی ثقافت کی تعمیر میں دوسروں کی طرح وہ بھی ایک کارگزار فرد ہے۔

اس موقع پر میں ارمنی ادب کی تاریخ سے ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ آرمینیا میں اس سال [illegible] اکتوبر کے مہینے میں ہمیشہ کی طرح یوم مترجمین منایا گیا۔ مگر اس ثقافتی تہوار کی بنیاد پانچویں صدی کے نصف اول میں پڑی تھی [illegible] یہ صرف یوم مترجمین ہی نہیں ہے بلکہ تمام ثقافتی کام کرنے والوں کا قومی تہوار بن گیا ہے۔ البتہ قومی ثقافت کے [illegible] ادب جملہ ثقافتی کارگزار لوگوں کے نمائندے یا علامت باور کئے جاتے ہیں۔

[illegible] مترجم ادب [illegible] ہے [illegible] جاتا ہے کہ [illegible]
[illegible] ہے۔ ایک [illegible] متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر [illegible]
[illegible] ہے۔ اس کے برخلاف جس کتاب کا مترجم اپنے قومی ادب کو دنیا کی [illegible] جاتا اور [illegible]
[illegible] مختلف ہو سکتا ہے۔ جبکہ مترجم اس لئے بھی زیادہ قدر و منزلت کا مستحق ہوتا ہے کہ وہ عالمی ادب کے [illegible]
ایک دوسرے میں منسلک رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

جہاں اور جہاں عالمی ادب سے گفتگو کی جاتی ہے عام طور پر لوگوں کے ذہن و خیال میں وہ ترقی یافتہ ادب ہوتے ہیں جنہوں نے دنیا بھر کے ادبی افکار میں بیش از بیش حصہ لیا ہے لیکن ایک مترجم کے نزدیک عالمی ادب سے مراد فی الواقع دنیا بھر کے ادب سے ہوتی ہے جس کے اندر قدیم و جدید کا سارا ادب بھی شامل ہوتا ہے۔

بلاشبہ ادبی پیداوار اور ادبی ترجمے مختلف قوموں میں مختلف سطح پر اور مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سوویت یونین میں البتہ ادب کی نوعیت اس لئے مخصوص ہے کہ اس کے اندر ایسے ادب بھی شامل ہیں جو کچھ عرصے پہلے تک جن کے حروف تہجی [illegible] تھے اور اگر کسی قوم میں تحریری زبان تھی بھی تو اس میں ادبی سرمایہ مفقود تھا یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر یہ چھوٹی قومیں جنہوں نے تیز ثقافتی ترقی کر کے بیسویں صدی میں [illegible] اٹھائی گئی ہیں اور یہ قابلِ فخر و ابتہاج کارنامہ بکثرت ترجمے کئے جانے کی برکت سے ظہور میں آیا ہے۔

جن قومیتوں کا کوئی ادبی سرمایہ نہیں تھا ان قومیتوں کے مصنفین و مترجمین نے دنیا بھر کے متمول ترین ثقافتی سرمائے سے پورا پورا استفادہ کیا (اور یہ استفادہ انہوں نے اپنی زبان میں دیگر اقوام کے قابل قدر ادب کو منتقل کر کے ہی نہیں کیا بلکہ سوویت روس کی دوسری بہت سی زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ان سے بھی کیا ہے)

چھوٹی بلکہ بہت چھوٹی سوویت قومیتوں کے روسی زبان و ادب کی مدد سے بعض اوقات اس تیز ترقی کرنے کی اہمیت اس حقیقتِ امر سے ثابت ہو جاتی ہے کہ جن قومیتوں کا اپنا کوئی ادبی سرمایہ بھی نہیں یا نہ ہونے کے برابر تھا ان قومیتوں نے ادب میں ایسے رجالِ عظیم پیدا کئے جن کو بین الاقوامی شہرت و عظمت حاصل ہوئی اور اس بنا پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ادبی تراجم نے دنیا کی ثقافتی ترقی و پرورش میں بے مثال منصب ادا کیا ہے۔

ایسی بین الاقوامی شہرت پانے والے بہت سے ناموں میں ایک نام YURI RIT KHEU کا لیا جا سکتا ہے جو روس کے شمال بعید کی ایک بہت چھوٹی چکچی قوم کا ایک فرد ہے۔ رتخیو کی متعدد تصانیف دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ رتخیو کی اس غیر معمولی ترقی میں چکچی زبان کا [illegible] حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی تربیت کرنے کو روسی ادب کی [illegible] موجود تھیں اور یہی ذریعہ ہے جس نے رتخیو کو دنیا کے ادبی خزانوں سے متعارف کرایا۔

[illegible] ایک اور چھوٹی قوم ہے جو شاید چکچی قوم سے بھی چھوٹی ہے۔ اس نہایت چھوٹی قوم نے GENNADI AIDI جیسا شاعر پیدا کیا جس نے فرانسیسی شاعری کا پورا انتخاب چوواش زبان میں ترجمہ کیا ہے اور اس پر اسے فرانس کی [illegible] انعام بھی دیا ہے۔ اس فرانسیسی شاعری کے انتخاب کا نام ہے

FROM VILLON TO PRESENT DAY

[illegible] ایک [illegible] قوم ہے مگر ترجموں کی بدولت اس قوم میں تقریباً [illegible] جیسا ادیب [illegible]
پیدا [illegible] ایک [illegible] قوم ہے [illegible] اس قوم میں [illegible]

عظیم ادبی ہستیاں نمودار ہوئیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے۔

الغرض تمام سوویٹ زبانوں اور بالخصوص چھوٹی قومیتوں کی زبانوں میں ثقافتی کام کرنے والوں نے روسی و دیگر سوویٹ و غیر سوویٹ اقوام کے متمول ادب کے ترجمے کرکے اپنی قومی ثقافت کو بے حد ترقی یافتہ اور متمول بنا لیا ہے اور ان مترجمین کو اس کام میں یہ موقع بھی ملا کہ وہ اپنی اور دوسری اقوام عالم کی ثقافت کا موازنہ کرکے دیکھ سمجھ سکیں۔

اور یہ انسانی زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لوگ ایجاد کرتے ہیں وہ دوسری قوم کے لوگوں کے لئے اجنبی نہیں رہتی ہے۔

یہ ہمارا ادّعا ہے کہ ترجمے کرتے رہنے سے ایک قوم کا ادب متمول تر ہوتا رہتا ہے اور اس قوم کی ثقافتی ترقی میں بیش از بیش مدد ملتی ہے، مگر اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ ترجمہ کرنے والا بھی ثقافتی اعتبار سے برتر انسان بن جاتا ہے۔

ٹالسٹائی بھی اسی عقیدے کا آدمی تھا۔ اُس نے اپنی جوانی میں ڈائری کے اندر ۱۸۵۱ء میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

"مجھے دوسری زبانوں سے روسی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ میرا حافظہ اور طرز انشا بہتر ہو سکے"

ٹالسٹائی کا یہ خیال بلا شبہ خالصتہً ذاتی تھا۔ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ دوسرے بڑے ادیبوں کے بعض مثالی اقوال نقل کر دیئے جائیں JUSTINES MARCIKEVIUS کا قول ہے کہ "مجھے وہ صنّاعِ ادب زیادہ متاثر کرتے ہیں جو اپنی ہم عصر نسل کی زندگی میں کوئی موڑ پیدا کر سکے یا اُسے بلند ترین لمحۂ حیات سے متعارف کرا سکتے ہیں۔ مثلاً BLOK MAYAKOVSKY اور ESENIN جیسے ادبی فن کار۔ ایسے تین نے تو مجھے عذاب میں مبتلا رکھا تا وقتیکہ میں نے اس کی بعض تصانیف کا لیتھوانی زبان میں ترجمہ نہیں کر لیا۔ اس کی تصانیف کے ترجمے کر لینے کے بعد مجھے خود محسوس ہونے لگا تھا کہ جذباتی اور حسیّاتی اعتبار سے میرے اندر برتری آگئی ہے۔ روسی قومی زندگی کے اکثر صفحات میرے لئے آسان اور قابل فہم بن گئے، اور میں خود اپنی قوم سے قریب تر ہو گیا ہوں۔"

دنیا میں بعض ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جن کی نظر میں ترجمہ کرنا ایک فعل عبث ہی نہیں شرمناک بھی ہے۔ (ایسے لوگ اُردو داں طبقے میں زیادہ ملیں گے ـــ مترجم) ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ مترجم اپنی قابلیت مصنّف کے نام پر ضائع کرتا ہے۔ مگر بالغ نظر لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خیال جہل و بے علمی کا نتیجہ ہے۔ مترجم ادب کے ادب کا رتبہ اس شخص کا رتبہ ہے جو اسپتال میں جاکر اپنا خون دیتا ہے۔ ترجمہ کرکے مترجم اصل مصنف سے گہرا اثر قبول کرتا ہے (اور یہ اثر پذیری محض مطالعہ کرنے سے میسّر نہیں ہوتی ہے) یہاں بات ترجمے سے ہو رہی ہے، اِس لئے بلا واسطہ قرض لینے کا سوال پیدا ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے۔ (بایں ہمہ یہ اثر پذیری اُسی صورت میں بار آور ہوتی ہے جبکہ وہ غیر شعوری ہو اور مترجم کے خون میں شامل ہو کر متمائز نہ ہو سکے)

فنِ ترجمہ سے متعلق یہ مسئلہ موضوع بحث ہے کہ مترجم مصنّف کی طرز یا ہیئت کی تخلیق مکرر کس طرح کرے؟ اس باب میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ مترجم مصنف کا خیال (جوہر) اپنے ادب کی طرز یا ہیئت میں منتقل کرے۔ اور اس کے برخلاف دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل مصنّف کی طرز یا ہیئت ترجمے میں برقرار رہنا چاہیے۔ مگر یہ دوسرا گروہ اِس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ بعض مصنف کی طرز یا ہیئت ناقابل ترجمہ ہوتی ہے، اپنے نقطۂ نظر پر مُصر ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس زبان کا اپنا مزاج بھی ہوتا ہے۔ یہ بیّن حقیقت ہے کہ اِن دونوں میں کوئی نقطۂ نظر بھی ایسا نہیں ہے جو جامع اور مانع اُصول بن سکے۔

یہ بات بآسانی تامل سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایک جوہرِ قابل مترجم خود بھی ایک طرز یا ہیئت کا مالک ہوتا یا وضع کر سکتا ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنے کا حق مترجم کو ملنا چاہیئے کہ وہ کس طرز یا ہیئت میں ترجمہ کرے۔ اسے بہر حال اپنی زبان و ادب کے مزاج اور محاورے پر نظر رکھنا پڑے گی۔ وہ مترجم حقیقتاً جوہرِ قابل ہوتے ہیں جو اپنی زبان و ادب کو نئی طرز یا ہیئت بخشتے ہیں۔

علاوہ بریں اصل مصنف کی طرز یا ہیئت برقرار رکھنے کے لئے کوئی قاعدہ قانون نہ وضع ہو سکا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس مشکل کا حل تلاش کرنا لابدی ہے۔ مگر وہ حل ایک جوہرِ قابل مترجم ہی تلاش کر سکتا ہے اور ایسے جوہرِ قابل مترجم بہت ہو گذرے ہیں۔

سوویٹ مترجمین کے بہت سے ناموں میں سے ایک نام لیو بیموف کا لیا جا سکتا ہے جس نے RABELAIS کی مشہور عالم تصنیف GARGANTUA PANTAGRUEL کو اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور کمالِ ادبی صناعت کے ساتھ ربیلے کے ایہام یا ضلع جگت کو اپنی زبان کے محاورے میں منتقل کر سکا۔ بیموف کی جتنی قدر و منزلت سوویٹ یونین میں ہے اتنی ہی فرانس میں بھی ہے۔

تخیلی حرکت و عمل کا جہاں تک تعلق ہے مترجم کا کام مصنف کے کام سے مختلف یا کم درجہ نہیں ہوتا۔ مصنف اپنی صناعت کی زبان میں انسانی زندگی یا اُس کے جذبات و محسوسات کا ترجمہ کرتا ہے اور بالکل یہی کام مترجم بھی انجام دیتا ہے۔ اسی بناء پر ہمارا عقیدہ ہے کہ تصنیف و ترجمہ مختلف درجے کی چیزیں نہیں ہوتیں۔ انسانی ذہن و فکر کی حرکت و عمل میں برتر و کمتر کے کوئی معنی نہیں ہیں اور غور کی نظر ڈالی جاتی ہے تو واضح بھی ہو جاتا ہے کہ تصنیف و ترجمہ ذہنی حرکت و عمل کے دو رُخ ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

اگر علمی و ادبی ترجمے کئے جانے پر قید و بند عائد کر دی جائے تو ظاہر بات ہے کہ دنیا بھر کی قومی ثقافت، رموز اور ان کی توسیع محدود ہی نہیں ختم ہو جائے گی اور یہ عالمِ انسانی کے ثقافتی برزد کا ایک مخزنیہ ہو گا جس کا کوئی مداوا بھی نہ ہو سکے گا۔

ہم سوویٹ مترجم اپنا کام سوویٹ ادب و ثقافت کے متمول ترین تجربوں کے نقطۂ آغاز سے شروع کرتے ہیں اور اس بات کو دوہراتے جھکتے نہیں ہیں کہ سوویٹ یونین میں ادبی و علمی تراجم کا مسئلہ نہایت اہم قومی مسئلہ ہے۔ اتنا اہم قومی مسئلہ ہے کہ سوویٹ حکومت کو پوری پوری دلچسپی لینا اور اس پر کڑی نظر رکھنا پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک میں ترجمہ کرنا ایک فنِ شریف سمجھا جاتا اور دنیا کے کسی ملک میں اتنا اہم کام نہیں سمجھا جاتا جتنا اہم سوویٹ یونین میں سمجھا جاتا ہے۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہمارے ملک میں فنِ ترجمہ نہایت کامیاب اور معزز فن باور کیا جاتا ہے۔

▲ ▲ ▲

جگن ناتھ آزاد (سری نگر)

غزل

اے دلِ ناداں! نہ کر تو نکتہ آرائی بہت،
سامنے اہلِ نظر کم ہیں تماشائی بہت!

خونِ دل قطرہ بہ قطرہ رائیگاں بہتا گیا
سچ ہے جو ٹوٹے آنسوؤں نے آبرو پائی بہت

کچھ نہ کچھ وقعت تو میں نے شعر سے پائی مگر
لیکن اس فن سے ہوئی ہے میری رسوائی بہت

تیری بیگانہ روی سے دل بڑی اُلجھن میں ہے
میں یہ سمجھا تھا کہ ہے تجھ سے شناسائی بہت

آزما اِک بار اب تو ہم فقیروں کا بھی ظرف
طور پر تو ہو چکی ہے جلوہ فرمائی بہت

رنگِ دنیا پر نہ مائل ہو سکا اب کیا علاج
عقل تو اِس سخت دل کو کھینچ کر لائی بہت

ہر قدم پر تھی سہارا میری نادانی مجھے
کر گئی برباد داناؤں کو دانائی بہت

اب نگاہوں میں ہے انجامِ گُل و انجامِ خار
سیکھ لی دل نے جو طرزِ ناشکیبائی بہت

فصلِ گل آتے ہی گویا ہوئے آتش دیدہ تھی
اہلِ گلشن نے مجھے زنجیر پہنائی بہت

رومی و اقبال خود ہوتے ہیں مجھ سے ہمکلام
کیوں نہ ہو محبوب مجھ کو میری تنہائی بہت

یوں تو اے آزاد! میری شاعری میں کچھ نہ تھا
اہلِ دل اہلِ نظر نے کی پذیرائی بہت،

سراج۔ وحید شورپوری

آسمان سے گرا

آسمان کی پیشانی پر ابر چھایا ہوا ہے، ہمالے درخت ابر کو بھگا کر سورج کو نکالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، لیکن سورج نکل نہیں پا رہا ہے، پھر بھی اپنی جستجو سے وہ بیزار نہیں ہیں۔!

موسم سرد ہے — چولہا گرم — کولھو کی مورت کام کر رہی ہے، رات کے باسی ٹکڑوں کو کھانا کھونا ہے —!

ایک حسین خیال کھل رہا ہے۔

سپنوں کا اسٹو سرسرا رہا ہے۔

چولھے کی آگ بھبھک رہی ہے۔

"— کیا ایک وقت میں دونوں چیزیں پک سکتی ہیں؟" —

"نہیں!

"کیوں نہیں؟

مختلف سوالات کی سلائیاں دماغ میں رقص رہی ہیں، شکل رہا ہے کہ کوئی نرکوئی جھرنا پھوٹ نکلے —!

برسوں کی مسافت اتنی جلدی طے ہوئی! ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی ہاتھوں سے حنائی رنگ نہیں اترا —!

ایسا لگتا ہے کہ کچھ بہنے لگا ہے!

شاید جھرنے نے پہلی سانس لی ہو!

وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ اس کے ہاتھوں میں کچھ کچھ برکتا ہیں ہیں، وہ اپنے ملائم ہاتھوں کی جھریوں کی گرہیں دیکھتے ہوئے ٹن سے کہہ رہی ہے.....

اس نے آج مجھے ذمہ داریوں کی سیڑھیوں پر وقت سے کچھ پہلے ہی چڑھا دیا ہے۔ ناشتہ آج نہیں بن سکتا — ہوٹل میں ناشتہ کروں گی تم بھی باہر ہی کھا لینا —" کہتے ہوئے اس نے اپنے آنچل کو کھینچ کے کس لیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

چولھا جل رہا تھا۔

سپنا بڑھ رہا تھا۔

بات یہاں تک پہنچی ہے — میں دور نکل جا رہی ہوں۔

اور مجھے خبر بھی نہیں —!

یقین تو نہیں آتا!

لیکن ایسی حد میں یقین کرنا پڑتا ہے۔!

لمحوں میں تصور عرش پر! نظریں تحت الثریٰ کو کھنگال دیتی ہیں۔ اتنا طویل وقت بھی میرے لئے ایک لمحہ تھا۔! اچانک وہ وقت بھی تھا۔ گھر میں آگ جلی نہیں، اکثر کھانا پکا نہیں۔ کیا یہ غذا کی اپنی مرضی پر منحصر تھا؟

ویسے سب کے ہاتھوں پر تو ریکھائیں کڑھی ہیں، قسمت کے ستارے تو ہر سر والوں کی کھوپڑیوں میں ہیں۔ فرق صرف بیگلے اور نہ بیگلے کا ہے۔

ہونہہ! دادا جاگیر دار تھے نا، باپ گورنر اور نہیں! یہ سکھوں باتوں، انکا، شغل ذکر و وظیفہ ہی ہوتا تو، کشف و کرامت سے سب کچھ ہاتھ آ جاتا۔

دروازہ کھول اور — آ لے دوڑ دوشنی کو اندر — کہاں ہے "وہ شکر نے مجھے جانثار شے کر طویل نعمت حاصل کی ہے — کہ روشنی؟ ارے یہ باہر؟ باہر بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کس نے کھٹکا دیا

دروازے پر ۔۔؟ روشنی کا بچہ کو مارے مارے یوں ہی پھر گئی،
وہ تھوڑے ہی آزاد ہے۔ اُس کا مسکن تو بڑی بڑی جیب، بڑے
بڑے ایوان ہیں ۔۔ اندھیرے کا تسلط تو ہر جگہ قائم ہے، اندر
بھی اور باہر بھی ۔ پھر یہ صدائے بے وجود کس کی تھی؟ چھوڑو،
ہوگا کوئی ۔۔!

بلّی نے برتن خالی کیا ۔! دس سالہ بچّے کی پٹائی ہوئی ۔
بچّہ جھوٹ کہتا ہے کہ منّے کا دودھ اُس نے نہیں بلّی نے پیا ۔
اندھوں میں کانے راجہ نے آنکھ ملتے ہوئے فیصلے کے ساتھ
اپیل پیش کی ۔

چھوڑو دودھ پیا ہوگا کسی نے بھی، وہ تو پینے ہی کی چیز تھی ۔
سبھی اپنے ہی تو ہیں ۔۔ مہینے کی ۱۰ تاریخ ہے ۔ کیا میری ضبط
کی ہوئی جیب اِس مصرف کے لئے نہیں؟ اچھا میری نیند کا
کیا ہوگا؟ نیند ہو سکتی نہیں ہے ۔۔!

زلیات بھی چالو ہوتے ہیں ۔ گلے کہوں کہ کان کے،
اپنے نفع و نقصان کو خوب ذہن میں رکھتے ہیں ۔ وقت پر زلیات
مضبوط پہرہ لگا دیتے ہیں ۔۔ یہ تھوڑی اُن کے مطلب کی باتیں تھیں،
جو ایسی باتوں کو کان میں داخل ہونے دیں گے ۔ زلیات وفادار
ہوتے ہیں، خیر چھوڑو مائنر کیس ہے ۔۔!!

کام کاج سے فرصت تنگ ہوتی جا رہی ہے ۔ کام! کام
کی باتیں! محنت! محنت کی باتیں، کھاؤ کچھ ہیں، اس طرح جس طرح
سٹی بس یا ندی کی ٹوکری ۔ اچھا بُرا، نیک بد، جو بھی ڈالو قبول افتد ۔
حیرت کیا ہے، اِس ٹوکری کے نیچے سوراخ ہے، سب بہہ کر مٹّی
میں مل جاتا ہے مٹّی میں ۔۔!

دھُواں ۔
جل رہا تھا
سینا بڑھ رہا تھا ۔

یہ ایک شہر تو نہیں لیکن شہر تھا ۔ اس میں شہر کے لوازمات
تھے، ایک کالج تھا ۔ یونیورسٹی تو نہ تھی مگر ایک سوسائٹی ضرور تھی ۔
سیاسی ادارہ ابھی باضابطہ قائم نہیں ہوا تھا لیکن سیاسی شعور کا
بہاؤ تیز تھا ۔ تفریح کے مقامات تھے شہر اور شہرت سے الگ ایک

انہی جیسی خوبصورت عمارت تھی جو "مستور محل" سے موسوم تھی ۔۔
مشغلے تھے ۔ مشغول ہوتے تھے ۔ محروم تھا ۔ مسرور ہوتے تھے ۔
"یہ کیا؟ نہیں اتنے سارے روپے اِس وقت میرے پاس نہیں،
کہہ دو اُن سے جا کر ۔۔!"

خنجر لوٹا ۔۔!
۔۔ کھٹ! کھٹ! کھٹ ۔۔! ہونہہ! اچھا ٹھیک ہے!
وقت پر دیکھ لوں گا ۔ آج اسسٹنٹ سے ہیڈ مسٹرس ہو چکی ہوں
اِس کا بھی خیال نہیں تمہیں ۔۔!"

"کیوں کیا بات ہے؟ کیا دیکھنا چاہتی ہو وقت پر ۔؟ آج کی
بالائی آمدنی قلیل تھی، سو میں گھر لوٹتے لوٹتے ساڑی خرید لیا،
بندہ بلیک میلر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی کلرک نہیں ۔ ۔ آمدنی کا ہے کثیف
کا ہے لطیف! یہ رِستا، کِستا! کیسا؟"

جیلے بہانے بند کرو ۔۔ تمہیں کیا پتہ ۔ آج مسز کو کا کولا
کے بل ہیلی نے دے کر مجھے پیچھے ڈھکیل دیا ۔ آج میں اُس سے
اوپر چڑھنے سے رہ گئی ۔ "مستور محل" میں ناک والی ایک
میں ہی تھی! چٹ کے بجائے پرم کا چیک ہی بھجاتے یا پھر
دس بارہ جوڑے سوٹ کے گھر پڑے ہوتے تھے، اُس میں سے
ایک آدھ کو بکواتے یا رکھواتے ۔ بات بات پر فقط ایکس کیوزمی
کہتے ہو! چکنے گھڑے کی طرح سب پھسل جاتا ہے، آدمی ہو کر بین گوٹ؟

دھُواں جل رہا تھا ۔ سینا بڑھ رہا تھا
مجھے چھپا دو ممّی! کہیں مجھے چھپا دو جلدی کرو مجھے ۔ ۔ ۔ ۔!
پڑوس کے گھر کا تالہ کیا ٹوٹا! کہ فلم بم پھوٹا ۔۔!
"ہاں بیٹے تم اپنے گھر میں آرام کرو ۔۔ ہمارا فرض پہلی ہی طرح
یاد ہے ۔"

داڑھی میں تنکا نہیں شہتیر چھپ سکتا ہے ۔ ایسی داڑھی پالو ۔
ایک بات یاد رکھو کہ سیدھے سادے نہ بنو ۔ عقل سے کام لو گے
تو لوگ اُسے نقل کہیں گے، تو کنا مت! بجلد کچھ کر دھرے نئے
جاؤ گے ۔۔ اب شریف کون ہے: تلاش کرو ۔۔؟ دنیا کی
ساری شرارتوں کو روک سکے بھلا کس کے پاس اتنی قوت ہے آج!
کوئی نیک خیال ۔ یہ تو انسان ہی کو پیدا ہونے سے روک رہی

ایک نسخہ تو ہے گرانی کو روکنے کا ۔!
چولھا
جل رہا تھا
سپنا
بڑھ رہا تھا
"ووڈ لینڈ چلو ——!"
"ہاں ——! نئی گاڑی تو آگئی! لیکن یہ شوفر کیوں نہیں رکھا؟"
"آج کی دنیا کا جائزہ لیا تم نے —— کیا معلوم گاڑی لیکر ہی بھاگ جائے!
تم ہی بتاؤ اب گاڑی شوفر کے ہاتھوں میں رہے یا ....؟!"
"ایک! ایک بات پوچھوں؟"
"پوچھو؟ ہزار پوچھو قیمت نہیں لوں گی، بیوی ہوں۔!"
"یہ! یہ ....! سکار ....؟"
"ہاں! لیفٹ کو کراس کرو! بات کو نہیں..."
"میرا مطلب ہے .... روپیہ ...!!"
"بس! ارے ارے! روکو کار! ہاں..! بات کو نہیں بات کو جاری رکھو۔ باتوں میں تمہیں یاد نہیں رہا —— ووڈ لینڈ یہی تو ہے —— چلو کافی پیتے ہوئے چلیں۔!"
"آئی ریم ساری"
چولھا جل رہا تھا —— سپنا بڑھ رہا تھا ۔
تین سو ساٹھ بچوں کا بھاری بوجھ سر پر سے کر دماغ پاشی کرکے ساری توانائی صرف کرنے کے بعد ملتا کیا ہے، ماہانہ صرف تین سو ساٹھ کوڑیاں —— جو پیٹ کے غار میں پلنے والے سانپوں اور بچھوؤں ہی کو ناکافی ہیں۔ یہ ٹکے بھر کی نوکری بھلا کسی آڑے وقت بھی کام آئے گی —— قطعی ناممکن —— پھر تو دولت کا دامن کیسے ہاتھ لگے گا —— ہونہہ! یہ تو سارے عالم کا بڑا المیہ ہے —— ! اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ کوئی تجارت کا سوچ سکوں؟ کوئی ہنر بھی تو میرے نزدیک نہیں ہے، جس کے کرتب سے نوٹ چھاپ سکوں۔ کیا کیا جائے؟ ہاں۔ الیکشن —— الیکشن آرہا ہے۔ استعفیٰ —— میں استعفیٰ دوں گی۔ ——

آج —— جس کے پاس لاٹھی یا کرسی ہے، وہی تو مالک ہے بھینس کا۔ ایک اور دو کی نسبت نہیں، دو گنے اور تگنے کی نسبت بھی نہیں، بلکہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے —— بڑھتا رہے گا۔ عزت دولت! سب کچھ یہ سب الیکشن میں چن کر آنے کے چمتکار ہیں ——
پہلے جاگ جاؤ —— جو جاگا اس نے پایا۔ جو سویا اس نے کھویا۔ سوئٹزر لینڈ کی گھڑی میں ریلوں کا ٹائم ہو تو کیا وہ صحیح نہ ہوگا ——!
عجیب غریب تجربات دینے والا، اعلیٰ وجود اور کھادل ——!
اور ہر معاملے کی موت کو ملتوی کرنے والا دماغ خریدو ——
تو ہی انسان کی قیمت! مچھر، مکھی سے بھی کچھ زیادہ ہو جائیگی آدم کے بچے تو ہائیں گے ——
چولھا جل رہا تھا ۔ سپنا ......
پھونک پھونک کر ناک منہ میں دھواں بھر گیا —— کمرے میں دھواں دوسرے کمرے میں دھواں —— دھواں ہی دھواں —— لکڑیاں کچی ہیں یہ لکڑیاں نہ جانے کس کا غصہ کس پر توڑ رہی ہیں ۔!
ام... اہا! شوربا پھیکا ہے —— مرچ کے بغیر چل جائے گا لیکو. نمک کا برتال بھی تو خالی ہے! وہ بھی پڑوس سے قرض کرکے آیا تھا ۔ فقر و فاقہ سے پیٹ پھٹنے کو ہے ——
بڑھتی ہوئی گرانی کی زہریلی مکڑی نے افلاس و نحوست کا جال تان دیا ہے۔ گھر نابلد —— غیر سنجیدہ، بے اسباب ہو چکا ہے —— اب کیا ہوگا ——؟ گھر میں ایک چادر باقی رہ گئی جس کے وسط میں روشن دان ہیں —— اس کو تہہ کرکے احتیاط سے فروخت کر ڈالو —— فاقہ کشی میں ہی انسان ایمان فروش، بردہ فروش! بردہ فروش کہلاتا ہے ——!
کنبہ دیکھو —— دیور! جیٹھ! نند! ساس، سسر! کل سترہ ہیں! باپ رے! ان سب کا بوجھ —— اونہہ —— کون ہیں یہ لوگ —— کون کس کا ہوتا ہے آج کے دور میں —— اور ہاں ذرا ان کی حالت ملاحظہ فرمائیے ذرا! فقط گنوار ہیں گنوار سب ہی، کسی کو بھی سو تک گنتی نہیں آتی ——!

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

اُڑیا۔ دُرگا چرن پریڈا
ترجمہ: کرامت علی کرامت

روانگی

یہ کب
چاہا تھا میں نے
کہ آؤں
اس جہاں میں ؟
نہیں تو !
میں نے یہ چاہا نہیں تھا

تو پھر
کیوں خوف ہو
جانے کا مجھ کو اس جگہ سے
مجھے کیوں فکر ہو
اس کی
کہ مل جاؤں گا اک دن
خاک و آب و باد میں
اور پھر
خلا میں
روشنی میں ——

ہے اس میں حرج کیا
سمجھوں اگر
خود کو سُبک تر ؟
ہے اس میں حرج کیا
گر خود کو سوچوں
کہ ہوں اس خاکِ سُرمگوں کا
لطیف و دلنشیں پیکر
کہ اک دُم دار تارا ہوں
خلائے بے کراں کا

اگر سوچوں
کہ بھیگے موسمِ باراں
کا ہوں اک قطرۂ ناچیز
نسیمِ جاں فزا ہوں میں
صبائے انگبیں بردوش کی
اگر سوچوں
کہ ہوں اک پنکھڑی
منو بیز غنچے کی ۔

مقالہ

ڈاکٹر عنوان چشتی

گیت کی تکنیک

شاعری کی دوسری ہیئتوں کی طرح اگرچہ گیت اور گیت نما نظموں کی تکنیک بھی داخلی اور خارجی عناصر کی ہم آہنگی، توازن اور تناسب سے وجود میں آتی ہے۔ مگر گیت اور گیت نما نظموں کی تکنیک میں داخلی عناصر خارجی عناصر پر چھائے رہتے ہیں۔ جب تک جذبے کی شدت، حرکت اور موسیقی الفاظ اور بحر و قوافی کے سنگیت کی لہروں میں تبدیل نہ ہو جائے گیت کی تکنیک کامیاب نہیں سمجھی جاتی۔ گیت کی تکنیک میں لفظ و معنی کا ایک دوسرے میں تحلیل ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ جذبہ کا حرف و صوت کی طبعی صورت اختیار کر لینا بھی ہے۔ گیت کی تکنیک تخلیقی عمل کے لمحۂ اول سے گیت کی ہیئت میں شامل رہتی ہے اور گیت کی ہیئت کے دوسرے عناصر اور لوازم کی نشوونما کے ساتھ اُس کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور گیت مکمل ہونے پر یہ بھی مکمل ہو جاتی ہے اور تکمیل کے بعد ہی اُس کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ تکنیک کا لفظ علمی اور سائنسی علوم سے فنونِ لطیفہ میں آیا ہے جس سے کسی حد تک خارجی ترتیب و تہذیب کا تصور وابستہ ہے۔ فنونِ لطیفہ میں محض خارجی ترتیب کو تکنیک نہیں کہہ سکتے۔ اس میں داخلی اور عناصر کے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر وجود پذیر ہونے اور جذبہ کے فطری ارتقا کے مطابق ڈھل جانے کی شرط لازمی ہے۔ مگر تکنیک کی شناخت، محض خارجی سطح پر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے گیتوں اور گیت نما نظموں کی تکنیک کا تجزیہ کرتے وقت اُن کی ساخت، خارجی عناصر اور اُن کی ترتیب کو بنیاد بنایا گیا مگر داخلی عناصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

اُردو گیتوں کی تکنیک کے تنوعات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی (۱) ہندی چھندوں اور اسالیب کا اثر (۲) ہندوستانی موسیقی کی دُھنوں کا اثر (۳) ہندی اور اُردو بحروں کے امتزاج کا اثر (۴) اُردو اصناف و اسالیب کا اثر۔ سطورِ ذیل میں ان اثرات کے تحت گیت اور گیت نما نظموں کی تکنیک کے تنوعات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) ہندی چھندوں اور اسالیب کا اثر

اُردو گیتوں پر ہندی گیت اور لوک گیت کی روایت کا اثر ہے۔ ان اثرات کے تحت اُردو گیتوں کی تکنیک کی دو واضح صورتیں ملتی ہیں۔ (الف) پد شیلی کا اثر (ب) ماترائی چھندوں کا اثر۔

(الف) ہندی میں گیت کی ایک قدیم اور عام تکنیک پد شیلی ہے۔ ودیاپتی سے تا حال ہندی گیتوں میں اس روایت کا تسلسل نظر آتا ہے۔ عام طور پر پد میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اُردو شعر کے نقطۂ نظر سے پد دو ایسے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے جو چار ٹکڑوں میں منقسم ہو سکے چوتھائی حصہ کو چرن (۱۱۲) یکتے ہیں۔ اُردو گیتوں پر ہندی پد شیلی کا اثر ہے۔

عجیب ہے یہ زندگی، کبھی ہے غم کبھی خوشی
ہر ایک شے ہے بے یقیں، ہر ایک چیز عارضی

نا مکمل

یہ گال زرد زرد سے اُٹے ہوئے ہیں گرد سے
ستم رسیدہ دل یہاں تڑپ رہے ہیں درد سے
یہ صورتیں کہ جن پہ ہے ستم کی داستاں لکھی
عجیب ہے یہ زندگی (تنویر نقوی)

پد شیلی کی خصوصیت یہ ہے کہ پد کا پہلا چرن ہر بند کے بعد دُہرایا جاتا ہے۔ اس گیت میں یہ التزام کیا گیا ہے۔ اس گیت میں زندگی کی ستم رانیوں پر حیرت اور کرب کے احساس کو سمویا گیا ہے۔ ـــــــ چونکہ شاعر نے اس کی بحر ... جو فاعلن مفاعلن کی تکرار سے بنتی ہے اور جس کا مزاج رزمیہ ہے اس لئے اس گیت میں وہ کسک اور کیفیت پیدا نہیں ہوا جو گیت کے لئے ضروری ہے۔ البتہ بحر کی خوش خرامی اور خوش آہنگی سے تھوڑا سا لطف ضرور ملتا ہے۔

اُردو شاعروں نے پد شیلی میں تھوڑا سا تصرف کر کے اور چرن پر مختلف انداز کے بند بنا کر اُردو گیت اور گیت نگاروں کی تکنیک میں خوش گوار اضافے کئے ہیں۔

اب بھی نہ آئے من کے چین
نا کوئی ساتھی نا کوئی ساجن نا کوئی میرے پاس سہیلی
برہ کی لمبی رات گزاروں قسمت کی ماری، کیسے اکیلی (اختر شیرانی)

کب آؤ گے پریتم پیارے کب آؤ گے پریتم مدھ والے
رہ گئے پاؤں چلتے چلتے۔ تھک گئیں آنکھیں رستہ تکتے
کب آؤ گے پریتم پیارے (محمد دین تاثیر)

ان دونوں ٹکڑوں میں پورا پد نہیں ہے مگر پد کا ٹکڑا "چرن" ضرور ہے۔ اگر اس کو چرن نہ بھی تسلیم کیا جائے تو بھی اس ٹکڑے کے ٹیک کی ہئیت کے بار بار واقع ہونے کی صورت میں "چرن نما" ضرور ماننا پڑے گا۔ پہلے ٹکڑے میں ایک چرن اور دوسرے میں دو چرن ہیں۔ جن میں پہلے چرن کی تکرار ہوئی ہے۔ یہ تکرار ہی پد شیلی کے اثر کو تیز کرتی ہے ایک اور مثال دیکھئے۔

اے دل اے نادان
تو سُولا کر گئے مجھکو دو دن کے مہمان
کس کس نے توڑے ہیں تجھ سے اُلفت کے پیمان
راتیں کتنی سُونی ہیں اب دن کتنے ویران (سیف الدین سیف)

اس ٹکڑے میں "چرن" کے ساتھ تین مصرعوں کا بند ہے جس میں "ک اور ن" کے آہنگ نے ایک علاحدہ نغمگی پیدا کی ہے اور تاثر کو بڑھا دیا ہے۔

یہ تکنیک یہیں نہیں رُکی بلکہ گیت کاروں نے چرن پر ۳، ۵، ۶، ۷ مصرعوں کے بندوں کا اضافہ کر کے اس تکنیک کے امکانات کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس تکنیک کا ایک دلکش تجربہ مصطفےٰ زیدی کے یہاں ملتا ہے۔

آئی پیا کے دیس
سات سمندر پار سے گوری آئی پیا کے دیس
روپ بدیسی لیکن جیون پورب کا سندیس

کالی کالی پلکیں جن میں تلواروں کی کاٹ
نیلی نیلی آنکھیں جیسے جمنا جی کے پاٹ
انگڑیاں یا ٹھنڈے ٹھنڈے دریاؤں میں سانپ
روشن روشن چہرہ جیسے دیوالی کے دیپ
گوری جیسی رنگت کے یہ نرم سنہرے کیس
آئی پیا کے دیس
(مصطفیٰ زیدی)

اس گیت کی تکنیک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چرن "آئی پیا کے دیس" ہے بلکہ یہ ہندی چھند "سرسی" میں ہے جو بہت مترنم ہے۔ مصرعوں کے قوافی کی ترتیب یہ ہے کہ پہلا دوسرا تیسرا چوتھا اور پانچواں چھٹا آپس میں متفق ہیں یعنی تین مطلعے الگ الگ قوافی میں ہیں۔ اور ساتواں مصرعہ "ٹیک کی پنکتی" یا چرن کے قافیے میں ہے۔ یہ چرن آہنگ کو اور نمایاں کر دیتا ہے۔ ایسی ہی قوافی کے تنوع اور آخری دو مصرعوں کے ارکان یا ماتراؤں کی تعداد کے اختلاف سے غنائیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس گیت کی جمالیاتی فضا بھی دل و دماغ کو مسحور کرتی ہے۔ مگر اس پر ہندی اور اردو کی سراپا نگاری کا اثر ہے جس سے اس میں خارجیت کا عنصر بڑھ گیا ہے اور تاثیر سے زیادہ حسن اور آرائش کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب حفیظ کا یہ بند دیکھئے۔

تو ہی سب کا پالن ہار
تو نے یہ سنسار بنایا۔ اتنا سارا کھیل رچایا
موتی ہیرے سونا روپا، تیری دولت تیری مایا
دن کے رخ پر تیرا پرتو، رات کے سر پر تیرا سایا
پھولوں سے دھرتی کو ڈھانپا تاروں سے آکاش سجایا
آگ، ہوا، مٹی اور پانی، سب میں جانداروں کو بنایا
تو ہی پالن ہار ہے سب کا، سب تیرے بالک ہیں خدایا
تو سب سے رکھتا ہے پیار
تو ہی سب کا پالن ہار
(حفیظ جالندھری)

اس گیت میں مصرعوں کے بعد چرن آتا ہے جو ایک ہی قافیہ میں ہیں اور ہر مصرعہ دو برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ چرن سے قبل چرن سے باہم متفق ایک اور مصرعہ بھی آتا ہے۔ جس سے ایک طرف گیت کی ہیئت کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف غنائیت کا عنصر بڑھتا ہے۔

پنگل کی تکنیک بہت لچکدار اور وسیع ہے۔ اردو گیتوں میں اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ابھی تک اس کے پیچیدہ امکانات کو نہیں برتا گیا ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہندی ماترائی چھندوں کے التزام کے ساتھ پنگل کو برتا جائے تاکہ اس تکنیک کے دائرہ کو مزید بڑھایا جا سکے۔ ہندی میں گیت کے لئے ماترائی چھند مخصوص ہیں اور گیت نگاروں نے بحر کی تخصیص نہیں کی ہے۔ مگر گیت کے مزاج کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ گیت کے لئے ہندی کے چھند ہی زیادہ مفید ہیں۔

خانو بیگم

(ب)، ہندی چھند شاستر ایک وسیع فن ہے جس میں ایک بحر کی لاتعداد ذیلی بحریں ہوتی ہیں جن کے آہنگ میں نازک اور لطیف امتیازات ہوتے ہیں۔ اگرچہ اُردو کے گیت لکھنے والوں نے ہندی چھندوں کے بہت کم امکانات کو برتا ہے پھر بھی بعض بعض چھندوں میں گیت لکھے ہیں۔ انھوں نے ہندی چھندوں کے انتخاب میں اُردو بحروں سے قریب تر چھندوں کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ حفیظ جالندھری اور اُن کے معاصرین اور اُن کے بعد کے شاعروں کے یہاں ہندی چھندوں کا ہلکا سا اثر ملتا ہے مگر جدید شاعروں نے ہندی چھندوں کا خاص طور پر التزام کیا ہے۔

چھیڑا غم کا راگ کسی نے پربت کے اُس پار

شیتل پُروا کے ہونٹوں پر کھیلت ہے ملہار
آنکھوں کی سندر برکھا میں ڈوب چلا سنسار
چھیڑا غم کا راگ کسی نے پربت کے اُس پار (الطاف مشہدی)

دل کی لگی کو کیسے چھپاؤں تم بن موہے آئے نہ چینا
پریم ڈگر پر کیسے لاؤں سمجھے نہ بالم نینوں کی بینا

یاد تری یوں آئے سنوریا جیسے لہریں کھائے چُنریا
کب آؤ گے پریم نگریا بیتی جائے بالی عمریا
من پنچھی کو کیسے مناؤں پھڑکے ہے موہے پنجرے کی مینا
دل کی لگی کو کیسے چھپاؤں تم بن موہے آئے نہ چینا (سیدہ)

الطاف مشہدی کا گیت سرسی، چھند میں ہے۔ سیدہ کا گیت بھی ایک ایسی بحر میں ہے جو ہندی بحر سے قریب تر ہے۔ الطاف کے گیت میں یادوں کی کسک ہے۔ اس میں ایک ایسی برہ کی ماری استری کے دل کا غم ہے جو شیتل پُروا کے ہونٹوں پر مچلتے ہوئے ملہار کے گیتوں سے اور پریشان ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں کی برکھا میں سنسار ڈوبنے لگتا ہے۔ سیدہ کے گیت میں "بیتی" جو کہ سنوریا ہے اُس کی راہ تکنے میں بالی عمریا کے ضائع ہونے اور اُس کی یاد کے چُنریا کی طرح لہرانے کا احساس بہت قوی ہے۔ شاعرہ نے من کو پنچھی اور محبت کو پنجرے کی مینا قرار دیکر اُردو گیتوں کو حسین اور نسوانی پیکروں، استعاروں اور تشبیہوں کا حسن عطا کیا ہے۔ اسی طرح ذیل کے گیت میں ایک برہ کی ناری کے جذبات کو موسم کے پس منظر میں فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور
کالے کالے بادل آئے چھائے چاروں اور
سکھی ری چھائے چاروں اور
ہوا چلے اور بوندا برسیں بن میں ناچے مور
سکھی ری بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور (سید مقبول حسین احمد پوری)

شانو بیگم

اِس گیت کے بندوں میں ارکان یا ماترائوں کی تعداد کی کمی اور بیشی سے صوتی آہنگ کی تخلیق ہوئی ہے۔

اُردو گیتوں کی تکنیک پر "لوک گیت" کی تکنیک کے اثرات بھی مُرتسم ہوئے ہیں۔ اگرچہ اُردو کے گیت کاروں نے اِس تکنیک کے امکانات سے پوری طرح فائدہ نہیں اُٹھایا پھر بھی بعض گیتوں میں ایسی جھلک نظر آتی ہے جس پر لوک گیت کی تکنیک کا گمان ہوتا ہے۔

آج رنگ ہے
ہولی کھیلن کے دن آئے ـ آج رنگ ہے
بھر پچکاری بھر بھر ماری
رنگ سے ل بھیج رہی ہے موری ساری
عبیر گلال اُڑائے ـــــ آج رنگ ہے
سکھیاں مل مل گائیں ہولی
آنند کیسر من میں گھولی
ہر دے پھاگ اُڑائے ـــــ آج رنگ ہے (عشرت رحمانی)

اِس گیت کی زبان ہی پر لوک زبان کے اثرات نہیں بلکہ مصرعوں کے ایک لے کے تحت بدلتے ہوئے آہنگ پر بھی لوک گیت کا اثر ہے۔

۲۔ ہندوستانی سنگیت کی دُھنوں کا اثر

اُردو کے گیت کاروں نے حسبِ موقع ہندوستانی سنگیت کی دُھنوں سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے۔ گیت اور سنگیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُردو کے اوّلین گیت کاروں نے سنگیت سے زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے۔ امانت کی اندر سبھا آغا حشر اور اُن کے معاصرین و مقلدین کے ڈراموں میں جو گیت پائے جاتے ہیں وہ ہندوستانی سنگیت کے راگ راگنیوں اور ہلکی پھلکی دُھنوں میں ہیں۔ چونکہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے ڈرامے اسٹیج کرنے کے لئے لکھے گئے تھے اس لئے ان ڈراموں کے گیتوں میں گائے جانے کی صلاحیت کا پورا پورا دھیان رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس عہد کے تمام گیت معیاری نہیں ان گیتوں کی دو خصوصیتوں یعنی گائے جانے کی صلاحیت اور سنگیت کی دُھنوں کے مطابق ہونے کی اہلیت نے انھیں دوسرے گیتوں اور گیت نما نظموں سے ممتاز کر دیا ہے۔ امانت نے رادھا کرشن کے پریم کی روایت سے فائدہ اُٹھا کر عورت کے جذبات کی عکاسی یوں کی ہے۔

پا لاگی کر جوری ـ شیام موسے کھیلو نہ ہوری
گنتوں پچاروں میں کسی ہوں۔ ساس ننند کی چوری
سگری چنری رنگ نہ بھوو۔ اتنی سنو بات موری
شیام موسے کھیلو نہ ہوری

اور پیا کے ہجر میں برہنی اس طرح اظہار جذبات کرتی ہے۔
رُت برکھا کی آئی سے گیاں ـ آج پیا کو کل نہیں کٹے

موری اور سے پاون بجنی ۔ کو و اس کو سمجھائے
پیا بن گھٹا نہیں بجائے (امانت)

اندر سبھا کے گیتوں پر رادھا کرشن کے پریم کی روایت کا اثر نہیں ہے ۔ ان میں برندابن کی رعنائی نیز ادراک سے لطیف فضا ملتی ہے ان میں ہجر و وصال کی کیفیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور ایک برہ کی ماری ناری اور ملن کی منتظر نا بیاہتا عورت کے جذبات نے کونے سے ٹپکتے ہیں ۔ عورت کے تڑپ کا بیان بھی دلآویز ہے اور اس پر ہندی اور فارسی کی سراپا نگاری کی روایات کا اثر بھی ہے ۔ اس کے علاوہ امانت کے گیتوں میں درد اور کسک ، انتظار اور خلش نیز اداسی کی کیفیات بھی ملتی ہیں جنھیں سنگیت کی دھنوں نے اور شدید کر دیا ہے ۔

موری انکھیاں پھرکن لاگیں ۔ کیا ہوا یار کہ مر گئیں انکھیاں
انکھیاں پھرکن لاگیں
نینن کی پچکاری بنا کے ، انسوان رنگ میں بوری
بن پیا انکھ پر مار کے گھا پر ۔ کھوئب گلال طوری
نینن کی پچکاری بنا کے ۔ انسوان رنگ میں بوری
بن سیاں دیکھ شگنت موری (امانت)

آغا حشر کے یہاں بھی یہی تکنیک ملتی ہے ۔

دیکھو بلما موری بالی عمریا
میں بل بل جاؤں گر وا لگاؤں ، سجن موہن کو رجھاؤں

او جان
ہوئے نیناں دشمن مری جان کے ۔ جگر میں چبھے نظر بان کے (آغا حشر)

۳ ۔ ہندی چھندوں اور اردو بحروں کا امتزاج

اردو میں ہندی چھندوں اور اردو بحروں کے امتزاج کی صورتیں بھی ملتی ہیں ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اردو گیت کاروں نے ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جو ہندی اردو میں مشترک ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ایک ہی گیت میں دو بحروں کا امتزاج کیا گیا ہے عظمت اللہ خاں کا عروضی نقطۂ نظر اگرچہ ہندی چھند اور اردو عروض دونوں سے مختلف ہے مگر ان کے یہاں امتزاج کی شکلیں بھی نظر آتی ہیں ۔

(الف) مُرلی کی دھن برگوپیوں کے دل میں اُمنگ اٹھتی ہے اور وہ اس طرح خوشی سے گانے لگتی ہیں ۔

گوکل بن میں برستا رنگ
باجے ہر گھر میں مردنگ
خوشی سے کھلا ہر اک انگنا

شاعری

ہر اک گوپی مسکائی
یہ کس نے بجائی مرلیا
ہر شے میں مستی چھائی (جوش ملیح آبادی)

انجانے نگر میں جانے تھے من مانے نگر انجانے ہیں

اپنی باتوں کی مستی میں
ٹھنڈی ہی دل کی بستی میں
وہ گیت جو کچھ من مانے تھے وہی روگ جو سکھ کے بہانے ہیں۔ (میرا جی)

اسی طرح گیتوں کی دنیا گھر کی چہار دیواری میں سمٹ آتی ہے۔ "پیارا پیارا گھر اپنا" کا یہ ٹکڑا دیکھئے

وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی — پیارا پیارا گھر اپنا
وہ امبر کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی — آنکھوں کا تارا گھر اپنا (عظمت اللہ خاں)

(ب) اُردو کے بعض گیت کاروں نے اُردو ہندی بحروں کا پیوند بھی کیا ہے۔ ایسے گیتوں میں موسیقی کا آہنگ ایک مخصوص زیر و بم کے ساتھ غنائیت کے عنصر کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ زیر و بم جذبے کی شدت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس تکنیک میں غنائیت کے سحر کو نمایاں کرنے کی پوری اہلیت ہے بشرطیکہ شاعر موسیقی اور بحروں کا مزاج داں ہو اور اُن کے اسرار و اثرات سے واقف ہو اور بنیادی جذبہ کو موسیقی کی لہروں میں تبدیل کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ خاطر غزنوی نے اس تکنیک سے فائدہ اُٹھا کر ظلم سے ٹکرانے کی کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے۔

اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار

اور بجلیوں سے ڈرنے والے
اُنگلی کان میں دھرنے والے
اُٹھنا بھی قیدی ہو کر اور چلنے پر وار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار (خاطر غزنوی)

اور دل دیکر بے بسی کے عالم میں کیا کیا گزرتی ہے اس کا اظہار اس تکنیک میں اس طرح ہوا ہے۔

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
چھپ میں جاگا ہے سویرا۔ چھدرا دنیا کا اندھیرا
لیکن گھر تاریک ہے میرا
بھیگی جاگی ہیں گھٹائیں — پھرتی ہیں مست ہوائیں
جگ کو جگانے والو — جینے اور جلنے والو
زہر ملاؤ رس میں
دل ہے پرائے بس میں (حفیظ جالندھری)

شام میٹھو

حفیظ نے ارکان کی کمی دبیشی سے گیت کے مصرعوں کو اِس طرح مرتب کیا ہے کہ وہ دیکھنے میں بھی اچھے لگتے ہیں اسی طرح بادلوں کو دیکھ کر شاعر کے ذہن میں کیا کیا پیکر اُبھرتے ہیں۔

آئے ہیں بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے۔ اُمڈے پھیلے تُلتے جھکتے
ایک اندھیری شے کر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے۔ پلن کے گھوڑے سہے ٹھٹکے (عظمت اللہ خاں)

یہ ہندی کی کسی مخصوص بحر میں نہیں ہے، البتہ ہندی کے دو چھند "مودک" اور "سار وتی" کو ملا کر ایک نیا وزن تیار کیا ہے یہ اپنی جگہ تکنیک کا ایک نیا تجربہ ہے۔ اُردو عروض کے نقطہ نظر سے یہ گیت بحر متدارک مخبون مسکن (اخذ دسولہ رکنی) ہے صرف مستزاد کے طریقہ پر ہر مصرع کے ساتھ فعلن فعلن فعلن فعلن یا فع کا ٹکڑا لگا دیا ہے یا اسی طرح یہ ٹکڑا دیکھئے۔

میں کیسے کہوں
چاند کے دھیان میں گم تاروں میں
نیلے ساگر کے تاروں میں

میں آپ بہوں
تم جیسے چاہو بہوں
میں کیسے کہوں (قیوم نظر)

اس گیت کے تمام مصرعے ایک بحر کے ارکان کی مختلف ترتیب سے بنے ہیں۔ یہ تکنیک گیت کی روایت سے گریز نہیں بلکہ اس کی توسیع ہے اور گیت نما نظموں کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

۴۔ اُردو اصناف و اسالیب کا اثر

اُردو گیتوں پر اُردو اصناف و اسالیب کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ اِس تکنیک کی چند نمایاں صورتیں یہ ہیں۔
(۱) غزل کی تکنیک۔ (۲) مثنوی کی تکنیک (۳) مستمط کی تکنیک اور (۴) خالص اردو بحروں کا استعمال۔

غزل کے ایک شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے باہم مقفّیٰ ہوتے ہیں۔ باقی اشعار میں دوسرے مصاریع میں قافیہ ہوتا ہے۔ تمام اشعار میں ایک ہی بحر ہوتی ہے۔ آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ آزاد اور خود مکتفی ہوتا ہے۔ اُردو گیت میں یہ تکنیک بھی ملتی ہے۔ مگر یہ زیادہ موزوں تکنیک نہیں ہے۔ کیونکہ گیت میں ہر شعر کے آزاد اور مکتفی ہونے کی صورت میں تسلسل خیال، اور گیت کی وحدت ختم ہو جاتی ہے۔ بعض گیت نگاروں نے اس تکنیک میں گیت لکھے ہیں۔ ہندی میں اِس تکنیک کو غزل شیلی کا نام دیا جاتا ہے۔ محبوب کے ردِ عمل سے بے نیاز ہو کر پریمی اس طرح گزارش کرتا ہے کہ

مجھے چاہے نہ چاہے دل تیرا تو مجھکو چاہ بڑھانے دے
اک پاگل پریمی کو اپنے چاہت کے نغمے گانے دے
نورانی پریم کہانی کی چپ چاپ کہانی سُنتی جا
یہ پریم کی وانی سنتی جا۔ پریمی کو گیت سُنانے دے (میراجی)

اندر سبھا میں یہ تکنیک چھائی ہوئی ہے۔ گیت "بعنوان" ٹھمری زبانی نیلم پری کے بیچ دُھن کھماچ کے "غزل کی

تکنیک میں ہے۔

راجا جی کرو موسے بتیاں رے ۔ دل تڑپت دن رتیاں رے
ہم روٹھ اُٹھے تم سے دن دن ۔ سوتن جا کے لگیاں رے
جیرا اُتڑت تم سے درسن سے ۔ دھڑکت ہیں موری چھتیاں رے
درس استاد کا چاہے مہکا ۔ کھو کے بیٹھا ۔ یہ پتیاں رے (امانت)

مثنوی کی تکنیک کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے تمام شعروں میں ایک بحر ہوتی ہے۔ ہر شعر مطلع ہوتا ہے اور ہر مطلع کے قوافی جداگانہ ہوتے ہیں۔ اُس کے اشعار میں معنوی تسلسل ہوتا ہے۔ یہ تکنیک گیت کے مزاج سے قریب تر ہے مگر ایسے گیتوں کی ہیئت گیت کی جدید ہیئت سے مختلف ہوتی ہے اس لئے غزل کی تکنیک کے گیتوں کی طرح ایسے گیتوں کو بھی گیت نما نظم کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ساون کے مہینہ میں پیتم کے انتظار میں سجنی کا یہ حال ہے کہ

ساون بیتا جائے سجنی پیتم گھر نہیں آئے
کیسے کاٹوں رات ورہ کی ناگن بن بن کھائے
کنج کنج میں پڑے ہیں جھولے مل کر سکھیاں جھولیں
پینگ بڑھائیں تان اُڑائیں اپنے من میں پھولیں

مسمط کی تکنیک جدید گیت کی ہیئت سے قریب ترین ہے۔ اور اُس کے اثر سے گیت کی تکنیک نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تکنیک پر انگریزی اسٹنزا کی مختلف شکلوں کا اثر بھی ہے۔ بسنتی رنگ اور قدیم رنگ کی تمنا یوں کی جاتی ہے کہ

رنگ دے ــــــ رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے قدیم رنگ بے دریغ بے درنگ
جس کی ضو سے مات ہو رنگِ بازیٔ فرنگ
عشق کے لباس کو
رنگِ شوخ و شنگ دے
رنگ دے ــــ رنگ دے قدیم رنگ (حفیظ جالندھری)

سطور بالا میں اُردو کی جن تکنیکوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے خد و خال بہت واضح ہیں۔ اُن کی بہت سی ذیلی اور ضمنی صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر گیت کی اپنی تکنیک ہوتی ہے جو شعری تجربے کے ساتھ اُس کے ساتھ ہوتی ہے اور تکنیک کے داخلی اور خارجی عناصر کے تال میل، تناسب اور ہم آہنگی سے تکمیل کی طرف بڑھتی ہے۔

غزلیں

متین سروش (بنگلور)

غمِ بہار و خزاں سے گزر گئے ہوتے
کچھ اپنا کام بھی دیوانے کر گئے ہوتے

عظیم تر ہے تری یاد کا فسوں ورنہ
خیال و خواب کے جلوے بکھر گئے ہوتے

جو کشتگانِ وفا اپنا دِل دکھا سکتے
کئی گلاب سے چہرے اُتر گئے ہوتے

شگفتِ گل کا سلیقہ بھی زندگی پاتی
دِلوں کے درد سے پیمانے بھر گئے ہوتے

چراغِ راہ بنے اور ہو گئے خاموش
عظیم ہم سفرِ تا سحر گئے ہوتے

رہِ حیات میں پھرتے نہ سر بکف جو لوگ
فروغِ دار و رسن سے جو ڈر گئے ہوتے

فرازِ کوہ پہ بادل برس گئے تو کیا
خزاں رسیدہ چمن پر بکھر گئے ہوتے

نشاطِ قلب سے خالی تھا کاسۂ دانش
وگرنہ گیسوئے ہستی سنور گئے ہوتے

جمالِ قلب و نظر سے ہمیں تھا پیار سروشؔ
وگرنہ ہم بھی نئی راہ پر گئے ہوتے

ناجیؔ انصاری (کامٹی)

ڈھونڈلی دل نے بہت اپنی بقا کی صورت
نقش بر آب ہی' عہدِ وفا کی صورت

بوئے پیراہنِ رنگیں سے معطر ہے فضا
اُن کی آمد کے قرینے ہیں صبا کی صورت

ہم نے خود ترکِ تمنا پہ قناعت کر لی
ورنہ دشمن تو نہ تھی آب و ہوا کی صورت

اب نہ وہ ذوقِ تماشہ' نہ چمن آرائی
کیا کریں رنگِ حنا موجِ صبا کی صورت

رہزنی عام ہوئی شہر کے بازاروں میں'
سخت مشکل ہے زمانے میں بقا کی صورت

سانس لینا بھی ہے دشوار گھٹن ایسی ہے
بند کمرے میں کہاں تازہ ہوا کی صورت

اپنے اشعار گراں گوش ہیں اُن پہ ناجیؔ
کاش پیدا ہو کوئی عرضِ وفا کی صورت

عُبید قمر

گمائے سرمگوز

وہ ایک منظر جو اُسے سکھلاتیں دو دن کے لئے کلکتہ آیا تھا۔
جہاں کسی طرح [illegible] وقت گیا تو ناکامیاں اس کا منہ چڑھا رہی تھیں
پیسے [illegible] نکال رہا اور کچھ کتاب کی ورق گردانی کی نذر ہو گیا۔
لیکن [illegible] سے دو پہر سے مسافر خانہ کے کمرے
میں [illegible] کیا تھا [illegible] اس کے ذہن و دماغ
کو جلا [illegible] رہے تھے ___ والد کی اچانک موت کے بعد
[illegible] بمشکل [illegible] کا دو وقت آسرا تھا۔ سال بھر ہونے کو آیا۔
[illegible] ختم ہو چکی۔ آگے گھر کی کچھ شہ دوری سے
[illegible] کسی [illegible] کی رشوت سے وہ
کسی کو [illegible] سفارش ہی اُس کا
[illegible] کھینچنا ہی پڑے گا۔ اِس
[illegible] ہے ___ سوچتے سوچتے
وہ [illegible] بے بسی پر اُس کی آنکھیں نم سی
ہو گئیں [illegible] پانچ بجے شام میں گاڑی پکڑنی تھی۔
بادلِ ناخواستہ وہ باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔ مسافر خانہ کا
حساب [illegible] کے بعد [illegible] نکالے وہ ایک ہوٹل کی
جانب [illegible] ہے یہاں لباب
پہ [illegible] آگے بڑھتی
[illegible] بہت خود [illegible]!
[illegible] سمت
[illegible] اور فٹ پاتھ پر دو پیسے بیٹھے
[illegible]

چمک چمک جا رہی تھیں۔ پہلے ایک اور پھر کئی گندے گندے ننگے
اُس کی سمت لپکے اور پھر جھرمٹ سے ہاتھ دستِ سوال
پھیلائے ہوئے تھے۔ وہ پیسے دو پیسے دیتا گیا اور تیزی سے
بڑھتا گیا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے وقت بھی کئی ہاتھ پھیلتے گئے
تھے ___ وہ بہت مشکل سے کچھ کھا سکا تھا۔ تمام وقت ننگے بھوکے
کمزور سے ہاتھ جیسے مفلوک شخصیت کا روپ دھار کر اُسے اطراف میں
لئے گھوم رہے تھے۔ اور ذہن کی اندھیری کوٹھری میں مختلف بگولے
ننگا ناچ ناچتے رہے تھے۔ پھر ہوٹل سے باہر آتے ہی [illegible]
ہاتھ۔ اُف! وہ ذہن کو جھٹکتا ہوا تجل کی پان کی دوکان کی طرف
بڑھ گیا۔ اب سامنے لگے آئینہ میں وہ اپنی شخصیت کو پرکھ رہا تھا۔
اُس نے اپنا اکلوتا شادی کے وقت کا بنا ہوا سوٹ زیب تن
کیا ہوا تھا۔ گلے میں لگی ٹائی اُس کی وجاہت کو پرکشش بنا رہی تھی اور
آنکھوں پہ لگا بادِ کا گاگلس اُس کے دوست نے اُسے زبردستی
یہ کہہ کر دیا تھا کہ "آج کل ٹیپ ٹاپ کا زمانہ ہے جناب!" اور
آج یہی ٹیپ ٹاپ اُس کے لئے وبالِ جان بنا ہوا تھا۔ وہ واقعی
چہرے بشرے سے ایک باوقار افسر نظر آ رہا تھا۔
"پیسے دو پیسے دے دیں صاحب!" اُس کے قدموں میں گھسٹتا
اکڑوں بیٹھا ایک مفلوک فقیر ٹُنڈا ہاتھ جو کسی شاخ کی مانند
بڑھا رہا تھا۔ اُس نے پان کی گلوریاں منہ میں ڈالیں اور دکاندار سے
واپس ملے پیسوں میں سے چند سکے اس کی گدلی ٹُنڈی انگلیوں
سے گزری ہتھیلی پر ڈال دئے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ گاڑی
میں ابھی وقت کافی تھا۔ اس لئے وہ فٹ پاتھ پر رک رک کر گزرنے

کے خیال سے چورنگی مارکیٹ جا رہا تھا۔ کوڑ لُولا اسٹریٹ کے موڑ پر یکایک اُس کے قدم رُک گئے۔ پُل سے بندھی رسّی میں لاٹری کی ٹکٹیں لٹک رہی تھیں۔ اور اسٹول پر بیٹھا ایک شخص اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ جیسے یونہی ٹکٹ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا —

"ارے سوچتے کیا ہیں صاحب! بس لگا دیجئے اور لاکھوں پائیے" — لاٹری والا اُسے اُمید کی کرشمہ سازیوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک مستان قسم کا شخص آ پہونچا۔ لمبی لمبی زُلفیں اور گھنی داڑھی، گلے میں مختلف قسم کی مالائیں، لنگی اور سیاہ کُرتا میں ملبوس وہ مجاور معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے دیکھتے دیکھتے کئی ٹکٹیں لے ڈالیں اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

"کیا فقیر لوگ بھی ٹکٹ لیتے ہیں ۔؟" اُس نے غیر شعوری طور پر سوال کر ڈالا تھا۔

"— یے حضور مت پوچھئے۔ یہ ایک روپیہ میں لے جاتے ہیں اور پانچ پانچ روپے میں لوگوں کو یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ یہی ٹکٹ نکلے گا۔ اب یہ تو اعتقاد کی بات ہے! آپ کو بھی دوں۔ یہ بہار، یہ یوپی، یہ مہاراشٹر ہے۔ اس کی تاریخ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں مجھے نہیں نہیں چاہئے" — اور وہ جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وقت کے حساب سے تو ہر پیشے میں ماڈرنیٹی آگئی ہے یہ فقیر لوگ — اور اُس کے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے پراگندہ خیالات پھر مچل مچل جانے لگے۔ اور وہ جیسے اُن سے چھٹکارا پانے کے لئے بھیڑ میں دھکّے کھاتا تیز تیز قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا پیرا ڈائز سنیما سے تھوڑا آگے فٹ پاتھ پر لگے مجمع نے اُس کے قدم روک دیئے۔ اُس نے آگے بڑھ کر جھانکا۔ ایک پیر سے مفلوج شخص لیٹا تھا۔ اُس کے سامنے مختلف قسم کے چاک بکھرے تھے اور بغل میں شری کرشن جی کی بڑی ہی جاذب تصویر رنگین چاک سے بنی ہوئی تھی۔ نیچے لکھا تھا — "اِس گونگے اور مفلوج کی مدد کیجئے۔"

اُف کتنا اچھا آرٹسٹ ہے بیچارہ لب اور چند بکھرے سکّے میں گر کر تھوڑی جھنکار اُس کے سکّوں نے بھی فضا میں تحلیل کر دی۔

جب وہ اسپلینڈ ایریا پہونچا تو چار بج رہے تھے کافی گھما گھمی تھی۔ آرزوؤں اور تمنّاؤں کی ڈوروں سے بندھے ہُوق در جُوق لوگ انجانی منزلوں کی سمت رواں دواں تھے۔ جیسے زندگی کے اسٹیج پر رنگین ڈوریوں سے بندھی یہ کٹ پُتلیاں اک معیّن مدّت تک ناچنے پر مجبور ہوں اور پردے کے پیچھے کوئی اَن دیکھا ہاتھ۔ کبھی ڈھیل دے دے، کبھی کھینچ لے اور کبھی ڈوری اُچھال دے!

اسپلینڈ سے وہ سڑک کراس کر کے چورنگی بازار جانے ہی کو تھا کہ ایک ٹیکسی اُس سے تھوڑے فاصلے پر رُکی۔ ایک ادھیڑ عمر کا سیٹھ اُترا تھا۔ ٹیکسی بل لے کر آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک خوش پوش نوجوان نے تیزی سے سیٹھ کو جا لیا۔ وہ کچھ کاغذات سیٹھ کو دکھانے لگا۔ سیٹھ نے پہلے تو دیکھنے ہی سے انکار کیا پھر کاغذات پر اُچٹتی نگاہ ڈال کر تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چلتا بنا اور اُس کے سڑک کراس کرنے کے لئے اُٹھتے قدم رک گئے وہ نوجوان کی جانب دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا — شاید یہ بھی کوئی فقیر ہے۔ اُس نے سفر میں ٹرین اور بسوں میں مختلف قسم کے گونگے اور مفلوج فقیروں کو دیکھا تھا جو کاغذات دکھا کر بھیک مانگا کرتے تھے۔

اُس نے دیکھا دو پرائیویٹ کاریں ذرا آگے آکر رُکی تھیں، وہ نوجوان جیسے باز کی طرح اُن پر جھپٹا تھا۔ اور اُس نے اُترنے والے مسافروں میں جو ذرا متموّل اور وجیہہ شخص تھا اسے جا لیا اور پھر نفی میں گردن ہلی۔ اور نوجوان اپنے چہرے کی بجھتی مسکراہٹ میں لَو دینے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا — یکایک نوجوان کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ تیزی سے لپکتا ہوا آدھمکا۔ اور گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا —

"پلیز سر لیسن ٹو می — سر مجھے آپ کہیں بھی کسی جگہ نوکر رکھوا دیں۔ سر میں نے بی ایس سی پاس کیا ہے۔ یہ میری سرٹیفکیٹس ہیں۔ پلیز سر فیتھ می۔ میں غریب ہوں! پر میری رگوں میں شرافت کا خون ہے۔ پلیز ہیلپ می سر — پلیز سر!!"

نوجوان اُس کے رکتے اور خاموشی سے گفتگو سننے پر جیسے پُرامید

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

رؤف خیر

بے اثاثہ (ذوالفقار احمد کی نذر)

یہ واقعہ ہے کہ میں ابنِ بے اثاثہ ہوں
نہ کوئی گھر نہ زمیں پائی میں نے ترکے میں
وہ ایک گھر جو تھا پرکھوں کا آخری پندار
ہُوا ہے اُس پہ بھی اتمامِ لطف و نظرِ کرم

مری شریکِ نفس ہے تمہاری ہانپتی سانس
مرے بدن میں تمہارا پسینہ شامل ہے
تمہارا رعشہ گناہوں سے روکتا ہے مجھے

یہ ہاتھ خالی نہیں، صاحبِ قلم ہوں میں
(قلم نہ ہوتا تو تیشہ ہی میں اُٹھا لیتا
کہیں وقار نہ زخمی ہو دست و بازو کا)
یہ آنکھ کاسہ نہیں، چشمِ معتبر ہوں میں
یہ دِل سیاہ نہیں، نُور کا سمندر ہے۔

مجھے تمہارے وسیلے سے مِل گیا کیا کیا
یہ جھوٹ لگتا ہے میں ابنِ بے اثاثہ ہوں!

شاطر حکیمی

سینۂ کائنات کا اضطراب و کرب!

یہ مہر و ماہ، یہ انجم، یہ کہکشاں، یہ شفق
یہ روز و شب کی کتابیں یہ روشنی کے ورق
پیالۂ گل و لالہ، یہ رنگ و بُو کی شراب
یہ نا و نوش کا موسم، یہ فصلِ برق و سحاب
یہ طائرانِ چمن کی جگر گداز آواز،
یہ جوئے بار کے نغمے یہ آبشار کے ساز
یہ شہرِ خاک نشیناں، یہ ہوشوں کا جہاں
یہ بزمِ سیف و قلم یہ جہاد کا میدان
یہ سرحدوں کے نگہباں، یہ پربتوں کے ہجوم
یہ گرم و سرد فضا، مرکزِ نسیم و سموم
یہ ساحلوں کی خموشی یہ شورشِ طوفاں
یہ برف بار گھٹائیں، یہ موجِ آبِ رواں
یہ امن و شر کے مناظر، دیارِ خیر و فساد،
یہ کائناتی مسائل کا ناگزیر تضاد
یہ حاملانِ جرائم، یہ قاتلانِ سکون
یہ مجرمانِ فراعنہ یہ حامیانِ جنوں
یہ باغیوں کی جماعت یہ سرکشانِ حرم
یہ خوش دلانِ مذاہب یہ زادۂ آدم،
دِل و نگاہ کا آرام ہو گیا ہے حرام
اک اضطرابِ مسلسل لئے ہوئے ہیں تمام
مجھے یہ فکر انہیں انتظار ہے کس کا؟
نشانِ پائے سرِ رہ گذار ہے کس کا؟

احمد تنویر

انعکاس

ہوائیں ساکت ہو گئی ہیں۔ شور بڑھ رہا ہے۔ زرد چہروں کا ہجوم آنکھوں میں سرخ سرخ انگاروں کی تند حدت لیے چیخ رہا ہے۔ جنہوں نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لیکن ابھی تک انہیں وہ منزل نہیں ملی ہے جس کی تلاش میں انہوں نے اپنے چہروں کی رنگت تبدیل کر لی ہے۔ آدم کی یہ نسل نہ جانے کس کرب میں مبتلا ہے۔ ایک ہاتھ میں پتھر اور دوسرے ہاتھ میں خنجر لئے نہ جانے کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔
جب شاہراہوں اور گلیوں میں وہ نہ مل سکا اور عماروں اور جھونپڑیوں میں بھی اس کی کوئی خبر نہ مل سکی تو فیصلہ یہ ہوا کہ قافلے کا ہر ایک شخص الگ الگ راستوں پر نکل جائے اور جس شخص کو بھی وہ مل جائے اسے پکڑ لائے۔ اور تب سبھوں کے سامنے اس کو سزا تجویز کی جائے۔ تو ایسا ہی ہوا اور ان میں سے ہر ایک شخص الگ الگ راستوں پر ہو لیا اور اب جبکہ سورج اپنی کرنیں سمیٹنے میں مصروف ہے سوکھے اور لہلہاتے کھیتوں پہاڑوں جنگلوں دریاؤں اور صحراؤں کی خاک چھان کر تمام لوگ واپس ہو گئے ہیں۔ لیکن اب تک وہ نہ مل سکا ہے جس کی ان سبھوں کو تلاش ہے۔
ان کی آنکھیں ابھی تک سرخ ہیں اور ایک ہاتھ میں پتھر اور ایک ہاتھ میں خنجر بدستور ہرا رہا ہے ——— دفعتاً شکست خوردہ ہجوم میں سے کسی ایک نے کسی دوسرے کے کان میں سرگوشی کی ہے

ہم کس کی تلاش میں ہیں؟

ہمارا رقیب کون ہے؟

——— دھیرے دھیرے ایک بھنبھناہٹ پورے ہجوم میں پھیلتی جا رہی ہے۔

ہم کس کی تلاش میں ہیں!

ہمارا رقیب کون ہے؟؟

——— لیکن کسی کے پاس بھی اس بات کا جواب نہیں ہے۔ بس سبھی ایک دوسرے کو گھورتے جا رہے ہیں اور پھر گھورتے گھورتے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنا ہی عکس دیکھ کر ان کے چہروں کی رنگت ایک بار پھر تبدیل ہونے لگی ہے۔ جسم کے تمام اعضا ڈھیلے پڑنے لگے ہیں اور ہاتھوں سے پتھر و خنجر چھوٹ چھوٹ کر دھرتی پر گرتے جا رہے ہیں۔
تلاش و جستجو ختم ہونے کے باوجود آدم کی یہ نسل ایک کرب سے نجات پا کر اب دوسرے کرب میں مبتلا ہو چکی ہے!

صداقت کی ۱۹ ستمبر

بچہ

عجیب سی رات تھی وہ کوئی سایہ "دھڑکتا" ہوا نہیں مل رہا تھا۔ سب نہ جانے کہاں سنبھلتے پتّوں کی طرح بے بس ہو کر
جامد و ساکت پڑے ہوئے تھے۔

پٹریوں پر کوئی کھٹکا تو نہیں تھا جو اس جمود کو توڑ کر رات کے بطن میں خاموشی کے پیدا شدہ اس تسلسل کو توڑ دیتا۔ اس رات
کے بطن میں تو دھڑکن "کا" پتا بھی لا دیتا۔ اس رات کی پھیلی چادر میں نغمات "گنگناہٹوں" اور لوریوں کا جادو جگا دیتا۔

آخر بڑی بڑی پلکوں پر سانسوں کی بڑی بے تاب سی آہوں نے اسے اس طرف مائل ہونے پر مجبور کیا کہ وہ دیکھے اس گوشے میں
ایک ننھے سے بچے کی لاش سردی سے ٹھٹھر کر اکڑی پڑی تھی۔

وہ اس کا اپنا بچہ تو نہیں تھا پھر بھی وہ جانے کیوں پتّوں کی طرح خاموش پیڑوں کی مانند جامد اور ہواؤں کی طرح ٹھہر گیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اس نے سہمی سی اس آستین والے سینے کے ساتھ دبوچ لیا اور اپنی میلی گدڑی سی سوکھی چھاتیاں اس کے ہونٹوں
کے ساتھ دبائے جس پر وہ ہونٹوں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ بھی اس بچے کی طرح بے جان اور بے حس ہو چکا تھا۔ اس سماج کی طرح جس نے اسے ایک
کوڑھ ایک گناہ ایک زحمت سمجھ کر اس گوشے میں پھینک دیا تھا۔

اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اب وہ اس لوتھڑے کو خود بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا اس گوشے سے باہر نکلنے کی
کوشش کر رہا تھا کیونکہ فضا میں آوازوں کا شور، پرندوں کی چہچہاہٹ کا شور، اس کی ٹکار آلود آنکھوں کی طرح اب اٹھنے لگا تھا۔ رات
نہ جانے کب وہ اپنا گوشہ خالی کر چکی تھی۔ گھر پہنچ جانے اس کے موہوم بچے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وقت ناچنے گانے والیوں کے
کوٹھوں پر سے رقص کرنے کی آوازیں اس کے کانوں میں دھمک اٹھی تھیں۔

۵۵

مقالہ

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

ہیئت

ہیئت کا مفہوم جس قدر آسان ہے اُسی قدر پیچیدہ بھی ہے۔ اِس لفظ کی سادگی و پُرکاری کا تقریباً تمام نقّادوں نے اعتراف کیا ہے۔ مواد کے مخالف مفہوم رکھنے والے اس لفظ کو ہم ادب میں عموماً لفظ "سانچہ" کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہیئت کا مفہوم صرف سانچہ نہیں، اس سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ یوں کہیے کہ یہ مفہوم بڑی حد تک متعین ہونے کے باوجود لوچ اور لچک کا حامل ہے۔ ہم ناول افسانہ، ڈرامہ، غزل اور مثنوی کی ہیئتوں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن یہ کیا بات ہے کہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی مواد کے حامل دو ناول دو افسانے، دو مثنویاں اور غزل کے دو اشعار ایک معیار کے نہیں ہوتے۔ یہاں اسلوب کی بھی اہمیت ہے لیکن اس کا بنیادی سبب ہیئت ہے۔ ہیئت میں صرف سانچہ ہی نہیں، الفاظ کا استعمال، جملوں یا مصرعوں کی ترکیب، ترتیب اور تنظیم بھی آجاتی ہے۔ اور غزل یا نظم کتنی طویل ہونی چاہیے کس بحر کا استعمال کرنا چاہیے، غنائیت کیسی اور کتنی ہو۔ نظم، افسانہ یا ناول وغیرہ ہو تو اس کا عنوان کیا ہو۔ کم و بیش یہ ساری باتیں ہیئت میں شامل ہیں۔ فنکار صرف و نحو کا استعمال کس طرح کرتا ہے اِس پر بھی ہیئت کے بانکپن اور ندرت کا انحصار ہوتا ہے ـــــ کسی ناول یا افسانے کے چند جملوں، مثنوی یا قصیدہ کے چند اشعار کے ذریعہ ہم کسی فنکار کے اسلوب کو واضح کر سکتے ہیں۔ اِس طرح "کُل" کے ایک ٹکڑے "جزو" کی مثال اسلوب کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہیئت کی تفہیم کے لئے جزو ناکافی ہے وہ بجائے خود "کُل" ہے۔ ہیئت اپنی ایک اکائی رکھتی ہے۔ اُس کی ایک وحدت ہے۔ ادب میں اسلوب کی اہمیت خواہ کچھ ہو لیکن بنیادی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہیئت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اسلوب کا انحصار بھی دراصل ہیئت پر ہے۔ کسی تخلیق میں ہیئت سے مراد مواد سے قطع نظر سب کچھ ہوتا ہے۔ (تخلیق۔ مواد = ہیئت) لیکن بعض نقّادوں نے لفظ "ہیئت" میں ایک حد تک "مواد" کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جیسا کہ ڈبلیو۔ پی۔ کیر نے۔ وہ لکھتا ہے:

> لفظ ہیئت اِسی قدر مبہم اور خطرناک ہے جس قدر کہ لفظ "فطرت" (Nature) جب ہم نظم کی ہیئت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ہم نظم کی ہیئت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں یا اُس کے مواد کے بارے میں۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس وقت یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔"[1]

دراصل ہیئت پر کسی تخلیق کے وقیع اور معیاری ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ اُس کی ایک نہیں کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر غزل گو شعراء نے ایک ہی مضمون کو باندھا ہے، لیکن ہم کسی ایک شاعر کے شعر کو عمدہ قرار دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ شاعر کا اپنا اسلوب ہی نہیں وہ ہیئت بھی ہے جس کو اس شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور تو اور میر کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

باہر اشورش کے جو لوگوں نے کہا کیا پوچھنا تو وہ یہ کہا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو، یہ وہی تو خانہ خراب ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

---

[1] W. P. KER, Form and Style in Poetry - MACMILLAN, LONDON 1966 P. 137

ان دونوں شعروں میں مواد ایک ہی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلوب دونوں اشعار میں جدا جدا ہے کیونکہ میرؔ کا اسلوب میر ہی کا اسلوب ہے۔ پھر بھی جو بات دونوں اشعار کو ممیز کرتی ہے، وہ ان کی ہیئت ہے۔ دوسرے شعر میں میرؔ نے جو ہیئت استعمال کی ہے اس سے شعر مزہ دے جاتا ہے۔ یہاں ہیئت مواد سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یا مراثی کی مثال لیجئے۔ مرثیہ نگار شاعر کئی ہیں، لیکن کیا بات ہے کہ ہم انیسؔ کو اہمیت اور افضلیت دیتے ہیں۔ واقعۂ کربلا سے متعلق جتنے مراثی ہیں ان سب کا مواد ایک ہے، پھر انیسؔ کے ہاں یہ عظمت و رفعت کیوں؟ اگر ہیئت سے مراد وہ ادبی سانچہ لیا جائے جو عام طور پر مراثی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تب بھی تمام مرثیہ نگاروں کے ہاں ہیئت وہی ہے، پھر انیسؔ کا باعثِ انفرادیت؟ یہاں ایک مقررہ سانچے سے انیسؔ کا جو TREATMENT ہے وہ بھی جزوِ ہیئت ہے اور ہیئت میں یہی شعر تاب و توانائی کا حامل ہوتا ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہی ہیئت ہے!"

PARADISE LOST کی مثال دیتے ہوئے کیر (KER) نے اس بات کو اپنے طور پر نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے:

"PARADISE LOST کا مواد کیا ہے جو اس کی ہیئت سے مختلف ہے۔ فطری طور پر جواب ہوگا کہ اس کا مواد قطعی تاریخی ہے اور یہ مواد ملٹن کے علاوہ دیگر لوگ بھی بیان کر سکتے ہیں۔ اس طرح گویا ہیئت وہ شے ہے جو ملٹن نے اس نظم میں لکھی ہے اور جس شاعرانہ طریقہ سے اس مواد کو پیش کیا ہے[1]۔ اسی خصوص میں وہ آگے چل کر ترمیم کرتا ہے کہ PARADISE LOST کا مواد ایک کہانی ہے جس کو ہر شخص اپنے طور پر بیان کر سکتا ہے لیکن ہیئت ملٹن کی اپنی ہے، اس کے اپنے الفاظ ہیئت ہیں۔"

" اس طرح ہیئت کی وضاحت ہو تو فرد جاتی ہے لیکن یوں کہ ہیئت کا صرف تجریدی تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف بطنِ فنکار میں ہوتی ہے۔ فنکار کے ذہن میں کوئی مواد ہے۔ مواد کو چن لیتا ہے اور اظہار چاہتا ہے۔ اس مواد کے لئے کسی ہیئت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ فنکار مختلف ہیئتوں میں سے کسی ایک ہیئت کا انتخاب کرتا ہے۔ اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہوتا ہے تو یہ سب ارادی اور شعوری طور پر نہیں ہوتا۔ ہیئت کے انتخاب کا "عمل" بس آپ ہی آپ اور لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ شاید فنکار بھی وضاحت نہ کر سکے کہ اس نے فلاں مواد کے لئے فلاں ہیئت کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ لیکن ہر فنکار اس عمل سے گزرتا ہے کیونکہ ہیئت کے بغیر مواد بیکار ہے۔ یہ عمل کچھ ایسی برق رفتاری سے ہوتا ہے کہ فنکار کے ذہن میں مواد "پہلے" وجود میں آنے کے بعد صرف کہا جا سکتا ہے کہ ہیئت کا انتخاب تقریباً ساتھ ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسرے ثانیے میں یا مواد کے وجود میں آنے والے ثانیے کے فوراً بعد کہ ہم ان دونوں ثانیوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے اور نہ ان دونوں کے مابین حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔"

ہیئت کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ کینتھ بروک نے اپنے مضمون ـــــ THE NATURE OF FORM میں ہیئت کی چار بڑی اقسام بیان کی ہیں۔

اس کے بموجب ہیئت کی پہلی قسم ترقی پذیر ہیئت ہے۔ ترقی پذیر ہیئت کو کینتھ بروک نے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں پہلی منطقی ہیئت ہے۔ یہ ہیئت عموماً مدلل اور چست ہوتی ہے۔ جن تخلیقات میں اس ہیئت کا استعمال کیا جاتا ہے اس میں فنی ارتقاء بتدریج عمل میں آتا ہے۔ سمجھنے کو تو یہ ہیئت بالعموم جاسوسی کہانیوں میں ہوتی ہے، جہاں مختلف واقعات باہم گہرے مربوط ہونے چاہئیں کہ ہر آنے والا واقعہ واقعۂ ماسبق سے ہم آہنگ ہو، ان کا تسلسل ہو اور آخر میں جو نتیجہ نکالا جائے وہ بے تعلق دکھائی نہ دے بلکہ واقعات کی پیش رفت کا لازمی نتیجہ ہو۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس ہیئت کا استعمال نثر کے لئے مخصوص ہے۔ اصلاحی اور مقصدی تحریروں میں اس ہیئت سے استفادہ کیا جاتا ہے جیسے سرسید احمد خاں کے رفقاء کے مضامین اور نذیر احمد کے ناولوں میں۔

---

1. "Form and Style in Poetry" P. 137

ترقی پذیر ہیئت کی دوسری قسم "زوعیتی ہیئت" ہے۔ ایسی ہیئت میں ایک ہی واقعہ پر مبنی ہونے کی بجائے [illegible] کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ہم آنے والے واقعہ کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہر واقعہ کی نوعیت میں آنے والے واقعہ سے متفاوت کرانے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ اس ارتقائی کیفیت کا تعلق واقعات کی نوعیت اور کیفیت سے ہوتا ہے اُن کے تدریجی ارتقا سے نہیں [illegible] زوعیتی ہیئت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فسانۂ عجائب، سُرور کے ناول اور بیشتر اردو مثنویوں میں کچھ اسی طرح کی ہیئت سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ہیئت کی دوسری قسم "تکراری ہیئت" ہے۔ اس میں ایک ہی ہیئت تکراری بہت تبدیلیوں کے ساتھ بار بار پیش کی جاتی ہے۔ ایسی ہیئتوں کا جہاں استعمال کیا جاتا ہے اُن میں امیجز ہوں کہ کچھ [illegible] ہوتی ہے۔ ان کو بار بار دہرایا جاتا ہے [illegible] حالات کا ساتھ دیتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں یہ ہیئت استعمال کی جاتی ہے۔ ابوعمر "فسانۂ آزاد" میں یہ ہیئت ہے۔ شاعری میں [illegible] نے "پرچھائیاں" میں اور سردار جعفری نے اپنی کئی نظموں بالخصوص "نئی دنیا کو سلام" میں یہی ہیئت استعمال کی ہے۔ ابنِ انشاء نے بھی اپنی بعض منظومات میں اس ہیئت سے کام لیا ہے۔

کینتھ برک نے ہیئت کی تیسری قسم کو روایتی ہیئت سے موسوم کیا ہے۔ قاری کو تخلیقات میں بعض اوقات ترقی پذیر، تکراری اور [illegible] ہیں۔ ذاتر کر جاتی ہیں خواہ وہ اُن سے واقفیت رکھتا ہو یا نہیں لیکن روایتی ہیئت کم و بیش ہر قاری کے لئے جانی پہچانی ہوتی ہے۔ ہزبان و ادب میں اس ہیئت کا استعمال بہت زیادہ ملتا ہے۔ اس ہیئت میں کوئی پیچیدگی نہیں [illegible] پیچ و خم نہیں ملتے۔ یہ ہیئت بے حد سیدھی سادی، رواں دواں اور معمول کے مطابق ہوتی ہے۔ ایسی تخلیقات میں آغاز و انجام سب کچھ جانا پہچانا ہوتا ہے۔ خالص آغاز اور خالص انجام! یونانی المیوں میں اور ہمارے یہاں مرثیوں، قصیدوں اور غزلوں میں یہی ہیئت ملتی ہے۔ [illegible] اے آر۔ خاتون اور اسی قبیل کے ناول نگاروں نے اس ہیئت کو استعمال کیا ہے۔

ہیئت کی چوتھی اور آخری قسم "موقتی اور چھوٹی ہیئت" ہے۔ تخلیقات میں بعض اوقات چھوٹی موٹی اور موقتی ہیئتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جیسے استعارہ، قول فیصل، تضاد وغیرہ میں۔ اِن کے کرداروں اور واقعات پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً قولِ فیصل سے بات ایک جھٹکے میں ختم ہو جائے گی۔ بڑھتی ہے۔ اس ہیئت میں فنکار ذیلی ہیئتوں کے علاوہ ہیئتوں کا بھی [illegible] شکلوں میں استعمال کرتا ہے۔ یہ وقتی ہیئت جیسا کہ ظاہر ہے، واقعات کے نشیب و فراز کی روشنی میں متبدل ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک ترقی پذیر ہیئت ہے اور خیال کی مرکزیت کو برقرار رکھنے کے باعث ایک تکراری ہیئت بھی۔ اس ہیئت کا استعمال عموماً طویل ناولوں اور منظوم ڈراموں میں ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی افسانے، ناول، قصے، داستان یا نظم کے بعض اقتباسات اپنی جگہ مکمل اور بامعنی ہوتے ہیں [illegible] کی عمدہ مثال ہے۔ اڈمنڈ برک کے ہاں ہر پیراگراف ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ ابز بیتھ کے عہد کے ڈراموں میں بالعموم یہ ہیئت [illegible] اُردو میں "باغ و بہار"، "سب رس" اور کرشن چندر کی "گدھے کی سرگزشت" میں یہ ہیئت ہے۔

بعض اوقات کئی ہیئتیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ ترقی پذیر ہیئت، روایتی اور چھوٹی وغیرہ ہیئتوں کا ایک دوسرے سے یوں گھل مل جانا کہ اُن کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کیا جاسکے۔ کیٹس کی ODE TO A NIGHTINGALE [illegible] ہیئتوں کا امتزاج پایا ملتا ہے۔ "امراؤ جان ادا" اور حیات اللہ انصاری کے ناول "لہو کے پھول" میں کئی ہیئتیں پائی جاتی ہیں۔

ہیئتوں کا ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے کے علاوہ ہیئتوں کا باہمی تصادم بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تصادم [illegible] آتا ہے۔ کینتھ برک کے بموجب کوئی فنکار کسی کردار کو اس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ اب اُس کو ختم ہو جانا چاہیئے [illegible] اس قدر کشش ہوتی ہے کہ قاری اُس کی بقا چاہتا ہے۔ یہ منطقی اور زوعیتی ہیئتوں کا تصادم ہے کہ کوئی کردار ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ [illegible]

ارتقا بیش [illegible] ہے تو کردار میں بانکپن ممکن ہے، لیکن کردار کا ارتقا [illegible] ہوتا ہے۔ یہاں کوئی دو ہیئتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں اور فنکار کو ایک ہیئت کی خاطر دوسری ہیئت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اُردو کی قدیم داستانوں میں عموماً ایسی ہیئتیں پائی جاتی ہیں روایتی ہیئت اور تخلیقی ہیئت کا تصادم بھی ممکن ہے۔ جبکہ ڈراما، داستان یا ناول کا موضوع ابتداً غیر جاگیردارانہ ہو اور جاگیردارانہ معاشرہ کے موضوع کی صحت پر اصرار کرے۔

نثر اور شاعری دونوں میں ہیئت کی اہمیت ہوتی ہے لیکن شاعری میں کہیں زیادہ۔ بعض مغربی نقادوں کے نزدیک تو شاعری میں ہیئت ہی سب کچھ ہے۔ ہیئت کے سوا کچھ نہیں اور اگر ہیئت کو شاعری سے جدا کر دیا جائے تو شاعری برقرار نہیں رہتی۔ دیوانِ غالب کی کتنی ہی شرحیں ملتی ہیں۔ سب نے غالب کے طرزِ فکر اور مزاج کو اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود غالب کے اشعار کی دلکشی اور معنی آفرینی اپنی جگہ رہتی ہے۔ اقبال کی مسجد قرطبہ ــــ اگر اس نظم میں اقبال کے مخصوص زاویۂ فکر اور ان کے فلسفہ کو علیحدہ کر دیا جائے اور پھر اس کو نثر میں بیان کیا جائے تو یہ چیزیں اتنی ندرت اور بانکپن کی حامل نہ ہوں گی۔ گویا شاعری وہ ہیئت ہے جو اقبال نے اس نظم میں استعمال کی ہے اور یہ ہیئت اقبال کی اپنی ہے۔

بعض تخلیقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی کوئی ہیئت نہیں۔ اگرچہ ہیئت کے بغیر کسی تخلیق کا تصور ممکن نہیں۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں تخلیق ہیئت سے عاری ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں ترتیب و تنظیم اور ہیئت کے دیگر عناصر پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسی تخلیقات میں کئی ہیئتیں ایک دوسرے میں گڈمڈ بھی ہو سکتی ہیں یا ہیئتوں کا تصادم بھی ہو سکتا ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ساری باتیں ایک ساتھ عمل میں آئی ہوں۔ ایسی تخلیقات میں تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہیئت اس صورت سے اس وقت دوچار ہوتی ہے جب کہ فنکار اُلجھنوں کا شکار ہو۔ یہ اُلجھنیں نفسیاتی بھی ہو سکتی ہیں، ذہنی بھی اور جذباتی بھی ــــ ہیئت کا یہ بحران بسا اوقات تخلیق کی اہمیت و عظمت کو متاثر کر دیتا ہے۔

ہیئتیں اگرچہ بندھی ٹکی ہوتی ہیں، لیکن ہیئتوں میں بانکپن اور طرفگی ان کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور یہ منحصر ہے فنکار کے معاشرتی، معاشی اور ذہنی پس منظر پر، اس کی جذباتی وابستگیوں پر۔ اس کا ماضی کیسا تھا، اس کو کیا ورثہ ملا ہے اور اب وہ کس حال میں پرورش پا رہا ہے اور وہ کن سرچشموں سے اخذ و اکتساب کر رہا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس پر بھی ــــ وارث شاہ کے علاوہ اور کئی لوگوں نے ہیر رانجھا کا قصہ بیان کیا ہے۔ لیکن وارث شاہ کی مقبولیت کا باعث کیا ہے؟ ان کی تخلیق میں جو بانکپن، ندرت اور دلکشی ہے وہ کہاں ہے؟ اُردو میں قحطِ بنگال، تقسیمِ ہند کے ہنگاموں اور فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ پر نظم و نثر کا ڈھیر سا ذخیرہ ہے، اس کے باوجود بہت کم تخلیقات ایسی ہیں جن کو ہم اُردو شعر و ادب کا گراں قدر ورثہ قرار دے سکتے ہیں۔ اور بھی وجوہ ہوں گی لیکن ان میں اہم ترین وجہ یہ ہے کہ ہیئت اور مواد میں جیسا کہ ربط پایا جانا چاہئے ویسا ربط نہیں پایا جاتا۔ ان موضوعات کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن بیشتر فنکاروں نے ہیئت کی سمت توجہ نہیں دی یا ہیئت ناشناس رہے کہ تخلیقات کی دنیا کم عیاری ہے۔

ہیئت کا انحصار معاشی اور سیاسی حالات پر ہوتا ہے اور جب بھی ان حالات میں تبدیلی آتی ہے عصری حالات اور تقاضے بدلتے ہیں۔ ہیئت بھی تبدیل ہوتی ہے لیکن لازم نہیں کہ یہ تبدیلی تیز اور واضح ہو۔ ہیئت میں تبدیلی بے حد دھیمی، بہت آہستہ اور غیر مرئی سی ہوتی ہے۔ ایک اچھا فنکار ایسا فنکار جو عصری حسیت کا حامل ہوتا ہے وہ ان تبدیلیوں اور عصری تقاضوں سے بے پروا نہیں رہ سکتا اور رہنا چاہئے، یہ ممکن بھی نہیں۔ وہ ان کو اخذ کرتا ہے اور اپنی تخلیقات کو عصری زندگی کا آئینہ بنانے کے لئے استفادہ کرتا ہے۔ ان کو پرکھتا ہے۔ ان کے خوب و زشت کا جائزہ لیتا ہے وہ معاشرہ کے پیچھے رہ جانے کو گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ معاشرہ میں صحت مند تبدیلیوں کے لئے ہر وقت آمادہ اور ان کے تعمیر نو کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے فنکاروں کے یہاں ہیئت ساکت و جامد نہیں ہوتی۔ حرکی، تغیر پذیر اور سنگِ روحت ہوتی ہے۔ ہیئت کا ایسا ہی استعمال ندرت اجاگر اور فنکار کی انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

شفق تنویر

رنگوں کا خوشبوؤں کا سماں دیر تک رہا
خوابوں میں رقصِ لالہ رخاں دیر تک رہا

ساقی نے مے کے بعد لہو بھی پلا دیا
پھر بھی ہجومِ تشنہ لباں دیر تک رہا

آواز ایک بھی نہ لگی معتبر مجھے
ہمراہ شورِ ہمسفراں دیر تک رہا

بونوں کے آگے ختم ہوا آخر سرِ غرور
ہر چند سحرِ سرو قداں دیر تک رہا

مردہ صدائیں جسم کی قبروں میں گھٹ گئیں
ہنگامِ جوشِ زندہ دلاں دیر تک رہا

پھر بھی نہ پا سکا نگہِ دور رس شفق
حالانکہ قربِ دیدہ وراں دیر تک رہا

غزلیں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خان منشاؔ

ننھی زخمی لہو لہو چہرے
بلبلاتے ہیں کو بکو چہرے

بکھرا بکھرا ہے درد کا سونا
پیلے پیلے ہیں چار سو چہرے

روز و شب گرم گرم اشکوں سے
جانے کرتے ہیں کیوں وضو چہرے

بن کے تصویرِ خامشی اکثر
ہوتے ہیں محوِ گفتگو چہرے

نرم و نازک شگفتہ و شاداب
پھول جیسے ہیں ہو بہو چہرے

ان نگاہوں کی بات کیا کہیے
کرتے ہیں جن کی جستجو چہرے

فیضی نظام پوری

ہر ایک چہرہ دمکتا دکھائی دیتا ہے
مگر دلوں میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے

عجیب سی ہے یہ مکر و فریب کی دنیا
جسے بھی دیکھئے اپنا دکھائی دیتا ہے

ہے سرد برف کی مانند وقت کا سورج
ہر ایک لمحہ پگھلتا دکھائی دیتا ہے

گھنا گھنا تو ہے جنگل حیات کا لیکن
شجر شجر مجھے تنہا دکھائی دیتا ہے

وہ ایک خوابِ مسرت جو ہے نصیب نہیں
ہمارے درد کا سایہ دکھائی دیتا ہے

جو سوچتا ہوں وہی سامنے ہے اے فیضی
خیال و خواب میں رشتہ دکھائی دیتا ہے

نسیم محمد جان

توجیہہ

شیلا اور مدھوکر بھی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ چائے کی پیالیاں بھری ہیں۔ اُنھیں اُٹھا کر اندر رکھ دینا چاہیے۔ کتنا بڑا فرق ہے اِن خالی پیالیوں اور گرم چائے سے بھری ہوئی پیالیوں میں۔ پیالیاں بھلے ہی بھری اچھی لگتی ہوں۔ مگر آدمی اندر سے جتنا خالی ہو اُتنا ہی بہتر ہے، جلد جلد ترقی کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ مدھوکر کو میں اسکول ہی سے جانتا ہوں۔ گندمی رنگ، اکہرا بدن، فٹ بال بہت اچھی کھیلتا تھا۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا ہے مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اجنبی سا لگتا ہے۔ زندگی کے دس سال ذکیہ کے ساتھ گزار چکا ہوں، صبیحہ پلتے بڑھتے سات سال کی ہو گئی ہے۔ چار سال کی رخشاں میری اُنگلی پکڑے چڑیوں کی طرح چہکتی رہتی ہے —— لیکن جب بھی میں نے اِنھیں غور سے دیکھنا چاہا، مجھے سبھی اجنبی لگے۔ شاید ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ ممکن ہے ہر گزرتا ہوا لمحہ ہمیں نیا چہرہ دے جاتا ہو ——

شیلا مدھوکر کی نئی بیوی ہے، ابھی اُس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مدھوکر خوش نظر آتا ہے۔ خوش تو اُس وقت بھی تھا جب اس کا ذہن مکمل طور پر جینی کی گرفت میں تھا۔

'میں سب کچھ کر سکتا ہوں جینی سے الگ نہیں رہ سکتا۔ جینی کے لئے اپنی قربانی بھی دے سکتا ہوں۔ . . . .

'کیا جینی بھی تمہارے لئے . . . .

'ہاں وہ بھی مجھے حاصل کرنے کے لئے سارے پرانے اصولوں کے چہروں پر بھرپور طمانچے مار سکتی ہے . . . . اُس کا باپ ٹیڈ بڑا مذہبی ہے۔ جانتے ہو کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ پہلے مدھوکر کو مذہب تبدیل کرنے کو بولو۔

'—— اور تمہارے ماں باپ کی کیا رائے ہے؟'

'گھر سے نکال باہر کرنے کی —— برہمن خاندان کے آنگن میں کرسچین لڑکی آ جائے گی تو سارا آنگن ناپاک ہو جائے گا نا؟'

'تو پھر کیا پروگرام ہے؟'

'سیول میرج کا —— مذہب تو ذاتی چیز ہے۔ چند اصولوں کا نام ہے۔ ہم بنیادی طور پر انسان ہیں۔ اس بنیاد کو ہلانے کا حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔'

'لیکن ——'

'لیکن کیا جینی اور میں خود اپنا بھلا برا سوچنے کا حق رکھتے ہیں۔ زمانہ ہر لمحے آگے بھاگ رہا ہے۔ ہمارے والدین بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ صرف اس لئے ناراض ہیں کہ ہم اُن سے آگے کچھ فاصلے پر کیوں کھڑے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں —— ماں کہتی ہے میں نے تمہیں دودھ پلایا۔ جاڑے کی راتوں میں خود گیلے بستروں پر سوئی مگر تمہیں —— مگر میں سوچتا ہوں ہم سے تو سامنے چھجے پر چڑیاں بھی اچھی ہیں۔ یہ بھی تو آخر اپنے بچوں کی چونچوں میں دانے ڈالتی ہیں لیکن اپنی خدمات کے دام کبھی طلب نہیں کرتیں۔ بچوں کے جب پَر نکل آتے ہیں تو یہ نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ چڑیوں کی زندگی میں کوئی پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے؟'

مدھوکر کہتا ہے کہ مجھے ایک سائیکل خریدنا چاہیے۔ دفتر دو کیلومیٹر دور ہے۔ میں کہتا ہوں دو ہی کیلومیٹر کا تو فاصلہ ہے۔ ویسے بھی

آدمی کو زیادہ آرام طلب نہیں ہونا چاہئے۔ سائیکل تو خریدی جا سکتی ہے مگر اس سے بھی زیادہ کام ہے پیسہ اور جسم داخل کرنا۔ ویسے بھی دفتر جاتے ہوئے مجھے چھ سال ہو رہے ہیں۔ سائیکل سے بہت خراب ہو جاتی ہے۔ اس کی حالت ابھی نہیں، کبھی ہوا نکل گئی، کبھی ٹائر پھٹ گیا۔ اچھے نئے ٹائر کے لئے کوآپریٹو کے سکریٹری کے یہاں ہینڈ بیگ جا کر دیکھئے۔ کون جھنجھٹ مول لے —— پیالیاں اٹھا کر رکھ دینی چاہئیں۔ ذکیہ شاید کچن میں ہے —— جینی نیپال چلی گئی۔ ایک سال سے دھوکر کے پڑوس میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

'کسی کام میں اب تمہارا دل نہیں لگتا، میں اچھی طرح جانتا ہوں'۔

'صبح سے تو ماما کچن میں لگی ہے'

'تم کیا کر رہی تھیں۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں'

'آپ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ دادو صبح سے رو رہا ہے۔

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے'

'بکواس —— میں سب کچھ سمجھتا ہوں ——

تمہارا جی اب اس گھر میں نہیں لگتا —— کھانا پینا میرا بھی کھانا۔ کیا پینا کھانا میں نہیں کھاتا ہوٹل ہی میں کھاؤں گا'

حالانکہ دو سال قبل ذکیہ ان دونوں کی مثالیں دے دے کر میرا دماغ خراب کرتی تھی —— جب دیکھئے دونوں ساتھ، شام ہوئی اور نکل گئے ملک شاپ۔ بھلا روز روز شاپنگ کون کرتا ہے۔

—————— آپ تو ساتھ گھومنے سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے میں بیوی نہیں کوئی چھوت کی بیماری ہوں،

'دھوکر نے دیر سے کی ہے۔ اگر تم بھی شادی سے قبل گزارے ہوتے ہمسے محبت کرتیں تو تم کو کندھے پر بٹھا کر گھومنے نکلتا'

ذکیہ ایسی باتوں سے اب بھی شرما جاتی ہے —— اور شرماتی ہوئی وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ جینی نرس تھی ممکن ہے وہ نیپال میں پھر ملازمت کرتی ہو۔

اب میرے لئے اس گھر میں ایک پل رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ کب سے وہ کلرک یہاں بیٹھا تھا؟'

'آپ ہی کا تو انتظار کر رہا تھا'

ہاں اب تو تم یہی کرو گی —— اور کہنے کے لئے رہ کیا گیا ہے'

'کیا بات ہوئی'

'چائے بھی میں نے ہی لے جا کر اسے دی تھی ——

میں اپنے لئے چائے بنا رہی تھی۔ سوچا آپ کا انتظار کر رہا ہے ایک کپ جا کر رکھ آؤں'

'یہ بھی کیوں نہیں کہتیں، وہ چائے پی رہا تھا اور تم اُسے باتیں سنا رہی تھیں'

'یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے'

اگر کچھ بات ہی نہ تھی تو مجھے آتے دیکھ کر بھاگنے کی پیالی اٹھا کر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔

'ماما بازار گئی ہوئی تھی سوچا پیالی خود ہی واش کر دوں'

'تو ماما کو بھی تم نے باہر بھیج دیا تھا'

'کیا بکتے ہیں آپ؟'

'میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں تم کو —— اسی لئے تو وہ دفتر میں ادھورا کام کر کے کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر یہاں آنے کی کوشش کرتا ہے'

'تم بہت گر گئے ہو —— شرم نہیں مجھ پر الزام لگاتے ہوئے'

'تم سے اور امید ہی کیا رکھی جا سکتی ہے، ایک نرس ——'

'اب حد سے بڑھ رہے ہیں آپ'

'مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا'

'آپ کیوں گھر چھوڑیں گے —— میں خود چلی جاؤں گی'

'ذکیہ'

'ہاں'

'سن رہی ہو'

'ہاں'

'اب تم کچھ نہیں کہتیں'

'کیا؟'

'پہلے تو تم یہ کہا کرتی تھیں کہ میں دھوکر کی طرح تمہیں وہاں تمہیں کیوں نہیں ٹہلاتا ——'

'جی ہاں'

اب تمہیں کہنا چاہئے کہ میں دھوکر کی طرح لڑتا کیوں نہیں؟'

اس [illegible] شادی [illegible] ہیں،
[illegible] ڈھوکر سے [illegible] تھا

'[illegible] ہو میں سفر [illegible] کی،'

'[illegible]؟'

'[illegible] سے شادی کر کے،'

'کیوں؟'

'[illegible] پنے ہی ماں [illegible] ہے،'

'اپنا [illegible] کرنے کی کوشش کرو،'

'اپنے جنت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— ایسا لگتا ہے کہ ایسی حسینوں سے صرف ہی پیدا کیا جا سکتا ہے'

'——— میرا مطلب ہے کہ تم فاصلے سے اچھی لگتی ہیں،'

لیکن شادی کے قبل تم اُس کے نام کا دم بھرتے تھے،

ہاں۔ مگر اب جس کی شکل سے نفرت [illegible] ہے تم جانتے ہو میں بہت بزدل آدمی ہوں۔ بہت بزدل [illegible] کر سانس نہیں لے سکتا۔ جس طرح اپنایا تھا اسی طرح ذہن کے ہر گوشے سے نکال کر پھینک بھی سکتا ہوں،

مگر۔ طوطو کا کیا ہوگا،

ہر بچہ اپنا مستقبل خود بناتا ہے۔ میں بزدلوں کی طرح حالات سے سمجھوتا نہیں کر سکتا ——— اتنی چھوٹی سی زندگی اُسے بھی جہنم بنا دوں۔ باپ بھائی بہن ماں سب کو چھوڑا ——— بہت بڑی غلطی کی میں نے،

مگر جینی بھی تو اپنے ماں باپ سے صرف تمہارے لئے الگ ہوئی'
اُس نے بھی نوکری چھوڑ دی،

'ہاں اُس جینی سے مجھے اب بھی پیار ہے۔ وہ جینی کوئی اور تھی!

اُس دن جینی آئی تو اُس کا چاندی رنگ دھواں پڑ گیا تھا۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر باتیں کر رہی تھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی سمندر کے کنارے کھڑا ہوں جس میں [illegible] پانی ہے۔ مگر [illegible] جیسا شور نہیں۔ ہم دونوں نے جینی کو بہت سمجھایا مگر وہ بار بار کہہ رہی تھی جینی نیپال میں [illegible] عورت تنہا [illegible] تھی جب وہ تیاری کر رہی تھی [illegible] جا سکے گی ——— [illegible] ہی تعمیر

: [illegible] عورت کے بطن میں دب کر مر چکی ہوں۔ کسی لاش میں [illegible] کی امید فضول ہے، اس میں حرارت کبھی نہیں آ سکتی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ ایسی جگہ جہاں اب تک کے جلنے بھلنے بچھڑنے [illegible] ——— کل میں جا رہی ہوں ڈیکھ بہن!

دیکھو یہ [illegible] ہوں۔ سفر میں کیسے رہے گی ——— یہاں کا سب کچھ یہیں چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں' ——— تم نے جیسے کپڑے، سبھی زیورات ——— میں صبح یہ شادی پہن لوں گی۔ بالکل خالی ہاتھ اس گھر سے نکلوں گی۔ کل کورٹ سے علیحدگی کا کاغذ مل جائے گا۔ شادی کی انگوٹھی ڈھوکر کو میں کورٹ ہی میں واپس کر دوں گی،

'کیا تمہیں دس ہزار روپے مل گئے، شرط کے مطابق تو یہ رقم مل جانی چاہیئے'

'میں نے اُسے معاف کر دیا ہے،'

جینی چلی گئی۔ نیپال چلی گئی ———

'ڈھوکر تم کو شادی کر لینی چاہیئے،'

'شادی! شادی کے نام پر اب کان پر ہاتھ رکھتا ہوں بھگوان نہ کرے پھر اس چکر میں پڑوں ——— آدمی جانور ہو جاتا ہے۔ صرف بچوں اور بیوی تک قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ شادی دراصل ——— آدمی کے پاس صرف پیسہ ہونا چاہیئے۔ پیسے ہوں تو یہ ساری دنیا تمہاری ہو سکتی ہے، ورنہ اپنی اولاد اپنی بیوی بھی اپنی نہیں رہ جاتی،

'ڈھوکر تمہارے ریڈیو کی آواز بہت اونچی ہے،'

'مجھے یہی اچھی لگتی ہے،'

'مگر یہ تو کوئی غیر ملکی زبان ......،'

'تو کیا ہوا۔ گھر میں ایک ہنگامہ تو ہے،'

جینی کے جاتے ہی ڈھوکر کے والدین آنے لگے۔ ماں ڈھوکر کے لئے لڑکیاں دیکھتی پھرتی تھی۔ وہ تھا کہ شادی کے نام سے چڑھ جاتا تھا مگر یہ طوفان بھی ختم ہی گیا ——— وہ اب مجھ سے کہنے لگا تھا۔

'مرد بغیر عورت کے ادھورا ہی رہتا ہے ——— خالص

ہندوستانی عورتیں دنیا کی بہترین عورتیں ہوتی ہیں ــــــ صحت اور روپیہ کا کیا اعتبار۔ انسان کو ایک ایسا ہمدرد چاہیئے جو بُرے وقتوں میں بھی ساتھ دے ــــ سوائے بیوی کے اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا ــــــ شادی کے معاملے میں ہمیشہ بزرگوں کی رائے کا احترام کرنا چاہیئے۔ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔

دھوکر اور اُس کی نئی بیوی شیلا دونوں ہی ابھی ابھی اُٹھ کر یہاں سے گئے ہیں ــــــ چائے کی خالی پیالیاں اب تک یہاں پڑی ہیں۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں دھوکر جی سے" ذکیہ مجھ سے مخاطب ہے۔

"بس اِدھر اُدھر کی"

"میں تو آ نہیں سکی گوشت بھون رہی تھی۔ ماما کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"دھوکر جی کہہ رہے تھے میں سائیکل خرید لوں، مگر سوچتا ہوں عادت خراب ہو جائے گی۔ آدمی کو کچھ پیدل بھی چلنا چاہیئے پھر وقت ہمارے لئے کب قیمتی ہے جسے بچائیں۔"

"سائیکل تو آپ خرید سکتے ہیں۔"

"پیسے کہاں سے آئیں گے ــــــ تقریباً تین سو ۳۰۰ چاہئیں۔"

"میں دوں گی وہ عورت ہی نہیں جو کچھ پیسہ بچا کر نہ رکھتی ہو"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ نکالو پیسے میں ضرور خریدوں گا" بلکہ ابھی خریدوں گا۔ دیکھو نا کتنی دھوپ ہے پسینے پسینے ہو جاتا ہوں۔ وقت بھی بہت برباد ہوتا ہے۔ سائیکل سے تکان نہیں ہوگی۔ ساری باتوں سے الگ جیبو کو اسکول بھی اسی سائیکل پر چھوڑتا ہوا دفتر جایا کروں گا ــــــ بس اب دیر نہ کرو۔ تم رُوپے نکالو میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔"

ــــ اور میں بازار کی طرف سائیکل خریدنے جا رہا ہوں ــ کچھ فاصلے پر دھوکر اور شیلا شاید شاپنگ کے لئے ــ مگر ابھی تو پانچ بجے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کتنے دن تک یہ لوگ پانچ بجے شاپنگ کے لئے نکل سکیں گے۔ ▲▲

بقیہ: "آسمان سے گرا" صفحہ ۱۴

چولہا......!

خیالات کے دھوئیں کے ساتھ چولہے کی آگ بھی بھڑک رہی تھی ــ اچانک ایک کرخت بُو پھیل گئی ــ جل رہا تھا ــــ!؟

کسی کا جسم تو نہیں جل رہا تھا۔!؟

"نہیں نہیں صرف روٹی جل رہی تھی!

یعنی کہ پیٹ کی بھوک چیخ رہی تھی ....وہ چیخ جس کی آواز کے ساتھ ہی کائنات کی گردش رک جاتی ہے ــ!

ــــــ یہ تو صرف اُس کا سپنا تھا، یہ کیسے نہیں رکتا ــ!

بھلا اب کون سا سپنا زندہ رہ سکتا ہے ــــ!

اُس کا سپنا رک گیا، تب اُس نے جلتے چولہے کے پھیلتے دھوئیں میں گیلی آنکھوں کے ساتھ خود کو دیکھا۔! نہ وہاں کتابیں تھیں، نہ کار ــــ نہ مدرسہ تھا نہ ملائم ہاتھ، نہ یہاں وہ گھوڑی! یہاں تو ایک ٹوٹا پھوٹا بکھرا بکھرا سا گھر تھا، اور وہ ــ ــــ وہ جو خود بھی گنوار تھی جاہل تھی ــــ! ▲

بقیہ: گدائے سرِ رہگذر ۔ صفحہ ۴۰

ہو اُٹھا تھا۔ جلدی جلدی بولتے ہوئے بھی اُس کے ایک ایک لفظ میں اُسی کا ٹھہراؤ تھا ــــ اور ــــ وہ ایک بےجان و بےحس مورت کی مانند بس اُس نوجوان کو خالی خالی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے اُس کے غم واندوہ کی پیالی چھلک اُٹھی۔ اور وہ جو باوقار آفیسر نظر آ رہا تھا ــ اُس نے نوجوان کے کاندھے پر ہمدردی کا ہاتھ رکھتے ہوئے پگھلتی آواز میں کہا ــــ

"سوری!"

آگے بڑھتے ہوئے سامنے گرینڈ ہوٹل کے وال کلاک پر جب اُس کی نظریں پڑیں تو وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا! ــــ ▲

غزلیں

رؤف خیر (حیدرآباد)

مقتل سجے ہیں کوچہ و بازار کی طرح
ہر شہر میں فساد ہے تہوار کی طرح

پوجے نہ جاؤ گے کسی اوتار کی طرح
بہتر یہی ہے جی لو گنہگار کی طرح

ہے بادِ خار سر کو جھکا کر پھر ایسا ان
جانِ حزیں ہے راہ میں دیوار کی طرح

یہ سوچتا کھڑا ہوں میں راہِ پیش و پس
کیسے بنا ہوں تم سے ریاکار کی طرح

میں ہوں ازل سے راہ روِ راہِ منتہی
رستے میں پُل صراط ہے دیوار کی طرح

مَعصوم شیرکوٹی

جانے کس سمت ڈھل گیا سورج
ہم سے نظریں بدل گیا سورج

عمرِ رفتہ کو رو رہے ہیں لوگ
رُخ پہ غازہ وہ مل گیا سورج

چاندنی میں بھی اب سکوں نہیں
کیسی گرمی اگل گیا سورج!

دن ہی دن تھا لطافتوں کا طلسم
شام آئی تو ڈھل گیا سورج

چاہ کر بھی ہوئے نہ ہم سقراط
زہر سارا نگل گیا سورج

روشنی ہے سفیر خوشیوں کی
ہو کے کیوں منفعل گیا سورج

محبوب راہی

عیش و عشرت کا ہے طالب خوشی مانگے ہے
دل تو ہر لحظہ بس ایک چوٹ نئی مانگے ہے

کوئی ملبوس نہ لفظوں کا اسے راس آیا،
جانے کیا میرے تخیل کی پری مانگے ہے

اس سفر میں نہیں گنجائشِ راحت طلبی
شوق تو حوصلۂ کوہ کنی مانگے ہے

میرے اندر جو رہا کرتا ہے، اکثر مجھ سے
جس کا میں اہل نہیں چیز وہی مانگے ہے

وہ کبھی دیکھنے والوں کو میسر ہے کہاں
حسنِ نظارہ جو ایک دیدہ وری مانگے ہے

کب سکوں پائے ہے اپنا دلِ ہنگامہ پسند
جب بھی مانگے ہے اک افتاد نئی مانگے ہے

اب تو احساسِ توانائی بھی باقی نہ رہا
ہم سے اب اور بھی کیا اپنی صدی مانگے ہے

سوانگ جدت کا رچائے ہوئے تہذیبِ جدید
اک نیا نعرۂ بے راہ روی مانگے ہے

راہی تعریف کے ان کھوکھلے شبدوں کے عوض
آج کچھ اور بھی اردو کا کوی مانگے ہے

طنزیہ

تاجدار احتشام

پڑوس

کسی دیوار کے آر پار رہنے والوں کو ایک دوسرے کا پڑوسی کہا جاتا ہے، جو صرف دو طرح کا ہوتا ہے۔ بُرا اور بہت بُرا۔ اچھا پڑوسی ملنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا لاٹری ٹکٹ پر انعام کا ملنا۔ سُنتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں کچھ اتنے خوش نصیب لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن کا پڑوسی اچھا ہوتا تھا، اُس سے کچھ پہلے زمانے کا پڑوسی اُس سے بھی اچھا ہوتا تھا کیونکہ وہ ہوتا ہی نہیں تھا، ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ لوگ اپنے پڑوسی کو دریافت کر کے اور اُس کے مکینوں کو اپنے گھر کا سالا دعوت کھلا کر بہت خوش ہوا کرتے تھے اور اسی خوشی کی وجہ سے اُن کی عمریں بھی بہت لمبی رہا کرتی تھیں۔ بڑی تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ پچھلے زمانے کے لوگوں کی طویل عمری کا راز یہی تھا۔ حاتم طائی کا تعلق اسی لئے اُس قدیم ترین زمانے سے ہے۔ اگر حاتم طائی نے آج کے اس دور میں پیدا ہونے کی جسارت کی ہوتی تو وہ اتنا مشہور ہرگز نہ ہوتا کیونکہ اُس کی زندگی کے چار دنوں میں سے تین دن راشن کی دوکان پر لائن لگاتے لگاتے ختم ہو گئے ہوتے اور بقیہ ایک دن گھی آٹا لینے میں۔ ہم تو اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمام تاریخی حضرات نے قدیم زمانے ہی میں پیدا ہونے میں اپنی عافیت سمجھی اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج اُن کی کوئی تاریخی حیثیت نہ ہوتی۔

ایک تاریخی قول ہے کہ ہر بڑی یعنی کہ ہر تاریخی شخصیت کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ضرور رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے، مگر ہمارا جہاں تک خیال ہے کسی بھی شخصیت کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہو یا نہ ہو، پڑوسی کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ پڑوسی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے لوگ ویرانوں میں جا بستے ہیں (ویرانوں میں جا بسنے والے لوگ ہی بڑے لوگ ہوا کرتے ہیں) ہمارے ایک پڑوسی کو اس پر اعتراض ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آج کل ان ویرانوں میں صرف دو طرح کے لوگ جایا کرتے ہیں، مجذوب اور جدید شاعر۔

ہم نے جب بھی اس اہم ترین بین الاقوامی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا، بہت سی باتیں ہمارے ذہن میں روشن ہو گئیں۔ پُرانے زمانے میں فیملی پلاننگ پر عمل نہ کرنے کے باوجود لوگوں کی تعداد اتنی کم ہوا کرتی تھی کہ اُن کے دن کا بیشتر حصہ ایک ہی گھر میں رہنے والے عزیز و اقارب کو ڈھونڈنے میں گذر جایا کرتا تھا جو اس گھر میں بنا کسی سازش کے مختلف کمروں میں رہا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں لوگ ایک دوسرے کو (اپنے عزیزوں وغیرہ کو) جمع کر کے رات کا قیمتی وقت قصے کہانیوں میں گذار دیا کرتے تھے۔ جنوں اور پریوں کا تعلق اسی لئے پُرانے زمانے سے ہے۔ اُس زمانے میں پڑوسی کا احساس صرف خاص موقعوں پر ہوا کرتا تھا اور لوگ "تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے" پر عمل کیا کرتے تھے۔ اسی لئے پیدا ہونے کے بعد سے مرنے تک ہر طرح کی رسومات وجود میں آئیں۔ لوگ ان رسومات کو بڑی شان سے منایا کرتے تھے۔ کوئی غم کا موقع ہو یا خوشی کی کوئی تقریب، گھروں میں ایک جمِ غفیر پندرہ بیس دن یا مہینہ اور پندرہ بیس دن اُدھر موجود رہا کرتا تھا۔

مگر اب زمانے نے بہت ترقی کر لی ہے ـــــ اور لوگوں نے وہ تمام کام جو وہ پہلے چوری چھپے کرنے میں بھی ہچکچایا کرتے تھے آج تمام پابندیوں کے باوجود کھلے خزانے کرنا شروع کر دئیے ہیں۔ آبادی میں اضافے کا تعلق اِن پابندیوں میں سے ایک ہے۔ سنجیدگی اور گہرائی سے سوچا جائے تو اِن پابندیوں کے پیچھے حکومت کی ایک بہت بڑی سازش نظر آتی ہے۔ حکومت دراصل یہ چاہتی ہے کہ اُن سے زیادہ لوگوں کو پڑوسی نصیب ہو۔

پڑوسی کا اتنا ہی کمال رکھنا نہیں اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی شاعر کے لئے سامعین کا ہونا۔ اچھے اور باذوق سامعین ان دنوں خوش قسمتی سے پائے جاتے ہیں اور بڑی عزت کے ساتھ مشاعروں وغیرہ میں بلائے جاتے ہیں اور جس طرح شاعر کسی بھی قصبہ میں اپنے سامعین سے مطمئن نہیں ہو سکتے ٹھیک اسی طرح پڑوسی بھی کسی ایک محلہ سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ دراصل اکثر سامعین اور پڑوسیوں کے مابین ایک بین سازش کی لڑائی ہے جو آپ خود دیکھئے کسی جلسہ، مشاعرہ یا شب افسانہ کے موقع پر سامعین کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور ان سامعین کی وہ وہ تعریفیں کی جاتی ہیں کہ پروگرام کے بعد خود اور ششدر حیرت سے سامعین کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہی کچھ حال پڑوسی کا ہے۔ ہمیں اپنے پڑوسی کی اہمیت کا اندازہ مختلف مکانوں کو بدلتے رہنے کی وجہ سے اچھی طرح ہو چکا ہے۔

حالیہ مکان میں ہمارا پہلا دن بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ ہمارا سارا سامان چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ ہمارے پڑوسی ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں پنجرے کے باہر کھڑے ہوکر جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے اپنی پرانی اخلاقی روایات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سر پر کھڑے پڑوسیوں کو دیکھا اور اخلاق سے ادھر کچھ نظریں گھمائے ہوئے ایک معصوم سے بچے کو دیکھا، جو اپنی ماں کی گود میں تھا۔ بچے نے بھی جواباً ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ بچہ بھی بااخلاق معلوم ہوتا تھا۔ مسکراہٹ کا جواب نہ صرف یہ کہ مسکرا کے دیا بلکہ ہماری طرف دونوں ہاتھ بڑھا کر لپکنا شروع کر دیا ——— اور ہمیں اس بچے کو اپنی گود میں لینا پڑا، مگر کاش، بات یہیں ختم ہو گئی ہوتی۔ پوری بلڈنگ کی تمام عورتیں اپنے چار پانچ بچوں کے ساتھ ہمارا گھیراؤ کئے ہوئے تھیں اور بچوں کی سمجھ میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ اسی پہلے والے بچے کی تقلید کرنے لگے۔ پہلے وہ اپنی ماؤں کی گود میں چپک جاتے اور پھر ہماری طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیتے۔ اس THROUGH PROPER CHANNEL سے بلڈنگ کے تمام بچوں نے ہماری گود میں آنے کا ہمیں شرف بخشا۔ آخری بچے کو گود سے اتارنے کے بعد ہمارا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ہم پسینے میں شرابور تھے اور ہماری شکل پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہم نے بڑی بےکسی سے اپنے چاروں طرف اُس جمِ غفیر کو دیکھا جو از راہِ پڑوس نوازی ہمارے چھوٹے سے کمرے میں آموجود ہوا تھا۔

پڑوسی ہونے کے لا تعداد فوائد ہیں۔ خود ہمیں اپنے بارے میں بے شمار باتوں کا علم صرف اپنے پڑوسی ہی کی وجہ سے ہو سکا ورنہ شاید اپنے بارے میں اتنی ڈھیر ساری خوبیوں کا انکشاف خواب میں بھی نہ ہو پاتا۔ ہمیں اپنے جھوٹ بولنے کے عظیم آرٹ کا پتہ بھی پڑوسی کے ملنے کے بعد ہی چل سکا اور اب تو یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کس دن غلطی ہی سے سہی سچ بھی بولا تھا۔ جھوٹ بولنے کی وجوہ بھی بڑی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ہمیں کبھی مصلحتاً جھوٹ بولنا پڑتا ہے، کبھی ضرورتاً اور اب ——— صرف عادتاً۔ جھوٹ بول کے نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب ڈھیر سارے پڑوسیوں کے ساتھ آپ کو جھوٹ بولنا پڑے اور یہ یاد نہ رہے کہ کس سے آپ نے کون سا جھوٹ بولا تھا۔

پڑوسی کی وجہ سے آپ پہلی تاریخ سے آخری تاریخ تک بغیر کسی ضمانت کے قرض حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے ایک دوست کو جانتے ہیں جو صرف قرض کی بنیادوں پر اپنی بڑی سے بڑی ضرورت نکال لیتے ہیں۔ انھیں آج تک ڈاکخانوں کے سیونگ بینک کے اشتہارات، بڑے بڑے بینکوں کے کئی طرح کی بچت یوجناؤں کے اشتہارات اور ایل۔ آئی۔ سی کے اشتہارات اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بینک تو پھر بھی ضمانت مانگتی ہے اور ہزاروں طرح کے کاغذات کی خانہ پُری کا رونا الگ۔ قرض مانگنے کے بیشتر مجرب نسخے ان کی انگلیوں میں پڑے رہتے ہیں۔ بلکہ کچھ اتنا تیز ہے کہ نہ جانے کیسے انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ پڑوس میں کسی کے پاس کچھ رقم موجود ہے۔ حکومت نے بینکوں کو قومیا کے وہ خوبیاں پیدا نہ کی ہوں گی جو یہ پڑوسی ایک مدت کو ضروریات پوری کرتے آرہے ہیں۔ پیاز کی ایک گانٹھ اور چٹکی بھر نمک سے لے کر چھوٹی بڑی ضروریات کے تمام استعمالات تک ہر کام پڑوسی کی بنیاد پر ہو جاتا ہے۔

صرف پڑوسی کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اخباروں میں چھپنے والے "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہارات پر سے بالکل اٹھ چکا ہے اور فریقین والدین پڑوس ہی میں اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادی بیاہ کے فرائض انجام دے لیتے ہیں، بشرطیکہ یہ کام لڑکے لڑکیوں نے بذاتِ خود انجام نہ دے لیا ہو۔ [illegible] ایک عورت ایسی بھی گزری ہے جس میں صرف عزیز و رشتہ داریاں بسا کرتے ہیں اور حقیقتاً پڑوسی سے ہی نہیں۔

اگر مجبوراً پڑوس میں کوئی جوڑ نہ مل پائے تو لوگ دوسرے پڑوس کی طرف توجہ ہوتے ہیں اور اس صورت میں بھی لڑکے اور لڑکی کے بارے میں چھان بین کرنے سے زیادہ اس بات پر توجہ دی جاتی ہے کہ پڑوس کے بارے میں تمام تفصیلات جمع ہو سکیں۔

پڑوس کی وجہ سے عورتوں، ماؤں اور بہنوں کی عزت محفوظ رہتی ہے اور اُن کے متعلقہ مرد حضرات اُن کی عزت کی حفاظت کی فکر سے بے نیاز ہو کر دور کسی دوسرے پڑوس میں جاکر آزادانہ عشق وغیرہ کے کاموں میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ اونچے اور اعلیٰ قسم کے پڑوس میں رہنے والی لڑکیاں، مائیں بہنیں وغیرہ چونکہ بہت ہی اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے بہت ہی آزاد خیال ہوتی ہیں اور عزت، عصمت، عفت وغیرہ لفظوں کے استعمال کو مناسب نہیں سمجھتیں۔ عزت کا خیال تو درمیانہ طبقہ کے لوگوں میں بلکہ درمیانہ پڑوس میں رہنے والوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ اُس پڑوس میں جہاں عزت کا تلفظ "اِجّت" رہ جاتا ہے۔ آج کل پڑوس اپنی حفاظت کے لئے کچھ بیکار، مضبوط اور ہٹے کٹے نوجوانوں کا ایک دل تیار رکھتا ہے۔ جس کے حصار میں پورا پڑوس اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھتا ہے۔ اور آزادانہ ہر اچھے بُرے کام میں حسب معمول مصروف رہتا ہے۔ یہ دَل وقتاً فوقتاً دوسرے پڑوس کے دَل کے ساتھ اسی طرح لڑتا جھگڑتا رہتا ہے جس طرح مختلف ممالک کی ہاکی ٹیمیں۔

کھٹمل مچھر مارنے کی دوا سے لے کر کسی کے قتل کی سازش کا پتہ لگانے تک ہر ہر قدم پر پڑوس کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ محکمۂ سی۔ آئی۔ ڈی کے بیشتر ذمہ داران کو مقتول سے زیادہ پڑوسیوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اکثر صورتوں میں صرف پڑوس کی بنا پر قاتل کا سُراغ آسان ہو جاتا ہے۔ اگر پڑوس نہ ہوتا تو آج نہ جانے کتنے قاتل شہر میں آزادانہ گھوما کرتے۔

انواع و اقسام کی گالیاں صرف پڑوس کی وجہ سے وجود میں آسکیں اور اگر یہ گالیاں نہ ہوتیں تو ہماری تہذیب اور ہمارے معاشرہ کی آج یہ حالت نہ ہوتی۔ لوگوں میں، قوموں میں، نسلوں میں، ملکوں میں اگر جنگ کا تصور اُبھرا تو اس کا سہرا صرف اور صرف پڑوس کے سر ہی پہنایا جا سکتا ہے۔

عزیز اندوری

تین نظمیں

میں مدّتوں سے اپنی ذات کے
حصار میں گھرا ہوا
حیاتِ جاوداں کے نام پر
ہزاروں طوق کرب کے
گلے میں ڈال کر
اُداسیوں کی بھیڑ میں
نہ جانے کب سے ہوں میں گم
حیاتِ جاوداں کے نام پر
بنا ہوا ہوں قیدی جسم کا۔

۲

ایسی آبادیاں کہ جن میں حیات
صرف تصویرِ رفتگاں بن کر
مدّتوں سے ٹنگی ہے کھونٹی پر
تحفتاً جس کو وقت نے اکثر
گردِ تنہائی سے نوازا ہو،
ایسی آبادیوں میں جیتا ہوں

۳

اُف رے وہ بستیاں جہاں دن بھر
تپتے سورج کی تیز کرنوں میں
چلتے پھرتے سے سیکڑوں سائے
بجھتے رہتے ہیں تپتے رہتے ہیں
پھر بھی کندن وہ بن نہیں سکتے۔

اختر بستوی

چہروں کی بے چہرگی

جدھر نظریں اُٹھاتا ہوں اُدھر چہرے ہی چہرے ہیں
مگر ان سب میں اک بے چہرگی سی دیکھتا ہوں میں

کوئی صورت، بنا کرتی ہے جس سے شکلِ انسانی
ہر اک چہرے کو اس خوبی سے عاری دیکھتا ہوں میں

لقب چہروں کا زیبا ہے اُنھیں کے واسطے یارو!
جو احساسات اور جذبات کی تفسیر ہوتے ہیں

نہ مانو فیصلہ میرا، خود اپنے ذہن سے پوچھو
کہیں اوراقِ سادہ بھی کبھی تصویر ہوتے ہیں؟

کرشمہ

مظہر محی الدین

اس قدر حیرت سے تم کیا دیکھتے ہو
مجھ کو اندازہ ہے تم کیا دیکھتے ہو
گر مہذب بن کے رہنا چاہتے ہو
تم بھی اپنی زندگی کو مختلف کمروں میں بانٹو!
اپنے گھر کو
جتنا اونچا ہو سکے اُتنا بڑھاؤ
پھر ذرا دیکھو!
نئی تہذیب!!
کیوں کر جنم لیتی ہے نئی دہلیز سے!!!

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم

منیر شکوہ آبادی کا ایک بے مثال قصیدہ

اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں صرف دو شاعر ایسے ملتے ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی بلکہ ہر صنف میں اہلِ علم سے اپنی اُستادی اور کمال کا لوہا منوا لیا۔ ان میں ایک خوش قسمت تھا اور دوسرا بد نصیب۔ مرزا رفیع سودا خوش نصیب تھے کہ دنیا نے اُن کے کمال کی قدر کی اور ان کے کمال کو سراہا۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی بد نصیب تھے کہ اُن کا کلیات کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ نئے دور کے تذکروں میں اُن کا نام بھی نظر نہیں آتا۔

منیر انتہائی باکمال استاد تھے اور استادانہ چابکدستی، فنکارانہ کمال اور قدرتِ زبان و بیان میں سودا کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو اُن پر فضیلت حاصل نہیں۔ اُن کی کلیات میں جتنے نئے مضامین ملتے ہیں اُتنے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں دستیاب نہیں ہوتے۔ وہ سو سو دو دو سو شعر کی غزل کہتے ہیں جس میں ایک ایک قافیے کو دس پندرہ مرتبہ باندھتے ہیں اور ہر مرتبہ ایک نیا مضمون پیدا کرتے ہیں۔ خلاقیٔ مضامین، معنی آفرینی اور تخیل کی اس بے پناہی کی مثال اُردو کے اور کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے غزل میں عصری حالات اور سیاسی مسائل بھی داخل کئے۔ انہوں نے قصائد کی تشبیب کو محض عشقیہ اور بہاریہ مضامین کی گرفت سے آزادی دلا کے اُس میں مضامین کا تنوع پیدا کیا۔ انہوں نے قصیدے اور مثنوی میں مختلف علوم و فنون کی درجنوں ایسی اصطلاحات نظم کیں جنہیں اُن سے پہلے کسی اور شاعر نے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ غرض اُن کی اولیات کی فہرست بہت طولانی ہے۔

اس مضمون میں منیر کے کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالنا مقصود نہیں بلکہ اُن کے صرف ایک قصیدے کا ذکر کرنا ہے جو انہوں نے جلاوطنی کے عالم میں جزائر انڈمان میں کہا تھا۔ اُردو میں یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری قصیدہ ہے۔ نہ اس سے پہلے کسی نے اس قسم کا قصیدہ کہا اور نہ اس کے بعد کوئی اس قسم کا قصیدہ کہنے کی جرأت کر سکا۔ قصیدہ بے حد مشکل ہے۔ اور بیشتر علمِ فلکیات کی اصطلاحات میں کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سمجھنے میں سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

منیر نے یہ عجیب و غریب قصیدہ کیوں کہا اور یہ حیرت انگیز اندازِ کلام کس لئے اختیار کیا؟ اس کی توجیہ انہوں نے خود ہی قصیدے کے آخر میں کر دی ہے اور اس قصیدے کو سمجھنے کے لئے پہلے اس پر توجہ ضروری ہے۔ ذیل کے اشعار سببِ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہیں:

مخزنِ علم و کمال، عالمِ عالی مقام — ناقدِ تازی زباں، نبض شناسِ سخن
مولوی بے نظیر فضلِ حق اسمِ شریف — دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن
قید میں میں اور وہ رہتے تھے ایسی جگہ — جیسے سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن
کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اس کا بتا — شاعرِ اُردو زباں اس میں بیاں کیا ہے فن

مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس — کس طرح کہتے تھے بہ زیبِ نظمِ سخن
یا متحمل نہیں لہجۂ اردو زباں — یا کوئی قابل نہیں تم میں ہے بے دیں وطن
گو کہ غزل [illegible] ہو پر ہے قصیدے میں نقص — دقتِ مضموں سے ہے حسن و ہو حسن
حضرتِ سودا بغیر کس نے قصیدے کہے — وہ بھی یہاں [illegible] ہو سکے [illegible]
شاعروں میں یاں بجز غزل پھر کسی نے کہا — [illegible]
میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں — آپ سُنیں تو کہوں کچھ [illegible] سخن
مصطلحاتِ غریب جو کہ نہ معروف ہوں — نظم کرے کس طرح شاعرِ ہند کا سخن
جو متعارف ہوا [illegible] پہلے سے — ان کو نکالیں کہ سُن کے آتے ہیں سب طعن
کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے — جیسے شعرائے سواد، جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے، بڑھ گیا سلسلۂ قہر و خشم — بسکہ تھے نازک مزاج آئی تھی پر آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال — رمز و کنایات میں دقت و لطفِ سخن
ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا — کوچۂ نو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحطِ کتاب تھا نظر از بس ضعیف — پر مددِ غیب سے خامہ ہوا [illegible]

اس تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی جو غالب، ذوق اور مومن کے ہم نشین و ہم جلیس رہ چکے تھے اور ہندوستان کے سب سے نامور اور جلیل القدر عالم تسلیم کئے جاتے تھے، یہ مانتے تھے کہ —

۱۔ قصیدے میں "مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس" کا ہونا لازمی ہے۔

۲۔ اردو میں صرف سودا نے قصائد لکھے لیکن وہ بھی اس راہ میں گامزن ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہاں یہ لحاظ رہے کہ مولانا نے غالب، ذوق اور مومن کے قصائد سُنے تھے لیکن وہ ان اساتذہ کو محض غزل گو تصور کرتے تھے۔

۳۔ مولانا کے خیال میں یا تو اردو زبان ان مصطلحاتِ عجم و کنایاتِ فرس کی متحمل نہیں ہے جو قصیدے میں بلندی پیدا کرتے ہیں یا "یہ شعرائے سواد، جہل ہے ان کا وطن"۔ اس لئے وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ "دقتِ مضمون سے حُسن" پیدا کر سکیں۔

۴۔ مولانا کی زندگی دہلی کی ادبی انجمنوں میں بسر ہوئی تھی اور ملک کے بڑے بڑے باکمال شعراء سے اُن کے روابط تھے لیکن ان کی یہ رائے تھی کہ ہندیوں سے رمز و کنایات میں دقت و لطفِ سخن محال ہے۔

اس تمہید سے نہ صرف یہ کہ قصیدے کا سببِ تصنیف واضح ہو جاتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ منیرؔ کو کن پابندیوں کو سامنے رکھتے ہوئے قصیدہ کہنا پڑا تھا۔ منیرؔ کو خود بھی ان دقتوں کا احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اولاً "مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس" اردو کے لئے حد درجہ نامانوس ہیں اس لئے ان کا استعمال قصیدے کو نہ صرف بہت مشکل اور بعید الفہم بنا دے گا بلکہ ایک مخصوص طبقہ اس پر طعنہ زن بھی ہوگا۔ پھر نئے کنایات و تراکیب کی ایجاد بھی کوئی معمولی کام نہ تھا بالخصوص انڈمان میں انگریزوں کے ایک باغی قیدی کے لئے کتابوں کی فراہمی بھی ناممکن تھی۔ لیکن اس پر بھی انہوں نے ہمت کی اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ فاقوں کی طرز میں قصیدہ موزوں کریں۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :

شاعروں میں ہے مثال بکریاں خاقانیا — مادحِ سلطانِ قیاں نامیٔ عہدِ کہن
پہلا قصیدہ کہا اس نے ہے اس طرز میں — پھر ہوئے عرفی جواب بعض مرانِ سخن

خامۂ مینا

ہند والوں نے اِدھر اپنی توجہ نہ کی   ہو گئے اس طرز میں پہلے بھی جو سخنداں

ایک ایسی طرز میں قصیدہ کہنا جس میں سوداؔ کے سے قادر الکلام نے بھی کہنے کی جرأت نہ کی ہو بہت بڑی ادبی جرأت تھی اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لئے جو انڈمان میں موت سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا لیکن منیرؔ نے محض ہمت کے سہارے اس میدان میں قدم رکھا اور ایک ایسا قصیدہ کہا جو اُردو کی ادبی تاریخ میں بلا خوفِ تردید سب سے بلند پایہ اور سب سے حیرت انگیز قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ قصیدہ سبطِ اکبر حضرت امام حسنؓ کی شان میں کہا گیا ہے اور ۱۲۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں تین مطلع ہیں۔

مطلعِ اوّل :

اشکِ زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن   غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن

اشکِ زلیخا ۔ نجوم و کواکب
نیل ۔ چرخِ نیلی فام
یوسفِ گل پیرہن ۔ آفتاب جو ڈوبتے وقت سرخ نظر آتا ہے۔

مطلعِ ثانی :

کلک کو بخشیں اگر آپ لعابِ دہن   آخرِ ابجد کا حرف سیکھ لے اُس سے سخن

آخرِ ابجد کا حرف ۔ حروفِ ابجد کا آخری حرف غ ہے اور غ کے عدد ہوتے ہیں ہزار۔ ہزار بلبل کو کہتے ہیں۔

مطلعِ ثالث :

گردِ رہِ پاک اگر جائے سوئے مرغزن   بچۂ خورشید ہو سنگِ مزارِ کہن

مرغزن ۔ قبرستان

بچۂ خورشید ۔ جواہرات، آفتاب کو صباغ الجواہر کہتے ہیں اور اسی کی گرمی سے جواہرات بنتے ہیں۔ اس لئے جواہرات کو بچۂ خورشید کہا گیا۔

منیرؔ کا یہ قصیدہ بلندیٔ فکر، مضمون آفرینی، ندرتِ تخیّل اور شکوہِ الفاظ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کا جواب پورے ادبِ اردو میں ملنا مشکل ہے۔ اس میں بعض استعارات و کنایات ایسے استعمال ہوئے ہیں جو ہماری زبان کے مزاج سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں اور انہیں عام کرکے ہم اپنے ذخیرۂ الفاظ میں بیش بہا اضافہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ۔

۱۔ آسمان کے لئے گنبدِ فیروزہ، خیمۂ زربافت، فانوسِ سبز، دبیرِ فرد نگار، صوفیٔ ازرق لباس، بامِ سبز، خضرِ زمرد لباس، لوحِ زمرد۔

۲۔ آفتاب کے لئے یوسفِ گل پیرہن، یوسفِ زرّیں قبا، مرغِ طلا بدن، زمزمِ آتش نشاں، زورقِ زرّیں، خسروِ زرّیں عطا۔

۳۔ ستاروں کے لئے اشکِ زلیخا، نقاطِ گہر، خردۂ کافور۔

۴۔ رات کے لئے لیلیٰ مشکیں لباس، چاہِ سیہ، مشکِ غزالِ ختن، تکیہ گہِ اہرمن۔

۵۔ زہرہ کے لئے لولیٔ الماس پوش، شاہدِ بابل وطن

۶۔ چاند کے لئے حلقۂ سیمیں، شمعِ مرصع لگن، طائرِ سیماب گوں

۷۔ کہکشاں کے لئے منطقۂ گوہریں، نہرِ لبن، موجۂ آب گہر۔

(باقی صفحہ ۴۵ پر دیکھئے)

راہی فدائی کڈپوی

گلوں کو بو نہ ملی، شب کو چاندنی نہ ملی — تیرے دیار میں اے دردِ زندگی نہ ملی
ہر ایک مسندِ عشرت کو مل گئے تحفے — صلیب و دار کو شہرت کی بھیک بھی نہ ملی
کرم تو اُن کا سمندر کی طرح پھیلا تھا — لبِ طلب ہی کو صحرا کی تشنگی نہ ملی
جدید فکر کے باغی ٹٹولتے ہی رہے — اجاڑ ذہن کے گوشوں میں سرکشی نہ ملی
اُجالے بٹ گئے شہروں کے اونچے محلوں میں — غریب کے ٹوٹے گھروندوں کو روشنی نہ ملی
خلوص مہر و وفا کا جو دور تھا بہت — کسی کے طرزِ تکلم میں سادگی نہ ملی

اتارتے ہو یہ رختِ سفر کہاں راہی
ابھی وہ گھر نہ ملا اُس کی وہ گلی نہ ملی

غزلیں

حسن رضا رانچوی

ہر شخص یا تو خود میں نظر بند ہو گیا
یا پھر خلوصِ جاں کا سفر بند ہو گیا!
خود شہر چھوڑ کر ہی چلے جا رہے ہیں لوگ
اب وہ طریقِ شہر بدر بند ہو گیا
مُردہ تنوں میں رُوح کہاں ہے جو جاگتے
وہ صبح سو گئی وہ گجر بند ہو گیا!
کوئی گلی جو راہ تو چلنے کا شوق تھا
جب راستہ ملا تو سفر بند ہو گیا
ڈرنے لگا کہ کیسے صبح کا بھولا حسن رضا
دروازہ شام ہی سے اگر بند ہو گیا

قمر اعظمی

پاگل پن کی بات کہو یا فیض ہے یہ دانائی کا
محفل محفل گھوم رہا ہوں زہر لئے تنہائی کا
چہرہ دیکھ کے کیا سمجھو گے من کا پیڑا ایک سا ہے
ہم نے کلیجہ پھٹتے دیکھا بجتی ہوئی شہنائی کا
جنسِ وفا بھر کر لے آئے اہلِ ہنر بازارِ دل تک
مجھ کو شکوہ سستے پن کا دُنیا کو مہنگائی کا
اپنا جنازہ آپ اُٹھائے شہروں شہروں پھرتا ہوں
سلسلہ دیکھئے ختم کہاں ہو اُن کی کرم فرمائی کا
دل کی چوٹ دکھاؤں کس کو کون قمر یاں دیکھے گا
لوگ تو لے بیٹھیں گے قصہ نشتر کی رعنائی کا

شبیر مرزا

منزل ہے کہاں تیری

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں نے اپنے آپ کو اس عمارت میں پایا ہے۔ میں اس بلند عمارت میں جیسے قید ہو گیا ہوں۔ سوچتا ہوں زندگی کی چوبیس سیڑھیاں جن کو میں نے پیچھے چھوڑ دیا ہے، یا بڑی ہی بے دردی سے انھوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ کتنی پیاری تھیں کتنی اچھی تھیں اور جیسے جیسے ایک ایک سیڑھی بڑھتی گئی نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اپنی زندگی موت کی طرف بڑھ رہی ہے اور انھیں جان لیوا تکلیفوں سے گذر کر میں اس عمارت میں مقید ہوں۔ یہ عمارت کتنی بلند ہے کتنی بڑی ہے اوپر کی جانب اسکی اونچائی کا اندازہ لگانے کے لئے میں دیکھتا ہوں تو میری نظریں اوپر ہی اوپر اٹھتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور اس کی چھت مجھے نظر نہیں آتی میری آنکھوں کے سامنے دھندلے دھندلے سائے سے آجاتے ہیں۔

اور میں مجبوراً اپنی نظروں کو نیچے کر لیتا ہوں۔ کئی بار میں نے کوشش کی ہے اور ہر بار میری ہی ہار ہوئی ہے، میری سمجھ میں نہیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آخر میں اس عمارت کی اونچائی کا اندازہ کیوں لگا نہیں سکتا، اس کی حدوں کو کیوں پہنچ نہیں سکتا، کیا میری آنکھوں میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ نہیں ایسا بھی نہیں، ایسی کوئی شکایت بھی تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عمارت کی چھت ہی نہ ہو مگر یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور وہ عمارت ہی کیا جس کی چھت نہ ہو۔ یہ سوچ کر میں پھر اُس کی تلاش میں کھو جاتا ہوں پھر میری نظریں اوپر بہت اوپر اٹھتی چلی جاتی ہیں، مجھے کچھ اطمینان سا ہوتا ہے، میرے جسم میں خوشیوں کی لہریں سی دوڑنے لگتی ہیں اور . . . . اور پھر ایک دھندلی سی اک گہرا سا میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ میری آنکھوں کی ساری طاقت اس دھند میں اس گہرے میں تحلیل ہو جاتی ہے مٹ جاتی ہے میرے ذہن کے پردے کچھ کچھ ہٹتے ہیں اور مجھے کچھ یاد آتا ہے جیسے میں اس عمارت میں کئی صدیوں سے کئی جنموں سے یوں ہی بھٹک رہا ہوں اور میں نے شاید یہیں جنم بھی لیا، نہیں میں نے جنم کہاں لیا نہیں میں نے جنم کیسے لیا میں کیا کہوں، میں کون ہوں مجھے کچھ بھی نہیں معلوم ہاں اتنا یاد ہے کہ میں اس عمارت میں صرف چھت ہی کی تلاش میں نہیں ہوں مجھے اور بھی چیزوں کی یہاں تلاش ہے۔ کتنے برسوں سے میں اس کے دروازے گن رہا ہوں۔ کتنی صدیوں سے میں اس کی کھڑکیاں گن رہا ہوں پر آج تک گن نہیں پایا۔ ایک جانب سے حساب لگاتا ہوا گزرتا ہوں اور گزرتے گزرتے اس حساب کو بھول جاتا ہوں، صرف حساب ہی کو نہیں اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں اور جب پھر حساب لگانے کے لئے تیار ہوتا ہوں تو میرے اندر سے کوئی کہتا ہے:

"پہلے اپنا حساب لگاؤ بعد میں دوسروں کا"

میں اپنا حساب کیسے لگاؤں؟ کیا میں بھی ایک عمارت ہی کی طرح ہوں۔ جس کی بھی ایک چھت ہے چند دروازے چند کھڑکیاں نہیں میں اس عمارت کی طرح نہیں ہوں۔ یہ عمارت تو صرف نام کی ہے۔ کھوکھلی بنیادوں پر تعمیر کی ہوئی جس کی چھت کا صرف گمان ہے جس کے دروازے صرف نظر آتے ہیں جبکہ کھڑکیاں صرف نظر آتی ہیں جن کا حساب لگایا نہیں جا سکتا نہیں میں اس فرسودہ عمارت کی طرح نہیں ہوں جس کی کھوکھلی اونچی دیواروں کو دیکھ کر کالے دیو نظر آتے ہیں جس کے گرد میں چکر کاٹ کر پاتال کی گہرائیوں میں اُترتے ہوئے محسوس ہوتا ہے پھر میں کہاں ہوں اس عمارت میں کیوں ہوں کب سے ہوں اور کس لئے ہوں . . . کوئی مجھے بتلائے

خاموشی

کوئی مجھے بتائے !!

تم کون ہو جو مجھ سے یوں بولتے ہو، دیوانے ہیں .... میں تو تم کو جانتا ہوں مجھ سے کیوں ڈرتے ہو۔

میرے ساتھ چلو گے تو تمہیں مطمئن کر دوں گا۔ میں تمہارا ہر فیصلہ کر دوں گا۔ اس عمارت کے چکر میں پڑے رہو گے تو کچھ نہیں ملے گا۔ اس عمارت کی دیواروں کو دیکھ رہے ہو یہ کتنی اونچی ہیں تم ان کے باہر کبھی نکل نہیں سکتے۔ یہ تمہیں صدیوں سے قید کر رکھا ہے تمہیں یہیں ختم ہونا ہے پھر پیدا ہونا ہے پھر ختم ہونے کے لئے یہ سلسلہ صدیوں سے چل رہا ہے اور چلتا رہے گا!

مجھے ایسی باتوں میں مت الجھاؤ۔ میں کون ہوں یہ بتاؤ مجھے دیواریں پسند ہیں یہی میرا سب کچھ ہے۔ یہی میری میراث ہے میں اس سے کبھی باہر نہیں نکل سکتا۔ صرف یہ بتا دو کہ میں کون ہوں!

تم.... تم ایک مشین ہو تم تو ایک حساب لگانے کی مشین ہو۔ تمہیں تو صرف حساب لگانا ہے تم اور کچھ نہیں کر سکتے۔ میری بات سنو گے ان دیواروں کو پار کر دو کسی بھی طرح اور باہر آ کر اس کھوکھلی عمارت کو مسمار کر دو یہ عمارت بہت بوڑھی ہو گئی ہے یہ ختم ہونے کے قریب ہے اس کی عقل بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور جو چیز بوڑھی ہو جاتی ہے وہ دوسروں پر بوجھ بن جاتی ہے آج یہ عمارت بھی تم پر بوجھ ہے باہر چلے آؤ۔ اس عمارت کی جگہ ایک اور ہی بہت بلند اور بہت ہی اچھی عمارت کی بنیاد ڈالنی ہے!

تم جھوٹ کہتے ہو، باہر کی باتیں نہ کرو، باہر کچھ بھی نہیں ہے تم جھوٹے ہو، مجھے جھوٹا کہتے ہو۔ اگر میں جھوٹا ہوں تو تم کون ہو؟ شرم نہیں آتی اپنے آپ کو سچا کہتے ہوئے!

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں رات آدھی سے زیادہ بیت گئی ہے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے، میرے کمرے کا بلب جل رہا ہے۔ سامنے ٹیبل پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہوا ہے۔ میں زمین پر بیٹھا ہوا ہوں مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ میرے بستر پر لگی ہوئی چادر سفید چادر کسی کو اپنی آغوش میں لینے کو تڑپ رہی ہے۔ اپنے سفید صاف و شفاف چہرے کو پُر شکن بنا لینے کے لئے بیقرار ہے کسی کے لئے اپنے آپ کو برباد کرنے پر لگی ہوئی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں لیکن، نہیں، مجھ سے نیند کوسوں دور ہے، ٹیبل پر رکھا ہوا ریڈیو کسی کی انگلیوں کے لمس کیلئے تڑپ رہا ہے۔ کوئی رنگین نغمہ پھوٹ پڑنے کے لئے بیقرار ہے لیکن میں خاموش بیٹھا سوچ رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں میں ان چیزوں سے لطف اندوز نہیں ہو رہا ہوں حالانکہ ہر انسان اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ میں بھی اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔

میں دوسرے کمرے میں آ گیا ہوں۔ میرے سامنے نئے پرانے اخبار بکھرے پڑے ہیں۔ میری نظریں اخباروں کی سرخیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔

• ایک ملک کی حکومت نے پناہ گزینوں کو ۴۸ گھنٹوں میں نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔" یعنی ایک ملک کے انسان دوسرے ملک کے انسان کو نکال رہے ہیں۔

• کوؤں نے اپنے ایک ساتھی کو اپنے ساتھ نہیں پایا اسے مار مار کر ہلاک کر دیا"

• آندھرا کے ایک وزیر نے کہا ہے اگر تقسیم نہیں ہوئی تو یہاں بھی ہزاروں مجیب پیدا ہو جائیں گے۔" سارے ریلوے اسٹیشن جلا دیئے گئے آندھرا کے لوگوں ہی نے نقصان پہنچایا۔

• بجٹ میں پھر کروڑوں روپیوں کا ٹیکس۔ یہ ٹیکس کس کو دینا ہوگا۔ لوگوں ہی کو دینا ہوگا۔ اسٹیشن کس نے جلائے؟ لوگوں ہی نے جلائے

صبح ہو گئی ہے۔ میری آنکھیں بوجھل بوجھل سی ہو گئی ہیں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونا چاہتا ہوں۔ میرا بستر میرا انتظار کر رہا ہے لیکن نہیں مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اب تو صبح بھی ہو گئی ہے۔ اب کیسے سوؤں۔

باہر لوگ پانی کے نلوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ آوازیں آ رہی ہیں۔ کل پانی نہیں ملے گا۔ آج ہی کا بھر لو۔ مجھے پانی نہیں چاہئے؟ مجھے مٹی کا تیل چاہئے، مٹی کا تیل کہاں سے ملے گا، مٹی کا تیل کب ملے گا جلانے تیل لیکر کیا کرو گے، پانی لو.... پانی ہی تو سب کچھ ہے۔ پانی.... پانی تو صرف پیا جاتا ہے، مٹی کا تیل، اپنے جھونپڑے کو آگ بھی تو لگائی جا سکتی ہے

شاعروں نے کہا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھیں بند کر دیں

شکوہ سے گا۔ من کا سکون مل جانے سے تن کے سارے دکھ ڈھل جاتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں لیکن شانتی کہاں ہے من کا سکھ کھو رہے۔ مجھے اخبار نہیں چاہیئے۔ مجھے پانی نہیں چاہیئے۔ مجھے تیل کی ضرورت نہیں میں آبادی کی تقسیم کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے شانتی چاہیئے۔ من کی شانتی!

دیوانے شانتی چاہتے ہو، شانتی چاہتے ہو تو پہلے مکتی پاؤ۔ پہلے آزادی لے لو، ان بڑی بڑی اونچی دیواروں میں بس کر شانتی کو پکار رہے ہو۔ میری بات نہیں سنو گے، آجاؤ باہر اس عمارت سے باہر آجاؤ ورنہ۔۔۔۔ ورنہ تم بھی اس کے ساتھ فنا ہو جاؤ گے تم اگر باہر نہیں آؤ گے تو بھی پرواہ نہیں۔

صبح کے صاف و شفاف سورج کے ساتھ کئی ہاتھ اٹھیں گے۔ کئی آوازیں اٹھیں گی، جو تمہیں اور اس فرسودہ بیانک عمارت کو مسمار کر دیں گی اور یہاں جگہ ایک نئی عمارت ہوگی اپنی بلند قامتی کا اپنے بلند مرتبے کا ثبوت پیش کرنے کیلئے اس سے پہلے کہ وہ تمہیں ختم کر دیں تم ہی آجاؤ تاکہ تم بچ جاؤ گے ورنہ یہ تمہیں بھی زندہ دیکھنا نہیں چاہتے۔

فاسد خون کو مٹا دینا چاہتے ہیں جلا دینا چاہتے ہیں، کوئی مجھے اس بھیانک بستیوں سے دور لے جا کر کسی حسین وادی میں ڈال دے، جہاں میں سکون اور خوشی کے چند لمحے گزار سکوں، پڑوس میں کسی کے ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی ہیں "چھوٹے ملکوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے۔ بڑے بڑے ملکوں سے ہتھیار خریدنے شروع کر دیئے۔ دلی میں کیونسٹوں کا جلوس ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کرایہ گھٹایا جائے۔ ڈاکٹر آدم ملک تینوں دلیتوں کے درمیان دوستی کرانے کے مقصد سے آج ہی دلی پہنچے ہیں۔

باہر سے آوازیں آرہی ہیں۔ میرے کان ان آوازوں سے پھٹ رہے ہیں۔ یہ کون ہیں یہ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں میں باری باری ساری کھڑکیاں سارے دروازے بند کر رہا ہوں تاکہ کوئی اندر نہ آسکے اور میں چین سے آرام سے رہ سکوں اس عمارت میں کتنے [illegible] طاقت کہاں ہے۔ میں ان [illegible] ساتھ اور بھی [illegible] اور ہم سب مل کر دنے [illegible] کر لیتے۔

لیکن آوازیں بڑھتی ہی جارہی ہیں نزدیک ہی آتی جارہی ہیں اب بھی بے شمار کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔ میں کیا کروں، اب کیسے بچوں، کاش کوئی مجھے بچا لے کوئی مجھے اپنے نرم نرم بستر پر ڈال کر تھپک تھپک کر ہمیشہ کے لئے سلا دے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں لیکن یہ کیسا شور ہے۔ یہ کیوں مجھے مارنا چاہتے ہیں۔

لمحہ بہ لمحہ آوازیں آگے ہی بڑھتی آرہی ہیں۔ اب شاید وہ سب اس عمارت کے باہر کھڑے ہوں گے۔ اب تو وہ مجھے اور اس عمارت کو ختم ہی کر دیں گے، اور۔۔۔۔۔ یہ بلند دیواریں مضبوط دروازے مجھ پر پڑ رہے ہیں۔ عمارت گر رہی ہے۔ میں نیچے بہت نیچے دبتا چلا جا رہا ہوں۔ ▲

بقیہ صفحہ ۵۰۔ منیر شکوہ آبادی۔۔۔۔۔

بقیہ صفحہ ۵۰

۸۔ سرطان کے لئے آبلۂ پنج پا۔
۹۔ خاموشی کے لئے روزۂ مریم۔
۱۰۔ جبرئیل کے لئے عقلِ نخستیں۔
۱۱۔ حضرت آدم کے لئے طفلِ جبیل روزہ
۱۲۔ زلفوں کے لئے عمرِ لرزاں
۱۳۔ جواہرات کے لئے بچۂ خورشید
۱۴۔ کعبہ کے لئے شاہ مربع نشیں
۱۵۔ خسرو ہشتم بہشت
۱۶۔ دنیا کے لئے زادۂ شش روزہ

ان کنایات و تراکیب کو اپنی زبان میں عام کر کے ہم نہ صرف یہ کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کر سکتے ہیں بلکہ مفہوم کے اظہار میں زیادہ شدت اور لطف پیدا کر سکتے ہیں۔ ان ترکیبوں کا حسن ناقابلِ انکار ہے۔ رہا اسناد کا معاملہ تو منیر کے سے مسلم الثبوت استاد کا ان ترکیبوں کو استعمال کرنا بجائے خود ایک سند ہے۔ ▲

- شاعر کے ساتھ آپ کی ہمدردی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ
- آپ اس کے حلقۂ اشاعت کو وسعت دیں۔
- اپنے احباب و اعزا تک اردو کے اس ترجمان ماہنامے کو پہنچائیں۔

خلش بڑودوی

وہی ہمارے قدم سے قدم ملا کے چلے — جو سینہ تان کے نکلے جو سر اُٹھا کے چلے
گذر نہیں کا ہوا شہرِ سر فروشاں میں — ہر ایک چیز سے جو اپنا دل اُٹھا کے چلے
ہم اپنے راہنما خود رہے ہیں دنیا میں — جدھر چلے ہیں نئے راستے بنا کے چلے
دیا نہ تھا کہ مخالف ہوا سے بجھ جاتا — رہِ حیات میں ہم اپنا دل جلا کے چلے
اگرچہ ہم کو سرِ دار لے گئی دنیا — بڑے بڑوں کو مگر آئینہ دکھا کے چلے

کسی کے چوٹ لگے اپنا دل تڑپ اُٹھے
جہاں کے درد کو ہم زندگی بنا کے چلے

غزلیں

ڈاکٹر افتخار احمد فخر دھولیوی

ہے بظاہر مختلف شیخ و برہمن کی تلاش
ایک مرکز پر مگر ہے صبحِ روشن کی تلاش

چاہیے جوشِ جنوں کو روز کیا تازہ بہار؟
کیوں ہے پھر دستِ جنوں کو جیب و دامن کی تلاش؟

بھولی بھٹکی صبحِ نو کی آ ہی جائے گی کرن،
چشمِ دل کو ہے درِ زنداں میں روزن کی تلاش

بسکہ دورِ نو ہے اے دل محفلِ شیشہ گراں
کر مصافِ زندگی میں سنگ و آہن کی تلاش

فخرؔ! مجھ پر دوستوں کا کم نہیں لطف و کرم!!
بزمِ ہستی میں ہو پھر کیوں مجھکو دشمن کی تلاش

قیصر صدیقی

جو آج زیبِ فرازِ صلیب ہے بابا
رسولِ صبحِ چمن کا نقیب ہے بابا

یہ ریزہ ریزہ اُجالے دھواں دھواں سی فضا
یہ صبحِ نو کا بھی منظر عجیب ہے بابا

اِسے ملی نہ کبھی زندگی کی کوئی کرن
مری اُمید بہت ہی غریب ہے بابا

لرز رہی ہے اندھیرے میں روشنی جیسے
یہ غم کا سایہ بھی کتنا مہیب ہے بابا

اُسی پہ بارشِ سنگِ خزاں ہے آج ظہیر
وہ اک درخت جو سب کا حبیب ہے بابا

فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونہ — 4

داخلہ نوٹس : تعلیمی سال 75-1974ء

آئندہ تعلیمی سال یکم جولائی 1974ء سے شروع ہوگا۔

انسٹی ٹیوٹ میں درج ذیل کورسوں کی پڑھائی کا بندوبست ہے"

(۱) فلم ڈائریکشن اور سکرین پلے رائٹنگ

(۲) موشن پکچر فوٹوگرافی

(۳) ساؤنڈ ریکارڈنگ اینڈ ساؤنڈ انجینئرنگ،

(۴) فلم ایڈیٹنگ اور

(۵) فلم ایکٹنگ

اِن میں سے پہلے تین کورسوں کی مدّت تین تین سال ہے اور آخری دو کورس دو دو سال کے ہیں۔

مختلف کورسوں کے لئے داخلے کی درخواستیں دینے والے اُمیدواروں کا انگریزی کمپوزیشن اور جنرل نالج کا تحریری امتحان لیا جائے گا۔ متعلقہ اُمیدوار ایک روپئے کا کراسڈ پوسٹل آرڈر بنام ایڈمنسٹریٹیو آفیسر فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، پونہ 4، اور اپنا پتہ لکھ کر ایک لفافہ (25 سینٹی میٹر X 18 سینٹی میٹر) جس پر 50 پیسے کے ڈاک ٹکٹ لگے ہوئے ہوں، پراسپکٹس کے لئے درخواست کے ساتھ بھیجیں۔ پراسپکٹس میں ضروری تفاصیل درج ہوں گی اور درخواست کا فارم بھی اس میں شامل ہوگا۔ ہر لحاظ سے مکمل درخواستیں ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء تک ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے پاس پہنچ جانی چاہئیں۔

ٹیلی ویژن کے تربیتی کورس ابھی تک شروع نہیں کئے گئے ہیں اس لئے ایسے کورسوں میں داخلے کے لئے درخواستیں نہ بھیجی جائیں۔

داخلے کے لئے اہلیت

<u>فلم ڈائریکشن اور سکرین پلے رائٹنگ</u>

فلم ڈائریکشن : آرٹس/سائنس میں ڈگری یا اِس کے مساوی یا نیشنل اسکول آف ڈرامہ کا ڈپلوما یا اِس کے مساوی یا فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا کا موشن پکچر فوٹوگرافی، ساؤنڈ ریکارڈنگ اینڈ ساؤنڈ انجینئرنگ میں انسٹی ٹیوٹ کا ڈپلوما یا پریکٹیکل تجربہ۔

<u>موشن پکچر فوٹوگرافی</u> : فزکس اور کیمسٹری کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ (جن اُمیدواروں نے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا ہے، وہ فزکس اور کیمسٹری کے مضامین کے ساتھ سائنس کے تین سالہ ڈگری کورس کے پہلے سال کا امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ لے سکتے ہیں) یا فنونِ لطیفہ (مصوری) میں ڈگری یا ڈپلوما کے ساتھ ایس۔ ایس۔ سی، یا کسی یونیورسٹی یا سرکار کے منظور شدہ ادارہ سے انجینئرنگ (دو سال کا کورس) ڈپلوما کے ساتھ ایس۔ ایس۔ سی یا کسی یونیورسٹی یا بھارت سرکار یا ریاستی سرکار کے منظور شدہ ادارہ سے فوٹوگرافی میں ڈپلوما کے ساتھ ایس۔ ایس۔ سی، (فوٹوگرافی میں ڈپلوما کورس دو سال کا ہونا چاہیئے۔)

<u>ساؤنڈ ریکارڈنگ اینڈ ساؤنڈ انجینئرنگ</u> : فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا اُس کے مساوی (جن اُمیدواروں نے ہائر سیکنڈری امتحان پاس کیا ہے، وہ فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے مضامین کے ساتھ تین سالہ ڈگری کورس کے پہلے سال کا امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ لے سکتے ہیں) یا کسی یونیورسٹی یا سرکاری طور پر منظور شدہ ادارے سے انجینئرنگ (دو سال کا کورس) کا ڈپلوما، ایس ایس سی کے ساتھ۔

<u>فلم ایڈیٹنگ</u> : آرٹس/سائنس میں انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی (جن امیدواروں نے ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کیا ہے وہ تین سالہ ڈگری کورس کے پہلے سال کا امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ لے سکتے ہیں) یا کسی یونیورسٹی یا سرکار کے منظور شدہ ادارے سے انجینئرنگ (دو سال کا کورس) کا ڈپلوما ایس۔ ایس۔ سی کے ساتھ

<u>فلم ایکٹنگ</u> : آرٹس/سائنس میں انٹرمیڈیٹ یا انگریزی بطور ایک مضمون کے یا اس کے مساوی۔ ہندی/اُردو کی کام چلانے کے لائق جانکاری لازمی ہے۔

davp. 73/598

مکتوبات

● دسمبر میں طے ہوئی کہ ہم چلند شمارے نذرِ قارئین ہوئے۔ دسمبر کا شمارہ آپ نے مرحوم سلام مچھلی شہری کی نذر کیا ہے۔ جب سے میں نے صحافت کی منزل میں پہلا قدم رکھا ہے، اس راہ کی دشواریوں سے ہر گام پر دوچار ہوتا آیا ہوں۔ پچھلے دنوں مرحوم احتشام حسین کی یاد میں نقوش لاہور کا احتشام نمبر شائع ہو چکا ہے۔ احتشام صاحب اردو کی بہت بڑی شخصیت تھے لیکن مرحوم پر مضامین حاصل کرنے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ آپ نے اتنی جلدی سلام پر مواد حاصل کر لیا اور اتنی سرعت سے شاعر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا کہ حیرت ہوتی ہے۔

ان مضامین میں کوثر چاند پوری، ڈاکٹر محمد حسن اور آپ کا مضمون قابلِ ذکر ہے۔ عموماً اپنے دلی تاثرات کا جس خوبصورت پیرائے میں آپ نے پیش کیا ہے، وہ دل کو چھو لیتا ہے۔ عمر کے ساتھ آپ کی Boldness میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک قابلِ تعریف پہلو ہے آپ کی تحریر کا ورنہ عمر کے ساتھ مصلحت پسندی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا اداریہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ جنوری کا شمارہ ابھی دیکھ نہیں پایا ہوں۔

دسمبر کے شمارے میں "مکتوبات" کے تحت محبوب راہی کے اعتراض کو پڑھ کر تعجب ہوا۔ موصوف کے خیال میں موہن راکیش کی کہانی "پرایا سا کُتّا" اردو والوں کے لئے نئی نہیں کیونکہ "شاعر" کے صرف چند قارئین (؟) ہندی ادب کا کچھ نہ کچھ ذوقِ مطالعہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں محبوب راہی صاحب اردو سے زیادہ ہندی ادب کا مطالعہ فرماتے ہیں، ورنہ وہ اس سے لاعلم نہ رہتے کہ "پرایا سا کُتّا" آج سے چند سال قبل "شب خون" میں شائع ہو چکا ہے اور اس کا ترجمہ پروفیسر نقیر کلیم نے کیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کہانی البتہ اردو والوں کے لئے نئی نہیں۔ مترجمین کو چاہئے کہ ترجمہ کرتے وقت اس کا اطمینان کر لیں کہ ان کے منتخبہ ادب پارے کا ترجمہ ہوا تو نہیں۔ ویسے تخلیق نئی ہو یا پرانی، اگر ترجمہ کے لائق ہو تو ضرور اردو میں ڈھالنی چاہئے۔ ہم اردو والوں کو ہر زبان کے ادب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

قومی یکجہتی نمبر کی تیاریاں تو زور شور سے چل رہی ہوں گی؟ کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔

اقبال احمد [illegible] روڈ [illegible] — آئی ایس [illegible]

● بہت خوب۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ کب سے شاعر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ آپ کی مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے کہ آپ اتنے انہماک اور لگن سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ واقعی "شاعر" سخت مشکلات میں مبتلا ہے۔ فی زمانہ حالات کے تقاضے کو پورا کرنا آپ کا ہی حصہ ہے۔ "شاعر" کا چندہ ۳۰ روپیہ کم معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ پچاس رکھتے تو بھی شائقینِ اردو کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرتا۔ دو خریداروں کے چندے علیحدہ بھیج رہا ہوں۔ دوسرے خریدار بھی ایسا کریں تو اردو ادب کی بہت کم خدمت ہوگی۔

دسمبر ۷۳ء اور جنوری ۷۴ء کا شاعر ملا۔ اتنا اچھا انتخاب، کتابت (جو ابھی شاعر میں محسوس ہوتی ہے) اور سلام مچھلی شہری کے لئے چند صفحات پڑھ کر سر عقیدت سے آپ کے لئے جھک گیا۔ مگر اعجاز صاحب کل کافی ہاؤس میں رسالہ زیرِ بحث تھا۔ متفقہ طور پر ایک بات تھی کہ ایسے تو حقِ عقیدت ادا نہیں ہوتا۔ سلام نمبر ضرور نکلنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ضرور نکلے گا۔ آپ اعلان کیجئے تو اپنے حلقۂ احباب اور احباب سے ابھی رقم اکٹھی کر کے ادارۂ "شاعر" میں پیش کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ دوسرے کئی ایسے احباب مل جائیں گے جو کہ اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹائیں گے۔ شاید اس طرح ہم اردو کا کچھ قرض ادا کر سکیں۔ سلام مچھلی شہری کی آخری خواہش کا احترام کرنا ہر اردو نواز کا فرض ہے۔ اعجاز صاحب میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ "شاعر" کو سلام نمبر نکالنا ہی ہوگا اور وہ بھی جلد ہی۔ امید ہے کہ بہی خواہانِ اردو اس کارِ ثواب میں پوری امداد کریں گے۔

ایگزیکیٹو انجینئر A2/102 راجوری گارڈن، نئی دہلی ۲۷ — ایل۔ آر۔ چودھری

● "شاعر" کا مشترکہ شمارہ دسمبر ۷۳ء اور جنوری ۷۴ء موصول ہوا۔ آپ نے اس کے ایک حصہ کو "یادِ سلام" وقف کر کے ایک نیک کام کیا ہے ورنہ دوسرے مشاہیر کی طرح سلام کو بھی جلد ہی بھلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اردو میں "مُردہ پرستی" کی رسم جاری تھی، زندگی میں جن فنکاروں کی قدر نہیں ہوتی تھی مرنے کے بعد ان کی تعریفیں کی جاتی تھیں مگر اب "زندہ پرستی" کے رجحان نے اس پر کاری ضرب لگائی اور فنکار کی قدر دانی "جشنِ فلاں" اور "شامِ فلاں" تک محدود ہو گئی۔ یہ جشن بھی انہیں شاعروں اور ادیبوں کے منائے جاتے ہیں جو سماجی اعتبار سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوں اور کسی نہ کسی قسم کے سرمایہ دار ہوں۔ لیکن موجودہ دور میں نہ سچے فنکار رہ گئے

ختم ہو جاتے ہیں، نہ مرنے کے بعد ہی اُن کی خاطر خواہ پذیرائی ہوتی
ہے۔ سلام مچھلی شہری، نریش کمار شاد، شفیق جونپوری، روش صدیقی،
خورشید احمد جامی اور مولانا ابر احسنی وغیرہ ایسے ہی فنکاروں میں ہیں جہاں
یہ صورتِ حال ہو وہاں آپ کا "شاعر" کے ایک حصہ کو یادِ سلام وقف کر دینا
آپ کی نیک نیتی، خلوص اور ادب و ادیب سے تعلقِ خاطر اور اُن کے تئیں احترام
کے جذبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ جس پر میری طرف سے مبارکباد۔

سلام پر اگرچہ تمام مضامین تاثراتی ہیں مگر ان میں کوثر چاندپوری،
ڈاکٹر محمد حسن، امجد صدیقی، مظہر امام کے مضامین میں خلوص، تازگی اور
تنقیدی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ سلام جمالیاتی شاعر تھے۔ ان کی نظموں،
غزلوں اور دوسری شاعری میں تخئیلی شادابی اور جذباتی دفور کا امتزاج
ملتا ہے۔ یہ امتزاج ہیئت کے تجربوں کی صورت میں اور زیادہ دلکش نظر
آتا ہے۔ دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح سلام کو بھی اپنے فن کو
ذریعۂ زندگی بنانا پڑا، اس لئے انہوں نے بے تحاشا لکھا۔ اس میں معیاری
ہر طرح کی تخلیقات ہیں۔ اگر ان کی تخلیقات کا انتخاب شائع کیا جائے تو
اس سے سلام کی انفرادیت کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اُن کی انفرادیت
کی اساس انہیں عناصر پر ہوگی جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔

سلام کو بے رحم موت نے ہم لوگوں سے جدا کیا، لیکن مولانا ابر احسنی
کو بے رحم قاتلوں نے ایسی دنیا میں پہنچا دیا جہاں سے اب وہ کبھی واپس
نہیں آ سکتے۔ ابر صاحب کا قتل منصوبہ بند انداز میں ہوا ہے۔ ۷ نومبر کی
شب میں گنور ضلع بدایوں میں ایک مشاعرہ منعقد تھا، اسی شب میں مولانا کو
قتل کیا گیا۔ قتل کے سلسلے میں جناب امر سنگھ صاحب عاجز ریڈیو ایم بے
کا ایک گشتی مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے موقع و محل کا معائنہ
کر کے لکھا ہے کہ

"مجھے بتایا گیا کہ قبلہ اپنے پلنگ پر سیدھے دراز تھے اور اُن کا چہرہ
داہنی جانب تھا۔ قاتل نے چھرے سے اُن کی شاہ رگ یعنی حبل الورید
میں آر پار سوراخ کر دیا اور بعد میں تولیہ کا کچھ حصہ اُس سوراخ کے
دونوں طرف ٹھونس دیا تاکہ خون زیادہ نہ بہے۔ آلۂ قتل کو قبلہ کے
جامہ سے صاف کر کے پلنگ پر ایک جانب رکھ دیا۔ اپنے ہاتھ
قبلہ کے کپڑوں سے پونچھ کر صاف کئے اور اُن کے نزدیک رکھے لوٹے میں
پانی سے دھویا۔ خون آمیز پانی کمرے کے باہر والی دیوار پر پھینک دیا۔"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا ابر احسنی کو منصوبہ طریقے سے
قتل کیا گیا ہے۔

دوسرے حصہ میں "تعلیم اور تعلیم کے مسائل" از رفیق ظفر الاعظمی کا مقالہ خوب
ہے۔ آپ علمی، تعلیمی اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کر کے علم و ادب کی
خدمت زیادہ وسیع دائرہ میں کر رہے ہیں۔ قاہر حسین فرشاد صاحب کا مضمون
"افسانوی ادب کا زوال" اختلافی ہونے کے باوجود پسند آیا۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ ڈاکٹر عنوان چشتی

● آج دسمبر جنوری الشمارہ کے زرد رنگ کے گیٹ اپ کے سرورق پر
سلام مچھلی شہری کی قدِ آدم تصویر دیکھ کر جلد ترتیب اٹھا لی اور "جرعات"
سے لے کر آخری صفحات تک میں اس انہماک کے ساتھ رسالے سے چپٹا
رہا کہ ختم جانے کا بھی شعور نہیں آیا۔

سلام مچھلی شہری سے میرا تھوڑا سا ادبی رشتہ ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا تھا۔
جبکہ میری ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ "سبیل" دیکھا ہے کے صفحات
پر اُن کی انیسویں تخلیقات کے جلوے بکھرا کرتے تھے۔ وہ اُس زمانہ میں
ایک خاص رومانی شاعر تھے اور اُن کی رنگین نظموں کی مجموعیت میرے دل کو
خاص طور پر متاثر کرتی تھی۔

سلام مچھلی شہری سے میری ملاقات کبھی نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود بھی
میرا جذباتی لگاؤ ہمیشہ رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بے اختیار ہو کر میں یہ
چند سطریں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"شاعر" کا یہ شمارہ "سلام مچھلی شہری نمبر" تو نہیں لیکن تھوڑے سے وقت
میں مرحوم کی یاد میں ایک اچھا خاصا مواد پیش کر دینا یقیناً ایک قابلِ قدر
بات ہے جس کے لئے اردو دنیا کو آپ کا ممنون ہونا چاہئے۔

آپ کے ایک گذشتہ معروضہ "کشمیر کے سفر کا ایک تاثر" جس میں اہلیہ محترمہ
صاحبہ کے معصوم آنسوؤں کا بار بار ذکر آیا ہے، اور تازہ شمارہ کے طویل
مقالہ کو پڑھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ ایک مستند شاعر ہی
نہیں بلکہ ایک سحر طراز نثر نگار بھی ہیں۔

"شہزادۂ شاعری" سلام مچھلی شہری کی ایک ایسی مختصر اور پُر خلوص
داستانِ حیات ہے جس کے مطالعہ کے بعد مجھ پر ایک کیفیت سی
طاری ہو گئی۔

تہ سلام مچھلی شہری

۸۔ مچھوئی بلڈنگ، ... قیصر قلندر

● مرحوم سلام مچھلی شہری کے بارے میں بھائی عزیز تمنائی نے بہت کچھ بتایا تھا لیکن ان سے ایک دفعہ کا لیے پناہ لگاؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ابھی "شاعر" سلام کی یاد میں آپ نے خلوص سے جو پڑھ کر آنکھیں بھیگے بغیر نہ رہ سکا۔ خاص طور سے آپ کا مضمون بڑا جذباتی ہے۔ آپ نے اپنی خوبصورت صداقت اور خلوص سے بھرپور قلم لیا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن پر دیر تک تاثر قائم رہتا ہے۔ سلام مرحوم کو زندگی میں ارباب حل و عقد نے ایک طرح سے نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد چند ہی جگہوں میں ان کے غم کے خلوص کا جیسے حق ادا کر دیا گیا مگر صحیح معنوں میں آپ نے صحافت داری کا ثبوت دیا ہے اور امکانی کوشش کی ہے کہ "شاعر" کے اوراق میں دستام مرحوم کی یاد کے شایانِ شان ان کی زندگی اور فن کا احاطہ کر سکیں۔ آپ کی کوششوں اور حوصلوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور زندگی کے معنی سمجھے ہیں۔

شعبۂ اردو گورنمنٹ گرلز کالج۔ اندور — مختار شمیم (ایم اے)

● "شاعر" باقاعدگی سے پچھلے کئی سال سے کالج میں آ رہا ہے۔ تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ سلام مچھلی شہری پر آپ کا مضمون بہت پسند آیا۔ مگر ایک کمی ضرور کھٹکی۔ سلام کی زندگی کے متعلق رسالے میں کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔ امید ہے کہ اگلے شمارہ میں آپ یہ کمی پوری کر سکیں گے۔ "قومی یکجہتی نمبر" نکالنے کے لئے میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ میرے خیال میں اس ضمن میں آپ کے اس اقدام کو منفرد حیثیت حاصل ہوگی۔

بسنت لال دھیر کالج۔ بھوانی (ہریانہ) — راجندر پردیپ (ایم اے)

● دسمبر جنوری کا مشترکہ شمارہ ملا۔ بہت مختصر عرصے میں آپ نے سلام مچھلی شہری پر مستند قلمکاروں سے لکھوا کر کمال کر دیا۔ ساری کی ساری تحریریں بڑی دل کو چھونے والی ہیں۔

بمبئی۔ — رضا الجبار

● تازہ "شاعر" بھی کل مل گیا۔ سلام پر آپ کا مضمون سب سے اچھا اور فطری لگا۔ سرورق پر تصویر بھی انتہائی جاذب نظر ہے۔

ایگزیکٹو آفیسر۔ میونسپل بورڈ۔ مہیدپور (راجستھان) — عشرت دھولپوری

● دسمبر اور جنوری کا مشترکہ شمارہ "بیادِ سلام مچھلی شہری" دیکھا۔ آپ کا یہ بیک وقت "شاعر" ملک کا ترقی پسند اور باشعور جریدہ بن گیا ہے، ہندوستان بھر کے صحافیوں، دانشوروں اور ادیبوں کے لئے دعوت فکر دے گیا۔ اس مقصد سے ایک اداریہ پر میری مبارکباد قبول فرما لیجئے کیونکہ بیباک صحافی، دانشور اور ادیب سوتوں کو جگانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ لیکن کیا اس بیدار شعور کے دور کی عمر ہی کیا ہوگی؟

مطلب بدلتے جاتے ہیں سانسوں کے ساتھ ساتھ
یکسانیت کا رنگ کسی انجمن میں ہے؟!

مہر سکن بیگم بازار۔ جہان آباد (اے۔ پی) — سید منجو قمر

● "شاعر" کا سلام نمبر (دسمبر ۸۳۔ جنوری ۸۴ء) کا شمارہ خوب ہے۔ نظم "سوداگرانِ اجل کی آواز" ارسال ہے۔ جنوری ۸۴ء کے آتش فشاں اداریہ کے پیشِ نظر امید کہ آپ اسے ضرور شائع فرمائیں گے۔ جس طرح آپ نے جنوری ۸۴ء کے اداریہ میں قلمکاروں اور دانشوروں کو آواز دی ہے، اسی طرح "شاعر" کو بھی انہیں افکار و جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنائیے۔ (اس میں شائع ہونے والی نظم نثر کے لحاظ سے)

پروگرام ایگزیکٹیو۔ آل انڈیا ریڈیو۔ بنگلور — متین سروش

● آج دسمبر اور جنوری کا مشترکہ شمارہ ڈاک سے ملا ہے۔ دسمبر کا شمارہ "بیادِ سلام مچھلی شہری" ہے۔ سلام مرحوم پر آپ نے رسالہ کے ایک معتدبہ حصہ کو مخصوص کر کے اور ان پر اچھے مضامین شائع کر کے ایک گراں قدر خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سعی محمود فرمائی ہے۔ آپ کے اس جذبہ کی ہم قدر کرتے ہیں۔ آپ نے یہ مختصر شمارہ جس اخلاص و عقیدت کے ساتھ پیش فرمایا ہے، وہ سلام صاحب سے آپ کے قریبی تعلقات کا مظہر ہے۔ سلام صاحب اپنی انفرادی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر یقیناً اس کے مستحق تھے کہ ان پر اور ان کی موت پر ادیبوں اور شاعروں کا ایک گلدستۂ عقیدت نذر کیا جائے۔ آپ نے اس کام کو انجام دے کر روحِ سلام کو یقیناً سکون و راحت پہنچائی ہے۔ تمام مضامین بڑے تاثراتی ہیں۔ نظمیں بھی خوب ہیں اور ان سے شعراء کی محبت کی آئینہ دار۔ مضامین میں آپ کا مضمون "شہزادۂ شاعری" — "درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا" کا مصداق ہے۔ اس قدر سوز و درد و اثر آپ کے جملوں میں سمایا گیا ہے کہ پورا مضمون میں بیک وقت بھیگی ہوئی آنکھوں کے بغیر نہ پڑھ سکا۔ اشکوں کا تانتا جاری تھا اور میں مضمون پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ یہ مضمون مرثیہ نہ تھا، مگر اس کے الفاظ مجھ جیسے رقیق القلب انسان

کے لئے بہت کچھ تحقیق طلب اور اختلافی ہے۔ آپ کے قلم کے اعجاز کے تو ہم پہلے ہی سے قائل ہیں۔

جنوری ۸۴ء کے شاعر میں عابد علی خاں پر جو خاکہ ہے، وہ بھی بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ ایک اور مضمون نے میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا، وہ مضمون ہے رفیعہ منظور الامین صاحبہ کا۔ تعلیم و تعلم کے مسائل پر رفیعہ صاحبہ نے بڑا شگفتہ اور پُر از معلومات مضمون لکھا ہے۔

نشاط منزل۔ ٹونک (راجستھان)　　　سید منظور الحسن برکاتی

● کل دسمبر ۸۳ء، جنوری ۸۴ء کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ بیاد سلام (مرحوم) کا بیشتر حصہ پڑھ چکا ہوں۔ اس البیلے اور مخلص شاعر کی موت پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہے۔ اب شاید صدیوں سلام کی جگہ پُر نہ ہو سکے۔ سلام کا منفرد اور والہانہ اندازِ شاعری و زندگی یقیناً بے مثال تھا۔ سلام اختر شیرانی اور مجاز کی طرح رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ آپ نے دسمبر ۸۳ء کا شمارہ سلام کے لئے وقف کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔ آپ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن ایک ضخیم سلام نمبر کی پھر بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ گرانقدر خدمت بھی آپ ہی انجام دے سکتے ہیں۔

آپ کا مضمون "شہزادۂ شاعری" سلام کی زندگی کے کئی اہم گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے اور اس سے سلام کی زندگی اور شاعری کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کوثر چاندپوری، ڈاکٹر محمد حسن، مظہر امام، سلیمان رضوی اور عبدالقوی دسنوی کے مضامین بھی فکر انگیز اور لائقِ ستائش ہیں۔

ریلوے آڈٹ آفس، ہزاری باغ　　　ظہیر غازی پوری

● شاعر کا دسمبر اور جنوری کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ سلام مچھلی شہری مرحوم کی یاد میں دسمبر کے شمارہ کو وقف کر کے آپ نے اہلِ اُردو کی توجہ کو خوش اسلوبی سے ایک مسئلہ کی طرف موڑ دیا ہے۔ سلام صاحب مرحوم کی ادبی خدمات کا اعتراف صحیح معنوں میں اب تک نہیں کیا گیا ہے، ممکن ہے آپ کا یہ پُرخلوص قدم مفید ثابت ہو۔ اس کے تمام مشتملات توجہ کے مستحق ہیں۔ "شہزادۂ شاعری" کو آپ نے کچھ اس رنگ میں اور اس ڈھنگ سے تحریر کیا ہے کہ قارئین اُس کے حلقۂ اثرات میں ڈوب جانے پر مجبور رہیں۔ تحریر کی اس وضعداری، خوش سلیقگی اور احساسات کے خلوص بزداں نے عجب توانائی اس کے اندر پیدا کر دی ہے۔

جنوری کے حصے میں پروفیسر ظاہر حسین شمشاد کا مضمون "افسانوی ادب کا زوال" قابلِ توجہ ہے۔ افسانوی ادب کے مطالعہ کے بعد موصوف نے جو نتائج اخذ کئے ہیں اُن میں اختلاف اور اتفاق دونوں کے پہلو ہیں۔ ممکن ہے اس مسئلہ پر مفید بحث کا آغاز اسی سے ہو جائے۔

شعبۂ اردو فارسی۔ آئی ایس کالج مظفرپور۔　　　قمر اعظم ہاشمی

● سلام مچھلی شہری مرحوم پر خصوصی شمارہ بروقت ہے۔ مضامین تاثراتی نوعیت کے ضرور ہیں جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے لیکن چونکہ اکثر مضامین Personal قسم کے ہیں اُن سے مرحوم کی معصوم اور بھولی شخصیت کے خدوخال اُبھر آئے ہیں۔

جنوری کے شمارہ میں بھیشم ساہنی کا افسانہ اور پروفیسر ظاہر حسین شمشاد کا افسانہ پر مضمون پسند آیا۔ اُردو افسانے پر ایسے اچھے مضامین کم پڑھنے میں آتے ہیں۔

۷۰ تیری پیرخان اسٹریٹ۔ بمبئی ۸　　　انور خاں

● تازہ شمارہ مشترکہ نمبر موصول ہوا۔ آپ اسے دو حصوں میں الگ الگ بھی چھاپ سکتے تھے۔ دسمبر کا شمارہ "سلام نمبر" ہو سکتا تھا۔ آپ کا مضمون "شہزادۂ شاعری" مختصر اور جامع، ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ کیسے کیسے لوگ شراب کی نذر ہو گئے!۔

عموماً یہ خوش مزاج دل بھی ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت بہار کے ایگزیکیوشن آفس کے زیرِ اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں کئی بیرونی شعراء شریک تھے۔ بشیر بدر، سلام مچھلی شہری بھی تھے۔ سلام صاحب کو میں نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد ناظم تھے۔ بعد میں وہی صدر بھی ہو گئے۔ سلام نے چند قطعات اور ایک نظم پڑھی۔ اُس وقت وہ اچھے خاصے تھے۔ آخر میں میرے نام کا اعلان ہوا۔ ملک زادہ نے پہلے حضرت علامہ سیماب کی ذاتِ گرامی اور پھر ان کے فن پر اچھی روشنی ڈالی۔ اُس کے بعد میرے متعلق بہت کچھ کہا۔ سلام نے غالباً اُسی وقت مجھے دیکھا، وہ مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے غزل پڑھی، یہ خاموش بیٹھے سُن رہے تھے۔ مشاعرہ کے اختتام پر ملک زادہ نے منظور رائے پر میری غزل کو حاصلِ مشاعرہ کہا اور جس شخص نے سب سے پہلے اُٹھ کر تائید کی وہ سلام ہی تھے۔ مشہور کسی فراخ دل کی اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

　۳۱۔ کراس روڈ نمبر ۲، انگریز کٹھ، بھیکھنپور پٹنہ　　　ترقی دکنی

● تازہ شمارے میں مرحوم سلام مچھلی شہری پر مضامین پڑھ رہا ہوں۔ مظہر امام، شاکر، اور آپ کا مضمون بھی پڑھا۔ خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اعجاز صاحب آپ کا مضمون پڑھ کر نہ جانے کیوں میرے سلسلے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے؟ یہ کیسے ہوا میں بیان نہیں کر سکوں گا۔

پیار شخص کتنے عجیب سے ہیں جو جڑ جاتے ہیں تو رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی طرح ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگ کتنے عظیم ہیں جو اپنے خلوص کا پیکر قرار دے کے اس دور میں بھی اسی خلوص و محبت سے جیتے ہیں جبکہ خلوص و محبت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔ اللہ آپ کو آب حیات پلا دے۔

زینت السلطانہ۔ محمود (میسور)   شبیر مرزا

● سلام مرحوم پر آپ کا تڑپتا رہنے والا دل کاغذ پر اتر آیا ہے۔ پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔ یوں تو مرحوم سے ملاقات نہیں ہوئی ایک سال پہلے بنگلور آئے تھے مشاعرہ میں سنا تھا۔ بڑے پیارے شاعر تھے، ہم سب کو تڑپا کر چلے گئے۔ پتہ نہیں ان پر قلم اٹھاتے ہوئے آپ پر کیا گذری ہوگی۔ معلوم نہیں کتنی بار آپ کے قلم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ سلام کے حالات پڑھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ یہاں تو ہزاروں سلام ہیں جو موت کے دروازے پر کھڑے زندگی کو دور سے سلام کرتے ہیں۔ آدیب اور ابن احمد تاب نے ان سے بدتر حالات میں سب کو ہمیشہ کے لئے سلام کہہ دیا۔ یہ تو ہمارے سماجی نظام کی دین ہے۔

۲۹۔ سیکنڈ اسٹیج۔ اندرا نگر بنگلور   عبدالقادر آدیب بی اے ایل ایل بی

● پیرون شاعر کا دسمبر ۸۳ء اور جنوری ۸۴ء کا مشترک شمارہ ملا۔ ماہنامہ شاعر کا سلام مچھلی شہری کی یاد میں دسمبر کا شمارہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بھرپور ہے اور سلام مرحوم کی پراثر شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ مگر افسوس! مرحوم کے فن پر بہت کم روشنی ڈالی گئی۔ آپ نے "مجرمات" میں بالکل صحیح فرمایا کہ ہم اپنے مشاہیر ادب کو بہت جلد فراموش کر دیتے ہیں۔ اگر ہم مرحوم شعرا و ادبا کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو منظر عام پر لائیں اور ان کے فن کی روشنی میں آگے بڑھیں تو ہماری بھی سرفرازی ہو اور اردو زبان و ادب کا دامن بھی وسیع سے وسیع تر ہو۔ مرحومین کے لئے اس سے بڑھ کر خراج عقیدت کچھ نہیں ہو سکتا۔

معروف گنج گیا   فرحت قادری

بیان ملکیت و جملہ تفصیلات ماہنامہ شاعر بمبئی

فارم ۴، رول ۸

۱۔ مقام اشاعت — بمبئی	۲۔ وقفہ اشاعت — ماہانہ
۳۔ پرنٹر۔ اعجاز صدیقی	۴۔ پبلشر۔ اعجاز صدیقی
۵۔ قومیت: ہندوستانی	۶۔ ایڈیٹر، اعجاز صدیقی
۷۔ قومیت: ہندوستانی	۸۔ پتہ، دینانتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ کلینڈ روڈ بمبئی ۴

۹۔ ملکیت: اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) اعجاز صدیقی

۲۸ فروری ۸۴ء

نقد و نظر

قوی راج بمبئی

پندرہ روزہ

مہاراشٹر اور خصوصاً بمبئی میں اُردو زبان کی جو حیثیت اور اہمیت ہے، اُس کے پیشِ نظر حکومتِ مہاراشٹر نے ۲۶ جنوری ۸۱ء کو پندرہ روزہ "قومی راج" کا اجراء کیا ہے۔ انگریزی اور مراٹھی زبانوں میں حکومت کی طرف سے "لوک راج" شائع ہوتا ہے۔ چونکہ مہاراشٹر کی دوسری بڑی زبان اُردو ہے اس لئے "لوک راج" کے اُردو ایڈیشن کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی گئی۔

مرکزی حکومت کے رسالہ "آجکل"، اُتر پردیش کے رسالہ "نیا دور" کے بعد حکومت مہاراشٹر کا "قومی راج" اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ۲۶ جنوری اور ۱۵ فروری کے دونوں شمارے دیکھ کر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے۔ بمبئی کے اُردو رسائل کی تاریخ میں اسے ایک نئے دور کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔

پہلے شمارہ کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر رفیق زکریا، کرشن چندر، خواجہ عبدالغفور، سردار جعفری، شہاب مالیر کوٹلوی، سکندر علی وجد، قرۃ العین حیدر(؟) سلطانپوری، اعجاز صدیقی، جاں نثار اختر، سید شہاب الدین دسنوی، حسن کمال، عبدالحمید لویرسے کے نام اہم ہیں۔

ہندوستان میں اُردو کا مستقبل، قدیم اور جدید مراٹھی شاعری، مہاتما گاندھی پونا کی یاد میں، ہمارے ذاکر صاحب۔ ادبی اور علمی اعتبار سے بہت اچھے ہیں۔ دس سالہ سفر۔ مہاراشٹر میں صنعت کاری، مہاراشٹر میں چوتھے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی اور پانچویں منصوبے کے نشانے، مہاراشٹر کھیل کے میدان میں، مہاراشٹر میں سیر و سیاحت، مہاراشٹر ترقی کی راہ پر معلوماتی ہیں۔ اس شمارہ کا جہاں ادبی پلہ بھاری ہے، وہیں تہذیبی، ثقافتی اور صنعتی اعتبار سے بھی اس کے مندرجات اہمیت رکھتے ہیں۔ سرورق معنی خیز، دیدہ زیب رنگین ہے۔ متعدد تصاویر ہیں۔

"قومی راج" کا دوسرا شمارہ بھی خوب ہے۔ اس کا حصۂ نظم تو روایتی اور کمزور ہے لیکن نثری حصہ میں خواجہ عبدالغفور، خواجہ احمد عباس، سلمیٰ صدیقی، کرشن چندر، ریاض احمد خاں، معین الدین حارث، رحمت اللہ انصاری کی تحریریں رسالہ کے مزاج و معیار کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس شمارہ میں قومی راج کے افتتاح کے موقع پر تصاویر اور دیگر مواقعوں کی تصاویر ہیں۔ رسالہ میں مضامین کے ساتھ بھی تصاویر کا اہتمام ہے۔ لطائف و ظرائف اور کارٹون بھی ہیں۔

"قومی راج" کتابت طباعت، پرنٹنگ اور آرٹ کے اعتبار سے بھی قابلِ تعریف اور نظر بخش ہے۔ خواجہ عبدالغفور آئی۔ اے۔ ایس، سکریٹری حکومتِ مہاراشٹر اس رسالہ کے نگراں ہیں اور چونکہ غفور صاحب خود ایک اچھے ادیب بھی ہیں اس لئے "قومی راج" اپنے پہلے شمارہ ہی سے اُردو کے بہترین رسائل کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل بن گیا ہے۔ یہ خواجہ عبدالغفور اور حکومت مہاراشٹر کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی مشترکہ مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے اور ایک مبارک اقدام۔

"قومی راج" کا سالانہ چندہ برائے نام صرف پانچ روپیے ہے اور فی کاپی ۲۵ پیسے۔ اُمید کہ اُردو والے اور خاص طور پر مہاراشٹر کے لوگ بڑی تعداد میں "قومی راج" کے خریدار بنیں گے۔

ملنے کا پتہ :- ڈائرکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر سچوالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲۔

آوازوں کی صلیب

از ——— کوثر چاندپوری

کوثر چاندپوری نے بڑا ہی طویل ادبی سفر کیا ہے اور مسرت کی بات یہ ہے کہ وہ تھکے نہیں ہیں۔ اُن کی ہر تی تخلیق تازہ کار اور اپنے عصر سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بے شمار افسانے اور ناول، علمی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پر کتابیں اور مضامین اُن کی عظمت کا بیّن ثبوت ہیں۔

برِ صغیر پاک کے اہم اُردو رسائل میں اکثر کوثر صاحب کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں انہیں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اُن کے افسانوں کا آخری مجموعہ ۱۹۶۷ء میں "شعلۂ سنگ" کے نام سے کراچی (پاکستان) سے شائع ہوا تھا۔ اس دوران میں ان کے کئی ناول تو شائع ہوئے لیکن افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔

تیرہ سال کے بعد کوثر چاندپوری کے منتخب افسانوں کا یہ ضخیم اور خوبصورت مجموعہ شائع ہوا ہے۔ "آوازوں کی صلیب" میں ۲۸ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہیں شاہکار کا درجہ دیا جا چکا ہے اور بہترین افسانوں کے انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس تبصرہ میں اتنے بہت سے افسانوں کا فرداً فرداً رنگ الگ کرنا تو بہت مشکل ہے۔ مجموعی طور پر بلا خوفِ تردید یہ بات

کہیں کہیں جگہ بہ جگہ [illegible] رکھ کر کوئی اہم مقصد اجاگر کیا گیا
ہے۔ کوثر چاندپوری کے اسلوب کی انفرادیت تو اپنی جگہ مسلّم ہے، ان کے
یہاں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ گہری معنویت کے عناصر ملتے ہیں۔
ان کا [illegible] مشاہدہ ان کے فکر و نظر کا عکس ہر افسانہ میں جھلکتا ہے
بلکہ [illegible] امتیاز یہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات اپنی کہانیوں کے لئے
منتخب کرتے ہیں [illegible] سماجی زندگی میں روز و شب پیش آتے ہیں۔ زندگی کی
تمام خوبصورتی و بدصورتی کا احساس ہے اور تغیر و تبدیلیوں پر نظر۔ زندگی کے
[illegible] ان تمام تبدیلیوں کے اندر قبول
کی علامت بھی ان میں ہے جو جدید سائنس اور صنعتی دور اپنے ساتھ لایا ہے۔
ان کے کرداروں میں سماج کے پچھڑے ہوئے لوگ بھی ہیں اور اعلیٰ سوسائٹی کے
افراد بھی۔ وہ سوسائٹی کی خرابیوں، ناہمواریوں اور سرمایہ دارانہ نظام پر سخت
تنقید کرتے ہیں۔

"اچانک ایک بہتر [illegible] گاڑی دونوں ہاتھوں سے دھکیلتا
سڑک پر آ گیا اور آہستگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گاڑی میں
گندا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ اوپر مرا ہوا کتا رکھا تھا۔
"ہٹ جاؤ ایک طرف"
بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔ بہتر نے سہم کر ادھر پر لرزتے
ہوئے سیٹھ کے خوف سے پھر گاڑی پر رکھے ہوئے کتے
کو دیکھا، اور عجلت کے ساتھ دوسری گلی میں گھس گیا۔"
(ایک گلاس خون)

ایک افسانہ نگار جب تک طنز نگار نہ ہو بڑا افسانہ نگار نہیں ہو سکتا۔
کوثر چاندپوری طنز کے نشتر خوب چبھوتے ہیں۔ وہ چونکہ ایک بلند پایہ طبیب
بھی ہیں اس لئے بہت اچھی تحلیلِ نفسی کرتے ہیں۔ فلسفیانہ اور نفسیاتی TO-
[illegible] کی بھی گہرائی میں ملتے ہیں۔

واقعہ نگاری اور کردار نگاری دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک
افسانہ نگار اچھا واقعہ نگار تو ہو سکتا ہے لیکن اُسے کردار نگاری جیسے مشکل
فن میں بھی مہارت حاصل ہونی چاہئے، تب ہی وہ مکمل افسانہ نگار ہو سکتا ہے۔
کوثر چاندپوری کی یہ دونوں خوبیاں ہیں۔

"آنکھ مچولی کی صلیب" افسانوی ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کی حیثیت
رکھتی ہے اور اس سے اُردو افسانہ کے ارتقا کا کافی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جس کے افسانے اپنی گونا گوں خصوصیت کی بنا پر اپنی منفرد جگہ
ضرور بنا لیں گے۔

۲۲۸ صفحات۔ اچھی کتابت و طباعت۔ بہترین کاغذ۔ خوبصورت گرد پوش سے
روایتی آرٹ سے ہٹ کر کتاب کا گرد پوش بہت اچھا بنایا ہے۔
قیمت بارہ روپے۔
ناشر: حلقۂ فکر و شعور ۱۲۳۱ بلیماران۔ دہلی ۶

لاریب

از ———— غلام مرتضیٰ راہی

غلام مرتضیٰ راہی کا شمار اُردو کے اچھے جدید شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ
جدید حسیت کو نئے انداز، نئے استعاروں اور علامتوں کے ساتھ اپنے شعروں
میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلوبی سادگی ہے۔ بعض دوسرے جدید
شاعروں کی طرح ان کے شعر بوجھل نہیں ہوتے۔ نہ وہ بہت دور از کار قسم کے
استعارے اور علامتیں برتتے ہیں۔

"لاریب" میں جنوری ۱۹۷۰ء سے اپریل ۱۹۷۲ء تک کی غزلیں شامل
ہیں۔ ان کا اس سے پہلے کا کلام ان کے مجموعے "لامکاں" میں شامل کیا گیا
تھا۔ دو سال کی مدت میں اتنی بہت سی غزلیں کہہ لینا اس بات کا
ثبوت ہے کہ "راہی" کی "مشقت" کے ساتھ ان کی فکر بھی جاری ہے۔
ایسے سخت دور میں ذہن و فکر کو شاعری کی طرف متوجہ رکھنا بظاہر بڑا
کمال ہے لیکن یہ ایک طرح کا خطرہ بھی ہے۔ یہ کہیں شاعری برائے
شاعری ہو کر نہ رہ جائے۔ جس کی کچھ جھلکیاں جا بجا "لاریب" میں نظر
آتی ہیں۔ یہاں بطور مثال ذیل کا صرف ایک شعر دینا کافی ہے۔

مجھ کو سمجھائی تو دیتا نہیں پر کروں کیا تیرا سامنا تک ہی
کہا اس نے چاروں طرف دیکھ کر سُنا ہم نے سب [illegible]

—

میرے قدم تک اٹل رہی ہے ہوا   کہ اخبار بھی [illegible]

اس انتیس شعر کی زمین ہی میں یہ دو شعر دیکھئے کہ اپنی معنویت اور شگفتگی میں
کتنے اچھے اور اوپر کے شعروں سے مختلف ہیں۔

دیر سے تو بنی بنائی ہے   بلبلوں سے محل [illegible]
ناخدا بن گئی سمندر میں   کشتیاں [illegible]

"ادیب" میں بیشتر غزلیں کچھ کچھ شعر کی چیز گویا یہ انتخاب ہیں۔ لیکن ہر غزل میں دو تین شعر بہت اچھے اور دو تین خلاصے کرد ہیں۔ جدید شعرا اپنی علمی اور فنی کمزوریوں کو محسوس کریں یا یہیں اس مسلّمہ حقیقت کو مانیں کہ شعر میں جذبہ کا ہونا ضروری ہے تو ان سے اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تمام باتیں خارج از بحث ہیں جو شعر کو "انانیت" عطا کرتی ہیں۔ جدید حسیت بقول خلیل الرحمن اعظمی محض جھلکیوں کا ڈھیر معلوم ہو تو اس سے کیا حاصل۔ شاعر کی عمر، تجربے، مشاہدے اور علم میں جوں جوں اضافہ ہوتا ہے اس کے یہاں گہرائی (DEPTH) پیدا ہوتی ہے۔ "لامکاں" اور "ادیب" کے غزل نگاری میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہاں پختگی بڑھی ہے خیال کے اعادہ میں کمی پیدا ہوئی ہے، ایک طرح کا ٹھہراؤ آیا ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی سے جدید غزل میں اضافوں کی توقع بہرحال کی جا سکتی ہے۔

پیش لفظ آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اور ڈاکٹر وحید اختر نے غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری کے سلسلے میں بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ راہی کے لئے یقیناً طرۂ امتیاز ہے کہ ایسے صاحبانِ نظر ان کے کلام کی ستائش فرما رہے ہیں۔ پھر بھی انھیں "خود تنقیدی" سے کام لینا چاہئے۔ جدید شاعری کے نقاد، جدید شاعروں کی کمزوریوں کی طرف سے دانستہ اعراض کرتے ہیں۔ اسے تنقید کا صحت مند رویہ نہیں کہا جا سکتا۔

صفحات ۱۱۲۔ کتابت، طباعت، گرد پوش بہتر۔ قیمت فی کاپی چار روپے

ناشر: دلنواز پبلیکیشنز ۵، مرزا علی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۹





محفلِ اپنی ...!

پیشِ نظر شمارہ

فروری کا "شاعر" پچھلے شمارے کے صرف ۲۰ دن بعد شائع ہو رہا ہے اور مارچ کا "شاعر" ۱۵ مارچ تک شائع ہو جانے کی امید ہے۔ وقت اور حالات دونوں پر قابو پانے کی امکانی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ "شاعر" کو وہ تعاون نہیں مل رہا ہے جس کے بغیر ان مشکلات پر قابو نہیں پایا جا سکتا جن میں وہ مبتلا ہے۔ نہ اشتہارات بڑھ رہے ہیں اور نہ نئے خریدار، نہ معاونین بڑھ رہے ہیں اور نہ سرپرست۔ اُن نادہندہ خریداروں کی طرف سے جنہیں کئی ماہ تک رسالہ گیا اور انھوں نے زرِ سالانہ نہیں بھیجا، تقریباً چار ہزار روپے کا نقصان پہنچا ہے۔

بیادِ سلام مچھلی شہری

سلام مچھلی شہری مرحوم پر گزشتہ جن دو شماروں میں جو مواد پیش کیا گیا اُسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں اتنے زیادہ خطوط آئے ہیں کہ "شاعر" کے بیس پچیس صفحات میں بھی ان کا سمانا مشکل ہے۔ ہم بہت سے مکتوب نگاروں سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کے خطوط شامل ہونے سے رہ گئے۔ اگر خطوط کے لئے زیادہ صفحات وقف کئے جاتے تو "شاعر" کے حصۂ نثر و نظم کا توازن بگڑ جاتا۔ کئی خطوط کے صرف چند جملے لئے گئے ہیں۔

اہم تخلیقات

بار بار عرض کیا جاتا رہا ہے کہ اشاعت کے لئے صرف اہم اور معیاری نظم و نثر تخلیقات ہی بھیجی جائیں۔ ناپختہ قلم کار غیر معیاری نظمیں، غزلیں اور افسانے بھیج کر ہماری مشکلات میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ "شاعر" کے ہر شمارے میں صرف مشہور و معتبر لکھنے والوں ہی کی اعلیٰ معیار کی تخلیقات شائع ہوں۔ "شاعر" کے محدود صفحات کو ہر ایک کی تخلیقات سے پاٹا نہیں جا سکتا۔

غلطی ہائے کتابت

یوں تو "شاعر" میں کتابت کی غلطیاں بہت کم ہوتی ہیں لیکن متعدد چیزوں کا جائزہ ہر نظر سے لیتے ہیں۔ بعض غلطیاں بہت مضحکہ خیز ہوتی ہیں جیسے جنوری کا ہر کے شمارے کے جوہرات والے صفحے پر "کارِ دنیا" کی جگہ "خاک اڑانا" چھپ گیا۔ صفحہ ۲۳ پر سلمان خمیدی کی نظم کے پہلے مصرع کے شعر میں "ہیں" اُڑ گیا ہے اور تیسرے مصرعے میں "بھی" کی جگہ "تھے" چھپ گیا ہے۔

آئندہ شمارے میں

(مارچ ۱۹۷۴)

مقالے

اردو نثر میں سرسید کے طرزِ تحریر کی اہمیت — پروفیسر محمد [illegible] صدیقی

عہدِ مغلیہ میں شمالی ہند کی زبانیں — ڈاکٹر ستیہ پال [illegible]

ایک قدیم ڈراما — صولتِ عالمگیری — ابراہیم یوسف

افسانے

درگاہ کے دروازے پر (کشمیری) — تاج بیگم

مجبور — رضاء الجبار

پرایا غم — قیوم خالد

سیڑھیوں کی گفتگو — خاستو اسمو فسکی، ترجمہ: نسیم فاروقی

خاکہ

کنور چاند پوری — شخصیت اور فن — ڈاکٹر شفقت جعفری

انشائیہ

ہڑتال — اعجاز علی ارشد

مزاحیہ ڈراما

پولیس انسپکٹر — سید مظفر برنی

نظمیں

متین سروش - فرحت کیفی - یعقوب راہی - ماہر منصوری

غزلیں

لال چند پرارتھی چاند - کاوش بدری - عشرت دھولپوری، بھگت پرتاب گڑھی - حیات وارثی - شوکت پردیسی، الفت ادیب - خالد کشفانی - اقبال قاہر، نقیب اکبر - اختر مسعود پوری - عابد امام زیدی۔

مکتوبات، نقد و نظر، محفلِ اپنی، رفتار

رفتار

غالب کے اُردو فارسی کلام کا ایک اہم انتخاب

اُردو کے مشہور و ممتاز ادیب ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے غیر ملکی پڑھنے والوں کے لئے غالب کے اُردو فارسی کلام کا ایک بہترین انتخاب کیا تھا۔ اب یہ انتخاب فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ بڑے اہتمام سے نہایت خوبصورت طبع ہوگیا ہے۔ اس کی کتابت مشہور خوشنویس عبدالسلام حیدرآبادی نے کی ہے۔ یہ انتخاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت پندرہ روپے ہے۔ ظ۔ انصاری کی کتاب "غالب شناسی" کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا ہے۔ اس کی قیمت پانچ روپے ہے۔ قارئین "شاعر" دونوں کتابیں مکتبہ قصر الادب سے منگا سکتے ہیں۔

ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک صحافی کو اعزاز

صدر جمہوریہ نے مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی، ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر قاضی عبدالستار، ریڈر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور ممتاز صحافی حشرت علی صدیقی ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ کو یوم جمہوریت کے موقع پر "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا۔ ادارۂ "شاعر" ان تینوں حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

رضا لائبریری رامپور کو دس لاکھ روپے کی امداد

مشرقی زبانوں کی مشہور لائبریری "رضا لائبریری رامپور" کو قومی اہمیت کا ادارہ تسلیم کرتے ہوئے وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے اُس کی مزید ترقی کے لئے دس لاکھ روپے کی امداد منظور کی ہے۔

علی سردار جعفری پر تحقیقی مقالہ

امراوتی کالج کے پروفیسر محمد داؤد کشمیری کو اُن کے تحقیقی مقالے "علی سردار جعفری۔ حیات اور فن" پر بمبئی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی کل ہند کانفرنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کی وہ کانفرنس جو جنوری میں ملتوی ہوگئی تھی اب ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ مارچ [illegible] کو گاندھی درشن، رنگ روڈ دہلی میں منعقد ہو رہی ہے۔

قومی راج کے [illegible] کی تقریب

۳۰ جنوری کو حکومت مہاراشٹر کے پندرہ روزہ رسالے "قومی راج" کے اجراء کی تقریب [illegible] انڈیا [illegible] کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔ جناب ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر صحت حکومت مہاراشٹر نے اس تقریب کی صدارت فرمائی اور [illegible] مہاراشٹر نے اس اُردو رسالہ کا افتتاح فرمایا۔

شری ایس بی پوار، وزیر ریاست برائے داخلہ و پبلسٹی مہاراشٹر [illegible] ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، جناب خواجہ عبدالغفور سکریٹری [illegible]، [illegible] نے تقاریر کیں۔ اس کے بعد مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جناب سکندر علی وجد نے کی۔

مشہور صحافی سید انیس الرحمٰن کا انتقال

افسوس کہ ۱۲ جنوری کو دہلی میں مشہور پرانے صحافی سید انیس الرحمٰن مدیر روزنامہ "ملک و ملت" اور ہفت روزہ "پرچم ہند" کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک قوم پرست مسلمان تھے۔ جنگ آزادی کے دوران کئی بار انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سب سے پہلے انھوں نے الہ آباد سے رسالہ "زندگی" نکالا تھا [illegible] سے روزنامہ "شعیب" جاری کیا۔

حضرت امجد نجمی کی وفات

یکم فروری ۱۹۷۴ء کو اڑیسہ کے بزرگ اُردو شاعر اور رسالہ "شاخسار" کٹک کے مدیر حضرت امجد نجمی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک پختہ مشق شاعر تھے۔ اُردو کے متعدد رسائل میں اُن کا کلام شائع ہوتا تھا۔ "جوئے کہکشاں" کے نام سے اُن کا مجموعہ بھی شائع ہوا، لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت اُن کی اُن خدمات کی ہے جو اُنھوں نے اُردو زبان و ادب و شعر کے سلسلے میں صوبۂ اڑیسہ میں انجام دیں۔ اُن کے متعدد شاگرد ہیں، جن میں کرامت علی کرامت جیسے ممتاز نقاد اور شاعر بھی ہیں۔ حق مغفرت کرے، [illegible] اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے۔

مہجور شمسی کا انتقال

(چھپتے چھپتے) یہ اطلاع [illegible] بہار کے مشہور شاعر مہجور شمسی کا ۸ فروری ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوگیا۔

مالک، پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اعجاز صدیقی نے یونیورسل نائن آرٹ لیتھو ورکس ۳۰ نور روڈ [illegible] شاعر دفتر بمبئی ۸ میں چھپوا کر [illegible] شائع کیا


strength is in our people
much as in our steel—
because man does not live
alone, we carefully
at Jamshedpur his
for music, dance and
expressions of the
spirit.
STEEL



اردو ... کا ماہنامہ

شاعر بمبئی

مُدیرِ اعلیٰ: اعجاز صدیقی

مُعاونین: چندر ناتھ، ڈاکٹر محمد حسن

جلد ۴۵ — مارچ ۱۹۷۲ء — شمارہ ۳

تصویرِ سرورق —— تاج بیگم

زرِ سالانہ —— ... روپیے
معاونین —— ...
تا عمر خریداری —— ...
ممالکِ غیر سے —— ...

فون: ۳۵۹۹۰۶

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر پوسٹ بکس نمبر ... بمبئی ۴۰۰۰۰۸

جرعات

اِنقلاب و اِنقلاب و اِنقلاب ـــ !

ہر گلا سڑا اور ناکارہ نظام تبدیلی چاہتا ہے۔ لیکن اس کے کچھ آداب، اُصول، ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں۔ تبدیلیاں یُوں ہی ہو نہیں جاتیں، انقلاب آسانی سے نہیں آیا کرتا۔ اس کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ زندگی موت سے کھیلتی ہے اور خطروں میں بے دھڑک کُود جانا ہوتا ہے۔ خواص تو ہمیشہ اپنے محلوں کے دریچوں ہی سے جھانکا کرتے ہیں۔ سرمایہ داری سر فروشوں کے ہاتھوں پر چند سکّے تو رکھ سکتی ہے، لیکن خود انگلی تک نہیں کٹوا سکتی۔ گولیوں سے سینے تو عوام ہی کے چھلنی ہوتے ہیں۔ تحریکیں عوام ہی سے پنپتی، آگے بڑھتی اور کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ حالات کا دباؤ "ہوا کے دباؤ" ہی کی طرح ہوتا ہے۔ جب صبر و ضبط کے باندھ ٹوٹ جاتے ہیں تو جذبات کے دھارے سمندر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ پھیلتے ہیں اور پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں، انہیں روکا نہیں جا سکتا۔ ان کا ایک رُخ ہوتا ہے، مقصد ہوتا ہے، منزل ہوتی ہے۔ یہ اندر سے پھوٹتے ہیں، بہت گہرائی سے، اُوپر سے نہیں۔ آتش فشاں کھولتے رہتے ہیں اور بالآخر کوئی لاوا اُبلنے لگتا ہے، اُچھلنے اور بہنے لگتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ کسی میں ہمّت نہیں ہوتی کہ اُسے روک سکے۔ انقلاب کے محرکات اگر صحیح اور تیز ہوں تو وہ آ کر رہتا ہے۔

ایک چوتھائی صدی سے زیادہ مدّت تک کھولتے رہنے کے بعد ہندوستانی عوام کے سینوں سے لاوا پھوٹنے لگا ہے۔ حالات کے جبر نے عوام کے دل و دماغ کو بے قابو کر کے رکھ دیا ہے۔ اُن سے کئے گئے وعدے اپنا بھرم کھو چکے ہیں۔ یہ ایک ایک "نانِ جویں" کے لئے ترسا دیئے گئے ہیں۔ دو روپے کے ایک سیر "جَو" یہ کیسے خریدیں؟ نہایت کم مقدار میں زہریلے، غیر صحت بخش اور انتہائی گراں موٹے اناج اور سڑے ہوئے گندم سے پیٹ کی آگ کس طرح بجھائیں؟! اعلیٰ قسم کے گندم، چاول، پھل اور انواع و اقسام کی بہترین مُلکی پیداوار سے مقامی سرمایہ دار طبقے اور بیرونی ممالک کے زرِ مبادلہ دینے والے لوگ تو لُطف اندوز ہوں اور ہم غریبوں کے حصّے میں صرف ٹھوکریں، آہیں اور کراہیں آئیں۔ ہم اپنے بچّوں کے خالی پیٹ کی شکایت کریں تو گولیوں کا نشانہ بنیں ـــ!!

ادب کا سب سے اہم موضوع اُس کا اپنا عصر ہی ہو سکتا ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے سماج اور معاشرے سے کوئی الگ شئے تو نہیں ہے۔ ایک حسّاس، دردمند اور گداز دل رکھنے والا شاعر و ادیب درد و غم کی سجی ہوئی دوکانوں سے آنکھیں بند کر کے کس طرح گذر سکتا ہے؟ بھوک، افلاس، بیماریاں اور ناداریاں جب دروازے دروازے جھانک رہی ہوں، بستی بستی اور چوکھٹ چوکھٹ ایک ہاہا کار مچی ہو تو اسے کیونکر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ غالب بھی اگر اس دَور میں ہوتے تو اپنی فلسفیانہ فکر کو عوامی رنگ دینے پر مجبور ہو جاتے۔ وہ ـــ "مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" والی شاعری یقیناً بھول جاتے۔ "رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے" کی اُنھیں تمنّا نہ ہوتی۔ اقبال نے تو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کی بات اُس وقت کہی تھی جب گندم ایک روپیہ میں بیس پچیس سیر ملتا تھا۔ وہ بھی اگر آج ہوتے تو عوام کی صفوں میں شامل ہو کر ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے پر مجبور ہوتے۔

میاں نظیر اکبر آبادی نے کتنی سچی بات کہی ہے۔

روٹی نہ پیٹ میں ہو، تو پھر کچھ جتن نہ ہو — میلے کی سیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو — سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

۵ر مارچ ۷۴ء
(بستر علالت سے)

شاعری

متین سروش

سوداگرانِ اجل کی آواز

یہ روشنیٔ غم کی پہچان کس لئے ہے
انوارِ آگہی کا عرفان کس لئے ہے

بے سود ساری باتیں آرائشِ چمن کی
یہ مسکراہٹوں کا سامان کس لئے ہے

کیوں شاخِ گل پہ تازہ تعمیرِ آشیاں ہو
تشکیلِ بزمِ نو کا ارمان کس لئے ہے

موجِ شمیمِ گل کا کیا کام ہے چمن میں
زندہ حقیقتوں پر ایمان کس لئے ہے

مُردہ دِلوں میں کیسے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں
یہ جرأت و جسارت یہ شان کس لئے ہے

فاقہ کشوں میں ہمت آئی ہے یہ کہاں سے
افکارِ نو یہ ایسا ایقان کس لئے ہے

کیوں بج رہا ہے ڈنکا اقدارِ حریت کا
اتنا عظیم آخر انسان کس لئے ہے

اصرار کیوں ہے اتنا چارہ گریٔ غم پہ
جمہوریت کا ایسا فرمان کس لئے ہے

الفاظ بھی حسیں ہیں وعدے بھی خوشنما ہیں
پھر یہ بغاوتوں کا طوفان کس لئے ہے

شوریدہ سر یہ کیسی بے خود جوانیاں ہیں
بیداریٔ جنوں سے پیمان کس لئے ہے

زاغ و زغن وہی ہیں چہرے بدل گئے ہیں
رنگین داستاں کا عنوان کس لئے ہے

ہم موت کی تجارت کرتے رہے ازل سے
کر دیں گے تم کو عاجز فنکاریٔ عمل سے
ہر دور میں بہایا ہے یوں خونِ آدمی کو
رنگیں بنا دیا ہے رُخسارِ کشتگی کو
رقصاں رہیں گی یوں ہی انساں کا خون ارزاں
چھینے گا کون ہم سے یہ مسندِ بہاراں
وہ تو یہ تو ہماری دانش نے روپ دھارے
تیغِ ستم حسیں ہے انصاف سے ہمارے
آہ و فغاں عبث ہے فریاد بے محل ہے
ہنگامۂ تمنا ذہنوں کا اک خلل ہے
اِس سیلِ بے کراں سے کوئی مفر نہیں ہے
یہ ظلمت ہے وہ جس کی کوئی سحر نہیں ہے

پروفیسر مبشر علی صدیقی

اُردو نثر میں سرسید کے طرزِ تحریر کی اہمیت

سرسید سے پہلے اُردو نثر میں انشائے مادھو رام اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کی نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ سرسید نے خود "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن مقفیٰ و مسجع نثر میں لکھا تھا لیکن دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے اپنا مروجہ طرزِ تحریر جو سلیس اور روزانہ کام میں آنے والی نثر میں تھا استعمال کیا۔ اس طرح اس کتاب کو جس میں دہلی کی تاریخی عمارتوں کا حال تھا پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھ گیا۔ اُن کے سامنے غالب کے خطوط کی نثر کے نمونے بھی تھے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ غالب کے طرزِ تحریر سے ایک حد تک متاثر ہوئے ہیں۔

سرسید کے مضامین ایک موضوع پر نہیں ہیں، بلکہ قریب قریب ہر موضوع پر ہیں۔ جو تحریک اُن کے ہاتھوں سے وجود میں آئی اُس کے شعبے مختلف تھے۔ ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت اور مذہب۔ ان سب دائروں میں سرسید کی تحریک کا اثر ظاہر ہوا۔ لیکن بنیادی پہلو مذہبی اصلاحات ہے۔ اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کرنا کہ اُن کا نصب العین اچھی طرح واضح ہو جائے اور معترضین کا رد ہو سکے، یہی سرسید کی تحریر کا مقصد تھا۔ اُردو ادب سے اُنھیں براہِ راست دلچسپی نہ تھی لیکن اُن کی کوششوں سے یہی ادب زیادہ مالا مال ہوا۔ اپنے مقاصد کے اظہار کے لئے اور عوام تک اُسے پہنچانے کے لئے صاف اور سادہ زبان میں لکھنا ضروری ہے۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین اس کے شاہد ہیں۔ تہذیب الاخلاق تقریباً ½۱۱ سال تک شائع ہوا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اُردو زبان کی خدمت و اصلاح اُس کی ہر تحریر سے ہوئی۔ اُس کی مخالفت اور موافقت کی بنا پر اُس کا اجراء کیا گیا اور چند ہی سال میں ایک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مضمون نگاروں میں ممتاز نام خود سرسید کا ہے۔ بقیہ مضمون نگاروں میں چراغ علی، ذکاء اللہ، محسن الملک، الطاف حسین حالی اور وحید الدین سلیم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے ایک شمارہ میں لکھتے ہیں: "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں تک رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تُک بندی سے جو اُس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔" (تہذیب الاخلاق۔ اختتام سال ۱۲۹۱ھ و شروع سال ۱۲۹۲ھ)

سادہ زبان میں لکھنا اُن کے طرزِ تحریر کی پہلی خصوصیت ہے۔ حالی کے الفاظ میں اُن کے یہاں "وہ متعارفہ خوبیاں نہیں ملتیں جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں"۔ چنانچہ اُن کی تحریر تشبیہ و استعارات سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور لفظی تراش خراش سے خالی ہے۔ مگر اُن کی سادگی، خلوص اور جوش ان چیزوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔ سرسید تحریر و تقریر میں الفاظ کی تراش [illegible]

کرتے تھے۔ وہ گرامر کی پابندی سے آزاد تھے۔ وہ غلط فہم لفظوں کی بجائے لوگوں کی زبان پر جاری ہوں صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی زبان دہلی کی بول چال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ جو جملہ اور لفظ قلم سے ٹپک گیا اُن کے لئے کافی تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ انہوں نے طویل طویل جملے لکھے لیکن یہ سب اس لئے کیا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں ادا ہو جائے۔ جو کچھ تعلق ہو مضمون کے ادا میں ہو تاکہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ غالباً انہوں نے کسی لفظ کا استعمال کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ اہلِ زبان ایسا مانتے ہیں یا نہیں۔ سرسید قواعد کے محکوم نہیں تھے۔

دوسری خصوصیت اُن کا طرزِ استدلال ہے۔ جہاں تک اُن سے ہو سکتا ہے وہ اپنے مخاطب سے بحث کرتے ہیں اور منطقی دلائل سے اُسے قائل کرنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ علمی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں یا کسی علمی نکتہ کو بیان کرتے ہیں یا کسی آیت کی تفصیل کرتے ہیں۔ اُس وقت جذبات آرائی کے بجائے استدلال سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا استدلال کہیں کہیں غلط بھی نکلتا ہے۔ مگر عام طور پر وہ یہی چاہتے ہیں کہ اپنی شخصیت کے بجائے اپنے دلائل سے مخاطب کو اپنی طرف کریں۔ انہوں نے کبھی رسم و رواج کے نقصانات دکھلائے ہیں اور کبھی مغربی تہذیب کے فوائد بیان کئے ہیں۔ کبھی کھانے کے طریقے کی وضاحت کی ہے۔ کبھی ہیئت اور طبعیات کے مسائل حل کئے ہیں اور ہر موضوع کے اعتبار سے ویسے ہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اُن کا عام انداز بیان بھی سلیس ہے۔ سادگی، صفائی، استدلال کا دامن وہ کبھی نہیں چھوڑتے اور موقع و محل کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر اُن کے مضامین آدم کی سرگزشت، امید کی خوشی، بحث و تکرار اور طریقۂ تناول و طعام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

سرسید اُردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ اُن سے پہلے ہمارے ادب میں ایسے (ESSAY) کا وجود نہ تھا۔ تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مختلف اخبارات و رسائل میں سرسید نے بے شمار مضامین لکھے گویا نہ صرف ادب میں ایک نئی شاخ کی بنیاد ڈالی بلکہ اُسے پروان بھی چڑھایا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے ٹھیک کہا ہے "ادب کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں میں طے کر دئے جائیں۔ یہی سلاست سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی"۔

سرسید کا طرزِ تحریر سنجیدہ اور متین ہے اور اُردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کا کام کرتا ہے۔ سنجیدہ مضامین سے بحث کرتے ہیں اور سنجیدہ طبقہ سے مخاطب ہیں لیکن طبیعت میں ایک ہلکا سا مادہ ظرافت کا بھی ہے۔ یہ ایک لطیف طنز سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرسید پر جو اعتراضات اُن کے مخالفین نے کئے تھے اُن کا جواب دینے میں وہ اسی طنز سے کام لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تہذیب الاخلاق" کے وہ مضامین پڑھے جا سکتے ہیں جو ہر سال کے شروع میں انہوں نے لکھے تھے۔ سرسید کی تحریک گویا ہندوستان میں مغربی اثر کے رواج دینے کے لئے نکلی تھی۔ اُنکے طرزِ تحریر میں بھی مغربی اثر نمایاں ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا بیجا استعمال کرتے ہیں، اگرچہ اُردو کے مترادف الفاظ آسانی سے مل سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے انگریزی الفاظ کو ترجیح دی۔ نئی زبان کے الفاظ اپنی زبان میں لینا اصولاً بُرا نہیں کہا جا سکتا؟ لیکن اس سلسلہ میں یہ معیار رکھنا چاہئے کہ اپنے الفاظ کو چھوڑ کر اور اُن کے ہوتے ہوئے غیر زبان کے الفاظ لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے الفاظ خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ تہذیب کی جگہ سویلیزیشن، سیرت کی جگہ لائف، مواد کی جگہ میٹریل بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سرسید کا طرزِ تحریر حالی کے یہاں جا کر ایک ادبی شان دکھاتا ہے۔ مگر انگریزی [illegible] کا استعمال وہاں اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ حالی نے سرسید کو فادر آف اُردو کہا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ موجودہ ترقی اُن ہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے۔ تحریر کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُسے شوق اور توجہ سے پڑھتے ہیں اور اُن کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔" سرسید کے طرزِ تحریر کے نمونے اُن کے چند مضامین سے پیش کئے جاتے ہیں۔

مضمون تعلیم میں لکھتے ہیں۔ "مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ۔ اِن میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں، پر خوفناک۔ اُن میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں [illegible] نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زُور

تیار کر سکتا ہوں لیکن مجھے مصالحہ چاہیئے اور یہ سامان دیں کے تعمیر سے ملے ہوئے۔ ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔ بس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی قوتیں کا مل تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔

"آثار الصنادید" میں قطب صاحب کی لاٹھ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"اس عمارت کی رفعت اور شان اور بلندی اور خوشنمائی کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت میں یہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمین پر اپنا مثل نہیں رکھتی۔ نقل مشہور ہے کہ اگر اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھو تو ٹوپی والے کو ٹوپی اور پگڑی والے کو پگڑی تھام کر دیکھنا پڑتا ہے۔ جس لاٹھ پر سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آدمی ننھے ننھے ہاتھی گھوڑے دکھائی دینے سے عجب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح نیچے والوں کو اوپر کے آدمی بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ غرضکہ یہ لاٹھ عجائب روزگار سے ہے۔"

"امید کی خوشی" میں لکھتے ہیں۔

"ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں کر کرا محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر اپنے سب کا ہمدردی کرتے ہیں پر کوشش کچھ لے سے الگ کر کے دل ہر وقت بیقرار ہے، کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے، تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے۔ تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہونچیں گے۔ تیرے ہی سبب گو ہر مراد کو پائیں گے"

"بحث و تکرار" کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے . . . . نا مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے . آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں، ہاتھا پائی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔"

غزلیں

ظہیر غازی پوری

بکھرتے کھول ہیں رنگِ حنا ہیں اہلِ خرد
کہ دشتِ فکر کی تازہ ہوا ہیں اہلِ خرد

ہوا کی زد پہ شکستہ سے سائبان نہیں
فصیلِ ذہن، مدارِ بقا ہیں اہلِ خرد

یہ اشتہار نہیں داغدار چہروں کے
متاعِ حسنِ نظر، آئینا ہیں اہلِ خرد

بلندیوں کی امانت ہیں پستیوں کا وقار
یہ برگ و شاخِ درختِ انا ہیں اہلِ خرد

ہم اپنے عہد کی تاریخ سے ہیں شرمندہ
کہ جلتے جسم شگفتہ چتا ہیں اہلِ خرد

یہ سنگ دعوت کو اعجاز بخش دیتے ہیں
مزاجِ فن ہیں، لبِ ماجرا ہیں اہلِ خرد

بہوں پہ آیا دہ آشوبِ آگہی کا گلہ،
مگر یہ سچ ہے کہ زخمی صدا ہیں اہلِ خرد

ظہیر فکر و نظر کے زوال کے باعث،
بڑے عذاب میں اب مبتلا ہیں اہلِ خرد

لال چند پرارتھی چاند

خوشی کی بات مقدر سے دور ہے بابا
کہیں نظام میں کوئی فتور ہے بابا

بھری بہار میں ہر شخص ہے الم بہ کنار
تو ہی بتا کہ یہ کس کا قصور ہے بابا

شکستہ جام لئے ہیں مگر اہلِ خرابات
کہ لوگ دیکھیں یہ مے کا غرور ہے بابا

گھٹائیں پی کے بھی صحرا کی پیاس دکھاتا ہے
نہ جانے تشنگی میں کیا سرور ہے بابا!

جو سو رہا ہے لپٹ کر انا کے دامن سے
جگا کے دیکھ یہ میرا شعور ہے بابا

یہ خیر و شر کا تماشہ، یہ رقصِ لیل و نہار
کوئی ادا پسِ منظر ضرور ہے بابا!

یہ تیرا حسنِ تنوع، یہ تیرا عکسِ جمیل
ڈھلا ہوا کوئی سانچے میں نور ہے بابا

چھپا چھپا کے رکھوں بھی اسے کہاں لے جاؤں
یہ زندگی تو کسی کے حضور ہے، بابا!

کہانی
(کشمیری)

تاج بیگم

درگاہ کے دروازے پر

تاج بیگم

۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئیں۔ یہ وہی دن تھا جب کشمیری عوام نے شخصی حکومت کے خلاف پہلی بار علم بلند کیا اور دو درجن لوگ مہاراجہ کی فوج کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ اس کے بعد یہ جدوجہد آزادی اُس وقت تک جاری رہی جب تک کشمیر سے شخصی حکومت کا خاتمہ نہ ہو گیا۔ تاج بیگم کا سارا خاندان اس جدوجہد آزادی میں شریک تھا۔ اُن کے عزیزوں نے لمبی قیدیں کاٹیں۔ ہر ایجی ٹیشن میں اُن کے گھر کی تلاشی لی جاتی رہی تاکہ انڈر گراؤنڈ لیڈروں کو گرفتار کیا جا سکے۔

تاج بیگم ایسے ماحول میں پلیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستانی حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے زنانہ رضاکارانہ فوج بنی تو تاج بیگم نے اُس میں حصہ لیا اور باقاعدہ فوجی تربیت حاصل کر کے زنانہ فوج کی اہم رکن بنیں۔

ان کی ابتدائی تعلیم سرینگر میں ہوئی۔ اُنھوں نے ابتدا ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کئی اخباروں اور رسالوں میں لکھتی رہیں اور پھر بارہ سال تک سرینگر ریڈیو سے منسلک رہ کر زنانہ پروگرام کے کشمیری سیکشن کو چلاتی رہیں۔

تاج بیگم نے کشمیری زبان میں بہت سی کہانیاں لکھیں اور کشمیری افسانہ نویسوں کی صفِ اوّل میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اُن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "الاوٗ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس پر جموں و کشمیر اکاڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز نے اُنھیں ایک ہزار روپیے کا انعام بھی دیا۔

اُن کی کہانیوں کا موضوع عموماً یا تو محنت کش عوام ہیں یا وہ اونچے طبقے کی بناوٹی زندگی کی تصویر کشی کرتی ہیں جس کی وجہ سے لوگ اُنہیں کشمیر کی "عصمت چغتائی" کہتے ہیں۔ اُن کی تحریر بیباک اور بے لاگ ہوتی ہے۔ زبان وہی عورتوں والی گھریلو ہے جس میں سادگی اور تازگی بھری ہوئی ہے۔ تاج بیگم کشمیر کلچرل کانگریس کی نائب صدر ہیں۔

"درگاہ کے دروازے پر" اُن کے نمائندہ افسانوں میں سے ایک ہے۔

صبح صبح ہی شور محلّہ میں جاگ گئی۔ درگاہ کے دروازے پر پاگل "یاہو" گرج رہا تھا۔ سونٹا ہاتھ میں لئے کبھی اِدھر جاتا کبھی اُدھر آتا۔ کچھ گالیاں اپنے آپ کو اور کچھ دوسرے پاگلوں کو دیتا۔ کچھ پاگل نورخاں کے دروازے پر اور کچھ چبوترے کے آس پاس دبکے بیٹھے تھے۔ اُن میں سے دو کو یاہو پگلے نے پکڑ لیا تھا۔ جتنا اُس سے ہو سکتا تھا اُتنا انھیں سونٹے سے پیٹ رہا تھا۔

"میں نے تم سے کہا نہیں کہ روٹیاں نہ لو جیسے لو — اور تم سے یہ نہیں کہا کہ پاس پاس نہ بیٹھو دور دور بیٹھو۔ اور جب بیٹھو تو مُنہ قبلے کی طرف کرو —؟"

پاگل یاہو درگاہ کے دروازے کے پاگلوں اور بھکاریوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اپنی جگہ اُسے احساس تھا کہ وہ اُن سب کا سردار ہے۔ چنانچہ وہ جس کو جی چاہتا پکڑ لیتا اور حکم دیتا۔ سب پاگل اُس سے ڈرتے تھے۔ ہر ایک بھکاری اُس کے لئے کچھ نہ کچھ بچا رکھتا۔

یاہو دوپہر تک ایک سڑک کے بعد دوسری سڑک پر گھومتا۔ شور کرتا۔ خوفناک انداز میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوا گورنر اور حکام کو گالیاں دیتا۔

"ہت تمہارے گورنر کی لڑکی کی . . . . تمہارے حاکم کی ماں کی . . . کبھی کبھی وہ کسی فرضی دشمن کو گالیاں دیتا: "جا سالے حاکم کے پاس جا۔ وہ میرا کیا بگاڑے گا۔؟ میں نے کچھ اُس کا کھایا ہے۔"

یاہو کا یہی کام تھا۔ صبح سے دوپہر تک گھومنا اور گالیاں دینا۔ چار ہزار گالیاں دیں اور درگاہ کے دروازے پر واپس آ گیا: "ارے تمہاری . . . !" جوں ہی یہ آواز سنائی دیتی، پاگل دُبک جاتے۔ یاہو ایک کونے میں جگہ پر جیسے پہرہ دار چوکی پر بیٹھ جاتا اور گالیاں بکتا شور مچا دیتا۔ یہاں تک کہ اُس کے منہ سے جھاگ گرنے لگتے اور گالیاں دیتے دیتے پاگلوں پر سے وہ پھیرے کرنے لگتا جو ایک بلّی کی [illegible]

سونٹا تو پاپو کے سہارے ٹکا دیتا۔ اور سو سو بار خدا کے حضور میں سجدے کرتا۔ پھر وہ ایک طرح کا گھٹیری جیسا سر پکارتا اور پھر گانا شروع کر دیتا — "سکم — جاؤ جاؤ کس کے پاس!"

ایسا محسوس ہوتا جیسے پاگل پاپو کسی حالت میں پہنچ کر کے آیا ہے۔

"اری شندری — شندر پگلی —" بارہ من کی گالی پاپو شندر پگلی کو دیتا۔ "تجھیں کیا ہو گیا ہے پاس مال کا ... تجھیں کیا گھر میں بیٹھے اپنی پالو لڑکو موٹا کرنا ... !"

اور پھر گالیوں کا کوئی حساب نہ رہتا، شندری چلاتی
"ارے موت آئے تجھے۔ مجھے گالیاں کیوں دیتا ہے؟
اب لگی نہ مجھوک تجھی تو!"
"ارے مجھوک کی بچی۔ بک بک کیوں کرتی ہے۔ سالی تو نے یہ بھی خیال کیا کہ یہ سالا کام پر گیا ہے۔ اُسے تو کھانا تو پہنچنا چاہیئے۔"

شندری لڑھکتے لڑھکتے کھڑی ہوتی۔ کیونکہ اس کی ٹانگوں میں کوئی مرض ہو گیا تھا۔

"مجھ پر دارا جائے۔ آج مجھے ہی تنگ کرنے پر تلا ہے۔"
"آج تم ہی اُسے پسند آئی ہو۔" دوسری پگلی کہہ اُٹھی۔ !
"چپ ہو جاری۔ نہیں تو میں ابھی تیرے تنکے اٹھا کر رکھ دوں گی"
شندری نے کہا۔

شندری نے وہ سب کچھ اکٹھا کیا جو اُنھوں نے پاپو کے لئے رکھا تھا۔ سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے، ہری مرچیں، بھات اور جھوٹے سیبوں کے ٹکڑے اور پاپو پاگل کے سامنے رکھ دیا۔

"اری سالن میں آج نمک زیادہ پڑا ہے۔" وہ جھوٹا بھات کھاتے کھاتے چیخ پڑتا۔

"یہ تو آج تمہاری بہن نے پکایا ہے۔" شندری نے مُنہ بنا کر جواب دیا اور پاگل زور زور سے ہنس پڑے۔

درگاہ کے دروازے پر ہی کوئی بیس پاگل اور پگلیاں رہیں کچھ ان میں سے دیہاتی ہیں اور کچھ شہری۔ پگلیاں رات کو درگاہ کے ایک کمرے میں رہتی ہیں۔ جو عورتوں کے لئے بنوایا گیا ہے۔ اسے نور خانہ کہتے ہیں۔ پگلے درگاہ کی مسجد میں رہتے ہیں۔ ان کا کام کاج صبح کو شروع ہوتا ہے۔ جوں ہی اذان ہوئی یہ سب نیند سے جاگ جاتے ہیں اور درگاہ کے بڑے دروازے کے دائیں بائیں یا درگاہ کے چنار کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ زیارت کے لئے آیا ہوا کوئی بھی شخص انھیں کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے۔ صبح نو بجے تک یہ یہیں بیٹھے ہیں روز ہی یہ شور چاروں طرف سُنا جاتا ہے۔

"اندھے کو کچھ دو۔ خدا کے نام پر کچھ دو۔!"
"ارے بھائیو میں اپاہج ہوں۔ مجھے کچھ دیدو!"
"ارے بھائیو مجھ غریب بیوہ کی مدد کرو۔ خدا تمہارا بھلا کریگا!"
"اری بہن۔ تیری من کی مُراد پوری ہوگی۔ مجھ کمزور کو کچھ دیتی جاؤ"

نو بجے کے بعد یہ پگلے ایک دوسرے سے چُپ چاپ کرپیسے گنتے۔ کچھ نور خاں کے غسل خانے میں داخل ہوتے اور ان پیسوں کی پوٹلی بناتے، جو ان کی کمر سے بندھی رہتی۔ اس کے بعد یہ ٹڈیوں کی طرح آس پاس کے محلّوں میں پھیل جاتے۔ اور لوگوں کے یہاں جا کے بیٹھتے۔ دن بھر اسی طرح مانگتے رہتے۔ لیکن اُن کی چوپال یہی درگاہ کی ڈیوڑھی ہوتی۔

ایک عجیب بات ہے کہ جو کچھ یہ پاگل دن بھر اکٹھا کرتے وہ درگاہ کے مجاور احمد صاحب کے حوالے کر دیتے، احمد صاحب ویسے تو مجاور ہیں لیکن ان بھکاریوں کے خزانچی بھی ہیں۔ اُن پر بھکاریوں کو اتنا اعتماد ہے کہ وہ سب کچھ اکٹھا کیا ہوا اُن کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ احمد صاحب نے ایک رجسٹر بنا رکھا ہے۔ وہ کاغذ قلم لئے ہوئے شام کو صحن میں آتے ہیں۔ پاگل اُن کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک سب کچھ اُن کے سامنے رکھتے جاتے ہیں۔ احمد صاحب رجسٹر کھولتے ہیں، اُس کے بعد ہر ایک بھکاری کے پیسے گنتے ہیں پہلے ہر پاگل انھیں اپنی مرضی سے دو دو آنے دیتا ہے۔ اُس کے بعد جو جاہیں، پاگلوں کے ناموں میں درج کر دیتے ہیں۔

سب پاگل ساٹھ آنوں سے اسّی آنوں تک روزانہ جمع کر لیتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں گنتے وقت یہ تیس چالیس آنے رہ جاتے ہیں۔ کسی وقت اگر کوئی پاگل دبی زبان سے احمد صاحب سے کہتی — "حضور تم پر واری جاؤں۔ ذرا ٹھیک سے گن دو۔"

"تمہیں بھی کیا بھلائی کرنے کو اب یہ اصل ہی تم لوگ گندے ہو"
"میری جان آپ پر بچی اور عشق یاسمین تو میں نے نہیں کہا۔"
"پھر کیا میں جھوٹ ہے"

سامنے پاگل جس الزام لگانے والے پاگل کو تیلیوں کی طرح دھو لیتے۔ اعوو صاحب ناراض ہو جاتے۔ رجسٹر اور قلم دور پھینک دیتے۔ پیسے گنتا چھوڑ دیتے۔ پاگل اُن کے قدموں پر لیٹنے لگتے۔ کان پکڑتے اور گذارشوں کے بعد اعوو صاحب پھر گننا شروع کرتے۔

اس طرح اعوو صاحب عوام کی سیوا کرتے ہیں۔ سنا جاتا ہے تقریباً چھ روپے روز وہ اس طرح کما لیتے ہیں۔ کام والے کا اُس کی محنت کیسے ضائع ہو سکتی ہے۔ مہینہ پندرہ دن کے بعد جب کسی پاگل کا رشتہ دار گاؤں سے آ جاتا ہے تو وہ پاگل اعوو صاحب کے پیسے لے کر اُسے واپس گھر بھیج دیتا ہے۔

ایک دن ایک پگلی سرپھری نکلی۔ اُس کی سمجھ میں آ گیا کہ اعوو صاحب کس طرح اُس کے پیسوں کا آدھوں آدھ کر لیتے ہیں اُس نے ایک نان بائی کی بیوی کے پاس اپنے پیسے جمع کرنا شروع کر دئیے۔ اُسے بھی رحم آ گیا اور پیسے رکھنے کے لئے تیار ہو گئی نان بائی کی بیوی ایک مٹی کا گولک لائی۔ اور اُس پگلی کو جو کچھ ملتا اُس میں ڈال دیتی۔ جب اعوو صاحب کو معلوم ہوا تو اُن کے غصے کی حد نہ رہی۔

ثور خانے سے ایک دن شور اُٹھا۔ لوگ دوڑ پڑے کچھ دیر کے بعد وہاں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ توبہ پڑھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"اگر پگلیاں بھی گریں تو وہ بھی کم ہیں۔ ثور خانے میں ایسے کام"
"ایسے لوگو، کہتے ہیں ملا پگلی ثور خانے میں اپنے یار کے ساتھ پائی گئی۔ دو پگلیاں گواہی دے رہی تھیں۔"
"یہ وہی ملا تھی جس نے نان بائی کی عورت کے پاس اپنے پیسے رکھنا شروع کر دئیے تھے۔ اُس کے بعد درگاہ کی ڈیوڑھی پر ملا کبھی نہیں دیکھی گئی!

کسی دن پگلیوں کی جب آپس میں لڑائی ہو جاتی تو کبھی محلے والوں کو فیصلہ کرنے آنا پڑتا۔ یہ لڑائی قبائلیوں کی لڑائی سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ سات آٹھ پاگل ایک طرف اور سات آٹھ پاگل دوسری طرف۔ کچھ سونٹے اُٹھا لیتے ہیں اور کچھ پیالے بجانے لگتے ہیں۔ پھر بندروں کی طرح ناچنے لگتے ہیں۔ ایک دن میں جھگڑے کا اختتام ہوتا ہے دوسرے دن پھر شروع ہو جاتا ہے۔ دن بھر گھوم گھام کر بھیک مانگ کر جب واپس ٹھکانے پر آتے ہیں تو پھر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔

ایک دن صبح صبح ہی سُندری پگلی نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

"مخدوم صاحب اُس کا پیٹ کاٹیں۔ جس نے میری چیزیں چرائی ہوں۔ تم نے اور دست لگ جائیں۔ تم غیر مرد کے ساتھ پکڑی جاؤ۔ ٹھاکر تمہارا پیٹ کاٹے آفت آئے تمہارے اوپر۔"

آخر مغلی نے چبارے کے نیچے سے کہا "اری تم سب کو کیوں گالیاں دے رہی ہو۔ اُسی کو گالی دو جس نے تمہاری چیزیں لی ہوں۔ سب کو کیوں بھگو نے ڈال رہی ہو۔"

"تو کیوں بُرا مانتی ہے۔ گالیاں کیوں نہ دوں۔ ڈیڑھ سیر چاول تھے۔"

"تو اُس کو گالیاں دے جس نے تیرے چاول چرائے ہوں۔ سب کو کیوں بُرا بھلا کہتی ہے۔"

"بدچلن تجھے کیوں بُرا لگتا ہے، تُو نے ہی ---!"

بس سُندری پگلی کا اتنا کہنا تھا کہ مغلی کھڑی ہو گئی۔ جیسے کوئی خطرناک ناگن ہو۔ ایک ہاتھ سے سُندری کے بال پکڑے اور گھسیٹنے لگی سُندری نے شور مچایا۔ سبھی پگلیاں اکٹھی ہو گئیں۔ لیکن مغلی کہاں چھوڑنے والی تھی۔ اُس نے اُسے سر بازار گھسیٹ لیا۔ پگلیاں پکڑنے دوڑیں جو سُندری کی سہیلیاں تھیں اُنھوں نے مغلی کو پکڑا۔ اور مغلی کی سہیلیوں نے سُندری کو۔ اس طرح ایک لڑائی چھڑ گئی۔

سُندری ثور خانے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ مغلی چبوترے سے اُونچی جگہ پر بیٹھ گئی۔ مغلی کی سہیلیاں مغلی کے پاس بیٹھیں۔ اور سُندری کی سُندری کے پاس!

بالوں کے ڈھیر لگ گئے پیالے ٹوٹ گئے [illegible]
ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ برتنیاں [illegible]

لوگ ڈر گئے۔ شنوری نے چیخ ماری۔
"بڈھا چاول چرانے والی کو دیکھو۔ چاول چرانے والی کو"
منگی کو پھر طیش آ گیا۔ وہ بولی
"بڈھو کیا تیرے منہ پر۔ بابو بنگلے کے تھپڑ بھلا گئی کیا۔
ارے بابو بنگلا آ رہا ہے" اس کے بعد وہ گالی گلوچ شروع
ہوئی کہ خدا کی پناہ۔

ایک پگلی نے اپنی ساڑھی سر سے باندھی اور پٹھان کا بھیس
بنا لیا۔ دوسری پگلی کو پکڑا اور اسکو اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ یہ دکھا رہی
تھی کہ اسی طرح شنوری کو قبائلی لے گئے تھے۔ دوسری پگلی
نے چیتھڑے پوٹلی میں باندھے جیسے کہ بچہ ہو۔!
"اری حرام کا بچہ دیکھو۔ اری زرینہ جلد دیکھو۔!"
یہ پگلی منگی کی طرف سے تھی۔ کچھ پگلیاں پیار کی باتیں
اور گالیاں بک رہی تھیں۔ پگلیاں نہ جانے کب تک لڑتی رہتیں!
بابو بنگلا چلا آیا۔
"ارے تمہارے گور نہ کی۔۔۔!"
اس کے ساتھ ہی تمام پگلیاں اپنے اپنے آپ میں دبک گئیں!

ایک دن ایک پگلی نے صبح اٹھ کر درگاہ کی ڈیوڑھی پر
پہلے ہی جگہ لے لی تھی جس سے زیارت کرنے والوں کی نگاہ
سب سے پہلے اسی پر پڑتی، چنانچہ آج اس پگلی کو کچھ زیادہ
پیسے مل گئے۔ ہر ایک پاگل اور پگلی کی یہی کوشش رہتی کہ وہ درگاہ
کی ڈیوڑھی پر آ بیٹھے، ایک تو پیسے کے لالچ سے، دوسرے
بابو بنگلے کے خوف سے۔ بدقسمتی سے درگاہ کے اندر سے ایک
پگلا نکلا اور اس پگلی کے پاس اس سے اوپر کی جگہ پر بیٹھ گیا۔
پہلے اس پگلی نے اس سے صلح کے انداز میں ہی بات کی اور
بھیک مانگنے کے اصول سمجھائے۔ مگر وہ ایک بات بھی نہ مانا
اور جب اس نے خاص طور سے دھیرے سے کہا کہ اسے
بابو بنگلے نے وہاں بیٹھنے کو کہا ہے تو وہ چپ ہو گئی۔
جب کئی زیارت پر آنے والوں نے اس پگلے کو پیسے دیئے اور پگلی کو
کچھ نہ ملا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اسے بابو کا بھی خوف
نہ رہا۔ اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مسجد میں جو لوگ نماز ادا

کر رہے تھے وہ بھی باہر آ گئے۔ ان کی نماز چھوٹ گئی۔ سارا ہنگامہ
ہو گیا۔ سبھی پاگلوں اور پگلیوں نے اس پاگل کو پکڑ کر مارنا پیٹنا
شروع کر دیا۔ کچھ جوتیوں سے اور کچھ سوٹیوں سے اسے پیٹ
رہے تھے۔ جب کوئی ان میں صلح نہ کرا سکا تو احمد صاحب باہر آئے
اور چلا کر بولے۔
"ارے کوئی ذرا بابو بنگلے کو تو بلا لاؤ"
یہ آواز سن کر سب چپ ہو گئے۔ خدا خدا کر کے لڑائی ختم ہو گئی،
لیکن بابو بنگلے کے خوف کے باوجود بھی یہ پگلی کہہ رہی تھی۔
"حضور یہ پگلا کہہ رہا تھا کہ آؤ میرے ساتھ شادی کر لو"
"ہائے ہائے" "آکاش دھرتی پر آ گرا" "اس کی اپنی ماں
بہن نہ ہو گی" دوسری پگلی کہہ رہی تھی۔
"اری کیا کہوں" "تین سال مجھے مانگتے ہو گئے مگر یہ مصیبت
میں نے کہیں نہیں دیکھی"
"یہ بھی کہیں بھیک مانگتا ہوا۔ اس کی گردن کٹے" پگلا کو
پگلی کہنے لگی۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ پگلی ساٹھ برس کی تھی نا، اس کی
نہ آنکھیں تھیں نہ ٹانگیں، اور یہ پگلا کوئی بارہ برس کا تھا۔ ذہنی
کیفیت نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اس کی ماں کے برابر
تھی۔ اور کیا کہا اسے۔ دیکھ لو اس کی سادہ زندگی۔

اسی طرح یہ درگاہ کی ڈیوڑھی کے پاس بھیک مانگتے جھگڑا کرتے
لڑتے اور زندگی کے دن گزارتے۔ خدا نہ کرے اگر اس میں
سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کا اپنا آپا ہوتا ہے یا اس کا خدا۔
بس بیمار ہونا اس پر مصیبت کا پہاڑ ہوتا ہے۔ بیمار کی دیکھ بھال
کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے سب پاگل اس سے دور
بھاگ جاتے ہیں۔ کسی کے دل میں اس کے لئے جذبۂ ہمدردی
نہیں رہتا۔ محبت مر جاتی ہے۔ جس طرح مرغ مرے ہوئے مرغ
کا گوشت کھاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی خوشیوں سے محروم یہ
زندگی گزارتے ہیں۔ اگر کسی کی موت ہو جاتی ہے تو دوسرے
لوگ چندہ اکٹھا کر کے اس کا کفن دفن کرتے ہیں۔ اس مرنے
والے کی کمر کی پوٹلی میں جو پیسہ ہوتا ہے مسجد کے کام آتا ہے۔

اسی طرح ایک مسافر کے پاس سے اُس کے مرنے کے بعد چار سو روپے برآمد ہوئے۔ لوگ جوق در جوق اکٹھے ہوئے۔ سبھی روپے دیکھنا چاہتے تھے لیکن مرنے والے پر کوئی دو آنسو بہانے والا نہ تھا۔ جیسے اُس کے روپیوں کی کوئی دوسری ہی شکل ہو۔!

میرے پاس عام طور سے اِن پاگلوں میں سے کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی وقت آ ہی جاتا ہے۔ ایک دن چار عورتیں ایک ساتھ آگئیں اور چائے پیتے پیتے انھوں نے اپنی بات شروع کی۔ تین کے خاوند مر چکے تھے، اور ایک کو اُس کے خاوند نے طلاق دے دی تھی۔

"تیرا خاوند کیسا تھا۔" اُس نے سر نیچا کر لیا۔ "دھت پاگل! اری کہو تو سہی، سبھی نے تو ایسا کیا ہے۔"

"کہو نہ اب اُسی کی قسم دیتی ہوں۔" دوسری بولی۔

"نہیں کہوں گی نا ــــ" میں کہہ اُٹھی۔

"وہ کسان تھا۔" اُس نے شرماتے ہوئے کہا ــ

"اچھا کس جیسا تھا۔؟" میں پوچھ بیٹھی۔!

"اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ بابُو پگلے ایسا تھا۔" دوسری بیگی نے کہا۔

"اچھا پھر اُس کا کیا ہوا ــ؟" میں نے پوچھا۔

"اُسے گنگس (ایک ذات کا زہریلا سانپ) نے کاٹ کھایا جب وہ دھان کاٹ رہا تھا۔" اُس نے سر اُوپر اُٹھایا اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے تیری شادی بابُو پگلے سے کر دیں گے" میں نے کہا۔

باقی بیگیاں ہنسنے لگیں۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ وہ کہنے لگی ــ "جہنّم میں جائے وہ۔ میں اُس کو بھی اپنے خاوند کے پاس بھیج دوں گی۔"

دوسری بیگی اپنے گھر میں بڑی لاڈلی تھی لیکن اُس کے ماں باپ نے اُس کی شادی ساٹھ سال کے ایک بوڑھے سے کر دی تھی۔ یہ اُن دنوں گیارہ سال کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ حاملہ ہو گئی۔ کم عمر ہونے کا اثر اُس کے جسم پر بھی پڑا اُس کا بچہ بھی مر گیا اور پھر اُس کا خاوند بھی۔ بھائی کے پاس سر چھپانے گئی تو اُس کی بھابی نے اُسے کھیتی کے کام میں ڈھکیل دیا کمزور ہونے کی وجہ سے وہ یہ بوجھ سنبھال نہ سکی اور آخر میں درگاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

تیسری بیگی نے ایک کے بعد ایک تین شادیاں کیں۔ لیکن اُس کے تینوں شوہر مر چکے تھے۔ تیسرے شوہر کے مرنے کے بعد اُس کی ساری جائداد اُس کے رشتہ داروں نے بانٹ لی۔ اس بیچاری کو صرف اکیاون روپے دئیے تھے۔ اِس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی اِس لئے یہ بھی درگاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

چوتھی کو اُس کے خاوند نے طلاق دیدی تھی۔ اُس وقت بھی وہ بے وقوف ایسی لگتی تھی۔ کہتے ہیں اُس کا شوہر چودھری تھا ایک دن اُس گاؤں کا پٹواری چودھری کے گھر آگیا۔ کسان کے گھر پٹواری کا آنا کسی بادشاہ کے آنے کے برابر ہوتا ہے۔ چودھری نے جوں ہی قہوہ پٹواری کے سامنے رکھا۔ چائے چھاننے کے لئے چودھری نے اپنی بیوی سے چھلنی لانے کے لئے کہا۔ وہ چھلنی کے بدلے سرپوش (سرپوش۔ ایک جالی دار ڈھکن) پیالے پر رکھ کر قہوہ ڈالنے لگی۔ چودھری اور پٹواری باتوں میں مشغول تھے!

جب اُس پر پٹواری کی نگاہ پڑی تو ہنسی نہ روک سکا۔ اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ چودھری شرمندہ ہو گیا۔ اُسی وقت اُس نے اُسے طلاق دیدی۔ وہ گھر میں بھی نہ رہ سکی۔ کیونکہ اگر اُس کی ماں ہوتی تو وہ سب کچھ برداشت کر لیتی۔ لیکن اُس کی ماں بچپن ہی میں مر چکی تھی۔ بس بھاگتے بھاگتے یہ بھی درگاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

اِسی طرح ہر ایک پاگل یہاں ایک کہانی ہے اور ہر ایک بیگی ایک قصّہ ہے۔ یہ لوگ کتنے آئے اور کتنے گئے کتنے مرے اور کتنے بھاگے۔

اِن کی ایک عجیب سی دنیا اِس درگاہ کے دروازے پر آباد ہے۔ ایک ہیبتناک غریب سنسار دیکھنے کے لائق ــ!

▲

تنہا تماپوری

پہلا سبق

راہ چلتے
بے خیالی میں اچانک
ایک شہری سے ذرا ٹکرا گیا میں
رُک کے اخلاقاً معافی مانگ لی اُس سے
مگر ......
گالوں پہ میرے دفعتاً بھرپور تھپڑ جیسے اُٹھا
راہ چلتے قہقہوں نے
مجھ کو سمجھایا
نئے اخلاق کا پہلا سبق !!

تنہا تماپوری

دھرتی سدا سہاگن

تجھے میں نہ چھوڑوں گی اے ابنِ آدم !
ترے ہی لئے میں بسائی گئی ہوں
ترے واسطے ہی سجائی گئی ہوں
مجھے یاد ہے لمحۂ روزِ اوّل
کہ جب تیرے قدموں نے مجھ کو چھوا ،
میں سہاگن بنی تھی
میں اپنوں کے رشتوں سے بچھڑی ہوئی ہوں
میں تیرے لئے ہوں ، تو میرے لئے ہے ،
انیکوں جنم کا ہے رشتہ ہمارا
تجھے میں نہ چھوڑوں گی اے ابنِ آدم !!

یہ چاند اور تارے جو لگتے ہیں پیارے
کشش میں ہیں اِن کی انیکوں اشارے
ہوس کے بُلاوے ،
نہ تیرے نہ میرے
مجھے "سوت" ہرگز گوارہ نہیں ہے
تجھے میں نہ چھوڑوں گی اے ابنِ آدم — !

مقالہ

ڈاکٹر ست پرکاش سنگھ

عہدِ مغلیہ میں شمالی ہند کی زبانیں

مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت میں شمالی ہندوستان میں ادب کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ مغل شہنشاہ بذاتِ خود ادب کے دلدادہ اور علم و فن کے مربی تھے۔ بابر ترکی اور فارسی زبانوں میں نامور شاعر تھا اور فارسی کی شاعری میں ایک جدید اسلوبِ بیان کا موجد تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ممتاز نثر نگار بھی تھا۔ اس کا لڑکا ہمایوں ترکی اور فارسی کا عالم اور علم و فن کی سرپرستی کا دم بھرتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں علم و ادب عروج کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اپنے لائق وزیر راجہ ٹوڈرمل کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اور کام یکجہتی کو برقرار رکھتے ہوئے اکبر نے فارسی کو دربار کی زبان کا شرف عطا کیا۔ آئینِ اکبری میں پانچ درجن سے زائد مشہور و معروف فارسی شعرا کے نام درج ہیں جن میں ابوالفضل کے بھائی اور شیخ مبارک کے بیٹے فیضی ممتاز ترین گردانے جاتے تھے۔ بادشاہ کی سرپرستی سے فیضیاب ہو کر اور شہرۂ آفاق مسلمان علماء نے سنسکرت میں دسترس حاصل کر کے اس زبان کے شاہکاروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان میں ابوالفضل، ملا عبدالقادر بدایونی، نقیب خاں، حاجی ابراہیم سرہندی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اتھروید، رامائن اور مہابھارت کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں، اس کے فرزند ارجمند داراشکوہ نے اپنشدوں، بھگوت گیتا، نیز یوگ وششٹ کا سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں فارسی زبان نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔

اکبر اور اس کے جانشینوں نے سنسکرت زبان کو بھی سرپرستی حمایت کی اور نتیجہ کے طور پر اس زمانے میں دو سو کے قریب سنسکرت مصنفین نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔

عہدِ مغلیہ میں شمالی ہند کی توجہ زبانوں میں میتھلی، اودھی، برج بھاشا، راجستھانی، زبانِ دہلوی یا ہندوی اور پنجابی داخل تھیں۔ پنجابی زبان میں سکھ گوروؤں نے گورمکھی رسم الخط میں اپنے منتر و دھار مک گرنتھ تصنیف کئے۔ اس کے علاوہ دیگر زبانیں عموماً ہندی کی شاخیں مانی جاتی ہیں۔ میتھلی، اودھی اور برج بھاشا تو ہندی ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ راجستھان میں پہلے ادب کی تخلیق ڈنگل یعنی پرانی راجستھانی میں ہوتی تھی۔ بعد ازاں وہاں کے ادیبوں نے پنگل یعنی برج بھاشا کی طاقت کو تسلیم کر کے اسی زبان میں لکھنا شروع کیا۔

ودیشی ترکوں اور مرکزی ایشیا کے مسلمانوں اور اہلِ ہند کے باہمی ربط سے، دلّی کی سلطنت کے دوران، یا اس سے کچھ قبل زبانِ لشکری یا اردو کا جنم ہوا۔ شروع میں اسے زبانِ ہندوی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد کے خیال میں برج بھاشا اور فارسی زبان کے میل جول سے اس زبان کا آغاز ہوا۔ ایرانی اسکالر محمود شیرانی کا یہ دعویٰ ہے اردو کا جنم پنجابی اور سندھی زبانوں کے ساتھ فارسی زبان کے میل سے ہوا۔ حقائق کی چھان بین سے معلوم نہیں ہوتا۔ اردو زبان کو کسی بھی زمانے میں پنجابی، ہندکی، لاہوری یا ملتانی سے موسوم نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں شاید بجا طور پر فرماتے ہیں کہ دلّی سلطنت کے دوران بولی کی زرخیز زبان ہریانی اور فارسی کی باہمی آمیزش سے اردو کا جنم ہوا۔ اردو کو ایک عرصہ تک دہلوی کے نام سے [illegible] ہریانوی زبان سے مشابہ تھی۔ ان دونوں کی تاریخ، لغت اور قواعد بھی یکساں ہے۔ ایک معروف مورخ کے قول کے مطابق اردو اور مغربی ہندی میں [illegible] یکسانیت بنی رہی۔ یہ دہلی زبان تھی جو امیر خسرو اور مسلمان صوفیوں نے اپنے دوہوں اور اپنی غزلوں میں استعمال کی۔ امیر خسرو اردو اور ہندی [illegible] کے ممتاز شاعر تھے۔

شاعری

سولہویں صدی کے اختتام تک ... [illegible] ... کے نام سے ... [illegible] ... کا نام دیا ہے۔ خیال غریب ... آئے ... جیسی 1
مسلمانوں اور فارسی اور ترکی ... کے ہندوؤں کے باہمی میل جول کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے سبب اس زبان کی ترقی و ترویج کے لئے دلی نہایت موزوں
مقام تھا۔ ... [illegible] ... کی ... کتاب ... [illegible] ... کی تخلیق کی جس میں ... [illegible] ... عربی اور فارسی الفاظ کی خوب
آمیزش ہے۔ امیر خسرو کے زمانے میں ... [illegible] ... کا ایک اہم ذریعہ بن گئی تھی۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا بکثرت استعمال کرنے
والے شعرا میں خسرو کا نام پایا جاتا ہے۔ عہد اکبری اور جہانگیری کے ایک مصنف تقی اوحدی نے امیر خسرو کے ہندی شاعری کا حوالہ دیا ہے۔ میر تقی میر
کے زمانے میں بھی خسرو کے ... اشعار خوب مقبول تھے۔ روایت ہے کہ اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر خسرو نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چہوں دیس

عوام کو زبان استعمال کرنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ روایت کے مطابق یہ شعر بھی انھیں کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا   آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اور ــــ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

تیرہویں اور چودھویں صدی کے مسلمان صوفیوں نے عوام میں اسلام کی تبلیغ کے لئے اس عوامی زبان کو استعمال کیا۔ شیخ بو علی قلندر کا یہ ایک مشہور دوہا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رو
بدھنا ایسی کیجئے جو بھور کبھو نہ ہو

صوفیا کی طرح بھگت سنتوں نے بھی اس زبان کو مقبول بنانے میں مدد دی۔ لیکن دلی کے سلطانوں نے اردو زبان کی سرپرستی نہیں کی۔ مغلوں کے عہد
میں فارسی کو درباری زبان کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ اردو کو مغل بادشاہوں نے بھی سرپرستی نہیں کی۔ اورنگ زیب کی وفات کے پندرہ سال بعد محمد شاہ رنگیلا
کے عہد حکومت میں اردو کو ... [illegible] ... نصیب ہوا۔ ولی دکنی نے ۱۷۲۲ء میں دلی دربار میں آکر بادشاہ اور اراکین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔
بائیس سال قبل، اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ولی نے دلی کی زیارت کی تھی۔ اردو شاعری یعنی ریختہ کو گولکنڈا اور بیجاپور کے سلاطین نے باقاعدہ
طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فارسی کی جگہ، دکنی اردو کو درباری زبان کا اعزاز بخشا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں ہندی ادب کا ارتقا اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس عہد کے ہندی ادب کو ناقدین نے مختلف حصوں میں منقسم
کیا ہے جن میں اولین بھگتی شاعری کو دیا ہے۔ اس شاعری کی روایت اگرچہ بہت پہلے شروع ہوئی تھی، عہد مغلیہ میں وہ پیوستہ مقدر پکڑا گئی۔ بھگتی رس کے
ہندی کویوں میں ... [illegible] ... کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کی دو چیلیوں سہجو بائی اور
دیا بائی نے بھی ہندی کتب تصنیف کیں۔ رجب داس نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا اور ان کے ایک شاگرد خصوصی سندر داس سنسکرت اور
فارسی، پنجابی، گجراتی ... [illegible] ... کے عالم تھے۔ رجب داس کی شاعری کی زبان عموماً راجستھانی ہے لیکن اس میں گجراتی اور پنجابی کے اشعار بھی ملتے
ہیں۔ اسی فرقے کے ... [illegible] ... فارسی، ہندی اور سنسکرت کے عالم اور ... [illegible] ... کتابوں کے مصنف تھے۔

... [illegible] ... سے تعلق رکھتے تھے۔ بھگتی کی روایت سے متعلق، پنجاب، سندھ اور بہار کے سو سے زائد شعرا کے نام ملتے ہیں۔ پنجاب کے
... [illegible] ... بھگتی رس سے پر شستہ ادب کی تخلیق کی۔

کرشن کے ... [illegible] ... کے شعرا نے ہندی کے ادب کو مالا مال کیا جن میں سورداس اور اشٹ چھاپ کے کوی آتے ہیں۔ سورداس دلی
کے پاس ... [illegible] ... اور ۱۰۹ سال کی عمر تک زندہ رہے۔ مرنے سے ۱۱ سال قبل ان کی اکبر سے ملاقات ہوئی تھی۔ سور ساگر
... [illegible] ... اشٹ چھاپ کے دیگر شعرا میں ... گوبند داس، ... چتر بھج داس اور نند داس تھے۔
میرا بائی کا نام ... [illegible] ... کرشن کی بھگتی سے متعلق ان کے گیت ملک بھر میں مشہور ہیں۔ وہ عوام میں مقبول راجستھانی

[illegible]

زبانوں میں لکھی گئیں۔

اِس ضمن میں رس خان کا نام مشہور ہے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھے جن کی تصانیف میں سجان رس خان اور پریم واٹکا ہیں۔ ان مثنویوں میں کرشن اور گوپیوں کے آزاد پریم کا پرچار اور عشق کے لئے ان کی اپنی بھگتی بھاؤ کا نہایت خلوص اور سنجیدگی سے اظہار کیا گیا ہے۔

کرشن کی زندگی سے متعلق لکھنے والے شعرا کے کلام میں تین درجن سے زیادہ کے نام ہیں جن میں پرمانند داس، بیربل، گنگ، محمد عاقل، بلرام [illegible] نریہری، ویاس مشہور ہیں۔

رام کی زندگی سے متعلق شہرت تلسی داس نے ۱۵۷۴ء میں رام چرت مانس کی تخلیق کی جسے ایک لافانی ادبی شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تلسی کی ایک درجن دیگر تصنیفات ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدیوں میں راجستھانی بھاشا اور ہندی میں رزمیہ لکھنے کا عام رواج تھا۔ وہ اکبری اور جہانگیری کے سنگار رس کے مصنف کوی کیشو داس نے بیر سنگھ دیو چرتر اور جہانگیر کی زندگی سے متعلق منظوم کتابیں لکھیں۔ اس ضمن میں دوسرے کوی جن میں [illegible] اور سورداس۔ اکبری دربار کے معروف ہندی شاعروں نریہری، بیربل، گنگ، [illegible] تھے۔ کہا جاتا ہے کہ [illegible] اکبر نے چھ کروڑ روپے بطور انعام دئے تھے۔

راجستھانی، اودھی، پنجابی کے ساتھ ساتھ اُس زمانے میں مستعمل زبانوں میں گیت لکھنے کا عام رواج تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں اِس زبان میں لکھنے والوں میں گووند داس، نیپال کے مہاراجہ سبھو چیندر، ہری داس، ہبیش ٹھاکر، بھیکر [illegible] وغیرہ کا نام آتا ہے۔ درباری ماحول میں پرورش پانے کے سبب یہ لوگ عشقیہ شاعری میں خاص طور پر ماہر تھے۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندی کے شعرا نے مکتک شیلی میں رس شاستر کے اُصولوں پر مبنی، سنگار رس، بھگتی، نیتی، شاعری کا مطالعہ، کام شاستر اور جیوتش وغیرہ کے موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ اِس ضمن میں اکبری دربار کے معروف شاعر نریہری، بیربل، گنگ، تان سین، رحیم، کیشو اور راجہ جسونت سنگھ کے نام آتے ہیں۔ سنسکرت، عربی، فارسی کے عالم، شیخ مبارک نے دو ہندی کتابیں 'الک شتک' اور 'تل شتک' کی تصنیف کی۔

شاہجہاں کے درباری شاعر کوی رائے، سندر کوی، 'سندر شرنگار' بارہ ماسا اور سنہاسن بتیسی کے مصنف تھے۔ بہاری نے ۱۶۶۲ عیسوی میں ست سئی کی تخلیق کی۔ اورنگزیب کے مشہور جرنیل مہاراجہ جسونت سنگھ سات ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔

عہدِ مغلیہ میں عشقیہ موضوعات پر مستند کے مصنفین میں سید غلام نبی رس لین، ملک محمد جائسی، شیخ منجھن، شیخ عالم اور جان کوی تھے۔ جائسی کی بلند پایہ تخلیق 'پدماوت' ۱۵۴۰ میں لکھی گئی۔ ۵ سال بعد لکھی گئی اس سے بھی زیادہ بہتر شیخ منجھن کا لافانی شاہکار مدھو مالتی ہے۔ مادھو اور [illegible] کام کندلا کے عشق کو لے کر شیخ عالم نے ۱۵۸۲ میں 'مادھوانل کام کندلا' تصنیف کی۔ اس کے علاوہ اُن کی تین اور کتابیں 'شیام سنیہی' [illegible] اور عالم کیلی ہیں۔

فتح پور کے نواب الف خان کے فرزند 'نیامت خان عرف جان کوی' نے ۱۶۱۸ اور ۱۶۶۴ کے درمیان ساٹھ ہندی کتابوں کی تصنیف کی جن میں نصف کے قریب منظوم عشقیہ داستانیں ہیں۔ کامیاب قلمی سے وہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔

جون پور سرکار میں [illegible] کے قاسمی نور محمد نے ۱۷۴۴ میں اندراوتی اور انوراگ بانسری کی تخلیق کی۔ سید غلام نبی رس لین کی دو کتابیں 'انگ درپن' نیز 'رس پربودھ' ہندی ادب میں ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ اُن کا یہ دوہا آج بھی مشہور ہے۔

امیا ہلاہل مد بھرے سیت سیام رتنار　　جیت مرت جھکی جھکی پرت جے ہی چتوت اک بار

ہندی میں 'یوسف زلیخا' کی منظوم داستان لکھنے والے شیخ نثار کا جنم ۱۷۲۲ عیسوی میں [illegible] شیخ پور گاؤں میں ہوا تھا۔ [illegible] کی موت نے شیخ کو پاگل بنا دیا۔ اُسی کے فراق میں رو رو کر انہوں نے 'یوسف زلیخا' کی کہانی لکھی۔

ان شعرا نے اپنی تخلیقات میں ہندوستان کے ویدانت مت، نرگن برہم [illegible] ناتھ پنتھیوں کی یوگ [illegible] خصوصی ذکر ہے۔

[illegible]

عشرت دھولپوری

تم جو نزدیک سے گزرو کبھی خوابوں کی طرح
زخم سینے کے مہک جائیں گلابوں کی طرح

وہ گیا وقت کھلے تھے جو کتابوں کی طرح
آج کے دور میں چہرے ہیں نقابوں کی طرح

میں کڑی دھوپ میں تپتا ہوں تمہیں کیا احساس
تم تو چھائے ہو زمانے پہ سحابوں کی طرح

وقت ردی کے عوض بیچنے بازاروں میں
ہم کو لے آیا ہے بوسیدہ کتابوں کی طرح

نقش بر آب کی مانند بنے ہیں جس میں
کچھ سوالات جو ابھرے تھے جوابوں کی طرح

ہم کو دیکھو! کہ نظر آتے ہیں دریا ہم لوگ
ہم کو پہچانو! کہ پیاسے ہیں سرابوں کی طرح

ان کی محفل میں ذرا سوچ کے جانا عشرت
آج کل ان کے کرم بھی ہیں عتابوں کی طرح

غزلیں

حیات وارثی

جو میکدے میں بھٹکتے ہیں لڑکھڑاتے ہیں
مرا خیال ہے وہ تشنگی چھپاتے ہیں

دلوں کی سمت یہ لفظوں کے سنگ مت پھینکو
ذرا سی ٹھیس سے آئینے ٹوٹ جاتے ہیں

ستم ظریفی حالات کا کرشمہ ہے
بھٹکنے والے مجھے راستہ بتاتے ہیں

ذرا سا وقت کے سورج نے رخ بدلا ہے
مرے وجود پہ کچھ سائے مسکراتے ہیں

طلسم ذات کی پھیلی ہے تیرگی اتنی
کہ دوستوں کے اجالے سمٹتے جاتے ہیں

حیات جن کو شعور حیات حاصل ہے
فریب دیتے نہیں ہیں فریب کھاتے ہیں

کاوش بدری

(نذر وحید اختر)

میں لاکھ سادہ ورق ہوں کتاب بھی سمجھو
ورائے لفظ و معانی کا خواب بھی سمجھو

لہو کی دھوپ میں شامل ہے چاندنی غم کی
اس آفتاب کو تم ماہتاب بھی سمجھو

ہر ایک ماہ کی پہلی ہے تیس دن سے نجات
ہر ایک پہلی کو روز حساب بھی سمجھو

جو پھول خاک چمن کے حسین کھلونے ہیں
انہی کو ٹوٹتے بنتے حباب بھی سمجھو

بہار محفل رقص و سرور ہے گویا
شگفت گل کو نوائے رباب بھی سمجھو

میں فن شکن بھی ہوں اور فن پرست بھی کاوش
قدیم بھی کہو جدت مآب بھی سمجھو

یاسمین عباسی

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

"میرا خیال ہے میں صحیح آدمی تک پہنچی ہوں" ـــــ سفید نسل خارلٹ نے کہا

"میں کچھ نہیں سمجھا ـــــ سیاہ فام وکٹر جوائس نے تحیر میں جواب دیا۔

شارلٹ نے ایک تعارفی کارڈ اُسکی طرف بڑھا دیا ـــ "یہ کارڈ آپ کبھی میرے والد کے پاس چھوڑ آئے تھے"

"میں؟ معاف چاہوں گا بھولی لڑکی"

"آج سے سولہ سال پہلے ۲۰ نومبر کی وہ سرد شام کیا آپ بھول گئے؟ میرے لئے تو وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ سرکولر سڑک پر اُس بلڈنگ خاہ بولڈ کے نیچے وہ کار آپ کو ضرور یاد ہوگا جسے جلتا دیکھ کر آپ اپنی کار روک کر پڑوسیوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے شعلوں میں کود گئے تھے۔ ڈیڈی باہر گئے تھے۔ میری ماں شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ وہ مجھے اپنی گود سے الگ کرنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں آپ بھی کافی جل گئے تھے لیکن آپ نے مجھے بچا لیا۔ میری ماں نہ بچ سکی اور چند ہی لمحوں میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ وہ آپ کی اس ادب جو احسان مند تھی کہ آخری لمحات تک آپ کا ہی نام لیتی رہی۔ اُس کی ٹیپ شدہ وصیت میرا مقدس ترکہ ہی نہیں بلکہ میرا مقصدِ حیات بھی ہے اور یہی چیز مجھے آپ تک لائی ہے" ـــــ شارلٹ نے ایک سرد آہ کے ساتھ اپنی بات ختم کی۔

"مجھے افسوس ہوا تمہاری ماں نہ بچ سکی ـ کاش میں کچھ اور پہلے پہنچ جاتا! تو وہ ننھی بچی تم ہی ہو ـــ؟"

"جی ہاں وہ بدنصیب میں ہی ہوں ـــ میں وہ ٹیپ لائی ہوں۔ آپ وہ سننا پسند کریں گے ـــ؟"

"ضرور سناؤ عزیز بچی"

مشین پر ٹیپ گھومنے لگا ـــــ

"ننھی شارلٹ ہلوگن کی تنہا نشانی تھی جسے ظالم شعلے چھین رہے تھے لیکن سیاہ گہری آنکھوں والے ایک کالے شخص نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اُسے میری جلتی ہوئی گود سے کھینچ کر اپنے کشادہ سینے سے لگا لیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ شارلٹ بڑی ہو کر اُس سیاہ فام سے ضرور ملتی رہے گی اس سے میری روح کو سکون پہنچے گا۔ وہ ـــ جیسے سفید دل کا مالک ہے اور ہم سب کا محسن ہے" ـــــ مرنے والی کی آواز فضاؤں میں گم ہو چکی تھی لیکن ٹیپ گھوم رہا تھا۔

ـــــ یکایک شارلٹ اور وکٹر نے سروں کو اٹھایا۔ دونوں کی پلکیں بھیگی تھیں۔

"یہ ہے وہ مقدس ترکہ جسے میں اپنے کمزور کاندھوں پر لئے اپنے محسن کی تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ شکر ہے آپ مل گئے۔ واقعی مجھے آپ جیسا خوبصورت دل اپنے ہم نسلوں میں نہیں ملا........ کیا میں آئندہ آپ سے مل سکتی ہوں ـــ؟"

"کاش میں تمہارے اس سوال کا جواب اثبات میں دے سکتا ـــ! آہ! یہ ظالم سماج ـــ اچھا اس وقت چند ضروری کام ہیں اجازت چاہوں گا" گفتگو کے موضوع کو ختم کرنے کے لئے وکٹر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں پھر آؤں گی"

..... اور کچھ دنوں بعد شارلٹ پھر آئی ـــــ

"مجھے خوشی ہے تم پھر آگئیں ـ شاید تم دوبارہ ـــ ملنے" وکٹر نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"[illegible]"

معاشرہ پر چھائی ہوئی اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی —
اس کے بعد شارلٹ اکثر و بیشتر وکٹر کے یہاں جاتی رہی۔

موسم خوشگوار تھا … شام دھلی دھلی سی اور فضا معطر تھی۔ خلاف معمول آج شارلٹ بہت خوش اور شوخ نظر آ رہی تھی شاید اس لئے کہ آج اس نے وکٹر سے وہ سوال کرنے کا تہیہ کر لیا تھا جسے بارہا کوشش کے باوجود وہ اب تک زبان پر نہیں لا سکی تھی۔

وکٹر بھی آج اسے اتنا مسرور دیکھ کر متعجب ہو رہا تھا کہ وہ بول پڑی:-

"آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں"

"بصد خوشی۔"

"آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"مہلت نہیں ملی"

"ساتھی کا انتخاب تو کر ہی لیا ہوگا"

"ایسا بھی نہیں۔"

"میرے دل کی تو تمام وسعتوں میں تو صرف آپ ہی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے تو کیا آپ مجھے اپنی رفاقت دے سکیں گے؟"

"میرا انتخاب —؟ تم اپنے لئے —!"

"میں پورے ہوش میں ہوں مسٹر وکٹر —!"

"نہیں — یہ نہیں ہو سکتا — میرے اور تمہارے درمیان دو بڑے فرق رنگ اور عمر کے ہیں — میں سیاہ فام اور چھیالیس سالہ خزاں رسیدہ — تم ایک شفاف معصوم نوخیز کلی — یہ ناممکن ہے۔"

"لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"میری مخلصانہ اپیل ہے کہ اپنا فیصلہ بدل دو اور ہم دونوں کے درمیانی فرق کو محسوس کرو — کیا تمہارے ڈیڈی کی تمنا نہ ہوگی کہ تمہارا شوہر بھی تم جیسا ہی ہو؟"

"آپ کی باتیں بہت اچھی ہیں لیکن آپ کے لئے میرے دل میں جو جذبات ہیں وہ میں کیونکر چھپاؤں؟"

"نہیں" تمہارے انہیں جذبات کا واسطہ تم اپنی رائے بدل دو!"

"یہ ممکن نہیں — میرے ساتھ بڑی مجبوری یہ ہے کہ بچپن سے میں صرف آپ کے بارے میں ہی سوچتی رہی ہوں۔ ایک بے کشش سیاہ فام کی حیثیت سے کیا مجھے آپ کی بانہوں کا سہارا بھی نہیں مل سکتا؟ میں صرف آپ کی رفاقت چاہتی ہوں۔ نسلی امتیاز کے سلسلے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ انسان سفید فام و سیاہ فام ہو سکتا ہے لیکن انسانیت یکرنگ ہے۔ میں بنیادی طور پر COLOUR BLIND ہوں۔"

"میں بزدل ہوں کہ سماج کے ڈر سے تمہاری طرح نہیں سوچ سکتا۔ مگر جان لو کہ تم جس گہری کھائی کو اپنی یا ہم دونوں کی خواہشوں سے پاٹنا چاہتی ہو اس کے لئے لاکھوں شارلٹ اور وکٹرس کی ضرورت ہوگی۔"

"خیر میں جا رہی ہوں لیکن کیا آپ میرے گھر کبھی آئیں گے —؟"

"ضرور آؤں گا پیاری بچی۔"

—— —— کچھ دنوں بعد شارلٹ ایک مشہور ماہر جلد کی کلینک میں دیکھی گئی — ڈاکٹر مبہوت تھا۔ اب تک اس کی کلینک میں کوئی ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس نے اپنی گوری جلد سیاہ کروانی چاہی ہو۔ یہ پہلا کیس تھا۔ ڈاکٹر نے شارلٹ کو اس کی ضد سے باز رکھنا چاہا لیکن مجبور ہو کر اسے یہ کیس لینا ہی پڑا

رفتہ رفتہ سفید جلد سیاہ ہونے لگی — اس درمیان شارلٹ تمام تر اذیتوں سے گزرتی رہی۔

ادھر وکٹر بھی الجھنوں کا شکار رہا۔ اسے بار بار خیال آتا:—
"شارلٹ خفا ہوگئی — جبھی تو وہ عرصہ سے نہیں آئی۔ اتنی اچھی لڑکی اور اتنی عجیب خواہش —" وہ کئی بار اس کے گھر بھی گیا لیکن وہ نہ مل سکی۔

دن گزرنے لگے . . . .

کافی عرصہ بعد شارلٹ تمناؤں کی ایک دنیا لئے وکٹر کے گھر آئی۔ لیکن — پھاٹک ہی پر اس کے قدم رک گئے — ایک کالی عورت وکٹر کے ساتھ لان پر ٹہل رہی تھی — شارلٹ رکی لیکن کچھ سوچ کر پھر آگے بڑھ گئی:-

"شاید میں مخل ہوئی — مجھے معاف کیجئے گا مسٹر جوائس"

"اچھا —! آپ مجھے جانتی ہیں؟"

"جی ہاں — آپ مسٹر وکٹر جوائس ہیں اور . . . .

آپ نے صحیح سمجھا — یہ مسز جوائس ہیں لیکن — آپ —؟

"اچھا ہوا مسٹر وکٹر! آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں خوش ہوں .. میرا یہ روپ ہی مجھے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔" اتنا کہہ کر شارلٹ

انھیں گمنام راہوں پر واپس چل پڑی ...... شارلٹ کے جانے کے بعد وکٹر چونکا جیسے یکایک اندھیرے سے روشنی میں آ گیا ہو۔ اس نے شارلٹ کے پیچھے بڑھنا چاہا لیکن چرچ کی گھنٹی نے ساتھ نہ دیا —— وہ زیرِ لب بڑبڑاتا رہ گیا —— ایسا نہیں ہو سکتا ....

اب کیا ہوگا —؟ معصوم بچی —!

شارلٹ نے اپنے باپ کا گھر، شہر اور اپنا سماج سبھی چھوڑ دیا اور ایک انجانے شہر میں NEGRO UPLIFT SOCIETY کے دفتر میں بحیثیت RECEPTIONIST کام کرنے لگی ——

اس کی زندگی مسلسل طوفانوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی لیکن اس نے جینا سیکھ لیا تھا — اس نے جذباتی طور پر وکٹر کو فراموش کر دیا تھا لیکن روحانی طور پر آج اور تو یہ ساتھ کھینچ رہی تھی۔ اور یہی اس کی طویل تنہائیوں کا سہارا تھا۔ ویسے دل بہلانے کے لئے کالی آنکھوں والی وہ گڑیا بھی تھی جو وکٹر نے ننھی منی "شارلٹ" کو دی تھی۔ . . .

اس طرح دن ہفتوں اور مہینے برسوں میں ڈھلتے رہے — دیکھتے دیکھتے شارلٹ بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہونے لگی۔ شاید اسے یاد بھی نہ ہو کہ اس کی زندگی کبھی شباب کی راہوں سے بھی گزری تھی۔ — مگر وہ اپنے آج اور اس ٹھہراؤ کی زندگی سے مطمئن تھی اسے کسی کل TOMORROW کی تمنا نہ تھی —— لیکن ایک دن جب وہ RECEPTION COUNTER پر کوئی کاغذ دیکھ رہی تھی کہ ایک سیاہ فام نوجوان اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ مادام شارلٹ ہیں نا۔"

"تم صحیح ہو"

"آپ کی تلاش میں مجھے بہت دشواری ہوئی حالانکہ آپ کی پرانی تصویر میں اور آپ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔"

"میری تصویر —؟ کہاں ملی —؟ مگر تم ہو کون —؟"

"آپ کی یہ تصویر میرے والد نے آپ کے ڈیڈی سے لی تھی"

پہیلیاں نہ بجھاؤ اجنبی نوجوان"

"میڈم یہاں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ کیا آپ میرے ساتھ کچھ دور چلیں گی؟"

کچھ دور جا کر ایک چرچ کے پاس نوجوان رک گیا اور شارلٹ سے کہنے لگا —

"میں وکٹر جوالس کا بیٹا ایڈورڈ جوالس ہوں۔ عمر کی انتیس ۲۹ منزلیں طے کر چکا ہوں۔ اپنے والد کی زبانی کسی شارلٹ کا تذکرہ بچپن سے سنتا رہا۔ گو اب ڈیڈی اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے":—

"میرے بیٹے! تم سفید نسل سیاہ فام شارلٹ سے ضرور ملنا۔ ہو سکتا ہے اسے کسی نے نہ اپنایا ہو تو بڑھ کر تم خود کو اس کے قدموں میں ڈال دینا۔ وہ انسانیت کی مقدس دیوی ہے۔ ممکن ہے تمہاری یہ پرستش مجھے میرے بارے کچھ سبکدوش کر دے۔ میں اس کے خلوص و قربانی کا مقروض ہوں۔"

—— شارلٹ کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی —

کافی دیر بعد وہ سطح پر ابھری: ——

"ایڈورڈ — ! میں تمہیں تنہا ایڈورڈ تو نہ کہوں گی لیکن یہ ضرور بتاؤں گی کہ میری عمر پچاس سال ہے۔"

"مجھے آپ کی عمر جاننے کی ضرورت نہیں —— میرے سامنے اس وقت صرف اپنے والد کی خواہش کا احترام اور آپ کی عظمتوں کا اعتراف ہے —— سامنے قدیم مقدس چرچ ہمارا محافظ ہے۔ خدارا دیر نہ کیجئے! میرے والد کی روح کو سکون بخش دیجئے!"

"عظیم باپ کے فرمانبردار بیٹے — ! تم خوش نصیب ٹھہرے۔ اپنی ماں کے لئے ایسی ہی آرزو میں مجھ بد نصیب کی تو نصف صدی بیت گئی"...

اتنا کہہ کر ایک پروقار سکوت کے ساتھ شارلٹ نے اپنا ہاتھ ایڈورڈ کے ہاتھ میں دے دیا اور دونوں آہستہ آہستہ چرچ میں داخل ہو گئے۔

شارلٹ کے چہرے پر مریم کی معصومیت جھلک رہی تھی —— اور بڑے محراب کے پیچھے مریم کا مقدس بیٹا صلیب پر چڑھا انسانیت کی فلاح کے لئے مصروفِ دعا تھا۔ ▲

(روسی کہانی سے متاثر ہو کر)

جواب طلب امور کیلئے

▲ جوابی خط، ٹکٹ یا لفافہ ضرور بھیجئے۔

خط اور منی آرڈر پر نمبر خریداری کا بھی حوالہ دیجئے۔

یعقوب راہی

فتح کی شام تک

ہم اِدھر
جنگلوں، پربتوں، کھائیوں میں
کبھی آہنی پھولی بندوق کی طرح جاد بچھا کر جھنجھوڑیں
پتھروں سے اُبل کر اُبھرتے ہوئے نرم جھرنوں کو احساسِ آزادگی دیں
اور پھر پل کے ہم
فتح کی شام تک
راستہ راستہ سرفشانی ہوئی ہر رکاوٹ سے ٹکرا کے بڑھتے چلیں
کہ کبھی دھرتی کی رگ رگ میں اُتری ہوئی دشمنوں کی جڑوں کو اُکھاڑا کریں
اور تم سب
ساتھیو، تم اُدھر
کوچۂ یار سے مقتلِ شہر تک
اپنی آواز کی جستجو میں
بے سہارا بھٹکتی ہوئی گونگی سرگوشیوں کو زباں بخش دو
صوت والفاظ و معنی کے ٹوٹے ہوئے سلسلے جوڑ کر
اپنے دشمن سے لڑ بھڑ کے جو سرخ رو قافلے آنے والے ہیں
اُن کے سواگت کے گیت گاتے رہے ——— !!

فرحت کیفی

قومی ترانہ

(ترانہ کے لیے)

دکھ درد، مفلسی کی قبائیں اتار دیجئے
کیوں جا کے ہاتھ اوروں کے آگے پسار دیجئے
اپنے بھوش کو، اپنی اتا کو سنوار دیجئے۔
دھرتی سے خشک سالی چلی جائے پھر نہ آئے
اس دیش کا غریب غریبی ہی بھول جائے،
محنت کے کیک کھائے۔ محبت کے گیت گائے
خود بڑھ کے اپنے دیش کی قسمت سنوار دیجئے

ابلیس کا
سرمایہ داروں سے خطاب

(ترانہ کے لیے)

دے کر وہ کوئی سچا رکھ علیٰ ان جائیں گے
جا لوک میں رہنے والے کہیں ہاں جائیں گے؟
بل ڈوزروں کو لا کے زمیں چھان جائیں گے
پھر اس زمیں پہ پختہ عمارت کھڑی کرو،
ہر بعد کوئی تازہ مصیبت کھڑی کرو،
مجبور گر دکھائے تو طاقت کھڑی کرو
بوسیدہ مقبروں سے یہ شمشان جائیں گے!

مقالہ

ہارون ایوب

دلّی کی شام ـــــ ایک بہترین ترجمہ

دلّی کی شام ۱۹۴۰ء میں انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ "لندن کی ایک رات" کے بعد ایک معیاری ناول لکھا گیا لیکن یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایک لمبے عرصہ تک اس معیاری ناول سے محروم رہی۔ آخر جون ۱۹۶۳ء میں بلقیس جہاں کا ترجمہ مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے سلسلے میں احمد علی اپنے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اب بلقیس جہاں کا ترجمہ چھپ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں خود اس سے اچھا ترجمہ اردو میں شاید ہی کر سکتا تھا۔ بلقیس جہاں نے یہ ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اس پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ اُردو میں اتنا کامیاب ترجمہ شاذ ہی ہوا ہو۔ اس ترجمہ کو پڑھ کر یہ جی نہیں چاہتا کہ اسے ترجمہ کہا جائے ـــــ" ۱ "دلّی کی شام" ایک اجتماعی ناول ہے۔ جس میں نہ صرف دلّی شہر بلکہ اس میں آباد مسلمان اور ان کی مٹتی ہوئی تہذیب کو ناول کا مرکز بنایا گیا ہے۔ جس میں روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی حقیقتوں کو دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا کینواس بہت وسیع ہے۔ یہ پورے ایک شہر اور اس کی مٹتی ہوئی تہذیب کی کہانی کہتا ہے جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔

میر نہال اور ان کا گھرانہ دلّی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی غمازی کرتا ہے۔ میر نہال پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ ہر نئی چیز سے انہیں نفرت ہے۔ اصغر بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے جو نچلے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ میر نہال اس شادی کی اجازت نہیں دیتے ہیں، لیکن جب اصغر کی ضد حد سے گذر گئی تو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ میر نہال کو شادی کی اجازت دینا پڑی۔ دونوں کی زندگی آرام سے بسر ہوتی ہے۔ لڑکی کی ولادت (لڑکی نور جہاں) کے کچھ عرصہ کے بعد بلقیس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اصغر کی زندگی ناامیدیوں سے بھر جاتی ہے۔ زہرہ اصغر کی سالی نور جہاں کی پرورش کرتی ہے۔ زہرہ دھیرے دھیرے اصغر کے قریب آ جاتی ہے اور ایک دن اظہار تمنا کر بیٹھتی ہے۔ لیکن شہناز بیگم اس شادی کے لئے تیار نہیں ہوتیں اور ایک دن جب اصغر اپنے بھائی کے انتقال کے باعث بہت غمگین اور اداس تھا، تب اس کو زہرہ کا ایک خط ملتا ہے جس میں اس نے لکھا تھا۔

"مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ اماں کل صبح کو میری شادی کہیں اور کر رہی ہیں۔ مجھے تو آپ سے محبت ہے۔" ۲

اصغر کو یہ خط دو گھنٹے بعد ملتا ہے۔ مایوسی اور ناکامی کے گہرے سمندر میں بار بار ڈوبتا ابھرتا اس دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے ـــ

"دلّی کی شام" دراصل شہر دلّی کا شہر آشوب ہے کیونکہ اس میں دلّی خود کرداروں سے زیادہ اہم ہو کر ابھرتی ہے۔ بقول محمد حسن عسکری:۔

"احمد علی نے محض چند افراد کا قصہ نہیں لکھا ہے بلکہ ایک طبقہ، ایک شہر، ایک خاص تہذیب اور ایک تصورِ حیات کی کہانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا موضوع چند کردار یا ان کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ پورا ایک شہر ہے۔ یہ اصل میں اجتماعی ناول ہے جس کا ہیرو "دلّی شہر" ہے۔" ۳

دلّی اور اس کی زوال پذیر تہذیب کی خوبصورت عکاسی احمد علی نے اس ناول میں کی ہے۔ میاں پتنگ بازی اور کبوتر بازی کو بھی صحت سے بیان کیا ہے

۱۔ دلّی کی شام۔ احمد علی۔ دیباچہ۔ صفحہ ۵ - ۱ ۲۔ دلّی کی شام۔ احمد علی صفحہ ۱۴۴ (اردو)

۳۔ دلّی کی شام۔ (تبصرہ)، محمد حسن عسکری صفحہ ۱۱۔ جائزہ۔ کراچی مئی ۱۹۶۳ء۔ جلد ۴ شمارہ ۱۰

اہمیت حاصل تھی۔ دلّی شہر جو کبھی ایک تہذیب کی عظمت کا چراغ تھا' جس کی ایک ایک گلی اور کوچہ فخر و نقاشی جس کو کسی اور کوچے کا ذکر میرزا غالب نے اپنے کلام میں کیا تھا' انہیں گلیوں کی جھلکیاں اس ناول میں نظر آتی ہیں لیکن تباہ و برباد حالت میں:۔

"رات کا وقت ہو چکا تھا اور اصغر جانے کے لئے نکل گیا۔ گلیاں تنگ اور تاریک تھیں جو کہیں کہیں لکڑیوں پر تیل کے لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ دور سے فقیر کا شور ہوا کے ساتھ سنائی دے رہا تھا۔ ایک پھول والا اصغر کے قریب سے آواز لگاتا ہوا گذرا۔ فضا تھوڑی دیر کو مہکی اور پھر وہی موریوں کی بدبو اور شراند کے بھبکے ناک میں گھسنے لگے۔ پاس ہی ایک ٹاٹ کے پردے کو جنبش ہوئی اور کسی کا دست حنائی باہر آیا اور کھڑکی کے دھوئے فقیر کے کاسہ میں روٹی ڈال دی اور فقیر دعائیں دینے لگا۔" [1]

اس طرح احمد علی نے ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس ناول کا مواد فراہم کیا ہے۔ اس میں مسلمان گھرانوں کی زندگی اور گھر میں رہنے بسنے والے مردوں اور عورتوں کے خاکے پیش کئے ہیں' یہاں تک کہ مذہب' خاندانی وقار' رسم و رواج' ہندوستانی سیاست پر زبردست چوٹیں کی ہیں۔ مسلمان شرفا کی گھریلو زندگی' مردوں کی وضعداری اور عورتوں کی جیتی جاگتی زبان کے ساتھ دہلوی تمدن کی جھلکیاں اس ناول میں۔ جس نے دلی کی شام کو ایک جامع حیثیت بخش دی ہے۔ اُردو ناول نگاری میں اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا' کیونکہ ناول اپنے اندر بڑی شدت رکھتا ہے جس میں انسانی روح جکڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ دلی کی تباہی کا ذکر ناول نگار نے ایسے کرب ناک الفاظ میں کیا ہے کہ دل ہل جاتا ہے۔

"دلی میں آج بھی سیکڑوں غدر کی ماری شہزادیاں اور آفت رسیدہ شہزادے' بہادر شاہ ظفر کے پوتے پڑپوتے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں' نہ اُن کا کوئی ولی ہے نہ وارث' نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانہ۔ سراسیمگی اور کسمپرسی کا ایسا شکار ہوئے کہ کسی شہزادی کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تو کوئی کہاروں اور گوجروں کے ہتھے چڑھی' جو قبضۂ ناجائز سے بچیں وہ ماماگیری کرنے لگیں۔ پیٹ کی دوزخ کو ٹھنڈا کرنے کو شہزادوں کو ہر ذلیل سے ذلیل اور ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ کوئی بیل گاڑی اور تانگہ ہانکنے لگا اور کوئی گھسیارا ہو گیا۔ معدودے چند تھے جنہوں نے اپنے حق اور وراثت کے لئے عرضیاں گزاریں اور پانچ دس روپیہ ماہانہ کے وظیفہ دار بن گئے' اور کچھ وہ بے نصیب جو ہمیشہ کو گم کردہ عزت و ناموس ہو گئے اور جن کے حصہ میں ہمیشہ کو گداگری مقرر ہوئی۔" [2]

طوائفیں ہماری پرانی معاشرت کا ایک اہم حصہ رہی ہیں۔ جو بہت اعلیٰ معیار سے اپنی زندگی بسر کرتی تھیں اور اُن کے گھر تہذیب اور تمدن کے مرکز خیال کئے جاتے تھے۔ جن کی حیثیت ایک اسکول کی سی تھی' لیکن اس مٹتی ہوئی تہذیب کے ساتھ طوائفوں کا بھی بہت بُرا حال تھا۔ روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ احمد علی نے طوائفوں کی زندگی اور اُن کی بدحالی پر ایک زبردست چوٹ کی ہے جس کو مشتری بائی کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔

"میری زندگی کی اصلیت یہ ہے' جہاں نہ سبزہ ہے نہ شادابی' دور دور لق و دق ویران ریگ زار پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں سراب ہی سراب ہے' نہ جادہ ہے نہ منزل نہ چراغ۔ جو خود تاریک ہو وہ کیا کسی کی رہنمائی کرے گا۔" [3]

اس طرح احمد علی نے ہماری سوسائٹی کی سماجی اور معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اپنے ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس ناول کے تمام کردار مسلم معاشرہ کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ جو مٹتی ہوئی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک خاص طبقے کی روزمرہ کی زندگی اور ملک کے سیاسی حالات بھی ان کرداروں کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ جو اس دور کے پورے ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

میر نہال۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں' ہر نئی چیز سے نفرت کرتے ہیں۔ زوال کبھی کی ختم ہو چکی ہے' لیکن اب بھی کس بَل باقی ہے۔ پُرانے دستور کے مطابق "بیٹا جانی" کو دیکھ چھوڑا ہے۔ ان کا سارا خرچہ برداشت کرتے ہیں۔ حالانکہ گھریلو زندگی بہت خوشگوار تھی۔ کبوتر بازی کا بہت شوق تھا' جس کو آخر عمر تک جاری رکھا' لیکن ایک دن بلی کئی کبوتر کھا گئی۔ اس کے بعد کچھ ایسے بددل ہوئے کہ یہ شوق ہی ختم کر دیا۔ پھر کچھ احباب کے ساتھ

---

[1] دلّی کی شام احمد علی صفحہ ۲۰۴
[2] " " " " صفحہ ۲۱۱
[3] " " " " صفحہ ۱۱۲

شاعر بیٹی

بیاہا جانے کا پروگرام بنایا لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اصغر کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ مہرو کی شادی میں اتنی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ آخر عمر میں ان کی زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی۔ اب اصغر اُن کے سامنے انگریزی کپڑے اور ٹوپی پہن کر آتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں اور جب آخر عمر میں حسرت، محرومی اور ناکامی انہیں گھیر لیتی ہے تو بستر پر پڑے پڑے دیکھا کرتے ہیں مگر کسی سے کچھ نہیں کہہ پاتے اور دم توڑ دیتے ہیں۔

اصغر: میر نہال کا چھوٹا لڑکا ہے جو قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان لٹک رہا ہے۔ وہ پُرانے خیالات اور ماحول سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکا اور نہ جدید تہذیب کو اپنا سکا کیونکہ والد اس کے سخت مخالف تھے۔ اگر اتفاق سے اچکن پر انگریزی فیشن کے جوتے بھی پہنے دیکھ لیتے تو بس سمجھئے قیامت آ گئی۔ اصغر ناول کا ہیرو ہے لیکن حالات میں اس بُری طرح جکڑا ہوا ہے کہ خود نہیں اُبھر سکا۔ پُرانا تمدن اور اُس کے رسم و رواج اصغر کو اتنی مہلت ہی نہیں دیتے ہیں کہ وہ اُبھر کر سامنے آ گئے۔ شادی کے بعد اپنا گھر وہ نئے فیشن سے سجاتا ہے اور کچھ کر کے بتاتا ہے۔ یہی اُس کا سب سے بڑا باغیانہ قدم ہے۔ بلقیس سے شادی خاندانی مخالفت کے باوجود کی لیکن ایک سال کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ بلقیس کی چھوٹی بہن دھیرے دھیرے اصغر کے قریب آ جاتی ہے اور اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔ اصغر بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ لیکن شہناز بیگم اس شادی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اصغر حسرت اور مایوسی کا مجسمہ بن کر بلقیس اور زہرہ کی یاد میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بلقیس — بہت معمولی کردار ہے جو خالص ہندوستانی عورت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کردار میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے۔ وہ شادی سے پہلے ماں باپ کی مرضی پر زندہ رہتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر اُس کی زندگی کا مالک بن جاتا ہے۔ اُس کی ایک نگاہِ غلط بھی اُس کی زندگی میں ایک طوفان برپا کر دیتی ہے جو ہر ہر لمحہ کسی نہ کسی کی نظر کی منتظر رہتی ہے۔ یہی اُس کی زندگی کا ماحصل ہے۔

مہرو۔ کے کردار میں مسلم معاشرے کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی کیفیت کو بہت خوبصورت انداز میں ناول نگار نے پیش کیا ہے اور اُن نازک جذبات کی غمازی کی ہے جن کو لڑکیاں کبھی زبان پر نہیں لاتیں لیکن وہ اس قسم کے ذکر سے خوشی ضرور محسوس کرتی ہیں۔

"جب مہرو اپنے منگیتر کا نام بڑھا سنتی تو نہ صرف وہ مسرت جو اس نام سے وابستہ ہو گئی تھی بلکہ وہ اُمنگیں بھی جو اُس کے دل کے عمیق گوشوں میں پنہاں تھیں، جاگ جاتیں اور اُس کے خوابیدہ جذبات برانگیختہ ہو جاتے۔ وہ خود اِن بے نام جذبات کے مفہوم کو نہ سمجھتی تھی لیکن اُس کے جذبات کا توازن ڈانواں ڈول ہو جاتا اور اس حیلے سے سارا جوش عزیب تر سرد پڑ کر صورت میں اُترتا" ۱؎

اس کے علاوہ جمال بیگم، بیگم میر نہال، شہباز بیگم، حبیب الدین، مشتری بائی، مسز شمس اور شمس وغیرہ مسلم معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور اپنے طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "دلی کی شام" کے سارے کردار ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اُن کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پورے ناول پر دلی چھائی ہوئی ہے اور قاری کے ذہن پر دلی اس طرح مسلط رہتی ہے کہ دلی کے اس ماحول میں سارے کردار ضمنی حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

زبان بہت سادہ اور دلکش ہے، جو کرداروں کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ نازک نازک اور لطیف جذبات کی عکاسی بہت خوبصورت اور عام بول چال کے الفاظ میں کی گئی ہے جو اُس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ناول نگار نے اپنے طرزِ تحریر سے خیالات کا ایسا جال بُنا ہے کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے۔

"جب رات ڈھلنے لگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سرسرائی اور اصغر آسمان کو ٹکٹکی باندھے تکنے لگا۔ اَن گنت ستاروں کے جھرمٹ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ستارے الگ الگ خان و شوکت سے یوں چمک رہے تھے گویا اپنا دربار لگائے بیٹھے ہوں۔ ہر ستارہ ایک دوسرے پر خندہ زن تھا اور ہر ایک سلطنت گردوں لوٹ لینا چاہتا تھا۔ ستاروں کی چمک نے جس طرح بجلی جا بجا نور کے ننھے ننھے خدنگے ہر طرف برسا رہے تھے، جن کی ضیا پاشی نے فضائے آسمانی کو حسین اور دلفریب بنا دیا تھا" ۲؎

۱؎ دلی کی شام۔ احمد علی۔ صفحہ ۵۴۔ ۲؎ دلی کی شام۔ صفحہ ۲۳

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ ہو)

غزلیں

مہدی پرتاب گڈھی

راہِ جنوں میں ہر ہر گام پہ کچھ ایسے اسباب ملے
گھنائے گھنا سائے سے سب خوابوں کے مہتاب ملے

خوابیدہ لمحوں کے رُخ سے جب بھی ذرا پگھلی ہے برف
پردۂ ذہن پہ جوت جگائے بچھڑے ہوئے احباب ملے

موت سے ڈرنے والے انساں زندہ ہی درگور ہوئے
زیست کے ہم دیوانوں کو یہ دریا بھی پایاب ملے

اہلِ خرد نے ٹھہرایا ہے اُن کی بصیرت کو مشکوک
جن سے کل تاریخ جہاں کو چند حسیں ابواب ملے

کل تک کتنی ہی یادوں کے سینے میں بُت تھے جلوہ فگن
سُونے سُونے قصرِ دل کے اب طاق و محراب ملے

ہم کو حقائق کی دُنیا میں درد ملا یا چوٹ ملی
ہم جب بزمِ سخن میں آئے کتنے ہی القاب ملے

چند شگفتہ لمحوں کی اُمیدیں یوں کاٹی ہے حیات
آنکھیں دل کی پتھرائی سی، ذہن کے دُبلے خواب ملے

جن کی یاد کتابِ دل کے ورق ورق پر نقش ہوئی
مہدیؔ زیست کے ہنگاموں میں کچھ لمحے نایاب ملے

شوکت پردیسی

اپنی طلب کے اپنی غرض کے ملے ہیں لوگ
میری طلب کو دیکھنے والا نہیں ملا

وہ غم، نشاطِ غم کا مداوا کہیں جسے
مجھ کو بقدرِ ظرفِ تمنا نہیں ملا

میرے عیوب پر رہی ہر شخص کی نگاہ
کوئی ہنر کو دیکھنے والا نہیں ملا

جس کو خود اپنی ذات پہ بھی اعتماد ہو
اس دور میں مجھے کوئی ایسا نہیں ملا

خنجر بکف تو لوگ ملے ہر جگہ، مگر
مرہم بدست کوئی مسیحا نہیں ملا

دیکھا تو کوئی مجھ سے زیادہ بُرا نہ تھا
ڈھونڈا تو مجھ سے بڑھ کے لُٹیرا نہیں ملا

جانے کہاں گیا وہ بڑا ہی عجیب تھا
اک شخص جو کسی سے دوبارہ نہیں ملا

ایسا بھی ہے کہ میں نے جو سوچا نہیں ہوا
یہ بھی ہوا کہ دل نے جو چاہا نہیں ملا

ملنے گئے تھے رات کو شوکتؔ سے ہم مگر
افکار کا ہجوم تھا، تنہا نہیں ملا

کہانی

رضاء الجبار

چُبھَن

قطار میں دسواں نمبر مسٹر نعمانی کمشنر کا تھا۔ سب سے پہلے منسٹر تھے پھر تین وزراء، اعلیٰ سماجی حیثیت کے لوگ، شہر کے بڑے تاجران اور دوسرے معزز عہدیدار۔

سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور گلدستے تھے۔

جن کی بیویاں ساتھ آئی تھیں وہ اپنے شوہروں کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی تھیں۔

لیکن لوگوں نے دیکھا کہ مسٹر نعمانی کمشنر کے کندھے سے کندھا ملانے والی اُن کی بیوی نہیں، بلکہ کوئی بہت ہی خوبصورت دُبلی پتلی اور کم عمر لڑکی تھی۔ اُس نے خوب میک اَپ کیا تھا۔ اور نعمانی کے ہونٹوں پر آئی ہوئی مُسکراہٹ کی کسی حد یا گہرائی کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

اس انتظار میں آسمان پر سے ہوائی جہاز کے آنے کی آواز آئی۔

قطار میں کھڑے ہوئے سب لوگ اُوپر دیکھنے لگے۔ نعمانی اوپر دیکھنے اپنے ساتھ لائی ہوئی لڑکی کی اُٹھی ہوئی صُراحی دار گردن کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے، خوبصورتی کو تلاش کرنے کی اپنی نظر اور حِس پر نازاں ہو رہے تھے۔

طیران گاہ پر نگرانی کرنے والے پولیس کے عہدیدار سیٹی بجا کر انتظامی اُمور کا جائزہ لینے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ آوازیں گونجیں۔

"گورنر آ گئے، گورنر آ گئے"

ہوائی جہاز نیچے اُترا۔ فوراً سیڑھی لگ گئی۔ دروازہ کھلا۔ گورنر اپنے اے ڈی سی اور ضروری عملہ کے ساتھ خراماں خراماں اُترنے لگے۔

قطار میں کھڑے ہوئے لوگ باادب ہو گئے۔ اور گورنر کی طرف دیکھنے لگے۔ نعمانی نے لمبی سانس لے کر نازنین کے کپڑوں سے آنے والی خوشبو کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی اور اپنے کوٹ کے کالر کے قریب لگے ہوئے پھول پر ہاتھ پھیرا، جیسے خواہش کر رہے ہوں کہ نازنین جو خود بھی پھول ہے۔ کانٹوں بھری ڈال سے ٹوٹ کر اُن کے کوٹ کے کالر کی زینت بن جائے۔

گورنر صاحب قطار میں کھڑے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے۔ تعارف کرانے سے پہلے ہی سب کے نام یاد کر کے اپنی یادداشت کو جلا دے رہے تھے۔

نواں نمبر نازنین کا تھا۔ نازنین نے پھولوں کا بڑا سا گلدستہ پیش کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ نعمانی فوراً بولے۔

"یور ایکسیلینسی یہ مس نازنین بھاجی والا سوشیل ورکر ہیں۔ سماجی حلقوں میں اِن کی بے اندازہ شہرت ہے۔"

"جی یہ سب نعمانی صاحب کی ہمّت افزائی کی وجہ سے ہے یور ایکسیلینسی۔" نازنین نے فوراً کہا۔

گورنر نے مُسکرا کر نعمانی کی طرف دیکھا اور بولے: "اوہو نعمانی صاحب ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہوں گے، لیکن آپ تو پہلے سے زیادہ جوان نظر آ رہے ہیں۔"

نعمانی کھسیا گئے اور اُنھوں نے تیزی کے ساتھ گورنر سے ہاتھ ملایا۔

گورنر نے دوبارہ کہا۔

"آپ کی بیگم کہاں ہیں۔ وہ بھی تو سماجی خدمت میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں؛ پچھلی لڑائی میں زخمی فوجیوں کے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔"

"جی اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لئے نہیں آئیں"

"یور ایکسیلینسی! میں اب اچھی ہوں۔" پیچھے سے آواز آئی۔ مسز نعمانی ہانپتی ہوئی قطار توڑ کر آگے آئیں اور بولیں: "آپ سے ملنے کا شرف حاصل کرنے کی مسرت نے مجھے صحت مند کر دیا۔

"ادھر میں نے آپ کو یاد کیا اور ادھر آپ نظر آ گئیں۔ آپ کی عمر بہت

لمبی ہے۔ خدا کرے یونہی ہی ہو۔"

"یہ آپ کی نیک خواہشات ہیں جن کے لئے میں مشکور ہوں۔"

نعمانی کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ان کا منہ لٹک گیا جیسے ان کی بیوی نے عین موقع پر پہنچ کر اپنی طبیعت کی خرابی کے بجائے نعمانی کے دماغ کی خرابی کا ثبوت دے دیا ہو۔ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں گورنر کوئی دوسرا سوال نہ کر دیں۔ وہ ذرا ٹھہر کر بڑے غصے سے اپنی بیوی کو گھورنے لگے۔

نازنین آہستہ سے ہنس کر بولی: "ہائے رے۔ آپ کی مسز تو پہلوان جیسی ہیں، میں نے آج ہی دیکھا۔ ویسے خواتین کے رسائل میں بہت بار تصویر دیکھی ہے۔ آپ نے تو کہا تھا کہ انہیں گورنر کے آنے کا پتہ نہیں ہے اور پتہ چلے تب بھی بے اندازہ مصروفیت کی وجہ سے وہ نہیں آئیں گی۔"

نعمانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ گورنر ذرا آگے بڑھے تو وہ اپنی بیوی کے قریب آکر بولے۔ "رضیہ تم نے بڑا اچھا کیا جو آگئیں۔ میں دراصل تمہیں اطلاع دینا بھول گیا تھا۔ اب ایئر پورٹ کی ٹی پارٹی میں میرے بجائے تم شرکت کر لو۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔"

مسز رضیہ نازنین کی طرف پلٹیں اور نعمانی سے پوچھا "کیا یہ وہی مس رخسار بندوق والا ہیں جن کے محبت نامہ کو تم نے تجا کو کے ڈبے میں چھپایا تھا؟"

"رضیہ طنز" نعمانی بولے "یہ مس نازنین ہیں ـــ تم سے ملنے کی بہت خواہشمند تھیں، اس لئے میں نے فنکشن کے بعد تم سے ملنے کے لئے انہیں لانے کی ٹھانی تھا۔"

"اچھا" رضیہ نے طنز سے کہا۔ "ٹی پارٹی تمہیں ہی مبارک ہو۔ درخت اُکھاڑ مہم میں لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں چلی۔" اور وہ باہر جانے والے راستے کی طرف ہولیں۔

رات گئے نعمانی جب گھر لوٹے تو دونوں میں خوب ٹھنی۔

"میں نے جب تمہیں نہیں لے جانا چاہا تو تمہیں میری اطلاع کے بغیر وہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بہت خوب لوگو شہر میں میری ایک عزت اور انفرادیت ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لینے کے بجائے چپ چاپ اپنے ساتھ ایک غیر لڑکی کو دکھا کر شہر کے معززین کے سامنے تم نے میری ازدواجیت کا بھونڈا مذاق اڑایا ہے۔"

نعمانی چلائے: "تمہاری ازدواجیت کے پیچھے میں نے ہمیشہ اپنی آئیڈیل لائف کے تصور کو ملیامیٹ کیا ہے۔ میرے نازک احساسات تمہاری موجودگی میں مرجاتے ہیں۔ میں اپنے اطراف جو حسن اور دلکشی دیکھنا چاہتا ہوں وہ مجھے تم سے نہیں ملتی۔"

"میرے ساتھ پندرہ سال گزار کر اور میرے دو بچوں کے باپ بننے کے بعد ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیئے۔"

"پندرہ سال میری برداشت کی حد تھی۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس شہر کا بہت بڑا عہدیدار ہوں۔ میرے اختیارات وسیع ہیں۔ تو پھر زندگی مجھ پر کیوں تنگ ہونی چاہیئے۔ میرے اپنے بھی کچھ خواب ہیں، کچھ تصورات ہیں۔ میرے اختیارات میرے حسین خوابوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔"

"جی ہاں آپ کے اختیارات اب پندرہ برسوں کے بعد وسیع ہوگئے ہیں تو وہ لوگ جنہوں نے تنگ دامانی میں آپ کا ساتھ دیا تھا انہیں بوجھ بن جانا چاہیئے۔"

"میں بوجھ بننے کی بات نہیں کرتا لیکن سوسائٹی کے آداب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ پارٹیوں میں سب عہدیداروں کی کتنی خوبصورت بیویاں کتنی سج دھج کر ناز و ادا کے ساتھ محفل کی رونق کو بڑھا دیتی ہیں، لیکن تم اتنی بے ڈھب ہوتی جا رہی ہو کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھتا ہوں تو میں عجیب سی ندامت کے احساس میں ڈوب جاتا ہوں۔"

"تمہارے جملے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں نعمان کہ کبھی کبھی آدمی سماجی طور پر بلند تر رتبہ پا لیتا ہے تو اخلاقی طور پر گرتا بھی چلا جاتا ہے۔ ایسی کیفیت تعریف کے قابل نہیں ہو سکتی۔ ایسا آدمی چاہے کہے۔"

نعمانی نے چلا کر کہا: "تم مجھ سے کیا چاہتی ہو رضیہ۔ میری بلند سماجی پوزیشن سے تمہاری توقعات کی حدود کیا ہیں، بتا دو۔"

"کتنا مضحکہ خیز سوال کر رہے ہو مجھ سے۔ پندرہ سال کی رفاقت کے بعد ایک پارٹنر دوسرے برابر والے پارٹنر سے توقعات کی حدود پوچھ رہا ہے۔"

"پارٹنر شپ کا دار و مدار معاہدے پر ہوتا ہے۔ اور معاہدے کی شرائط

یا ختم کیا جاسکتا ہے: نعمان نے رُک کر دوبارہ کہا "پارٹنرشپ
تو ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"واہ واہ،" رضیہ نے کس قدر نفرت سے کہا: "میرے مرحوم اباجان
کو تمہارے تصورات کی اڑان کا پتہ چلتا تو میری حفاظت کے لئے زیادہ
اچھی تدبیریں کرلیتے۔ پارٹنرشپ کو ختم کرنے کی بات تمہارے ذہن میں
ہے تو جاؤ کسی قابل قانونی مشیر سے رائے لینے کے بعد مجھ سے گفتگو
کرلینا۔ قانونی مشیر خاطر خواہ رائے نہ دے تو پھر اپنے بچوں ہی سے
اس موضوع پہ بات چیت کرلینا۔"

نعمانی جھینپ گئے۔ کیونکہ رضیہ کے جملے کے اندر چھپی ہوئی طنز
نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا۔ اگر وہ رضیہ کو طلاق دینا طے کرتے تو مہر
ادا کرنے کے لئے تین لاکھ روپیوں کی رقم وہ نہیں لا سکتے تھے۔ اس
کے علاوہ جس بڑے بنگلے میں رہ رہے تھے، وہ جائداد رضیہ کے
والدین نے رضیہ کے نام پر لکھ دی تھی، اس لئے اُنھیں بنگلہ بھی خالی
کردینا ہوگا اور اُن کی شان میں فرق آجائے گا۔

نعمان جھلا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تین دن تک اُنھوں نے
کوئی بات نہیں کی۔ صبح جلد چلے جاتے اور رات میں دیر سے لوٹتے۔
تین دن تک وہ سوچتے رہے کہ اُن کی مشکل کا کوئی حل نکلنا ہی چاہیئے۔
رضیہ کو تین لاکھ روپے دینے کی بات بڑی ٹیڑھی کھیر تھی۔ اور بچوں سے
دستبردار ہوجانے کے لئے اُن کا ذہن تیار نہیں تھا۔

"میری شادی کو ہوئے پندرہ سال ہوگئے۔ پندرہ سال گزر گئے۔"
وہ ذہن میں دُہراتے رہے۔ اُنھیں خیال آیا کہ چار دن گزر جائیں گے
تو سولھواں سال شروع ہو جائے گا۔ ازدواجی زندگی کا سولھواں برس
چار دن کے بعد۔

چوتھے دن اُنھوں نے دوافروش کے ہاں جاکر خواب آور
دوا سفوف کی شکل میں خریدی۔ حلوائی مٹھائی والے کو بادام اور
پستے کے حلوے کا خصوصی آرڈر دیا۔ بادام کے حلوے میں اُنھوں
نے خواب آور دوا ملادی۔ پستے کا حلوہ یوں ہی رہنے دیا۔ پیکنگ
کرنے کے بعد ایک خوبصورت کارڈ پر لکھوایا۔

"مسٹر اور مسز نعمانی کے لئے
اُن کی سولھویں سالگرہ پر
اعظم سالار کی نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ"

شام کو مٹھائی کا ڈبّہ پہنچا دیا گیا۔ اُس کے بعد نعمانی گھر چلے گئے۔
نوکر نے مٹھائی کا ڈبّہ کھانے کی میز پر رکھا تھا۔ کھانے کی میز درمیانی
بڑے ہال میں رکھی تھی جو نعمانی کے کمرے کی راہ میں آتی تھی۔ میز کے
قریب ہوتے ہوئے جانا نعمانی کے لئے ضروری تھا۔

حلوے کے ڈبّے کو دیکھنے اور اُس پر لگے ہوئے لیبل کو پڑھنے کی
اُنھوں نے ایکٹنگ کی۔ اس کے بعد وہ اُچھل کر "رضیہ" کہتے ہوئے اپنی
بیوی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ رضیہ بیڈ پوشاک تیار کر رہی تھیں۔ اندر
جاکر بولے۔

"ڈیر آج ہماری شادی کی سولھویں سالگرہ ہے۔"

"جی ہاں ہے۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"مجھے بڑی ندامت ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا اور دیکھو تا اعظم بھائی
کو یاد رہا۔ صبح خیال آتا تو کم از کم بچوں کو ہی بورڈنگ سے بلالیتا۔
مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میں نے پچھلے دنوں تمہیں ناراض
کیا، مجھے معاف کردو رضیہ۔"

رضیہ آبدیدہ ہوگئیں۔ اور شوہر کا ہاتھ پکڑ کر بولیں: "میں جانتی ہوں
تمہارا دل بُرا نہیں ہے نعمان"

نعمان نے دل میں اپنے آپ سے کہا، "میرا دل بُرا نہیں ہے۔ اسی لئے
سوسائٹی کی سمجھدار اور خوبصورت لڑکیاں میرے قریب آنا چاہتی ہیں۔"

"آج ہم ساتھ میں کھانا کھائیں گے" نعمانی نے کہا۔ "بہت دنوں کے
بعد یہ موقع ملا ہے۔"

"میری بھی خواہش ہے۔" رضیہ نے کہا۔ "اعظم بھائی کو شکریہ کہنے کے
لئے میں نے کئی بار فون کرنے کی کوشش کی لیکن پتہ نہیں کیوں فون کا لائن
بگڑ گیا۔"

"اعظم بھائی اس وقت گھر پر ہوتے بھی نہیں۔ میں انھیں صبح فون کرکے
دونوں کی طرف سے شکریہ کہہ دوں گا۔"

نعمانی اپنے کمرے کی طرف گئے۔ تھوڑی دیر میں گھر کا پرانا خادم
کھانا کھانے کے لئے بلانے آیا۔
کھانا ختم ہوا تو نعمانی نے اپنی بیگم کی پلیٹ میں [illegible] کا حلوہ ڈالا اور
خود پستے کا حلوہ کھانے لگے۔

کھانے کے بعد وہ رضیہ کے کمرے میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر یکایک رضیہ نے کہا۔ شاید دن بھر زیادہ مشقت کرنے اور کسی قدر زیادہ کھا لینے کی وجہ سے وہ نیند کا خمار محسوس کر رہی ہیں۔

نعمانی اور رضیہ اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔

رضیہ نے کہا کہ وہ بے انتہا کمزوری محسوس کر رہی ہیں۔ ہاتھ پاؤں شل ہوتے جا رہے ہیں۔ نعمانی نے رضیہ کو سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا نرمی سے جسم کو ڈھانکتے ہوئے بولے۔

"تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر سو جاؤ تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔ میں تمہارے قریب ہی بیٹھا ہوں۔"

"نعمان ڈیئر" رضیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا "یہ کمزوری اور یہ خمار سا جو محسوس کر رہی ہوں یہ نیند کا نہیں ہے، یہ تھکن بھی نہیں ہے کیونکہ تھکن کے بعد نیند کے خمار میں ایک سرور سا لگتا ہے۔ میں کوئی سرور، آرام یا لطف محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ تکلیف دہ احساس ہے جو ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے کوئی دوا کھا لی ہو، خواب آور دوا یا زہر۔ کوئی بات ہے ڈیئر مجبوری اور لاچاری کا احساس ہو رہا ہے جیسے کشتی بھنور میں پھنستی جا رہی ہو۔ تم کار لے کر فوراً ڈاکٹر اشرف کو لے آؤ۔ اور ضمیر سے کہو کہ تب تک میرے نزدیک بیٹھا رہے۔"

"اچھا میں جا رہا ہوں۔" نعمان نے کھڑے ہو کر کہا "تم خواہ مخواہ فکر کر رہی ہو۔ آرام کے ساتھ لیٹی رہو۔ میں ممکنہ عجلت سے ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔"

نعمانی کمرے سے باہر آئے خوابگاہ کے دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور ملازم ضمیر کے پاس جا کر بولے۔

"تم اب جا سکتے ہو۔ کام جو باقی رہ گیا ہو وہ کل کر لینا۔"

تھوڑی دیر میں ضمیر بنگلے سے باہر کمپاؤنڈ میں بنی ہوئی اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

نعمانی نے بنگلے کا صدر دروازہ بند کیا اسے مقفل کیا اور کار لے کر میڈیکل کالج کے ہاسٹل کی طرف چلے گئے۔

ڈائننگ ہال میں انہیں تھرڈ ایئر کا میڈیکل اسٹوڈنٹ تنویر مل گیا اُس نے فوراً کہا۔

"انکل آپ کسی قدر پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔"

"ہاں میں پریشان ہوں بیٹے۔" نعمان نے تنویر سے کہا۔ "اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اپنا سرنج لے آؤ اور میری کار میں بیٹھ جاؤ۔ آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے فیملی ڈاکٹر پچھلے تین روز سے شام کو انجکشن دینے آتے تھے۔ آج وہ نہیں آئے۔ فون پر اطلاع ملی کہ اُن کے ایک عزیز کی حالت بہت خراب ہے جسے دیکھنے کے لئے وہ شہر سے باہر گئے ہیں۔ صبح تک نہیں آئیں گے۔ میں نے سوچا کہ پینی سلین کے ایک انجکشن ہی کی تو بات ہے تم بھی دے سکتے ہو۔"

"ہاں میں دے سکتا ہوں چلئے۔ میں ابھی دوڑ کر سرنج لے آتا ہوں۔"

چند ہی منٹوں کے بعد کار اسٹارٹ ہو گئی۔ اپنے بنگلے پر پہنچ کر نعمانی نے قفل کھولا۔ اور اندر جانے کے بعد اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دی۔

"انکل" تنویر نے کہا۔ "اس شیشی پر لیبل تو ہے ہی نہیں۔"

"ہاں بیٹا" نعمانی نے کہا۔ "صبح گرم پانی میں شیشی گر گئی تھی تو لیبل بھیگ کر نکل گیا۔ تم اس کی فکر نہ کرو سرنج میں دوا بھر لو اور انہی کی کمر میں لے لگا دو۔ انہیں پسند نہیں آئے گا کہ نوکر کے ہاتھ سے انجکشن لگے۔ لیکن تمہارے اندر اعتماد پیدا کرنے کے لئے میں تمہاری ہمت افزائی کر رہا ہوں۔ میں اندر جا کر اُن کے کپڑے ہٹاتا ہوں۔ تم انجکشن دے کر فوراً باہر نکل جاؤ۔"

تنویر نے سر ہلا کر "اچھا" کہا۔

نعمانی خوابگاہ میں آئے۔ رضیہ بے سُدھ پڑی تھی جیسے سو رہی ہو۔

"رضیہ" نعمانی نے زور سے پکارا۔

کراہنے کی ذرا سی آواز آئی۔

"ڈاکٹر اشرف آئے ہیں وہ تمہیں انجکشن دیں گے۔"

ہلکی سی کراہ بھرائی جیسے آواز نکالنے میں بھی تکلیف ہو رہی ہو۔

نعمانی اپنے اندر ہی اندر رضیہ کو مخاطب کر کے بولے "ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے پر تمہاری سرپرستی میں درخت اگاؤ مہم چل رہی ہے اُس کے قریب ایک بڑی کھاڑی ہے۔ کھاڑی سے ملحقہ ایک چھوٹا نالہ ہے۔ آخری انجکشن ہے لو رضیہ میں نے تمہیں وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا ہے۔ ایک تھیلے میں ٹھونس کر میں خود ہی تمہاری لاش کو اپنے کندھے پر اُٹھاؤں گا۔

[illegible] کہ یہاں تم جہاں بیٹھی ہوئی اپنی نگرانی میں گئے ہوئے نرسوں کی نگرانی کر رہی ہوگی۔

نعمانی نے باہر جاکر تنویر کو بلایا۔ انجکشن کی سوئی گڑنے پر رضیہ ایک مرتبہ اور کراہی۔ اپنے بچوں اور شوہر کو بھی بوجھل آواز میں پکارا۔

’’انکل‘‘ تنویر نے آہستہ سے کہنا شروع کیا: ’’امی کی آواز——‘‘

’’ہش!‘‘ نعمانی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اُسے فوراً خاموش کر دیا۔

تنویر چلا گیا۔ نعمانی نے رضیہ کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض کی رفتار تیزی سے گرتی رہی —— گرتی رہی —— گرتی رہی۔

اور رضیہ کی زندگی کے عنوان پر موت کی سیاہی پھیل گئی۔

نعمانی کو پسینہ چھوٹا وہ بڑبڑائے۔

’’تم مرگئیں رضیہ‘‘

وہ کمرے سے باہر گئے اور اس بات کا جائزہ کر لیا کہ باہر کھلنے والے تمام دروازے بند ہیں۔ گھر میں اُن کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

نعمانی کمرے میں واپس آگئے۔ اُن کا جسم پسینے سے تر تھا۔

وہ دوبارہ بڑبڑائے۔

’’میں نے تمہیں لوٹ کر کبھی نہ آنے والے راستے پر بھیج دیا ہے اگر تم قدرتی موت مری ہوتیں تو اس وقت چیخ چیخ کر رو رہا ہوتا۔ اور ہمدردی جتانے کے لئے یہاں پر بہت سے لوگ جمع ہوتے لیکن اب میں تنہا ہاتھ ملتا رہوں۔ میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرے گا۔‘‘

نعمانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور لاش کے سامنے وہ بولے۔

’’تم جیسی بیوی غلطیوں کو معاف کرکے اپنی محبت کا ثبوت دیا کرتی تھیں۔ اپنے دل و دماغ میں طے کر کے اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کے معاف کر دئیے جانے کا سند لیسہ دیا کرتی تھیں۔ تمہارے دل و دماغ کو ہی نہیں بلکہ تمہاری زبان اور آنکھوں کو بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کے بعد اب مجھے خیال آرہا ہے کہ میری کوئی قیمتی چیز چھن گئی ہے اور میں بے بس ہو گیا ہوں۔‘‘

نعمانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور لاش سے لپٹ کر بولے

’’تمہارے جسم میں لگائے ہوئے زہر کے انجکشن کی سوئی کا نشتر میں اپنے وجود میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں احتیاط کے باوجود بار بار یہ خیال بے ضابطگیوں کے خلاف اُٹھتا رہتا ہے۔ اب ہر لمحہ [illegible] تو مجھے اپنی غیر قانونی حرکت کی یاد دلاتی رہے گی۔ اور زہر کی سوئی کی چبھن بڑھ جائے گی۔ یہ احساس میرے لئے پھانسی کے پھندے سے کم نہیں ہوگا۔ فرق اتنا ہوگا کہ اس سولی پر لٹکنے اور تڑپنے کے باوجود میں [illegible] یہ سزا زیادہ کڑی نہیں ہوگی۔

’’قانون کے ہاتھ ——‘‘ آواز پر نعمانی گھبرا کر پلٹے لیکن فوراً انہیں پتہ چل گیا کہ یہ آواز اُن کے [illegible] ضمیر کی نہیں بلکہ اُس ضمیر کی ہے جو اب اُن کے اوپر حاوی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ▲

بقیہ صفحہ ۷۸ ۔ دلّی کی شام

بلقیس جہاں کی یہ برجستہ عبارت یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ ترجمہ نہیں ہے کیونکہ بلقیس جہاں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ناول کی اصلی زبان کی رُوح کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ بقول عزیز احمد

’’اُس کا اسلوب پُرانے طرز کا ہے جو پریم چند سے پہلے مقبول تھا‘‘

’’دلّی کی شام‘‘ جدید اُردو ناول نگاری میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ اور فنی اعتبار سے یہ ایک مکمل ناول ہے۔ حالانکہ ٹیکنیک بہت پُرانی ہے جس میں کوئی انوکھا پن یا جدّت پیدا نہیں کی گئی ہے، بلکہ کہانی بہت معمولی اور سیدھے سادے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی اور فن کا گہرا امتزاج ملتا ہے۔ بقولِ وقار عظیم

زندگی اور فن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہانی کی دنیا کا سفر کرتے ہیں اور اس گہرے ربط کے سلسلہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔[2]

الغرض ناول نگار نے کردار سے زیادہ ماحول پر زور دیا ہے۔ واقعات حقیقی ہیں، واقعات کی ترتیب فطری ہے اور ایک مقصد کے تحت [illegible] واقعہ میں کافی گہرا تعلق ہے، جس کی مثال اُردو کے کم ہی ناولوں میں ملے گی۔ ’’دلّی کی شام‘‘ اُردو ناولوں میں ایک بیش قیمت اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے، جسے اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ ▲

---

[1] ترقی پسند تحریک۔ عزیز احمد۔ صفحہ ۱۰۳ [2] نیا افسانہ۔ وقار عظیم۔ صفحہ ۱۸۱

ماہر منصور

اندیشہ

یہ غم جو میری ہستی پر
کئی برسوں سے چھایا ہے۔
کبھی زہرِ ہلاہل تو کبھی تریاق بنتا ہے۔
کبھی راتوں کو سورج کی طرح تاریکیوں کا قتل کرتا ہے
کبھی دن میں اندھیرا بن کے چھاتا ہے
کبھی یہ چلچلاتی دھوپ میں ابرِ رواں
بادِ صبا بن کر گزرتا ہے
کبھی صحرا کی لو بن کر بہاروں کو جلاتا ہے
کبھی میری اپاہج زندگانی کا سہارا ہے

بہر صورت
اک ایسا باب ہے میری کتابِ زیست کا
جس کو
ہزاروں بار سوچا ہے
کہ اپنی زندگی سے کاٹ کر پھینکوں
میں ایسا کر بھی سکتا ہوں
مگر ڈر ہے،
کہیں تنہائیوں کی طرح دیمک چاٹ نہ جائے۔!!

شب خون

پگھلتی ہوئی روشنی چیتنا کی
مری فکر کی تھی انوکھی امانت
امانت
مری روح کے اندھے تابوت میں قید تھی جو
مرا ذہن جس کا محافظ بنا تھا
مرا جسم دیوار بن کر تھا حائل
مگر ایک دن
سوچ کی دھوپ کی تیرگی نے
حوادث کی سازش سے مجبور ہو کر
خیانت کی بوسیدہ تلوار لے کر
بغاوت کی سیڑھی پہ چڑھ کر
مری چیتنا کے اجالے کے اوپر
نہایت دلیری سے شب خون مارا

ابراہیم یوسف

ایک قدیم ڈراما ـــــ صولتِ عالمگیری

جب بھی ہم اُردو کے ابتدائی ڈراموں اور تھیٹر کے متعلق بات کرتے ہیں تو غیر اختیاری طور پر ہمارا ذہن بمبئی کے اُس تجارتی تھیٹر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کو عرفِ عام میں پارسی تھیٹر کہا جاتا ہے۔ ابتدائی ڈرامے اور تھیٹر کی دیگر مقامات پر کیا خدمات انجام دی گئیں مشکل ہی سے سوچتے ہیں۔ عشرت رحمانی نے سب سے پہلے بنگال میں اُردو ڈرامے کی خدمات کے بارے میں لکھا ہے۔ خاص طور پر مشرقی بنگال میں اُردو تھیٹر کے قیام اور چند اُردو ڈراموں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مگر تاریخوں کی نشاندہی کو اوّل تو انھوں نے نظر انداز کیا ہے اور جہاں کہیں تاریخیں دینے کی کوشش کی ہے وہاں وہ خود اُلجھ گئے ہیں جس سے قاری کے ذہن میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔ خلاصۃً تحریر فرماتے ہیں کہ: "بعدازاں ماسٹر احمد حسن حافظ (ڈاکٹر ناؔمی نے محمد حسین واقف لکھا ہے) نے ایک نیا ڈراما بلبلِ بیمار لکھا۔ یہ ڈراما نویسی کے اُس دور میں ایک نیا موڑ تھا اور ڈھاکہ کی ڈرامائی تاریخ کی تبدیلی ایجاد پسندی کا نیا باب تسلیم کیا جاتا ہے۔

انھوں نے اس ڈرامے میں پہلی بار نظم کے ساتھ مکالموں میں سلیس و شستہ نثر کو شامل کیا اور گانوں کا انداز بھی بدلا ہوا تھا اب سرزمینِ مشرقی بنگال میں اُردو ڈراما اور تھیٹر کو باقاعدہ عروج نصیب ہوا۔ یہ تقریباً ۱۸۷۶ء کے اوائل کا دور تھا۔"[۲] — اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احمد حسن واقف نے بلبلِ بیمار ۱۸۷۶ء میں یا اس سے پہلے لکھا تھا جبکہ ڈاکٹر ناؔمی نے ببلیوگرافیا اُردو ڈراما حصّہ اوّل صفحہ ۱۹۷ پر واقف کے ڈرامے بلبلِ بیمار کا سنہ ۱۸۸۰ء تحریر فرمایا ہے۔ اگر عشرت رحمانی کی تاریخ کو تسلیم کر لیا جائے تو بلبلِ بیمار کو اُردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ انھوں نے اس ڈرامے کے اقتباسات بھی دیئے ہیں[۳] — ان اقتباسات پر نوٹس لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ ڈراما نثر میں پہلی تصنیف اور اندر سبھا کے بعد اُردو ڈراما نگاری میں پہلا موڑ ہے۔ مکالموں میں نثر و نظم شامل ہیں۔" — ڈاکٹر ناؔمی ببلیوگرافیا اُردو ڈراما حصّہ دوم صفحہ ۵۵۳ پر اس ڈرامے کی تفصیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بلبلِ بیمار سنہ ۱۸۸۰ء
مصنفہ واقف مولوی احمد حسین
پہلا ایڈیشن مطبوعہ ڈھاکہ
نسخہ نمبر ۱۲ ڈھاکہ سنہ ۱۸۸۰ء
انڈیا ہاؤس لائبریری لندن۔"

ناؔمی صاحب کی تفصیل میں تاریخوں کا اختلاف نظر آتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۰ء اور اس جگہ پر سنہ ۱۸۸۰ء کی تاریخیں دی گئی ہیں۔ یہ اختلاف کیونکر پیدا ہوا اس پر تو ناؔمی صاحب ہی روشنی ڈال سکتے ہیں مگر اس تفصیل کے بعد عشرت رحمانی تاریخ سنہ ۱۸۷۶ء مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہاں ان اختلافات سے بحث مقصود نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد صرف اس قدر

---

۱ اُردو ڈراما تاریخ و تنقید از عشرت رحمانی ص ۱۴۸ – ۱۴۹
۲ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۵۳ سے ۲۶۵ تک
۳ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۵۳

ہے کہ جس زمانہ میں بمبئی میں اُردو ڈراما اور تھیٹر اپنے قدم جما چکا تھا ہندوستان کے دوسرے علاقے مشرقی بنگال میں بھی اُردو ڈراما اور تھیٹر موجود تھا اور اس غیر اُردو علاقے میں اُردو ڈرامے لکھے اور کھیلے جاتے تھے۔ واجد علی شاہ کے کلکتہ پہنچنے پر اُردو ڈرامے کا اور ذوق پیدا ہوا۔ خود واجد علی شاہ نے اپنے کئی رہس کلکتے میں قائم کئے۔ واجد علی شاہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں لکھتے ہیں کہ ان جلسوں کو قائم کئے ہوئے چھ سات برس ہو چکے ہیں۔ کُل جلسے جو واجد علی شاہ نے کلکتہ میں سنہ ۱۲۹۲ھ تک قائم کئے اُن کی تعداد تیئیس ہے۔[1]

یہاں اسی دور کے ایک ڈرامے کا تعارف کرنا مقصود ہے۔ یہ ڈراما سنہ ۱۲۹۲ھ میں تصنیف کیا گیا تھا اور اس کے مصنف ہیں سید ابوالفضل الفیاض اور ڈرامے کا نام "صولتِ عالمگیری"۔ ڈرامے کے پہلے صفحہ کی تفصیل اس طرح ہے

ناٹک

صولتِ عالمگیری

از تصنیفات

دانشور عالی گہر۔ منبع علم و ہنر

مولوی سید ابوالفضل الفیاض

بنگارش پردازی

منشی احمد علی خاں صاحب

در سنہ ۱۲۹۲ھ

مطبع برکتی

متصل مدرسہ عالیہ کمپنی بہادر محلہ مصری گنج بمکان نمبر ۲۰

حلیۂ انطباع پوشید

قیمت فی جلد ایک روپیہ

سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق سنہ ۱۸۷۵ء کا ڈراما قدیم ڈراموں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر نامی نے ببلیوگرافیا اُردو ڈراما حصہ اول ۱۳۲ پر اس ڈرامے کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مصنف کے نام میں غلطی کی ہے۔ الفیاض کو فیضی کر دیا ہے۔

موجودہ تحقیقات کی روشنی میں اُردو کا سب سے پہلا دستیاب شدہ ڈراما: "خورشید" ہے جو سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھا گیا تھا اور جو اب تک گجراتی رسم خط میں موجود تھا۔ اس ڈرامے کو ڈاکٹر مسیح الزماں نے سنہ ۱۹۷۳ء میں اُردو رسم خط میں کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ: "میری عزیز شاگرد مسلّمہ نشاط کو اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں گجراتی رسم خط میں یہ کمیاب ڈراما ملا جسے اُردو میں منتقل کر کے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوا ....

موجودہ حالات میں اُردو تھیٹر کا یہ قدیم ترین ڈراما ہے جو سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھا اور کھیلا گیا۔ اب پہلی بار اُردو رسم خط میں شائع کیا جا رہا ہے"[2]

پھر فرماتے ہیں کہ: "اُنھوں نے (دادا بھائی سہراب جی پٹیل) ایدل جی کھوری سے ایک اُردو ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن وہ اُردو زبان سے ناواقف تھے۔ اس لئے اُنھوں نے ایک ہندو ڈراما "کالا ونتی" سے پلاٹ اخذ کر کے ایک ڈراما بنام "سونا نا مول نی خورشید" گجراتی زبان میں لکھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کا ترجمہ کون کرے؟ بہرام جی فریدوں جی مرزبان نے بدقّت تمام اس کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ مرزبان پارسی ہفت روزہ اخبار راست گفتار کے مالک تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف ترجمہ اُردو میں کیا بلکہ ڈرامے میں بہت سی تبدیلیاں کیں لیکن حق المحنت کچھ نہ لیا"

اس ڈرامے کی دیگر تفصیلات ڈاکٹر زماں نے اپنے مضمون "اُردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما" مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی اگست سنہ ۱۹۷۳ء میں دی ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر نامی کے بیانات کی روشنی میں "خورشید" کی حیثیت ماخوذ ترجمہ کی رہ جاتی ہے جو سو سال بعد اُردو رسم خط میں شائع کیا گیا ہے۔ اس لئے اسے اُردو کا پہلا ترجمہ شدہ ڈراما ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے "صولتِ عالمگیری" سنہ ۱۲۹۲ھ میں خالص اردو زبان میں لکھا گیا اور اُردو رسم خط میں شائع کیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وفا راشدی نے "بنگال میں اردو" لکھی تو نہ اس ڈرامے کا تذکرہ کیا اور نہ مصنف کے بارے ہی میں لکھا۔ اسی طرح جاوید نہال نے اپنے تحقیقی مقالہ "انیسویں صدی میں بنگال میں اُردو ادب"[3]

---

[1] اردو ڈراما اور اسٹیج۔ ابتدائی دور کی مکمل تاریخ از مسعود حسن رضوی ادیب صفحہ ۱۹۸ [2] خورشید مرتبہ و مولفہ ڈاکٹر مسیح الزماں صفحہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

میں بھی ڈرامے اور مصنف کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے جبکہ اس ڈرامے کے پہلے صفحہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی ادبی تصنیفات ہیں۔ ایک اور حیرت کی بات یہ ہے کہ محمد یامین پروڈیوسر نے "اُردو چھاپے خانے" (مطبوعہ ماہنامہ آجکل دسمبر ۱۹۵۸ء) میں بنگال کے چھاپے خانوں اور اُن کی مطبوعات کا ذکر کیا ہے لیکن مطبع برکتی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جبکہ ۱۲۹۲ھ میں یہ مطبع موجود تھا اور اس میں کتابیں ٹائپ میں چھپ رہی تھیں۔

"صولت عالمگیری" کے مصنف سید ابوالفضل الفیاض نے خود کو رنگپوری لکھا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں: "بعد حمد و نعت کے صاحبانِ والا رتبت و فاضلانِ عالی منزلت پر ہویدا ہوے کہ اِس سید ابوالفضل الفیاض رنگپوری ابنِ ناظم ابوالحیات بیربھومی عفی اللہ تعالیٰ نے اِس کتاب کو اس وضع خاص پر لکھا ہے جس کو نکتہ دانِ انگلستان و دقیقہ فہمانِ یورپ ڈراما کہتے ہیں۔" اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید ابوالفضل الفیاض رنگپور کے رہنے والے تھے۔ دیباچہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "مصنف نے اِس کتاب کی تصنیف میں اہلِ انگلستان کا اتباع اور حتی الامکان قوانین ناٹکیہ کا پاس کیا ہے۔" اِس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن کے پیشِ نظر انگریزی ڈراموں کی مثالیں تھیں اور انہی اُصولوں پر انہوں نے اپنے ڈرامے کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈراما لکھنے کے مقصد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "علمائے یورپ ڈراما کے ذریعہ سے اقسام توجہات کے وضع اور علم کی ترقی کلام کو نشر اور زبان کو وسیع کرتے جاتے ہیں۔ اِس کتاب کے لکھنے سے مصنف کا بھی یہی غرض ہے کہ اہلِ زبان لوگ اُردو زبان کی ترقی کریں۔ علمائے اوّلین و آخرین نے اِس وضع خاص کے کلام کے فضائل بہت لکھے ہیں۔ انشاءاللہ اس کے فضائل کے بیان مع قوانین ارسطو علیحدہ بالتشریح لکھے جائیں گے۔" صاف ظاہر ہے کہ مصنف کے پیشِ نظر ڈرامے میں اُردو زبان کی ترقی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے اُن اصولوں کو عام کرنا ہے جو ارسطو نے بیان کئے ہیں۔ مصنف نے ارسطو کے اصولوں کا لکھا یا نہیں، اِس کا پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مصنف ڈرامے سے دلچسپی رکھتا ہے اور اُس کے پیشِ نظر انگریزی ڈراما ہے۔

مصنف نے ایکٹ کے لئے "معاملہ" اور سین کے لئے "نمائش" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پہلے ایکٹ میں تین سین دوسرے میں آٹھ، تیسرے میں نو، چوتھے میں ایک اور پانچویں میں چار سین ہیں۔ اس طرح پورا ڈراما پانچ ایکٹ اور پچیس سین پر مشتمل ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ اورنگ زیب عالمگیر اور سمبھوجی کی جنگ سے متعلق ہے۔ گویا ڈراما تاریخی ہے۔ اس لڑائی میں مرہٹوں کو شکست ہوتی ہے اور سمبھوجی گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اس سے اطاعت قبول کرنے اور مذہب اسلام قبول کرنے کو کہتا ہے جس پر سمبھوجی یہ شرط رکھتا ہے کہ اگر شہنشاہ اُس کی لڑکی کی شادی اُس کے ساتھ کردیں تو وہ شہنشاہ کی دونوں شرطیں قبول کرنے کو تیار ہے۔ شہنشاہ کے لئے اس قسم کی شرط غیر متوقع ہے۔ علماء کے سامنے سمبھوجی پر الزامات کی فہرست سنائی جاتی ہے جو فارسی میں ہے اور اُن سے فتویٰ معلوم کیا جاتا ہے اور فتوے کے مطابق انصاف کیا جاتا ہے۔ اس تاریخی واقعہ کے ساتھ سمبھوجی کی لڑکی کا عشق سپہ سالار اسد خاں اور فتری کی لڑکی کا عشق دلیر خاں سے دکھایا گیا ہے جو عالمگیر کی فوج کا ایک افسر ہے۔ اسد خاں لڑائی میں مارا جاتا ہے اور پدمنی خودکشی کر لیتی ہے [illegible] کے ساتھ پدمنی کی لڑکی بھی خودکشی کر لیتی ہے۔ اسی وقت دلیر خاں بھی وہاں آتا ہے اور دونوں کی لاشیں دیکھ کر خود بھی خودکشی کر لیتا ہے۔ اس طرح ڈرامے کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے۔

ڈرامے کے زیادہ تر کردار تاریخ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے کردار نگاری کا زیادہ سوال پیدا نہیں ہوتا [illegible] غیر تاریخی کردار ہیں اُن کے ذریعہ مزاح اور [illegible] ہے۔ مثال کے طور پر [illegible] ایک [illegible] گر خود کو بزعم خود بڑا شاعر ظاہر کرتا ہے مگر اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ وہ صرف ایک ہی مصرعہ کہہ سکتا ہے مگر ملک الشعراء ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ فریب [illegible] مزاحیہ پلاٹ [illegible] زینت الملک اور شہزادہ اعظم کے [illegible] شادی کی محفل جم جاتی ہے وہیں [illegible] کے جوہر کھلتے ہیں۔ [illegible] زینت الملک

کے خیرہ جوانی جی ہوئی ہے کہ امیر لعل محمد سے شعر پڑھنے کی فرمائش
کرتا ہے۔

لعل: فرمایئے ہوئے، قبلہ جمال فرماویں (مصرع) یہ چاہے ہے میرا
کہنا اور بیچ ہے میرا شتاب

امیر: [illegible]

کاشی: جناب والا یہ بے نظیر شاعر ہیں۔

بیدل: اس میں شک کیا ما شاء اللہ صورت شکل بھی دیکھیے ہی
ہے اور ایک میر بیٹھا ہوا دیکھیے

حکیم: مصرع ثانی نکل گیا

کاشی: سچ ہے آپ کو کیوں کر معلوم ہوا

حکیم: قارورے سے

اس سے پہلے لعل محمد رات زیادہ پیشاب ہونے کی شکایت کر چکا تھا اب بیچارہ دوسرا مصرع نہیں کہہ سکتا تو امیر زمن الملک بیدل سے دوسرا مصرع کہنے کی فرمائش کرتا ہے۔ بیدل ازراہ مذاق دوسرا مصرع کہتا ہے۔

بیدل: الشیطان الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس

لعل: درست کیوں نہ ہو دہلی اشرف المکان ہے۔

حکیم: شاعر شاعر را می شناسد

لعل: درست قبلہ۔ (مخاطب بہ بیدل) یہ ناس کا سین کیا ہوا

حکیم: ناس تیز تھی چھینک کے ساتھ نکل گیا۔

بیدل: نہیں جی۔ رعایت قافیہ کے واسطے حذف کیا گیا ہے۔

لعل: درست معلوم ہوتا ہے یہ مصرعہ بحر رمل سے آیا ہے۔

بیدل: اس میں شک کیا یہ پورا بحر رمل ہے۔

اس طرح لعل محمد کے ذریعہ مزاح اور دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختلف مکالموں میں بہت مزاح نظر آتا ہے۔ زبان حسب حال استعمال کرنے کی کوشش کرتا۔ سمبھو جی کے دربار میں ہندی میں مکالمے لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سمبھو: باد شاہ نے کیا سمجھا اس کیا۔ وہ تو ہمارا ذات اور باپ کا دشمن ہے۔ کیوں منتری کیا کہتے ہو۔

کلو: بیشک مہاراج ہم لوگوں کا کس چیز کا اناٹن ہے مہاراج

دیری کرنا چوکنی نہیں ستر و ناس کی جلدی ادپاد کرنا چاہیئے۔

بھوت: (آہستہ ایک جانب میں) یہی تو راجہ کو خراب کیا۔ اس وقت کیا ہی منتر نا دینا چاہیئے۔ جیسا راجہ ویسا ہی منتری شتابی ادبیچہ آگے چل کر اسی سین میں

سمبھو: سنو جی منتری کیا کہتا ہے۔

بھونسلے: مغلوں کا داڑھی دیکھ کر منتری ڈر گیا ہے منتری کام کچھ کرنے ہوگا نہیں۔

بھوت: (آہستہ) تم کو سرناس کرنے کا فکر کئے ہو

سمبھو: منتری۔ (اشارہ بہ بھوت) بادشاہ ہم سے کس بات میں بڑا ہے۔

بھوت: سب بات میں۔ دھن میں۔ تن میں۔ حکمت میں۔ حکومت میں بچار میں اور کیا کہیں۔

بھونسلے: مہاراج شرف بداتی سے کام نہیں بنے گا۔

سمبھو: تمام اشوار لو

بھونسلے: وہی کرنا ہوگا

اب جاہل سپاہیوں کے خیالات اور زبان ملاحظہ ہو۔

عیدو: ارے بھو سوار بہر کوڑ در بھٹوں) لوگوں کا ایلچی پہاڑ پر چھپا آیا ہے۔ وہ کہتا ہے مرکٹو لوگوں کا دیوتا ان لوگوں کا سیہ سالار ہوا ہے۔

مسا: اسکا (اسکا) قیصر (کچھ) حالات بھی سنے ہو

عیدو: ہاں جی۔ سر اس کا شاہی مسجد کا گنبد کا سا ہے اور اور ڈھال کی برابر تین بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور ایسا زور آور ہے کہ وہ دو سو تین تین سو آدمی کو زمین پر پٹک دیتا ہے۔

عطا: اس کا نام دام بھی کچھ سنے ہو۔

عیدو: ہاں جی اس کا نام بھی دیو کا سا ہے اس کو سب کوئی دعا باجی بھونسلے کہتے ہیں۔

فراش: خدا کی قسم

عطا: ۔۔۔۔۔۔ اور آگے ملاحظہ ہو

عطا: ہاں جی اگر اس کو سردی لگا ہوگا تو پھر اور مشکل ہوگی تم ایک

عطا: سچ

جاؤ گے۔ ارے عیدو اس کا دم ہے یا نہیں

عیدو : ہے نہیں تو کیا

عطا : تو پھر ڈر کیا۔ دم پکڑ کے قابو کریں گے۔

عیدو : اُس کا دم محض چھوٹا ہے تم پکڑا جاؤ گے

عطا : تو اُس کو اندھا کرنے کی فکر کرو

مینا : وہ سب تیور دیکھو) نہیں بنے نا (گا) خورد کا گوشت دگورد کا گوشت) جیب میں رکھو اور تعویذ خود کارجی سے لکھوا لو۔ اپنے سے بھو نسلے گھونسلے میں جا کر ڈھوبطے کھائے گا۔ ہم خوزرات دگجرات) میں کتنے سمندری دیوں سے لڑے ہیں یہ تو جنغلی (جنگلی) دیو ہے۔

اورنگ زیب کے دربار میں جو گفتگو ہوتی ہے اُس کا بڑا حصہ فارسی پر مشتمل ہے ڈرامے میں کہیں بھی مقفیٰ اور مسجع زبان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ زبان کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہیں کہیں زبان کی معمولی غلطیاں نظر آتی ہیں۔

ڈرامے میں مرہٹوں کی ایک قبیح رسم کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ میدانِ جنگ میں جاتے تھے تو فتح کے لئے انسان کی قربانی دیتے تھے اور قربانی کے لئے کسی بھی غریب انسان کو پکڑ لیتے تھے۔

ڈرامے میں کوئی ضمنی پلاٹ نہیں ہے۔ پدمنی اور کچھمن کا عشق ... کا مقصد لڑائی، قربانی کی تیاریاں ... اور نگ زیب اپنے لڑکوں کو ترغیب دیا کرتا تھا۔

بہر حال ابتدائی دور کا یہ بہت ہی اہم ڈرامہ ہے جو اُس زمانہ کی عام روش سے ہٹ کر لکھا گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ڈرامے کو دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ ابتدائی ڈراموں کی بکھری ہوئی کڑیوں میں ایک اہم کڑی کا اضافہ ہو سکے اور جو صاحبان کلکتہ میں اُردو پر کام کر رہے ہیں وہ مصنف اور اُس کی دیگر تصانیف کے بارے میں چھان بین کر کے تاریخ ادب میں مصنف کی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔ ▲

خمار قریشی

جنگل چھپائے خود میں وہ چہرہ ہے دھوپ میں
بچ کر چلو کہ درد کا پہرا ہے دھوپ میں

پرچھائیوں کے جال سے آزاد ہے مگر
وہ شخص بے سبب نہیں ٹھہرا ہے دھوپ میں

پتوں کی گونج کون سنے کس طرح سنے
ہر سایہ داد خواہی سے بہرا ہے دھوپ میں

گاؤں کسی کا شہر کی دلدل میں پھنس گیا
ندی کا خواب کتنا سنہرا ہے دھوپ میں

کتنے سوال سایۂ وحشت میں حل کئے
پھر بھی ترے سوال کا پہرہ ہے دھوپ میں

سارے درخت اتنے تناور نہ تھے خمار
اُجڑا درخت جتنا کہ گہرا ہے دھوپ میں

غزلیں

مدحت الاختر

تمیز اُٹھ گئی تعریف کی اور گالی کی
چلی ہے رسم یہاں تیری ہم خیالی کی

ستم ظریف خداؤں نے التجا سُن لی
دیا ہے ظرف سخی کا نظر سوالی کی

تمام شہر سیاہی کی زد پہ لرزاں تھا
گزر گئی جو عجب رات تھی دوالی کی

بھرے جہان میں جن کی مثال مل نہ سکی
مثال بن گئے وہ لوگ بے مثالی کی

نہیں جو کوئی خریدار غم نہیں فرحت
کہ ہم نے جنسِ طلب سے دکان خالی کی

فیض الحسن خیال

مسکراتے ہوئے آنسو جو نہیں پی سکتے
عمر بھر پیاس کے صحرا میں رہا کرتے ہیں

کس طرح شہر کے وہ لوگ محافظ ہوں گے
اپنی تہذیب پہ جو وار کیا کرتے ہیں

جن کی نظروں میں اُبھرتا ہی نہیں نقشِ وفا
کیوں وہ احباب کے چہروں کو پڑھا کرتے ہیں

اُن کی راہوں میں اُجالا ہی اُجالا ہوگا
جو اندھیروں میں سلیقے سے چلا کرتے ہیں

کون سا شہر ہے، ہم لوگ کہاں آئے خیال
لوگ جسموں کو بھی نیلام کیا کرتے ہیں

شمیم خالد

پرایا غم

"یہ سالے گیہوں نے" گھر کے بیچ میں تھیلی پٹختے ہوئے منّو نے کہا۔ ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس گیہوں کی قلت کے زمانے میں اتنے گیہوں کہاں سے لایا۔ سوال کا جواب اُسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اُس نے خاموشی سے تھیلی اُٹھائی اور رسوئی میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ رسوئی سے نکلی تو اُس کے ہاتھوں میں کھانے سے بھرا ہوا تھال تھا۔

وہ خاموشی سے کھانا حلق سے اُتارنے لگا۔ بچپن میں اُس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ کھاتے وقت باتیں کرنے سے کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے۔ پر یہاں زیادہ کھانے کے لئے تھا ہی کہاں۔ کھاتے کھاتے وہ یکایک بول پڑا "دیکھو ماں تو اپنے چھوٹے بیٹے کو کہنا کہ ہڑتال وڑتال کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کی جانے والی ہڑتال میں حصّہ لے رہا ہے۔ کمشنر صاحب کو پتہ چل گیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔ اُسے ہڑتال کرنے کی کیا ضرورت۔ ہمیں دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی جس کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ کس مائی کے لال میں اتنا دم ہے کہ وہ "نواسٹاک" کر سکے۔ بڑا چلا ہے غریبوں کا ہمدرد بننے"

"چل خاموشی سے کھانا کھالے۔ اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عمر کا جذباتی دور ہوتا ہے اس عمر میں آدمی جو کچھ کرتا ہے وہ ایک تجربہ ہوتا ہے، آنے والی زندگی کیلئے۔ تو بھی تو اس عمر میں ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ تیرے پتا بھی تو ایسے ہی تھے۔" ماں نے کہا۔

وہی تو میں کہتا ہوں جب تجربوں کا انجام سامنے ہو تو پھر تجربہ کو دہرانے سے کیا حاصل۔ پھر یہ غم اپنا کہاں ہے جو اُس کے لئے اپنے کو گھلایا جائے۔ اپنا غم تو ان غموں سے بالکل مختلف ہے اپنا غم تو یہ ہے کہ ہم بڑے بنتے بنتے غریب بن گئے، ڈاکٹر بنتے بنتے پولیس والے بن گئے۔

(۳)

"ہلو ہلو!! یس کمشنر پولیس اسپیکنگ"

"میں شنکر لعل بات کر رہا ہوں"

"ارے آپ سیٹھ جی! نمستے نمستے۔ کہئے آج غریب کی یاد کیسے آگئی آپ کو۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

"کچھ نہیں شام نے۔ حکومت نے گیہوں کے بیوپار کو قبضہ لیا ہے اور گیہوں کے کھلے بیوپار پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور . . . . اور خفیہ گوداموں پر دھاوے کر کے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے"۔

"ہاں یہ خبر تو سچ ہے مگر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے دھاوے تو آخر ہم پولیس والے ہی کریں گے نا" کمشنر نے جواب دیا۔

"مگر بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں عوام بھی خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں اُن لوگوں نے میرے ایک خفیہ گودام کا پتہ لگا لیا اور آج کل کے سامنے جمع ہونے اور دھاوا بولنے کا پروگرام ہے۔ صورت حال کافی سنگین ہے کسی بھی لمحہ آگ بھڑک سکتی ہے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ امن و ضبط کی [illegible] نہ نکلنے دیں گے۔

کیوں نہیں سیٹھ جی کیوں نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے" کمشنر نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پچھلے ہی ہفتہ کھائی ہوئی پارٹی کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی پولیس کے دو اسپیشل دستے بھیجے دیتا ہوں آپ بےفکر رہئے"

"مگر ذرا جلدی بھیجئے" شنکر لعل نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا اور پھر فون ڈسکنکٹ کر دیا۔

بہت جلد پولیس کے دستے جائے واردات پر پہنچ گئے، اُن میں وہ بھی شامل تھا۔ عوام سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ گودام کی طرف بڑھ رہے تھے عوام کا

جوش و خروش پیچ و تاب پر تھا۔ پولیس نے آگے بڑھنے کے خلاف انتباہ دیا۔ پولیس کی دھمکی بیکار گئی۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا حربہ بھی جلوس کے جوش کو کم کرنے میں ناکام رہا۔ چند لڑکوں کے سر بھی زخمی ہو گئے لیکن وہ مجبور تھے جلوس کے [illegible] دھارا انہیں بہائے لے جا رہا تھا اور اُس دھارے کو کاٹ کر نکلنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں مزدوروں اور طالب علموں کا جلوس گودام کے گیٹ تک پہونچ گیا اور مشتعل ہجوم گیٹ توڑنے ہی والا تھا کہ پولیس نے گولیوں کی بوچھار کر دی۔

گولیوں کے چلتے ہی سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ سب سے پہلے بھاگنے والے وہی لوگ شامل تھے جو کرسیوں کے خواب دیکھتے دیکھتے وہاں تک چلے آئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سناٹا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں صرف سڑک پر خون کے دھبے پڑے رہ گئے تھے۔ زخمیوں کو ہسپتال پہونچا دیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ امن و ضبط کی برقراری کے لئے متعین کر دیا گیا اور دوسرا دستہ واپس ہو گیا۔

(۳)

تھانہ واپس آنے کے بعد اُس کے ساتھی تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ اُس نے کھونٹی سے ٹوپی لگا دی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اُسے تاش کھیلنا پسند نہیں تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنا تو انتہائی ناپسندیدہ۔ وہ لوگ پتے پھینکتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔

"یار تھانے بغیر لائٹ کے سائیکل چلانے پر جو جرمانہ کیا جاتا تھا وہ ختم کیا جا رہا ہے۔" ایک نے کہا

"ہاں یار بات تو تم نے ٹھیک کہی بہت" دوسرے نے جواب دیا

"پھر ہم کریں گے کیا۔ بغیر کام کے تنخواہ لینا تو حرام ہے" تیسرا ہمارے بد قسمتی [illegible]۔ تھانے میں ایک ننھا سا قہقہہ ابھرا ہنستے ہنستے تیسرے کی نظر ایک [illegible] تھانہ میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اُس سے مخاطب ہو کر [illegible] کوئی عورت اندر آ رہی ہے جا کر ذرا سنبھال لو [illegible] تو آفت آ جائے گی۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا [illegible] اور عورت سے نکلنے کی [illegible] واپس ہو گیا۔

"کیوں تھوڑا کا کر رہی تھی" اُس کے ساتھی نے جس نے اُسے بھیجا تھا پوچھا

"بے چاری ڈھونڈ رہی تھی کہ اُس کا بچہ گم ہو گیا ہے"

"پھر تم نے کیا کیا"

کیا کرتا۔ ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ لڑکے کا حلیہ بتانے جا رہی تھی کہ میں کہا جاتی ہے کہ ڈنڈا اٹھاؤں؟

"نہیں نہیں تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کتنا تڑپ رہی ہوگی بیچاری اپنے بچے کے لئے۔" اُس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"ہو کچھ بھی ہو اس نے کیا ٹھیک کیا ہے۔ خود اپنا پیٹ پالنا ہی اُسے مشکل ہے۔ سوچ رہی ہوگی کہ چلو مصیبت سے نجات ملی۔" تیسرے نے جواب دیا۔

"کچھ بھی کہو تم نے غلط کام کیا ہے۔ اگر وہ تمہاری جگہ ہوتا تو کم از کم ایسا نہیں کرتا" اُس کے ایک ساتھی نے اُسے [illegible] ہوئے کہا۔

اُس کے ساتھیوں کو ہمیشہ سے اُسے چھیڑنے میں مزا آتا تھا۔

"اچھا بتاؤ تم کیا کرتے۔ یہاں تک کہ جھوٹی ہمدردی جتا کر اُس کے ساتھ دو چار گلیاں گھوم آتے۔" اُس نے جواب دیا۔

"انسانی ہمدردی کے ناطے بھی تم سے کچھ نہ ہوا" اُس کے اُس ساتھی نے جس نے اُسے بھیجا تھا کہا۔

"انسانی ہمدردی کوئی ایسا معمولی جذبہ نہیں جو صرف الفاظ کے ادا کر دینے سے پورا ہو جائے۔ انسانی ہمدردی کا تمہیں اتنا ہی خیال تھا تو تم خود اُٹھ کر کیوں نہیں گئے۔ پھر بغیر کام کے تنخواہ لینا تو حرام ہے۔" اُس نے چوٹ کی۔ غصہ کے مارے اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ مذاق کو جھگڑے میں بدلتے دیکھ کر اُس کے ساتھی خاموش ہو گئے۔ اُس نے بھی ٹوپی اٹھائی اور وہاں سے چل پڑا۔ اُس کے جاتے ہی پھر ساتھی اُس کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

"مجھے تو کچھ سنکی لگتا ہے۔" ایک نے کہا۔

"ہاں گودام پر بھی لوگوں پر ایسے گولیاں چلا رہا تھا جیسے گودام اُس کے باپ کا ہو۔"

دوسرے نے کہا۔

"در اصل وہ مایوسی کا شکار ہے۔" اُس کا ایک ساتھی جو سلیے ساتھیوں میں اُس کا قریبی دوست سمجھا جاتا تھا، کہنے لگا۔ "اُسے زندگی میں سوائے ناکامیوں کے کچھ نہیں ملا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

پڑھے لکھے لوگوں کو تو اور بھی صبر کرنا چاہئے یہ تو اُن کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔" اُس کے ایک اور ساتھی نے کہا۔

جب خواب ٹوٹ جاتے ہیں تو انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی نظروں میں صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اُس کے پتا سچے گاندھی وادی تھے جس کا صلہ اُنھیں فساد کے زہر میں ڈوبی ہوئی گولی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے لیکن کس سے انتقام لینا ہے یہ اُسے معلوم نہیں ہے۔

جب وہ گھر میں پہونچا تو اُس کے استقبال کے لئے بھائی کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ فائرنگ سے دو افراد ہلاک ہوئے تھے اُن میں سے ایک اُس کا بھائی تھا۔ گھر میں سارے پڑوسی جمع تھے، ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بھائی کی لاش دیکھ کر اُس پر سکتہ طاری ہوگیا، بہت دیر تک وہ حواس باختہ ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

دوسرے دن شام کو پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ اُسکے بھائی کا انتم سنسکار کیا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے کل بھاگنے میں پہل دکھائی تھی وہ بھی موجود تھے۔ یہاں گولی چلنے کا کوئی ڈر نہیں تھا اُنھیں دیکھ کر اُس نے سوچا: کتنے سخت جان ہوتے ہیں یہ سالے مرتے ہی نہیں۔ جب بھی فائرنگ ہوتی ہے ہم غریبوں ہی کو قربانی دینی پڑتی ہے، اُنھیں کوئی گولی نہیں لگتی۔" ایک لیڈر نے آگے بڑھ کر دونوں چتاؤں کو آگ لگائی۔ اُس کے جی میں آیا کہ اُس لیڈر کو بھی چتا کی آگ میں جھونک دے۔ چتا کو آگ دکھانے کا حق اُسے پہنچتا تھا، لیکن یہ حق چھین لیا گیا۔ تب بھی جب اُس کا باپ مرا تھا اور اب جب اُس کا بھائی مرا ہے۔ مجھ سے یہ حق کیوں چھین لیا گیا؟۔ کیا صرف اس لئے کہ دونوں نے عوام کی خاطر جان دی تھی اور عوام کی خاطر جان دینے والوں کا انتم سنسکار کرنے کا حق صرف عوام کے رہبروں کو پہونچتا ہے۔ دونوں چتائیں دھیرے دھیرے جل رہی تھیں۔ اُن سے اُٹھتا ہوا دھواں اوپر جاکر ایک نقطے میں مدغم ہو رہا تھا اور ایک ہو کر یوں آسمان کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے صرف ایک ہی چتا جل رہی ہو۔ سورج کہیں دور گھاٹیوں میں ڈوب رہا تھا۔ گذرتے ہوئے لمحے اپنے ساتھ ٹھہر گئے تھے۔ قریب ہی پُرسکون ندی دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ جہاں کہیں ندی کی راہ میں پتھر حائل ہوتے، پانی اُن سے ٹکرا کر اُچھلتا اور قریب میں پڑی ہوئی ریت نم ہو جاتی۔

وہ مدغم ہوتے ہوئے دھوئیں کو دیکھتا رہا۔ اُس کی ماں اُس کے قریب کھسک آئی اور دکھی لوگوں کی طرف اشارہ کرکے اُس کے کان میں بولی۔ "ان لوگوں کا غم تو تیرا نہیں ہے۔ پھر تو یہاں کیوں کھڑا ہے" اس نے ایک نظر لوگوں پر ڈالی۔ دوسرے ہی لمحہ میں ندامت سے اُس کی گردن جھک گئی۔ لیکن اُس مختصر سے جائزہ میں اُس کی نگاہوں نے دیکھا کہ بھکارن بھی وہاں موجود ہے۔ وہ چونک اٹھا۔ اُس نے ایک بار پھر نظر اٹھا کر بھکارن کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحہ ٹکٹکی باندھے بھکارن کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی نظر خود بخود نم ہوتی ہوئی ریت کی جانب مڑ گئی: "وہ یہاں کیوں آئی ہے؟" اُس نے خود سے پوچھا۔ اپنے بچّہ کو تلاش کرنے یا اپنے بچّہ کے انتم سنسکار میں شرکت کرنے۔ دھیرے دھیرے بھکارن کا غم اُس کے دل میں اترتا گیا۔ پتھروں سے ٹکرا کر ندی کا پانی ایک بار پھر اُچھلا اور ریت ایک بار پھر نم ہوگئی۔

انتم سنسکار کے ختم ہونے پر سب لوگ بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہوئے گھروں کو واپس ہونے لگے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا شمسان گھاٹ کے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ گھر جانے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ گمشدہ بچّے کو تلاش کرنے ـــــ یا پھر اُس کی ماں کو ڈھونڈنے جو ایک بار پھر بھیڑ میں گم ہوگئی تھی، تاکہ بچّہ کا پورا پورا حلیہ پوچھ سکے۔ ▲

شاعر بمبئی

اقبال طاہر

میرے گھر کا جب ٹھہرا ایک فرد ستارا — کیسے بھول سکتا ہے میرا درد ستارا
دودھ جیسے چہروں پر شہد جیسی آنکھوں میں — آ کے جھونک جاتا ہے غم کی گرد ستارا
برف کی طرح دل میں منجمد ہے تنہائی — آگ کر کے دکھلا دے، ہے جو مرد ستارا
شہر دانت کیوں پیسے، گاؤں خار کیوں کھائے — بٹ گیا ہے دونوں میں زرد فرد ستارا
خامشی، جلوسوں کے پیچھے پیچھے ہوتی ہے — پیش پیش رہتا ہے کار کرد ستارا

شک اگر ہوا ہے طاہر دیکھ لیجئے ناخن
جانتا ہے برسوں سے مجھ کو زرد ستارا

غزلیں

نقیب اکبر (ھاوڑہ)

دھوپ دیکھی کبھی سایا دیکھا
وقت نے جو بھی دکھایا دیکھا

سبز موسم کی خبر بھی لیکن
ہم نے ہر پیڑ کو ننگا دیکھا

ہم سے انجام بہاراں پوچھو
حشر ہم نے گلِ تر کا دیکھا

رات بھر خون جلایا اپنا
تب کہیں جا کے اجالا دیکھا

اس نئے شہر میں دیکھا جس کو
گردِ غم میں اُسے لپٹا دیکھا

آسمانوں پہ اڑا تھا اکبر
زخم خورشید کا گہرا دیکھا

خالد شفائی

اس جہد و عمل کی دنیا میں گر گر کے سنبھلنا پڑتا ہے
پھولوں کی تمنا میں اکثر کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے

اک تو ہی نہیں ہے طوفاں میں، طوفاں بداماں اور بھی ہیں
ساحل کے تجسس میں صدہا موجوں سے نمٹنا پڑتا ہے

ناسازیٔ قسمت کا شکوہ بے سود ہے اے رونے والا
بے باک عزائم کے آگے قسمت کو بدلنا پڑتا ہے

جیون کی بھٹکتی راہوں میں ایسے بھی مراحل آتے ہیں
شعلوں سے گزرنا پڑتا ہے، انگاروں پہ چلنا پڑتا ہے

حالات ترے سنگین سہی، پُر درد سہی، غمگین سہی!
جینے کے لئے پھر بھی خالد، حالات سے لڑنا پڑتا ہے

خاکہ

ڈاکٹر شفقت اعظمی

کوثر چاندپوری ___ شخصیت اور فن

حسین و پاکیزہ و تاباں و کشادہ چہرہ، خوش وضع و خوش پوش، زیبا قامت، سیاہ آنکھیں، قابلِ رشک صحت، باوقار رفتار۔ یہ ہے کوثر چاندپوری کا سراپا۔

کوثر چاندپوری ایک باوقار، متین، سنجیدہ اور مہذب شخصیت سے عبارت ہیں۔ آواز جاندار اور لہجہ ایسا ہے کہ خاموش ہو جائیں تو وقار چھا جائے اور گفتگو کریں تو پھول جھڑیں۔ اُن کے مزاج میں وسیع المشربی، اعلیٰ ظرفی، انسانیت دوستی، لطف و احسان، ذکاوت، مردم شناسی، تدبّر و دانشمندی کی صفات قدرت نے بڑی فیاضی سے جمع کر دی ہیں۔ وہ ہر شخص سے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ کی عظمت کا اندازہ کسی حد تک اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ہر کہ و مہ آپ سے ملنے کے بعد مسرت محسوس کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوثر صاحب کی عظمت اُن کی شخصیت میں سرایت کر گئی ہے، جو انتہائے عظمت کی دلیل ہے۔

عموماً شاعر و ادیب ذکی المزاج اور حساس طبع ہوتا ہے کثر صاحب کے مزاج کے خلاف جب کوئی بات ہوتی ہے تو اُن کی پیشانی پر سکڑن زاویے بن جاتے ہیں، جو عین فطری تقاضا ہے لیکن چند ثانیے کے اندر اندر یہ زاویے گہرے سمندر کی لہروں کی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔ وہ ردِّ عمل کے طور پر جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے اور نہ زبان سے کوئی ایسا حرف آتا ہے جس سے اُن کی شخصیت مجروح ہو۔ میرے خیال میں جذباتیت اور غصے پر اِس خوش اسلوبی سے قابو پا لینا زبردست شجاعت کی علامت ہے۔

اُردو دنیا کے لئے کوثر چاندپوری نئے نہیں ہیں۔ اُن کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور چوٹی کے طبیبوں میں ہوتا ہے۔ تاریخِ ادبِ اُردو میں اُن کی ادبی خدمات کے اَنمٹ نقوش موجود ہیں۔ موصوف ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ادبی، ثقافتی اور طبی حلقوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ وقت کی اہمیت کسی کو معلوم کرنی ہو تو کوثر صاحب سے ملے، جن کی زندگی کا ہر لمحہ عمل کا بہترین نمونہ ہے۔

جناب کوثر صاحب کی ادبی تخلیقات ایک مدت سے ملک کے ممتاز ادبی اور طبی جریدوں میں شائع ہوتی چلی آ رہی ہیں اور آج حال یہ ہے کہ جس اُردو جریدہ کے خاص نمبر میں کوثر صاحب کی تخلیق شامل نہ ہو تو اُسے نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

اُردو کے افسانوی سرمائے اور مختصر ناول کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بحیثیت مقبولیت اور ہر دلعزیزی کوثر چاندپوری کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ موصوف نے جدت و ندرت اختیار کرنے کے باوجود مقصدیت سے انحراف نہیں کیا، ماضی سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔

کوثر صاحب کا اسلوبِ نگارش کسی حد تک منشی پریم چند سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ زبان کی سادگی اور چاشنی کہانی دونوں افسانہ نگاروں میں مشترک ہے۔ زبان پر کوثر صاحب کو بہت زیادہ قدرت حاصل ہے۔ "کوثر میں دھلی ہوئی زبان" کا محاورہ تو مشہور ہے۔ کوثر چاندپوری کی کہانیاں پڑھتے وقت اس محاورے کی صداقت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اُن کی زبان صاف ستھری ہونے کے سبب "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق دل کے تاروں کو فوراً چھیڑ دیتی ہے۔

کوثر صاحب کا تخلیقی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی تصانیف کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ بطور اختصار اُن کی صرف چند اہم تصانیف کا تذکرہ کر دینا ہی اکتفا کر رہا ہوں، ورنہ فرصت ہوتی تو میں چاہتا کہ ہر کتاب پر الگ الگ اظہارِ خیال کیا جائے۔ بہرحال چند تخلیقات کا تجزیہ یہ ہے۔

افسانوں کے مجموعے :۔ (۱) لالہ و گل (۲) جگر لرز افسانے (۳) دلچسپ افسانے (۴) عورتوں کے افسانے (۵) دنیا کی حور (۶) شعلۂ سنگ (۷) آدمیوں کی صلیب (۸) شب نامچے۔ افسانے بطرزِ خاص

ناول :۔ (۱) تیمر کا کلب (۲) مسکراتی کلیاں (۳) مسکراتی زندگی (۴) راکھ اور کلیاں (۵) عشق نہ دیکھے (۶) داستانیں (مہر آتش کی باغ و بہار جدید رنگ میں) (۷) محبت اور سلطنت۔ الف لیلیٰ کی ایک حکایت ناول کے رنگ میں)

سوانح :۔ (۱) حکیم اجمل خاں (خاندان اور شخصیت) (۲) جہانِ غالب

رپورتاژ :۔ (۱) کارواں ہمارا

تحقیق و تنقید :۔ گلشن و بخش

تاریخی :۔ (۱) محمد بیرم خاں ترکمان (۲) جام جم (۳) اکبر اعظم دورِ مغلیہ

کوثر صاحب کا ایک پہلو عوام کے سامنے بہت کم آیا ہے، وہ یہ کہ موصوف ایک کامیاب ادیب اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر مؤرخ بھی ہیں۔ موصوف کے متعدد تاریخی شہ پارے اکثر نگار لکھنؤ، نیرنگِ خیال لاہور، ادبی دنیا اور شاہکار لاہور میں چھپتے اور اہلِ نظر و ذوق سے تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ موصوف کی مشہور تاریخی کتاب "محمد بیرم خاں ترکمان" یقیناً ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اسے شہرتِ دوام حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کے حوالے سے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ... [illegible] ... ایک بڑی کتاب ... [illegible] ... گیا ہے جس میں کتاب کے اقتباسات بعینہٖ ... [illegible] ... پیش کئے گئے ہیں۔ موصوف کا طبی، تاریخی اور

ادبی حیثیت کا اعتراف ادبا نے بھی کیا ہے۔ مسیح الملک کے متعدد جانشین جناب پدم شری حکیم حاجی عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد (وقف) نے نہایت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"عام کتبِ تاریخ میں سے طبی مواد نکالنا آسان کام نہیں۔ یہ کام وہی شخص بہتر طور پر کر سکتا ہے جو بیک وقت طبیب بھی ہو، اور تاریخ کا بھی ذوق رکھتا ہو اور پھر حاصل شدہ مواد دلکش انداز میں پیش کرنے کے لئے ادیب بھی ہو۔ کوثر چاند پوری کی ذات میں یہ تینوں صفات ایک خاص امتزاج سے جمع ہیں۔"

کوثر چاند پوری نے زندگی کے حقائق کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک طبیب اپنی روزانہ پریکٹس میں بے شمار تلخ حقائق کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اسی لئے حقیقت نگاری موصوف کی تحریر کا ایک خاص وصف بن گیا ہے۔ بعض قارئین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ کوثر صاحب کے افسانے اسپتالوں اور نرسوں کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں، یعنی وہ اسپتال کے ماحول سے زیادہ متاثر ہیں، اُن کی شکایت بجا سہی، لیکن کیا اسپتالوں میں زندگی نہیں ہوتی، بلکہ اسپتالوں میں تو زندگی کے نقوش بہت زیادہ واضح ہوتے ہیں اور مرگ و زیست کی کشمکش سے زندگی کی ساری حقیقت اور اہمیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

کوثر صاحب ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں جو صحت مند ذہن اور حساس دل کی علامت ہے کیونکہ ہمارے لئے وہی ادب سود مند ثابت ہو سکتا ہے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ابھرنے کا موقع ملے اور معاشرے میں صحت مند رجحانات پیدا ہوں۔

"جنس کو ہمارے ادب میں ایک زمانہ تک شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایک بڑا طبقہ اس موضوع پر اظہار خیال کو گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ حالانکہ زندگی کے دیگر مسائل کی طرح یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے بلکہ طبی نقطۂ نظر سے تو اُس کی صحت مندانہ تعلیمات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ پھر کوثر صاحب کا قلم اس اہم موضوع کو بھلا کب تک نظر انداز کرتا؟ شب عروسی میں کوثر چاند پوری نے ایک اچھوتے افسانوی انداز میں جنسی تعلیم ... کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے جس کے بارے میں کتاب کے ناشر سید عبدالواحد رقمطراز ہیں :۔

"جنسی جذبات کو ادب میں ایک مناسب مقام ملنا چاہیئے،

مگر جنسی موضوعات کا حد سے بڑھ جانا تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ ماضی میں مُدتہا اکبر علی، بغداد اور عہد حاضر میں فرانس اس نوع کی بربادی کا ایک عبرت انگیز مرقع پیش کرتا ہے۔ بہرکیف اعتدال کے ساتھ اجتماعی مفاد اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لئے "جنس" جیسی ناگن کو چھیڑا جا سکتا ہے، لیکن محض تفریح، لذت اندوزی یا ادب برائے ادب کے تحت میں ایسی جرأت خطرہ سے خالی نہیں۔ "شب نامچے" میں زیادہ تر جنسی مسائل پر ہی بحث کی گئی ہے۔ اور کوثر چاندپوری نے جن کو دنیائے ادب میں سنجیدہ اور معتدل فنکار تسلیم کیا جاتا ہے "سماج کے رِستے ہوئے زخموں کو چھیڑ کر انھیں ناسور بن جانے کا موقع نہیں دیا، بلکہ کہیں تو کوئی ٹھنڈا مرہم رکھ کر مندمل کرنے کی کوشش کی ہے، کہیں عمل جراحی کرکے ان کی بیمار سطحوں کو صاف کیا ہے۔"

کوثر چاندپوری کے قدم شہرت اور ناموری بہت پہلے چوم چکی ہے، ایک کامیاب طبیب ہونے کے سبب معاشی انحطاط کے وہ کبھی شکار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ ایک خوشحال زندگی انھوں نے بسر کی۔ ان کے صاحبزادگان اور داماد سبھی اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ معاشی الجھنوں سے وہ بچے رہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا ادیب اور شاعر کیوں نہ ہو، اُسے مشکل ہی سے معاشی سکون ملتا ہے۔ ہرچند کوثر صاحب کی تخلیقات پر معاوضے ملتے ہیں۔ ان کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن ادب کو انھوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا۔ ایک چوٹی کے طبیب کی حیثیت سے انھوں نے زندگی کی بازی کو جیتا اور نہایت بااصول زندگی بسر کی۔

کوثر چاندپوری ملکی و ملی مسائل پر جب بحث کرتے ہیں تو اکثر فرماتے ہیں کہ ملک میں ابھی مکمل جمہوریت نہیں آئی۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب اب تو حکومت اور یہاں کی اکثریت کے مزاج میں بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ منافرت کا زور کم ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کی اکثریت تو اب یہاں تک سوچنے لگی ہے کہ مسلمانوں کی تباہی ملک کی تباہی اور ان کی خوش حالی ملک کی خوشحالی کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے مسائل پر آج کل سے کہیں زیادہ کھل کر بحث ہوتی ہے۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ہمیں حکومت سے اپنے حقوق منوانے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ اردو کے بارے میں نہ صرف ظالم کا رویہ بدلا ہے بلکہ حکومت خود اس کی بقا اور ارتقا کے لئے بھرپور کوشش کر رہی ہے جس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ غرضیکہ ملک کی فضا پہلے سے کہیں زیادہ سازگار اور جمہوری ہو گئی ہے۔ اس پر کوثر صاحب بڑی حسرت سے فرماتے ہیں۔

"لیکن ملک میں جمہوریت ابھی پورے طور پر نہیں آئی" پھر دوسرے ہی لمحہ اُن کا چہرہ ایک انجانی مسرت سے دمک اٹھتا ہے اور ان کے گلاب جیسے شگفتہ چہرے پر مجھے ایک تابناک مستقبل دکھائی دینے لگتا ہے پھر خود ہی ذرا تامل سے کہہ اٹھتے ہیں۔ "تاہم پھر بھی مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندوستان میں بہت جلد مکمل جمہوریت کا دور دورہ ہوگا۔" کوثر صاحب کے دل کی بات بالآخر نوکِ قلم پر بھی آگئی، چنانچہ وہ "ماہ و انجم" کے پیش نامہ میں رقمطراز ہیں:۔

"میں اپنے سینہ میں ایک ایسا دل رکھتا ہوں جو دکھ درد اور مصائب سے بے انتہا اثر لیتا ہے اس لئے میں نے مختلف تاثرات کے ماتحت ہر قسم کے افسانے لکھے ہیں۔ چنانچہ میں مجموعہ میں آپ کو ہندوؤں کی اصلاح و تعمیر کے متعلق افسانے ملیں گے اور اتحاد و اتفاق کے متعلق بھی۔ مسلمانوں کی بدحالی اور افلاس سے بھی میری آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور ہندوؤں کی مصیبت و تکلیف پر بھی، اور ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

میری رائے میں وہ جوہر تمام بنی آدم کی آفرینش میں مشترک ہے کسی طرح بھی ایک انسان کو دوسرے انسان کی پریشانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں چھوڑتا۔"

کوثر صاحب بے تعصب اور وسیع المشرب انسان ہیں۔ احمد آباد کے فسادات نے تاتاریوں اور چنگیزیوں کی روح کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اسی طرح کے نہ جانے کتنے فسادات ملک میں آئے دن اعلیٰ قدروں کو پامال کرتے رہتے ہیں۔ ناممکن تھا کہ ان حالات سے کوثر صاحب کا بیدار ذہن متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ [illegible]

(بقیہ صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجئے)

خناستو اسمرنینسکی

ترجمہ: نعیم فاروقی

سیڑھیوں کی گفتگو

"تم کون ہو؟" فرشتے نے پوچھا

"میں پیدائشی مفلس ہوں اور چیتھڑے پہنے ہوئے یہ سب لوگ میرے بھائی ہیں۔ یہ زمین کتنی بدصورت ہے اور یہ سب کتنے بدقسمت ہیں" جس نوجوان نے یہ بات کہی تھی، اُس کا سر اُٹھا ہوا تھا، گردن تنی ہوئی تھی اور مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ وہ جہاں کھڑا تھا، اُس کے سامنے بہت اونچی گلابی دھاریوں والی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں تھیں۔ اُس نے اپنے عقب میں دیکھا جہاں کسی گدلی ندی کے سیلاب کی طرح لوگوں کا اژدحام تھا۔ سبھوں کے چہرے پریشانی، غم، دُکھ اور تکلیف کے غماز تھے اور اُن کا جوش و خروش کسی بھی لمحے کچھ کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ اُن کی آوازیں ہوائیں ٹکرا کر دور کہیں چل رہی بندوقوں کی طرح دھماکے پیدا کر رہی تھیں۔

ساری بھیڑ زرد رنگ کی دُھول جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اس دھول میں سے کئی چہرے اُبھرتے نظر آرہے تھے ——— ایک ضعیف شخص آگے بڑھ رہا تھا، لیکن اُس کی کبڑی پیٹھ کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ زمین کو تکتا ہوا اپنی کھوئی ہوئی جوانی تلاش کر رہا ہے ——— ایک ننگے پاؤں والی چھوٹی سی خوبصورت لڑکی اُس کے پھٹے ہوئے کوٹ کا ایک سرا پکڑے سامنے امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیلے پھولوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے لوگ ٹوٹے پھوٹے، مرثیہ گاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"میں پیدائشی مفلس ہوں اور چیتھڑے پہنے ہوئے یہ سب لوگ میرے بھائی ہیں۔ اُف! یہ زمین کتنی بدصورت ہے اور یہ سب کتنے بدقسمت ہیں" نوجوان نے اپنی بات دہرائی اور سیڑھیوں کے اُوپری سِرے کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا "تم جو بالانشیں ہو..... تم ....."

سامنے کھڑے فرشتے نے اُس کی بات کاٹ دی اور کہا: "تمہیں اُن سے کیا شکایت ہے؟ وہ جو بالانشیں ہیں۔ اُن سے؟"

"میں اُن شاہوں، شہنشاہوں سے انتقام لوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں اُن سے میں سخت انتقام لوں گا۔ تم میرے اُن ساتھیوں کو نہیں دیکھ رہے ہو جن کے رنگ زرد ہو گئے ہیں، جن کی چیخیں صدیوں سے اِس فضائے بسیط میں گونج رہی ہیں۔ ایک بار اِن کے چہروں کی طرف دیکھو وہ کتنے برہنہ اور خون آلود ہیں۔ تم مجھے صرف ایک بار اوپر جانے دو کہ میں ـــ"

فرشتہ مسکرایا۔ "میں یہاں اُن کی حفاظت کے لئے کھڑا ہوں، لیکن تم اگر کچھ رشوت پیش کر سکو تو میں تمہیں آگے جانے دے سکتا ہوں"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ سونے کا ایک ذرّہ بھی نہیں۔ میں رشوت کہاں سے دوں۔ میرے پاس صرف اپنا سر ہے۔ اُن کی خاطر میں اپنا سر دے سکتا ہوں!"

فرشتہ ہنسا ——— "نہیں! میں تم سے اتنی بیش قیمت چیز نہیں مانگتا، تم مجھے ایک چھوٹی سی چیز دے دو۔"

"کیا۔"

"اپنی قوتِ سامعہ"

"اچھا لے لو! میں اُن کے لئے بہرا ہو کر جی لوں گا۔ لیکن....."

"ڈرو مت تم بہرے نہیں ہو گے، اِس کے بدلے میں مَیں تمہیں ایک نئی قوتِ سامعہ دوں گا..... آ..... آگے ——— آجا"

نوجوان جلدی سے آگے بڑھا۔ لیکن چوتھی سیڑھی پر فرشتے نے اُسے روک لیا اور کہا "یہاں کھڑا ہو کر سُن، سیڑھیوں کے نیچے تیرے ساتھیوں کے رونے کی آواز آرہی ہے۔" نوجوان رُک گیا اور کان لگا کر سُنتا رہا، پھر کہنے لگا "کتنی عجیب بات ہے، سب کے سب یوں ہنس گا رہے ہیں جیسے وہ بہت خوش ہوں۔"

"لیکن میں اگلی تین سیڑھیاں تمہیں اُس وقت چڑھنے دوں گا جب تم مجھے اپنی آنکھیں دے دو گے، میں تمہیں اور زیادہ بہتر آنکھیں دوں گا"

نوجوان نے اور تین سیڑھیاں پار کیں تو فرشتے نے اُسے یاد دلایا۔
"اب ایک بار نیچے دیکھو تمہارے بھائیوں کے جسم کتنے برہنہ اور خون آلودہ ہیں"
یا خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں میرے سارے لوگ اتنی جلدی اتنے خوبصورت کپڑے کہاں سے لے آئے۔ سب اپنی قمیص میں گلاب کی کلی بھی لگائے ہوئے ہیں۔

نوجوان پھر جلدی سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہر تین سیڑھیوں کے بعد وہ فرشتے کو کچھ نہ کچھ رشوت دیتا رہا —— صرف ایک سیڑھی بچ گئی تھی۔ نوجوان پھر نشے میں بڑبڑایا "..... چیتھڑے پہنے ہوئے یہ سب لوگ میرے بھائی ہیں . . . ؟"

"اے معصوم اور خوبصورت لڑکے ذرا ٹھہر جا" فرشتہ کہنے لگا۔
"بس ایک قدم اور . . . . پھر تو اپنا من پسند انعام لے لیگا۔ لیکن اس آخری سیڑھی سے گزرنے کے لئے میں وہ قیمتی رشوت لیتا ہوں۔ مجھے فوراً اپنا دل اور اپنی یادداشت دیدے۔"

نوجوان بھڑک اٹھا —— "دل . . . کبھی نہیں"
فرشتے نے قہقہہ لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں کہنے لگا "پگلے میں اتنا ظالم نہیں ہوں۔ تیرے معمولی دل کے بدلے میں تجھے سونے کا دل دوں گا اور تیری بے کار یادداشت کے بدلے بہترین یادداشت سے نوازوں گا۔ تو نے اگر ان دونوں کو نہیں بدلا تو آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا اور نہ وہاں پہنچ کر من پسند انعام لے سکے گا۔"
نوجوان نے فرشتے کی سبز آنکھوں کی گہرائی میں دیکھا، پھر گویا ہوا
"یہ انسانی چیز بھی اگر تم مجھ سے لے لوگے تو میں دنیا کا سب سے بدقسمت آدمی تصور کیا جاؤں گا"

"نہیں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان" فرشتہ ہنسا اور کہنے لگا۔
"بول پھر کیا چاہتا ہے"
نوجوان کشمکش میں پڑ گیا، اُس کے خوبصورت چہرے پر سیاہی کی لہر دوڑ گئی اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں۔ اُس نے مٹھیاں بھینچیں، دانت بھینچے اور کہنے لگا "اچھا لے لے"

اُس کے سر کے بال اُسے سانپوں کی طرح ڈسنے لگے اور وہ ہونٹ بھینچ کر آگے بڑھا۔ آخری سیڑھی پار کر کے جیسے ہی اُس نے قدم رکھا اور اچانک اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اُس کی آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ اُس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھل گئیں —— سامنے شاہوں،

شہنشاہوں کا جشن تھا۔
اُس نے ایک بار نیچے بہت دور لوگوں کی کراہتی بھیڑ کی طرف دیکھا، لیکن اُس کی پیشانی ہنس رہی تھی۔ اُس نے دیکھا اُنگور کے خوشے کو —— نیم برہنہ لوگ ریشمی کپڑوں میں سجے بیٹھے ہیں اور رقص و سرود میں مشغول ہیں۔
تم کون ہو فرشتے نے اپنی بھرائی ہوئی آواز میں اُس سے پوچھا اور وہ مجمع میں اٹھا "میں پیدائشی شہزادہ ہوں اور یہ سبھی بادشاہ اور شہنشاہ میرے بھائی ہیں۔ یہ زمین کتنی خوبصورت ہے اور لوگ کتنے خوش قسمت ہیں"

بقیہ صفحہ ۱۱۴ — کوثر چاند پوری

"اٹھانے پر مجبور کر دیا اور اُس کے بعد گونگا ہے بھگوان" جیسا شاہکار ناولٹ وجود میں آگیا۔ جس پر حکومت اتر پردیش نے ایوارڈ بھی دیا۔ حالانکہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اعزاز معاوضہ کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ یہ ناولٹ حب الوطنی اور انسان دوستی کی زندہ علامت ہے۔ فنکار قاری کو یہ تاثر دیتا ہے کہ اتنے ظلم و بربریت کے باوجود انسانیت آج بھی زندہ ہے۔ اس ناولٹ کے مثبت کردار آخر تک ظلم و بربریت، تشدد، تعصب اور منافرت کے خلاف جہاد کرتے رہتے ہیں یہاں ناساعد حالات میں انسانیت کو ٹھوکر بھی لگی، وہ مجروح بھی ہوئی، لیکن فتح بالآخر انسانیت کی ہوئی۔ ان فسادات کو کوثر صاحب نے ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ موصوف کے سینے میں اس قدر گداز اور درد مند دل ہے کہ دشمنوں کو بھی گلے لگانے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ نفرت و عداوت سے موصوف کو عداوت ہے اور خلوص و محبت سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی ؎

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹوں سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا [illegible] نسیم بہار کا

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوثر صاحب کو اس درخشاں چاند کو تابندہ و پائندہ رکھے۔

انور ادیب (جمشید پور)

سینے میں لئے بوجھ سا یادوں کا جیئے کون
اِک بھول پہ صدیوں کفِ افسوس ملے کون

بہتا ہوا دریا ہے نہ بہہ جائیں کنارے
بھیگی ہوئی پلکوں پہ نئے خواب سجے کون

کچھ ربط ہو اندازِ بیاں میں تو ملے لُطف
ہر لمحہ بدلتے ہوئے چہرے کو پڑھے کون

ہنس بول لئے سب سے یہی اپنا چلن ہے
ہم سادہ زبانوں کو بُرے کون بھلے کون

کیا غم ہے نئے لوگ جو پس ماندہ سمجھ لیں،
اِس عمر میں اب وقت کے سانچے میں ڈھلے کون

اک عمر سے جو رشتہ ہے بے جان سا انور
دُکھ درد کے اس رشتے کی تجدید کرے کون

غزلیں

عابد امام زیدی

بہار آؤ مجھے اذنِ شاعری دیدو
چمن کو حُسن فضاؤں کو دلکشی دیدو

یہاں تو تلخی کام و دہن سے مطلب ہے
شراب پی نہیں سکتی تو زہر ہی دیدو

یہ فکر و فن کے مسائل ہیں کس قدر دشوار
میں بے خبر ہوں مجھے ذوقِ آگہی دیدو

سحر کا نور شفق کا جمال شب کا جلالی
غزل کو جتنی بھی ممکن ہو دلبری دیدو

کمالِ عشق ہے عابد کسی کا غم سہنا
کمالِ عشق نہیں یہ کہ جان ہی دیدو

اختر مدھو پوری

کوئی ہو رند کی صورت کہ ہو ولی کی طرح
ہے آدمی کو یہ لازم ہو آدمی کی طرح

کہیں رکا ؤ ٹھہراؤ ایک پل کے لئے
یہ وقت بھی ہے کسی تیز رَو ندی کی طرح

کسی کی یاد کا رشتہ ہمارے ذہن کے ساتھ
بندھا ہوا سا ہے زنجیر کی کڑی کی طرح

اِک انقلاب کی آمد کی دے رہا ہے خبر
یہ انتشار ابھی ہے جو خامشی کی طرح

یہ سب کے دوست مگر ان کا دوست کوئی نہیں
خود اپنے شہر میں اختر ہیں اجنبی کی طرح،

اعجاز علی ارشد

ہڑتال

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اپنی اصلی صورت چھوڑ کر تھوڑی سی رد و بدل سے دوسری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ عموماً ایسے الفاظ کے دو جز ہوتے ہیں۔ جن کی ترکیب میں سابقہ اور لاحقہ کی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ جیسے لفظ "لا" کے ساتھ "فانی" یا "ثانی" کا لفظ لگا کر پڑھئے تو لافانی یا لاثانی ہو جائے گا۔ اسی طرح گھوڑا اور دوڑ کے مرکب سے گھوڑ دوڑ کا لفظ بنتا ہے۔ قواعد کا یہ قاعدہ یکجہتی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس لئے کہ اس اتحاد میں صرف ایک ہی زبان کے الفاظ میں یکجہتی پر انحصار نہیں بلکہ دوسری زبانیں بھی شریکِ کار نظر آتی ہیں۔ جیسے "سمجھ" کے ساتھ "دار" کا استعمال اب بالکل عام ہے اور ہر سمجھدار آدمی اسے استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح تھانیدار، چوکیدار، بٹائی دار یا ایسے دوسرے الفاظ ہم رات دن بولتے رہتے ہیں۔ یکجہتی کی بات آئی تو یک بیک مجھے اُس قومی یکجہتی کا خیال آ گیا جس کے شب و روز نہ جانے کتنے عظیم رہنما کوشش کر رہے ہیں مگر پھر بھی قومی یکجہتی پیدا نہیں ہو پاتی۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر یہ رہنما ایک دوسرے سے کوشش کریں تو قومی یکجہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے یہ رہنما ایک دوسرے سے اپنا اپنا لباس بدل لیں یعنی شیروانی اور پاجامہ پہننے والے دھوتی کرتا پہننا شروع کر دیں اور دھوتی کرتا پہننے والے شیروانی اور پاجامہ۔ اسی طرح اور آگے چل کر ایک دوسرے کی زبان اختیار کریں، پھر رسم و رواج اور اسی طرح دوسرے طریقۂ کار۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے اور کافی تشریح طلب ہے۔

"ہڑتال" کیا ہے اور یہ لفظ کہاں سے آیا؟ ضروری ہے کہ پہلے اس پر بھی غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ اس کو موجودہ دور میں آخر اتنی مقبولیت کیوں حاصل ہے؟

ہڑتال اپنی "ڑ" کی وجہ سے خالص ہندوستانی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی "ڑ" کو چھوڑ کر "ر" کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے "نہ چونا لگے نہ ہرتال، رنگ چوکھا آئے"۔ یہاں پر "ہرتال" ایک معدنی دھات ہے جو زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ مگر اب یہی ہڑتال ہی مستعمل ہے۔ بہرحال ہمارے پیشِ نظر چونے کی ہرتال نہیں بلکہ موجودہ سماج میں ہونے والی آئے دن لوگوں کی ہڑتال ہے جس میں چہل پہل بڑھ جاتی ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کے ٹھٹھ نظر آتے ہیں اور بازار بند ہو جاتے ہیں۔

اس ہڑتال میں بھی یکجہتی پائی جاتی ہے اور یہ لفظ دو اجزا سے مرکب ہے۔ بظاہر "ہڑ" اور "تال" کی ترکیب نے اسے وجود بخشا ہے مگر ایسی بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ایک راز ہے۔ اور اس کی ترکیب میں دنیا کی تین عظیم شخصیتوں کا ہاتھ ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ تین طرح کی ہٹیں یعنی "بال ہٹ"، "تریا ہٹ" اور "راج ہٹ" مشہور بھی ہیں اور بڑی خطرناک بھی۔ لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک ایک اور ہٹ ہے، جسے کبھی "تال ہٹ" کہا جاتا ہوگا لیکن مدتوں استعمال میں آتے آتے یہ پہلے "ہٹ تال" اور پھر ہڑتال بن گئی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو یہ ہڑتال جسے ہم میں سے بیشتر نومولود سمجھتے ہیں بڑی قدیم روایات رکھتی ہے۔ سنتے ہیں سکندر اعظم کی فوجوں نے بھی ایک بار اُس کے خلاف ہڑتال کی تھی اور آگے بڑھنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً سکندر کو ساری دنیا پر حکومت کرنے کا ارادہ ترک کر دینا پڑا۔ ہو سکتا تھا یہ ہڑتال نہ بھی ہوتی تب بھی سکندر ساری دنیا کو فتح نہ کر پاتا۔ مگر فی الحال تو یہی کہا جائے گا کہ ہڑتال ہی نے سکندر اعظم کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ ویسے کبھی کبھی تو میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ مجنوں نے فراقِ لیلیٰ میں جو کھانا پینا چھوڑ دیا تھا تو یہ بھی شاید ایک قسم کی بھوک ہڑتال ہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجنوں کی بھوک ہڑتال کامیاب نہ ہوئی لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ مجنوں بیچارہ سچا ہڑتالی تھا۔ آج کل کے ہڑتالیوں کی طرح نہیں کہ جس کو ذرا شہرت اور ناموری کا شوق ہوا اُس نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

[illegible]

آج کل تو ہڑتالوں کی بات نکلی تو مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے میرے ایک دوست نے جو کسی فیکٹری میں ملازم ہیں ... کی بھوک ہڑتال شروع کی ... رات کے وقت میں ان سے ملنے پہنچا دیکھا کہ ایک صاحب جو شاید انہی کے ساتھ کام کرتے تھے کھانا لئے مسلسل اُن سے ضد کر رہے تھے کہ تھوڑا سا کھا لو اور وہ بیچارے یہ کہے جا رہے تھے کہ جب میں نے بھوک ہڑتال کی ہے تو پھر کھانا کیسے کھالوں۔ انہیں بہت سمجھایا گیا کہ بھائی اس وقت کون دیکھنے آتا ہے کہ تم کھا رہے ہو مگر وہ کھانے پر راضی نہ ہوئے۔ آخر کار اُن کے ساتھی نے جھنجھلا کر کہا "ارے میاں اگر اس طرح بھوک ہڑتال کی تو دیکھ لینا چند دن بھی زندہ نہ رہ پاؤ گے۔" ابھی میں اپنے دوست کے اس سچے جذبے کی دل ہی دل میں داد دے ہی رہا تھا کہ میرے دوست نے اُن صاحب سے کہا "کیوں کیا خفا ہو گئے؟ ارے بھئی میں یہ تھوڑی کہہ رہا ہوں کہ کھانا کھاؤں گا ہی نہیں لیکن کم از کم ایک دو دن تو ... تاکہ لوگ شکل سے تو یہ سمجھیں کہ میں بھوک ہڑتال پر ہوں۔"

یہ بھی عجیب بات ہے کہ اتنے دن گزر جانے پر بھی یہ واقعہ یاد کر کے مجھے ہنسی آ گئی۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہڑتال کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ دراصل یہ بنی نوعِ انسان کی اپنی تاریخ کی طرح پرانی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدلتے ہوئے ادوار میں اُس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ مجھے ان بدلتی ہوئی شکلوں سے بحث نہیں بلکہ مجھے تو موجودہ دور کی صرف ان ہڑتالوں سے مطلب ہے، جن میں ہوش کم اور جوش زیادہ ہوتا ہے۔ ان الفاظ سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ خدانخواستہ میں ہڑتال یا ہڑتالیوں کو برا بھلا کہہ رہا ہوں۔ دیکھئے ایک بات آپ کو چپکے سے بتائے دیتا ہوں کہ اپنی تو حالت اس 'تریا چرتر' کے زمانے میں شیخ چلی جیسی ہو کر رہ گئی ہے۔ جدھر جاتا ہوں اُدھر کی کہتا ہوں، جس سے بات کرتا ہوں اُسی کی ہاں میں ہاں ملا دیتا ہوں۔ اس لئے مجھ میں ہمت کہاں کہ ان بڑی بی یعنی بی ہڑتال کے بارے میں کیا کہا جائے۔ یوں تو ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر ناممکن کو ممکن بنانا ان کا کام ہے۔ یہ اگر چاہیں تو ملازموں کی تنخواہ دوگنی اور تین گنی کروا دیں، لڑکوں کو بغیر امتحان دئیے پاس کروا دیں اور بڑے سے بڑے افسر اور سخت سے سخت حاکم کو کبھی سر بہ پیر اور کبھی پیر بہ سر رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیں۔ میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ چوہا بلی سے ڈرتا ہے، بلی کتے سے اور کتا شیر سے ڈرتا ہے، لیکن یہ سب کے سب انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ آج اگر وہ قصہ نویس زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ چوہا اب بھی بلی سے ڈرتا ہے، بلی کتے سے ڈرتی ہے کتا شیر سے اور شیر آدمی سے ڈرتا ہے۔ مگر اب انسان بھی ایک چیز سے ڈرنے لگے ہیں اور وہ ہے ہڑتال۔ غریب ہے تو اُس کو ہڑتال سے روزی بند ہونے کا خطرہ، امیر ہے تو دولت جانے کا خطرہ، کارخانے دار ہے تو کارخانے میں تالا پڑ جانے کا خطرہ اور منسٹر ہے تو کرسی سے نیچے گرنے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا ہے یعنی اِدھر ہڑتال ہوئی اور اُدھر ... سے لے کر ... تک ہزاروں لوگ پریشان۔ لیکن جناب نہ معلوم کیا بات ہے کہ دن بدن بڑی بی (بی ہڑتال) کا طلسم پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ دفتروں، اسکولوں، فیکٹریوں اور کارخانوں سے بڑھ کر اب تو یہ بڑی بی حکومت کے ایوانوں تک بھی جا پہنچی ہیں۔ ویسے سننے میں آیا ہے ... اخبارات میں ان بڑی بی کا طلسم توڑنے کے لئے گہرے منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

مشکل تو یہ آ پڑی ہے کہ یہ بڑی بی اب ہمارے اور آپ کے گھروں میں بھی اپنے قدم جمانے لگی ہیں۔ ابھی چند ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ ہم بیگم صاحبہ کو ساتھ لئے بغیر سینما چلے گئے۔ بس جناب غضب ہو گیا۔ واپس آتے ہی الٹی میٹم مل گیا کہ کل سے باورچی خانہ میں ہڑتال رہے گی۔ وہ تو کہئے کہ اسی بیچ اُن کی چند سہیلیاں آ گئیں، بیگم صاحبہ کا موڈ کچھ اچھا ہوا اور ہم نے موقع غنیمت جان کر ایک کے بدلے دو پکچر دکھلانے کا وعدہ کر کے یہ باورچی خانہ کی ہڑتال رکوائی۔ لیکن اب عالم یہ ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے ہمارے ہر کام میں تنقید ہوتی ہے اور ذرا ہم نے تیور بدلے نہیں کہ بس ہڑتال کی دھمکی دی جاتی ہے۔

آپ شاید اسے مذاق کہیں لیکن ہڑتالوں کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ کچھ دنوں بعد سال کا کوئی دن ایسا نہ گزرے گا جب ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ہڑتال نہ ہو۔

ڈرامہ
(مزاحیہ)

سیّد نظر برنی

پولیس انسپکٹر

کرداروں کا تعارف

(۱) انچارج تھانہ رام نگری
(۲) سب انسپکٹر رام سنگھ
(۳) رادھا، رام سنگھ کی بیوی
(۴) بختاور سنگھ، رام سنگھ کا ایک رشتہ دار
(۵) سُچا سنگھ، بختاور سنگھ کا دوست
(۶) مجسٹریٹ

انچارج تھانہ رام نگری: (گھنٹی بجاتے ہوئے) رامو! سب انسپکٹر رام سنگھ کو اندر بھیجو۔"

رامو: "اچھا حضور"

(سب انسپکٹر رام سنگھ اندر داخل ہوتا ہے اور سیلوٹ مارتے ہوئے جے ہند کہتا ہے۔)

انچارج تھانہ: "انسپکٹر رام سنگھ، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقے میں پچھلے کئی ہفتوں سے کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ یہ بڑی تشویشناک بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے فرض کو ادا کرنے میں ناکام ہو اور جرائم سے دانستہ چشم پوشی کر رہے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے علاقہ میں ہفتوں سے کوئی واردات ہی نہ ہوئی ہو۔ مجھے اس کا تسلی بخش جواب ملنا چاہیئے ورنہ تمہارے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔"

سب انسپکٹر: (عاجزی سے) "حضور، میرے علاقے میں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔ وہ کوئی جھگڑا فساد نہیں کرتے۔ اور کوئی اتفاق سے جھگڑا ہو بھی جاتا ہے تو لوگ آپس میں پنچایت کر کے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔"

انچارج: "شٹ اپ! میں کچھ نہیں جانتا۔ پولیس وہاں کس لئے تعینات ہے۔ جاؤ — فرض کو پہچانو۔ اگر تمہارے علاقے میں کچھ دن اور شانتی اور سکھ شانتی رہی تو مجھے خوف ہے کہ ہمیں مجبوراً تمہاری چوکی کو توڑنا پڑیگا۔ سمجھے!"

سب انسپکٹر: "اچھا جناب! آیندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملیگا۔"

انچارج: "تم جا سکتے ہو۔"

سب انسپکٹر: "جے ہند"

انچارج: "جے ہند"

دوسرا سین

(کھانے کی میز پر سب انسپکٹر رام سنگھ اور اس کی بیوی رادھا کھانا کھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ برتنوں اور چمچوں کی آواز آتی ہے)

رادھا: "کیوں جی، آج تم بہت اُداس دکھائی دے رہے ہو۔ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟"

رام سنگھ: "کیا کروں؟ آج ہمارے صاحب نے مجھے خوب ڈانٹا پھٹکارا ہے۔ کہنے لگے کہ تمہارے علاقے میں گڑبڑ کیوں نہیں ہوتی؟ جرائم کا بازار گرم کیوں نہیں ہے؟ بتاؤ، میں کیا کروں؟ جب ہمارے علاقے کے لوگ اتنے شریف ہیں اور کوئی جرم سرزد نہیں ہوتا تو کیا میں فرضی روزنامچہ بھر دوں۔ ان افسروں کا بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ اُلٹی گنگا بہاتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارے نیتا اور دھارمک لوگ تو نیتک آدرشوں پر بل دیتے ہیں اور جرائم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی شکشا دیتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ پولیس آفسر اُلٹے جرائم کو بڑھا دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

(اتنے میں انسپکٹر رام سنگھ کا ایک رشتہ دار بختاور سنگھ اور اس کا دوست سُچا سنگھ گھر میں داخل ہوتے ہیں)

دونوں نمستے کرتے ہیں۔

رام سنگھ: "نمستے! آؤ بختاور، آؤ! آج میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔ چلو اچھا ہوا تم آ گئے۔ آؤ کھانا کھا لو۔ اور ہاں، میں تو بھول ہی گیا، یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟"

بختاور سنگھ: "یہ میرے دوست سُچا سنگھ جی ہیں۔ ایک ٹرانسپورٹ کا

کاروبار سے بڑے سجّن اور دیالو پُرُوشس ہیں۔"

(کچھ دیر تک سب لوگ کھانے میں لگے رہتے ہیں کوئی بات چیت نہیں ہوتی صرف پلیٹوں اور برتنوں کے کھڑکنے کی آواز آتی ہے)

بختاور سنگھ: بھائی صاحب کہئے آپ کی چوکی کا کیا حال ہے؟ خوب مجرموں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہوگی۔"

رام سنگھ: ارے بھائی کیا ذکر چھیڑ دیا۔ ابھی ابھی تھانہ سے آ رہا ہوں۔ وہاں تھانہ دار صاحب میرے علاقے میں پچھلے کئی ہفتہ سے کوئی واردات نہ ہونے پر بہت برسے مجھ پر۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علاقے میں سکھ شانتی نہیں چاہتے۔ اب تم ہی بتاؤ' بختاور بھلا کیا میں کرایہ کے ملزموں کو پیش کروں۔"

بختاور: "ارے بھائی صاحب' یہ بھی کوئی سمسّیا ہے؟ آخر میں بھی پولیس آفیسر رہا ہوں۔ یہ تو پولیس والوں کے لئے معمولی بات ہے۔ دیکھو' میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ کان ذرا قریب لائیے"

(بختاور سنگھ کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ کھسر پھسر ہوتی ہے اور رام سنگھ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے" کہتا سُنائی دیتا ہے)

مجسٹریٹ کی عدالت

اُردلی آواز دیتا ہے۔ "بختاور سنگھ ولد زوراآور سنگھ حاضر ہے؟"

بختاور: حاضر ہے"

مجسٹریٹ: بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

سب انسپکٹر: "جناب یہ شخص رات کو بارہ بجے علاقے میں آوارہ گردی کر رہا تھا اور مشکوک حالت میں پایا گیا۔ میں نے اس سے پوچھ تاچھ کرنے کی کوشش کی تو یہ بھاگنے لگا۔ اور' یہ شخص بڑا خطرناک اور سماج دشمن لگتا ہے۔ یہ چاقو بھی اس کی جیب سے برآمد ہوا ہے۔ ہم نے اس کا چالان دفعہ ۱۰۹ کے تحت کر دیا ہے۔"

مجسٹریٹ: "ملزم بختاور سنگھ' تمہارا کوئی ضمانتی ہے؟"

بختاور: جی حضور' یہ ہیں"

سُنچا: جی ہاں' میں ان کی ضمانت لیتا ہوں۔ میرا نام سُنچا سنگھ ولد ہر دھاری سنگھ ہے۔"

مجسٹریٹ: "اچھا منشی جی' ضمانت کے جملہ کاغذات جانچ پڑتال کر کے لے لئے جائیں اور ملزم کو رہا کر دیا جائے۔"

(عدالت برخاست ہو جاتی ہے)

بختاور سنگھ: دیکھا بھائی صاحب' کیسی رہی ہماری ترکیب۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا ہی رہا آپ کی کارگزاری بھی ہو گئی اور میرا بھی کچھ نہیں بگڑا۔" (سب مل کر قہقہہ لگاتے ہیں)

▲

بقیہ:۔ نقد و نظر صفحہ ۴۲

راجستھانی پس منظر میں جہاں ریتیلے سراب ہیں' وہاں دو بوند پانی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گنگا اپنے باپ سے کہتا ہے۔ "بابا ـــــ میں تمہاری بہو کو مکلاوہ کر کے لے آیا ہوں۔ ڈھیر سا جہیز لائی ہے۔!"

"ڈھیر سا جہیز لائی ہے ـــــ" اُس کے باپ ہری سنگھ نے دہرایا۔ "پانی بھی ساتھ لائی ہے؟" گنگا اپنے باپ کو اپنی بیوی کے بارے میں بتاتا ہے۔ اُس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے۔ اُس کی تعلیم کے بارے میں بتاتا ہے لیکن اُس کا باپ کچھ اور ہی سوچتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے سے پوچھتا ہے "ارے یہ بتا کہ دو گھڑے پانی کے سر پر اٹھا کے لا سکے ہے کہ نہیں؟ ایک گھڑا ہم لوگوں کی پیاس بجھانے کے لئے اور دوسرا گھڑا" اُس نے سوکھی پیاسی دھرتی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہماری زمین کی پیاس بجھانے کے لئے۔"

یگوں کا ناول زندگی کی جدوجہد اور اُس سے گہرے لگاؤ کی ایک داستان ہے۔ جو ایک اچھے آنے والے دن کی کہانی ہے اُس کل کی کہانی جب انسان کے چہرے پر مسکان ہوگی۔ کل جب سب ایک ہوں گے، ہندو اور مسلمان نہ ہوں گے۔ صرف انسان ہوں گے۔

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔ شاہدرہ۔ دہلی ۳۲
ایک سو ساٹھ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے

(تاجدار احتشام)

مکتوبات

● فروری ۱۹۹۵ء کا "شاعر" آیا اور غور و فکر کے لئے قابلِ توجہ پیام لایا۔ آپ کی بہت قابلِ داد اور آپ کے "جرعات" کی اثر انگیزی دل ہلا دینے والی قلم کی آواز ہے۔ بھائی بحال یہ ہو رہا ہے کہ کوئی کہتا کیا ہے۔ اُسے سُنتا کون ہے؟۔ ہو کیا رہا ہے؟۔ اُسے دیکھنے پر لوگ مجبور ہیں۔ اور پیکرِ حیرت بنے خود بے دست و پا ہو رہے ہیں۔ دانشوری اور ترقی پسندی کے سایہ میں بے دانشی اُدھم مچا رہی ہے۔ ترقی پسندی کے ادّعا اور حق طلبی کی نعرہ بازیوں کے ساتھ کرتوت ایسے ہیں کہ رجعت پسندیاں کیا غنڈہ گردی کو بھی شرمانے تک فرصت نہیں رہی۔ بھلا جب ادائگیِ فرض کا احساس اور قانون کا احترام ہی جاتا رہا ہو حق طلبی کا نعرہ سماج کے کاروانِ حیات کو ڈاکوؤں کی للکار سے کم کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

خیالی وطن دوستی کی آلاپ میں سُر میں سُر ملتا سننے کے لئے کیسے کیسے بے سُرے ڈکارنے جاتے ہیں مگر اپنی عملی وطن دوستی کی دُرگت یہ ہے کہ مادرِ وطن کی بربادی اور بے آبروئی اپنے ہاتھوں آپ کی جا رہی ہے۔ کہیں لوٹ کھسوٹ ہے کہیں توڑ پھوڑ ہے۔ کہیں آگ لگائی اور لگی آگ بھڑکائی جا رہی ہے۔ وطن کا ساز و سامان اور سرمایہ غارت کرکے دیش بھگتی کا جھنڈا اونچا کیا جا رہا ہے۔ دُوش کال کا یہ حال ہے کہ جہاں دیش واسیوں کو تولے ماشوں کے حساب سے اناج وہ بھی بمشکل مل رہا ہے وہاں یہ دیش بھگت ہنگامہ آرا۔ پرجا کے نام نہاد پریمی اور ہماچی جہاں بس چلتا ہے یہ حال کر دیتے ہیں جس پر یہ ضرب المثل صادق آتی ہے۔ نہ خود خورم نہ کس دہم۔ گند شود کنم بہ سگ دہم۔

چاروں طرف نفسی نفسی کا داویلا ہے۔ حتّی کہ ڈاکٹر جو بجا طور پر بنی نوع کی صحت و سلامتی کے محافظ اور امین تسلیم کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر ملک بھر میں بیماروں۔ لاچاروں۔ گداگروں۔ دردمندوں کو تڑپتا چھوڑ کر اور انہیں چار چار بار بھرپیٹ کھانے والے ناشکری سے ہائے بھوک ہائے بھوک کہتے ہوئے سر پیٹنا اور ہی کے اڑوس پڑوس میں بڑی بے پروائی سے سگریٹ نوشی کے دھوئیں کے بادل اُڑا رہے ہیں۔ گھر جلتے ہیں۔ دکانیں جلتی ہیں۔ کارخانے جلتے ہیں کالج جلتے ہیں یونیورسٹیوں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ دفتر پھونکے جا رہے ہیں۔ جو قیمتی ذخیرے میں، لائبریریوں اور تھانوں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ خزانوں میں لوٹ ہے۔ آگ کے شعلوں اور بھبوکوں کو قابو میں لانے کے لئے پانی کہاں سے آئے۔ یوں پانی بُری طرح ضائع ہو رہا ہے۔ مگر آگ بجھانے کے لئے پانی کا قطرہ نصیب نہیں ہوتا۔ بھلا عقل والے گرم مزاج خفتی پرور کے سورماؤں کو پس پردہ رہ کر اُکسانے اور بھڑکانے والوں کو کون بتائے کہ چیونٹی کے مُنہ کے دانے کا نقصان ملک کا نقصان ہے۔ بھکاری کے ایک پیسہ کا نقصان سارے دیش کا نقصان ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ لُٹنے والوں کے گھر ہی کی لوٹ ہے۔ یہ آتش زنیاں اپنی ہی پونجی کو تہس نہس کر رہی ہیں۔ ملک میں جا بجا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اسی کو گھر پھونک تماشہ کہتے ہیں۔ اپنے گھر کو آگ لگا کر آگ تاپنے کا خیال۔ اپنی موت اور بربادی کو بے وقت بُلاوا دینا اور اس پر اترانا اپنی ہی نہیں آنے والی نسلوں کی بربادیوں کا سامان مہیا کرنا ہے۔ اپنے ہی بدن کو نوچنا۔ کاٹنا۔ بھنبھوڑنا۔ کھلا پاگل پن ہے۔ نادان سمجھ رہے ہیں کہ یوں سرکار دربار کے اقتدار اور سرمایہ کی رگ کاٹی جا رہی ہے اور نہیں جانتے کہ سرکار وہی ہیں اور سرکار کا سرمایہ اُنہی کا سرمایہ ہے۔ اس لئے ہر قطرہ بہتا خون انہی کی رگوں کا خون ہے۔ لوک سیوک عموماً دفتری نوکر بجز انفسِ منصبی انجام دینے کی بجائے سارا وقت اپنی تنخواہ اور اپنا بھتّہ بڑھوانے کی تو تو میں میں یا ذہنی فکروں میں گم ہیں۔ اور دفتروں میں سنّاٹا ہے۔

غرض ایسا لگتا ہے کہ سبھی فریادی ہیں اور سبھی اپرادھی۔ کون کس کی طرف انگلی اٹھائے۔ کون شور مچاتا ہے۔ کون رُلاتا ہے۔ کون دیکھے اور کون سُنے۔ کارخانہ جل گیا لاکھوں کا سرمایہ راکھ کا ڈھیر ہو گیا تاؤ ناؤ ذمہ داروں کو پکارا کہ آؤ اور ہمیں بربادی سے بچاؤ۔ جواب ملتا ہے کہ منسٹی فرسٹ ایڈ کے لئے روپہلی سنہری سکّوں کا نذرانہ پیش کرو تو ہمارا امدادی ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا۔ قاعدہ قانون کا نام لو گے تو ادھر اُدھر ہو گے۔ جان و مال کے پاسبان خود محتاط ہیں۔ ادھر یہ بیمار موت کے چنگل سے نجات کیونکر پا سکے؟ پہلے کہا جاتا تھا تعلیم و علم جہالت کے روگوں کا علاج ہے۔ مگر اب دیکھنے میں آ رہا ہے کہ اسکولوں کالجوں سے یہ ہونہار کچھ سیکھ کر نکل رہے ہیں سکولوں کالجوں کی

علاقے شعلے اور دھویں میں جلتے ہوئے مستقل نظر آتے ہیں یہی کہ
بجائے یہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ ان پرچوں کا تو یہ عالم
تھا۔ یہ نہیں کہ چھپے ہوئے کا کیا علاج؟

خدا بھارت کو ہدایت بخشے کہ یہ اگر اُن کو بجر شعار حکومت
کر لیا جاتا ہے کہ بھارت کو ہوش آئے اور ان کی ایجاد شکنیوں سے
نجات پائے۔

"شاعر" کے اسی نمبر میں اکبرآباد کے کہنہ مشق ادیب اور مترجم کبیر
جناب ل۔ احمد یعنی لطیف الدین احمد صاحب کی پُرمعنی تحریر اور صورت
کی تازہ ترین تصویر نظر آئی۔ آپ کی یاد تو ہمیشہ تازہ رہی۔ مگر نصف صدی
کے بعد شاعر کے توسط سے آپ کا عکس بھی سامنے آ گیا۔ اس صدی
کے دورِ اوّل کے آخری سالوں میں آپ اور "نگار" کے "یارانِ نجد" میں
سے اکثر سے کئی بار موصوف ہی کے مکان پر ملاقات کی عزت و مسرت
حاصل ہوئی تھی (رحمہ اللہ) اب اُن حضرات میں سے کون بزرگ کہاں
اور کس حال میں ہیں مجھے معلوم نہیں۔ حضرت علامہ نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتحپوری
مدیر "نگار" سے شرفِ نیاز بھی حضرتِ لطیف ہی کے مکان پر حاصل
ہوا تھا۔ علامہ نیاز ابھی "مولانا" نیاز ہی تھے۔ اور ماشاء اللہ خوبصورت
خوش وضع داڑھی مرحوم چہرہ کی شان دوبالا کر رہی تھی۔ "نگار" کی
"اشاعت اگرچہ آگرہ سے شروع ہوئی تھی مگر "نگار" اور حضرت
نیاز آگرہ سے بھوپال منتقل ہو چکے تھے۔ حضرت ل۔ احمد کا دولت کدہ
اُس زمانہ کے بیرونی اور مقامی باذوق اہلِ ادب، آزاد روؤں، ہونہاروں
اور نوخیزوں کا سنگم تھا۔ اُس زمانہ میں ہمارے مولانا علامہ عاشق حسین
سیماب مرحوم و مغفور کا وجود مستقل ایک اسکول تھا۔ اس مجلس تک
میری رسائی حضرت سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر "مدیر نقاد" کے
توسط سے ہوئی تھی۔ اسی زمانہ میں کہیں کسی مجلس میں ایک مؤدب، خاموش
نوخیز خوشرو، خوش رنگ، سبزہ آغاز سید زادہ کی زیارت ہوئی تھی جو
اپنے بزرگوں کے جانشین تھے اور جنہوں نے بعد میں اپنے علمی و ادبی
کمالات سے ملک کے ادبی حلقوں میں مقامِ امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اس
سے مراد حضرت سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی کی ذاتِ گرامی
ہے۔ پچھلے دنوں کسی رسالہ میں آپ کی تازہ تصویر سامنے آئی۔ جسے دیکھ کر
کس قدر حیرت مرتسم ہوئی ہو سکتے کہ وہ رنگ اور تھا اور یہ نقشہ

بچھا رہا ہے۔ اگرچہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زندہ انسان اپنی ذات کے تغیرات
کو نہیں دیکھتا مگر دوسروں میں ہلکی سی تبدیلی کو بھی محسوس کر لیتا ہے۔
بہرحال دعا ہے کہ ان بزرگوں اور عزیزوں کو رب العالمین دین و دنیا
کی برکتوں اور نعمتوں سے سرفراز فرمائیں۔

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی
پتہ: آر ڈی بلاس
ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

● فروری کے شمارے میں ترجمہ اور ثقافت کنول احمد
اکبرآبادی کا بڑا خیال افروز اور پُراز معلومات ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں
سے کسب و استفادہ ہی کسی زبان کی زندگی کی علامت ہے۔ ہمارے لئے
یہ واقعی بہت بڑا المیہ ہے کہ عالمی زبانوں سے اُردو زبان کو بقدرِ ضرورت
فیض نہیں پہنچ رہا ہے۔ یہ کام تو عوام سے زیادہ حکومت کے کرنے کا تھا،
مگر اُن کے پاس وعدوں اور وعدوں کی بھرمار لیکن عمل کا فقدان ہے۔
انجمن ترقی اُردو، ترقی اُردو بورڈ وغیرہ جیسے نامی گرامی ادارے بھی اصلیت کی
کی نذر ہو کر رہ گئے ہیں، جو اربابِ نظر سے مخفی نہیں۔ ان کا دائرۂ کار محض
چند کلاسیکی کتابوں کی اشاعت اور اصطلاحات سازی تک محدود ہو کر
رہ گیا ہے۔ ترجمہ و تالیف کا کام صفر کے برابر ہے۔ ان نازک حالات
اور طوفانی تند و تیز ریلوں میں اُردو کی کشتی کو آپ ہی جیسے جیالوں نے غرق ہونے
سے بچایا ہے۔ آپ ہی جیسے مخلص اہلِ قلم اُردو کے لئے وجہِ نازش و افتخار
ہیں۔ آپ کی انتھک جد و جہد اور اُردو دوستی کی شہادت "شاعر" کے
صفحات برسہا برس سے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ کہانیوں میں سراج وجیہہ
شمو یا پوری کی کہانی "آسمان سے گرا" اور عبید قمر کی کہانی "بگڑا ہے
سر پہ گنبد" بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔

تاجدار احتشام نے "بڑوسی" پیش کر کے طنز و مزاح پر ظلم توڑ دیا
ہے۔ بالکل فضول باتیں پیش کی گئی ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ
قابلِ ستائش ہے۔ تاہم ترقی پسند ادب کے انتخاب میں "مقصدیت"
کو ضرور پیشِ نظر رکھا کیجئے۔

آخر میں جنوری اور فروری کے بیباک اور تند "شذرات" پر تہِ دل
سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ موجودہ شرمناک اور المناک "حکومت
کو تاریخ کے صفحات کبھی معاف نہ کر سکیں گے۔ آج جنگ سے زیادہ
نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس کا مجرم نہ صرف ملک کا سرمایہ دار
طبقہ ہے بلکہ اربابِ حکومت بھی اس میں برابر کے شریک و سہیم ہیں۔

ناچیزوں" ہمارا جاؤں اور زوال کو ختم کر کے یہ لوگ خود داد عیش دے رہے ہیں اور دونوں ہاتھوں دولت سمیٹ رہے ہیں، جس کے سبب ملک کے کروڑوں باشندوں میں سے چند لاکھ خوشحالوں کو چھوڑ کر باقی سب پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ آج کی بدامنی، بے سکونی، پریشانی معاشی بحران، اسٹرائک، بند، فرقہ پرستی کے زہریلے رجحانات۔ لوٹ کھسوٹ وغیرہ وغیرہ اسی کے نتیجے میں وبائی صورت اختیار کر گئے ہیں، جس کے سبب مرکز اور صوبوں کا انتظامیہ بھی اصلاحِ حال میں سخت ناکام ہے۔ آپ کی دردمندانہ اور پُرسوز اپیل پر ملک کے بیباک اور محبِ وطن عوام دوست اہلِ قلم کو جلد از جلد میدانِ عمل میں آنا چاہئے آج سے زیادہ ان کی بیباک نگاری کی ضرورت شاید پھر کبھی نہ پڑے ہمارا بھرپور قلمی تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی بعد سلام آپ کے "جرعات" پر مبارکباد پیش فرما رہے ہیں اور آپ کے خیالات کی بھرپور تائید کر رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ۔ تغلق آباد۔ دہلی ۶۲ — ڈاکٹر شفقت اعظمی

● "شاعر" فروری ۸۳ء موصول ہوا۔ جرعات کے ذریعے فکر و نظر کے موتی بکھیرنے والے آپ کے قلم نے اس بار جس ولولہ انگیز انداز میں صاحبانِ فکر و قلم کو دعوتِ فکر و عمل دی ہے یقیناً وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے شہسوارانِ ادب ان خوں آشام حالات اور ہلاکت آفریں مسائل سے جنگ کرنے کے لئے میدان میں کود پڑیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی کیونکہ وہ خلوص سے پُر ہے۔ اور پھر اربابِ فکر و نظر کی روایات کے عین مطابق بھی ہے۔

شمارہ ہٰذا میں مقالات بھی قابلِ قدر اور معلومات افزا ہیں۔ کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ بالخصوص تاجدار احتشام کا مزاحیہ خاکہ "پڑوسن" بحد پسند آیا۔ ایسے ہلکے پھلکے مزاح کو میں سنجیدہ مزاح کا نام دیتا ہوں۔ اسی لئے مجتبیٰ حسین کے خاکے بڑے بڑے چاؤ سے پڑھتا ہوں۔ اور اب "پڑوسن" پڑھنے کے بعد میری رائے ہے کہ تاجدار صاحب واقعی طنز و مزاح کے میدان میں بڑے بڑے معرکے جیت سکتے ہیں۔ حرمت الاکرام صاحب کی نظم نے بحد متاثر کیا۔ ویسے مدحت خیر، عزیز اندوری اور اختر بستوی کی نظمیں بھی قابلِ قدر ہیں۔

لکھنؤ اسٹیشن بلڈنگ — محبوب راہی

● کل ایک کارڈ ارسال کر چکا ہوں۔ فروری کا شمارہ آج موصول ہوا۔ واقعی کتابت، طباعت بہت اچھی ہے۔ پھر بھی

(۱) صفحہ ۸ کی آخری سطر میں حوّا کی جگہ خدا لکھا گیا ہے۔

(۲) صفحہ ۹ پر اٹھارہویں سطر میں احصار کی جگہ اعصار۔

(۳) صفحہ ۹ ہی پر چوبیسویں سطر میں ذیحیات کی جگہ زیحیات۔ کتابت ہو گیا ہے۔ "حوّا" اور "خدا" کی غلطی ناقابلِ معافی ہے۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ میں بھی اچھا ہوں۔ علاج جاری ہے اور کامل صحت مند ہونے میں کافی وقت لگ جائے گا۔

منٹولہ۔ آگرہ ۳ — ل۔ احمد اکبرآبادی

● "شاعر" کا تازہ شمارہ خط کے پیچھے پہونچا۔ حضرت ل۔ احمد کا مضمون ہی اب تک پڑھ پایا ہوں، خوب ہے۔ آپ کا بھلا ہو آپ اُردو کے محسنین کو ہر نہج یاد رکھتے ہیں — ورنہ ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ — شہاب سرمدی

● فروری ۸۳ء کے شمارے میں اہم مقالہ ل۔ احمد اکبرآبادی کا ہے جگن ناتھ آزاد کی غزل کا مطلع اچھا ہے۔ سراج وحیدہ شہود اپوری کا کہانی جاندار ہے۔ بہت بہت پسند آئی۔ کاش! اُن کا پتہ اسوقت میرے پاس ہوتا۔ اس کے بعد کوئی مضمون دلچسپی پیدا کر سکا تو وہ ہے تاجدار احتشام کا طنزیہ و مزاحیہ "پڑوسن" — اور بس۔

نزد جامع مسجد۔ بارہ مولہ (کشمیر) — مشتاق حسین

● سب سے پہلے آپ کے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے اس کے بعد مضامین کی ترتیب۔ تازہ "شاعر" میں "جرعات"، ل۔ احمد اکبرآبادی کا مقالہ "ترجمہ اور قومی ثقافت"، حرمت الاکرام کی نظم "اتنے بے غرض"، جگن ناتھ آزاد کی غزل، سراج وحیدہ شہود اپوری بہت پسند آئے۔

اور "اے صاحبانِ فکر و قلم" میں آپ کا یہ جملہ اہلِ قلم حضرات کیلئے "تم اپنے قلموں کو ایک بار پھر تلوار بناؤ اور ملک کے اندرونی مسائل کی اس جنگ میں بے خطر کود پڑو۔ ان نفرتوں کی چنگاریوں کو بجھاؤ جو ہر طرف اڑ رہی ہیں۔"

نفنھ کراس۔ ویبے ٹگ۔ بنگلور — وحید پاشا

• شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ مندرجات نظر سے گزرے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا مضمون "ہیئت" اپنی جگہ خوب ہے۔ مگر بہت تشنہ ہے۔ اس موضوع پر نظریاتی طور پر غالباً ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون "شاعری میں ہیئت کا منصب" پہلا مضمون ہے اور ڈاکٹر جاوید کا مضمون دوسرا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" ڈاکٹر سیدہ جعفر کا "اردو نظم میں ہیئت کے تجربے"۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے"۔ ڈاکٹر محمد حسن کا "نئے اسالیب نظم" ریاض احمد کا "قوم نظر کے تجربے" ڈاکٹر زینہ ثانی کا "نظمیہ شاعری میں ہیئت کے تجربے" قابل ذکر مضامین ہیں۔ میں نے "سیارہ" کے عبدالعزیز خالد نمبر کیلئے "عبدالعزیز خالد اور رباعی کے تجربے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ ان مضامین کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین کا "مواد اور ہیئت" بھی اہم ترین مضمون ہے۔ ان مضامین سے ہیئت کے موضوع پر اتنا مواد جمع ہو گیا ہے کہ اب اس پر زیادہ سنجیدگی سے غور کیا جانا ضروری ہے۔ ان مضامین میں ہر مضمون نگار نے اپنے طور پر ہیئت، مواد اور تجربوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن نے جدید تر تصورات کی روشنی میں بحث کی ہے۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر جاوید کا مضمون تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کیر کی کتاب "فارم اینڈ اسٹائل ان پوئٹری" پر اکتفا کر کے مضمون لکھ دیا ہے۔ جبکہ انگریزی میں اس موضوع پر بعض اہم کتابیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں "کنونشن اینڈ ریوولٹ ان پوئٹری" اور "ٹریڈیشن اینڈ ایکسپریمنٹ" بہت اہم ہیں۔ ہیئت کی تفہیم کے لئے سوسن لینگر کی دو کتابیں "فیلنگ اینڈ فارم" اور "اے نیو کی ٹو فلاسفی" بھی اہم ہیں۔ چونکہ ادبی ہیئت محض خارجی شکل و صورت کا نام نہیں ہے اس لئے مواد اور ذریعۂ اظہار نیز زبان، اسلوب اور تکنیک پر لکھی جانے والی کتابوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اردو میں صنف کا تصور قدیم اور ہیئت کا جدید ہے۔ صنف کا تعین کبھی داخلی خصوصیات کرتی ہیں اور کبھی خارجی، کبھی دونوں۔ اس لئے صنف کا تصور واضح اور متعین نہیں ہے۔ ہیئت انگریزی لفظ FORM (فارم) کے ترجمے کے طور پر مستعمل ہے۔ اردو میں اس کے مترادف الفاظ شکل، صورت، شبیہہ، [illegible] ہے

کوئی لفظ ہیئت کے جدید ادبی تصور کو ظاہر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ "ہیئت" ایک ادبی اصطلاح ہی نہیں ہے بلکہ یہ فلسفہ، منطق، نجوم، ترسیمی فن اور جمالیات وغیرہ کی اصطلاح بھی ہے اور ہر جگہ اس کا اپنا ایک مخصوص مفہوم ہے۔ ان علوم و فنون میں سے بعض کے اہم تصورات ادبی ہیئت کے تصور میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس لئے ادبی ہیئت کے مفہوم پر گفتگو کرتے وقت خالص ادبی تصور ہیئت اور دیگر علوم کے تصور ہیئت کے امتیاز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ان ملے جلے تصورات میں خارجی ہیئت — EXTERNAL FORM داخلی ہیئت EXTERNAL FORM ماورائی ہیئت TRANSCENDENTAL FORM میکانکی ہیئت MECHANICAL FORM روایتی ہیئت TRADITIONAL FORM اور عضوی ہیئت ORGANIC FORM کے تصورات بہت اہم ہیں۔

موجودہ دور میں عضوی ہیئت کا تصور مقبول ہے۔ چونکہ شاعری ایک تخلیقی فن ہے اس لئے شاعری کی وہ ہیئت جو تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت کا خارجی ظہور ہوتی ہے عضوی ہیئت کہلاتی ہے۔ یہ مواد کی خودکاری اور خود تجسیمی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران مواد وہی شکل اختیار کرتا ہے جو اس کو فطری طور پر اختیار کرنی چاہئے۔ ذہن کے تخلیقی عمل پر (شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے پُراسرار عمل پر) نفسیات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس سلسلے میں سوسن لینگر نے بڑی دلکش بحث کی ہے اور ذہن کے بنیادی عمل کو علامت سازی کا عمل قرار دیا ہے۔ اس عمل کے دوران لفظ اور تصور باہم مل جل کر پرورش پاتے ہیں اور ایک خاص منزل میں ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ میکس میور نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے کہ لفظ اور خیال دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ہر خیال اپنے ساتھ مخصوص الفاظ کا جامہ لاتا ہے۔ دنیا کی زبانوں کے بعض باشعور شاعروں نے اپنے تخلیقی عمل کے تجربوں کو قلمبند کیا ہے۔ ان کے بیانات سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ اسپنڈر نے لکھا ہے کہ جب وہ تخلیقی تحریک کی گرفت میں ہوتا ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر صرف تخلیق کرتا ہے۔ اس عالم میں اس کے ذہن میں کوئی لفظ، ترکیب یا ٹکڑا ابھرتا ہے اور دوسرے الفاظ اس کے گرد جمع ہو کر نظم کی تشکیل کرنے لگتے ہیں۔ دراصل یہی تخلیقی عمل ہے اور اس عمل سے وجود میں آنے والی ہیئت ہی عضوی ہیئت ہے۔ اس کا لازمی

اور منطقی نتیجہ ہے۔ جبکہ اس سے ایک اور وہ تمام تصورات خود بخود مسترد ہو جاتے ہیں جو ہیئت کو تنہا یا مواد کو تنہا یا میکانکی قرار دیتے ہیں۔ ہیئت کے روایتی اور فلسفیانہ تصورات بھی رد ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہیئت ایک ایسی اکائی قرار پاتی ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہوتا ہے۔ اس میں بلا کی ہم آہنگی اور تناسب ہوتا ہے۔ اس میں مواد، ہیئت اور میڈیم کی تثلیث باقی نہیں رہتی بلکہ یہ تینوں ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک وحدت ہو جاتے ہیں۔ اس میں تازگی توانائی اور حسن ہوتا ہے۔

ہیئت میں دلکشی، تکنیک اور اسلوب اور اس کے تمام خارجی داخلی عناصر اور رشتے غرض سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ ان عناصر کو ذہنی تجربہ کے ذریعہ الگ کر سکتے ہیں۔ عملاً ان کو الگ الگ کرنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح مواد اور ہیئت کو الگ الگ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ مواد کے بغیر ہیئت کا اور ہیئت کے بغیر مواد کا تصور مشکل ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں میڈیم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس لئے ادبی یا شعری ہیئت کے تصور پر گفتگو کرتے وقت میڈیم (زبان اور اس کی تمام شکلوں) کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے ـــــــ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ — (ڈاکٹر) عنوان چشتی

● فروری ۱۹۸۲ء کا "شاعر" ملا۔ "جرعات" سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے اور برتنے کے لائق ہیں۔ آپ نے وقت کی صحیح آواز اٹھائی ہے، اس بار نظم و نثر کا حصہ بہت ہی قیمتی ہے۔

حرمت الاکرام کی نظم "انائے بے خبری" قابلِ قدر تخلیق ہے۔ غزلوں میں جگناتھ آزاد کی یوں تو پوری غزل متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن یہ اشعار تو خاص طور پر ناقابلِ فراموش ہیں۔

اے دلِ ناداں نہ کر تو شکستہ آرائی بہت
سامنے اہلِ نظر کم ہیں، تماشائی بہت

تیری بیگانہ روی سے دل بڑی الجھن میں ہے
ہم یہ سمجھا تھا کہ ہے تجھ سے شناسائی بہت

محبوب راہی کی غزل کے یہ اشعار بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتے ؎

میرے اندر جو رہا کرتا ہے، اکثر مجھ سے
جس کا میں اہل نہیں، چیز وہی مانگے ہے

کب سکوں پائے ہے اپنا دلِ ہنگامہ پسند
جب بھی مانگے ہے اک آشفتہ ذہنی مانگے ہے

اب تو احساسِ توانائی بھی باقی نہ رہا
ہم سے اب اور بھی کیا اپنی صدی مانگے ہے

غیر اردو کے علاقے میں رہ کر محبوب راہی کی ایسی فکر تخلیق قابلِ تعریف ہے۔ "شاعر" کی درپیش حال مشکلات ایک افسوسناک بات ہے۔ لیکن امید ہے کہ اہلِ نظر اپنی بہبود جہد میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کریں گے۔ "شاعر" کی زندگی اردو ادب ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام اردو پرستوں کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ اردو کے معیاری رسائل میں "شاعر" اپنی مثال آپ ہے۔ خدا کرے "قومی یکجہتی نمبر" کو نمایاں کامیابی حاصل ہو۔

جمدہاں۔ جونپور — شوکت پردیسی

● تازہ "شاعر" (فروری ۱۹۸۲ء) کے "جرعات" میں "نئے صاحبانِ فکر و قلم" کے عنوان سے آپ نے جو اداریہ تحریر فرمایا ہے وہ قومی یکجہتی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ملک میں ایسے بحران اور افراتفری کے پیشِ نظر قومی یکجہتی اور ایثارانہ جذبے کے مثبت رجحانات و میلانات کو فروغ دینا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

واقعی اس وقت کی تباہ کاریاں، ہلاکت خیزیاں اور خون آشامیاں قوم اور انسانیت کو پستی و زوال کی جانب لے جا رہی ہیں۔ اگر بروقت اس کی چارہ جوئی نہ کی گئی تو سارا ملک گروہ بندیوں، اقربا پرستیوں اور سیاسی مصلحت اندیشیوں کے شعلوں میں جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ دانشورانِ قوم و ادب اپنے افکار و قلم کے تیشے سے قلعۂ فتنہ و فساد اور کاخِ بغض و عناد کو ڈھا دیں۔

زیرِ نظر شمارہ کے منتخبات بے حد اہم اور متاثر کن ہیں۔ کہانیوں میں ـ سراج وحید، احمد تنویر، ملک رام آنند اور نسیم محمد جان اچھے لگے۔ نظموں میں حرمت الاکرام، کرامت علی کرامت، رؤف خیر، شاکر حکیمی اور اختر بستوی متاثر کرتے ہیں۔ تاجدار احتشام کا "پڑوسی" مزہ دے گیا۔ غزلوں میں جگن ناتھ آزاد، شین سرحدی، ناوک انصاری، حنیفی، محبوب راہی اور محبوب شیر گھاٹی نے بہت ہی اچھے تاثرات چھوڑے۔

مسجد روڈ۔ ہزاری باغ (بہار) — نشاط انصاری

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

آپ کا سالِ خریداری مارچ ۸۲ء میں ختم ہو چکا ہے یہ تازہ شمارہ آپ کی مدتِ خریداری کا آخری شمارہ ہے۔ لہٰذا کرم فرما کر آئندہ سال کیلئے ۱۲/- روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیج کر ممنون فرمائیے۔ امید کہ آپ بھی تجدیدِ خریداری فرمائیں گے اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو [illegible] تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو بھی ایک خط کے ذریعہ اطلاع دیجئے۔ اگر آپ کا زرِ سالانہ نہ آیا تو شاعر کی روانگی روک دی [illegible]۔

منیجر

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

صریرِ خامہ

از ——— مظفر حنفی

مظفر حنفی نے نظم و نثر میں بہت کام کیا ہے اور چند سال ہی میں اُن کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اینٹ کا جواب۔ دو غنڈے اور دیدۂ حیراں اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اُنھوں نے چار ناولوں کا ترجمہ کیا اور اپنے استاد شاد عارفی کے کلام کو مختلف جہتوں سے مرتب کیا۔ اُن پر مضامین لکھوائے۔ ایک تھا شاعر۔ شوخیِ تحریر، نثر و غزل دستہ، شاد عارفی کی غزلیں۔ تحقیقی و تنقیدی مقالہ "شاد عارفی، فن اور شخصیت" کے علاوہ خود اُن کے تین مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ تیکھی غزلیں، عکس ریز اور پانی کی زبان۔ "صریرِ خامہ" بھی اُن کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

مظفر حنفی نے نظم و نثر میں جتنا بھی کام کیا ہے، وہ سنجیدگی اور توجہ سے کیا ہے۔ شاد عارفی کے فکر و فن کو واضح طور پر پیش کرنے کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔ کسی شخصیت پر اتنے انہماک سے شاید ہی کسی نے کام کیا ہو۔ ادیب یا شاعر کا علمی پس منظر اگر روشن ہو اور وہ خلوص کے ساتھ اپنے کاموں میں لگا رہے تو اعتبارِ نظر کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ مظفر حنفی کی نظم و نثر میں یہ اعتبارِ نظر نمایاں ہے۔

مظفر حنفی نے شاد عارفی کے رنگ و آہنگ کا اثر قبول کیا ہے اُن کے شعروں کا تیکھا پن اور طنزیہ لہجہ شاد عارفی ہی کی روایت کی توسیع ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ اُردو شاعری میں تیکھے اور طنزیہ اشعار نہ ملتے ہوں۔ غیر روایتی غزل کے جتنے بھی بڑے شاعر ہیں، اُن کے یہاں کسی نہ کسی شعر میں طنز اُبھر کر آتی ہے۔ اُردو کا سب سے عظیم طنز نگار یگانہ چنگیزی ہے، اور اب تک یگانہ کے فکر و فن کی تقلید کرنے والا بھی کوئی پیدا نہیں ہو سکا ہے۔

گزشتہ بیس سال کی اُردو غزل میں اکثر در آجاتا ایک فطری امر ہے۔ ہماری خارجی زندگی نے کچھ ایسا ہی رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ مظفر حنفی نے طنزیہ شاعری میں کسی حد تک اپنی انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ اُن کے پہلے مجموعۂ غزل "تیکھی غزلیں" میں مجموعہ کی حیثیت سے دو تھیں اور "پانی کی زبان" سے اُن کی شاعری نے نیا موڑ لیا ہے

کیروں کے فقیروں سے مظفر کچھ نہیں ہوگا
نئی نسلوں کی خاطر ہم نئی راہیں بناتے ہیں

مظفر نئی نسل ہی کے شاعر ہیں، مگر اُن کے یہاں عموماً نئی شاعری کی بعض بے ضابطگیاں نہیں ملتیں۔ اس کے باوجود اُنھیں اپنے شعور سے خود کچھ سوالات ضرور کرنے چاہئیں اور جب وہ اِن سوالات کے جوابات پالیں گے تو اپنے یہاں ایسے اشعار کو روا نہ رکھیں گے ؎

نہ جانے بے عمل کیوں اس طرح بیکار بیٹھے ہیں
ہزاروں لوگ اپنی جان سے بےزار بیٹھے ہیں
اجازت ہو تو میں ہی تبصرہ کرتا چلوں ان پر
تمہاری انجمن میں سیکڑوں بےکار بیٹھے ہیں

"بیکار بیٹھے ہیں" اور "بیکار بیٹھے ہیں" نے دونوں شعروں کو بےحد سطحی فکر کا حامل بنا دیا ہے۔ اِس طرح کے سطحی اشعار کی اس مجموعہ میں کمی نہیں ہے اور اُن کو بطورِ مثال پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ طنزیہ شاعری بھی فکر چاہتی ہے۔ محض سطح پر ہاتھ مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ "صریرِ خامہ" کے مقدمہ نگار محمود سعیدی نے لکھا ہے کہ "مظفر حنفی عصری شعور سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔ تقسیم کے بعد ملکی سطح پر جو نئے مسائل سامنے آئے ہیں، یا جو نئی سماجی اور سیاسی ناہمواریاں رُونما ہوئی ہیں اُن پر بھی کہیں کہیں اُنھوں نے زوردار چوٹیں کی ہیں" لیکن مظفر کے یہاں شروع سے آخر تک ملنے والے عصری شعور پر مبنی اشعار کو پرکھا جائے تو اُن سے دانشوری کم اور ایک طرح کی کھلے انداز میں "ارتجالی نشانہ بازی" زیادہ ملتی ہے۔ "عصری حسیت" جس کا نام ہے، اُس کے لئے تو بہت گہرائی میں جانا ہوتا ہے۔ محض سماجی اور سیاسی ناہمواریوں تک پہنچنا عصری شعور یا حسیت نہیں۔ یہ تو پوری زندگی پر ایک دَرّاک نظر چاہتی ہے۔ یہ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ مظفر حنفی داخلی تہوں تک نہیں پہنچے۔ خارجی عوامل پر چند پھلجھڑیاں ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ یوں مظفر کے یہاں طنزیہ اور غیر طنزیہ خوبصورت اشعار کی کمی نہیں ہے۔ کئی خوبصورت بحریں اور متاثر کرنے والی نئی زمینیں بھی اُنھوں نے

اختیار کی ہیں۔

چھوڑ کر جنا سیکھ برستا ‘بادل’ او بادل
ساون میں اندھا ہے دریا ‘بادل’ او بادل
میرے پیچھے کیوں آتا ہے، بستی پیاسی ہے
میں بنجارا ہوں ’میرا کیا‘ بادل‘ او بادل

چند اور ایسے اشعار دیکھئے جو فکر و فن سے بھرپور ہیں ؎

خود اپنے حال پر ہی توجہ نہ کر سکے — ہم نے کسی کے داغ گنائے کسی کے زخم

تمام امواجِ دلِ شکستہ قریب آ آ کے لوٹتی ہیں
اگرچہ انجام سامنے ہے، مگر سفینہ نہیں سمجھتا۔

لوگ حالات پہ یوں طنز کئے جاتے ہیں
جیسے سانچے میں کسی اور کو ڈھلنا ہوگا

یوں تو بستی میں ہزاروں لوگ تھے — آدمی کی بو نہ آئی ناک میں
میرے اندر ہی کمیں گاہیں بنائے — کون بیٹھا ہے یہ میری تاک میں

اپنی غزلوں کے تقریباً تمام مقطعوں میں مظفر حنفی نے اپنی شاعری کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فراق کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اُن کے مقطعوں کا ردِ عمل تو کچھ اچھا نہیں ہوا۔ بہر حال "صریرِ خامہ" مظفر حنفی کے اُن کے اپنے انداز کی شاعری کا قابلِ قدر شعری مجموعہ ہے۔ رہی بات علمی و فنی کمزوریوں یا نکات کی، تو اس کے لئے ایک الگ تبصرہ چاہئے مگر بڑی حد تک مظفر حنفی علمی و فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

کتاب خوبصورت طبع ہوئی ہے۔ صفحات ۱۴۰۔ قیمت چھ روپے
ملنے کا پتہ: پی۔ کے سیلکشنز ۲۷۲ پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج دہلی ۶

غالبیات کے چند مباحث

از ـــــــــ ڈاکٹر ابو محمد سحر

بھوپال سے غالب اور کلامِ غالب کا رشتہ گہرا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کا سہرا بھوپال ہی کے سر ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی بھوپال ہی کے ایک صاحبِ نظر ادیب اور محقق ہیں جو سالہا سال سے نہایت خاموشی کے ساتھ ادبی اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور اپنی سنجیدہ تحریروں کے باعث قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

غالب صدی سے اب تک غالب پر کافی کام ہوا ہے، اچھا بھی اور بُرا بھی۔ ضروری بھی اور غیر ضروری بھی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے غالب پر اس دوران میں جو کچھ مختلف رسائل میں لکھا وہ لائقِ توجہ سمجھا گیا۔ اپنے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

"یہ مضامین ایک واضح مقصد اور نقطۂ نظر کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ نہ صرف غالبیات بلکہ اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی، ماخذ کی چھان بین، نکتہ شناسی اور استخراجِ نتائج کے ایک مخصوص معیار پر اصرار کیا گیا ہے۔"

(۱) دیوانِ غالب، اپریل فول اور اہلِ تحقیق (۲) امیر مینائی کا ایک شعر دیوانِ غالب میں (۳) اپریل فول یا جعل (۴) کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں (۵) نسخۂ حمیدیہ اور اس کی اہمیت (۶) دیوانِ غالب کا ایک اہم گم شدہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال (۷) نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف (۸) نسخۂ بھوپال چند انکشافات (۹) نسخۂ بھوپال ملکیت اور کتابت (۱۰) نسخۂ بھوپال ترمیمیں اور اضافے (۱۱) کچھ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب کے بارے میں۔ (۱۲) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب پر ایک نظر (۱۳) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے گُلِ رعنا بخطِ غالب تک (۱۴) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۵) گُلِ رعنا اور اُس سے متعلق مسائل۔

یہ ہیں اس کتاب کے مضامین اور ان مضامین میں ایک کتاب کے ابواب کا سا ربط و تعلق ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنے تحقیقی نتائج کو بہت واضح انداز میں پیش کرتے ہیں اور بعض دوسرے محققین کی طرح الجھنوں میں اضافہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی تحقیق میں "قیاسات" کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ شہادتوں اور تاریخی مرقومات کی تلاش اور اُن سے صحیح نتائج کے استخراج کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اس کتاب میں "نسخۂ بھوپال بخطِ غالب" (جو غالب صدی کے دوران چند صفحات پر مشتمل غلط سلط یکایک بھوپال میں برآمد ہوا تھا) پر تین حصوں میں کافی اچھی بحث ہے۔ افسوس کہ اس سہ رُخی مضمون کے چند صفحات خلط ملط ہو گئے ہیں۔ یہ غلطی ناشر کی ہے اور اس کا درست ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے ہمارے زیرِ نظر نسخے یا صرف چند نسخوں میں یہ فروگذاشت ہوئی ہو۔

کسی مرعوبیت اور رعایت کے بغیر غالب کے سلسلے میں لکھے گئے یہ تحقیقی مضامین کام کے ہیں۔

صفحات ۲۹۶۔ کتابت نہایت معمولی۔ قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے
ناشر نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ (یو۔ پی)

صحرا کا سفر

از ــــــــــ راہی قریشی

کتاب کے نام پر نہ جائیے۔ یہ نام کسی ناول کا بھی ہو سکتا ہے اور کسی سفر نامہ کا بھی۔ نئے شعرا اپنی کتابوں کے نام کے لئے ان افکار و موضوعات کی مطابقت ضروری نہیں سمجھتے جو وہ کتاب میں پیش کر رہے ہوتے ہیں یہ راہی قریشی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اُن کی عمر ۲۸ سال ہے اور وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ چند سال ہی میں انھوں نے اپنے فکر و اسلوب سے اُردو حلقوں کو متاثر کر لیا ہے۔ اُن کا کلام صحرا کا سفر نہیں ہے، بلکہ اجتماعی زندگی کا سفر اور ایک منظم ذہنی و فکری رویے کا اظہار ہے۔ یہ جدید غزل کی یکساں سانچے والی شاعری نہیں ہے۔ اور اس میں منفی رجحانات کی گرد بھی اُڑتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ محمود سعیدی نے پیش لفظ میں بالکل صحیح کہا ہے ــ

وہ صرف اپنے عہد کی ہزیمتوں ہی کے نوحہ گر نہیں ہیں

بلکہ اُن مثبت امکانات تک بھی اُن کی نظر جاتی ہے جو

ہر منفی صورتِ حال میں کہیں نہ کہیں برسرِ عمل رہتے ہیں۔

اثبات و نفی، نشاط و غم، دھوپ اور چھاؤں، رات اور دن، غرض کائنات اور کائنات میں موجود ہر شے کے دو رنگ ہیں۔ تضادات زندگی کا حسن ہیں اور جب کوئی شاعر زندگی کی متضاد کیفیتوں کو فکری انداز میں ڈھالتا ہے تو وہ دلپذیر بن جاتی ہیں۔ راہی قریشی کی ان غزلوں میں زندگی کی متنوع کیفیات ان کے محسوسات کے پیکروں میں ڈھل کر خوشگوار بن گئی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ راہی قریشی کی شاعری عصری میلانات اور جدید رجحانات کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مزید ترقی ہے، یہ اشعار دیکھئے ؎

میں بہت تنہا ہوں اپنے شہر میں　　　بڑھ گئے ہیں جب سے ہمسائے بہت

وہ وقت ہے کہ چھوٹ گیا سائے کا بھی ساتھ

وہ شور ہے کہ اپنی صدا کو ترس گئے

بہت دنوں سے ترستا ہوں گفتگو کو یہاں

مگر وہ شور ہے برپا کہ کچھ کہوں کیسے

در و دیوار سے بیگانگی اتنی ٹپکی　　　لوگ اپنے ہی گھروں میں بیٹھے بے گھر سے لگے

آئینہ خانۂ ہستی میں ہیں کتنے چہرے　　　کسی چہرے کو صدا دو کوئی صورت مانگو

محمود سعیدی لکھتے ہیں کہ ـــ "راہی کے لئے وجہِ امتیاز یہ ہے کہ وہ عصری زندگی کے مراحل تک شخصی تجربے کی راہ سے پہنچے ہیں۔ یہ گمان نہیں گزرتا کہ انھوں نے ان موضوعات کو صرف "فیشن پریڈ" میں شامل ہونے کی نیت سے چھوا ہے۔"

شاعری میں شخصی تجربے ہی کی اہمیت ہے۔ شخصی تجربہ جتنا گہرا ہوگا اتنی ہی زیادہ معنویت پیدا ہوگی۔ آدابِ شاعری اور معنویت دونوں اعتبار سے راہی قریشی کی شاعری اچھی ہے۔ اس میں تازگی اور رچاؤ ہے۔ جدید اردو غزل کا یہی مزاج ہونا چاہیئے ؎

اجنبی بن کے جو کچھ پوچھ لیا کرتا ہے

ساری بستی میں وہی ایک شناسا ہے بہت

میرے دامن میں فقط میرے ہی آنسو نکلے

اتنا تنہا ہوں کہ خود اپنا ہی غم خوار ہوں میں

۱۱۲ صفحات۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ ناشر: ولا اکیڈیمی، عزیز باغ، سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴

دریافت

مرتب ــــــــــ کرشن کمار طور

کشمیر کے بعد ہماچل پردیش وہ دوسری ریاست ہے جس میں سرکاری طور پر اُردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جہاں ابتدائی سطح سے ثانوی اعلیٰ ثانوی سطح تک اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ جہاں عام طور پر اُردو بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ جہاں عدالتوں اور سرکاری اداروں میں بھی اُردو کی اصطلاحات رائج ہیں۔ وہاں پوسٹ مین اب بھی خط پر لکھتا ہے کہ "مکتوب علیہ اپنی جگہ موجود نہیں ہیں"۔

افسوس کہ اس ریاست کی طرف ذمہ داران اُردو نے اب تک کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اس اُردو نواز ریاست میں اُردو کے اچھے ادیب اور شاعر بھی ہیں مگر انھیں بھی اُردو کے رسائل، اُردو کے نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے مسلسل نظر انداز کیا ہے۔ اب خود ہماچل پردیش کے ادیبوں اور شاعروں کو اس کا احساس ہو چلا ہے۔ وہاں کی نئی نسل کے کئی شاعر اب اُردو رسائل میں نظر آنے لگے ہیں۔ "دریافت" اس اعتبار سے واقعی دریافت ہے کہ پہلی بار اس میں ہماچل پردیش کے ۱۹ شعرا کا منتخب کلام اُن کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ لال چند پرارتھی، چاند گلوڑی، شباب للت۔

دھرمپال عاقل، حکیم راج گپت ساغر، احسن رضوی، ارمان شہابی، رتن سنگھ جگیش، ساغر پالمپوری، کرشن کمار طور، ضیا صدیقی، طلعت عرفانی، ڈی کے نگار، کاہن سنگھ جمال، کوشل نور پوری، پریم عالم، کنول نور پوری، خالد آزر، پریم ناتھ نہرو اور جیش چندر تسکین اس میں شامل ہیں۔ ہر شاعر کے لئے چھ صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ ایک صفحہ پر شاعر کا تعارف ہے اور اس کی پانچ غزلیں۔

ہماچل پردیش کے شعرا کا یہ منتخب کلام (چند جزوی کمزور اشعار کو چھوڑ کر) فن و وقار کا حامل ہے۔ اسے معیاری اردو شاعری سے ناپا جا سکتا ہے۔ اس میں جدید فکر و فن کے خوبصورت نمونے نظر آتے ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں ہماچل پردیش کے شعرا کہ انھوں نے "خود تعارفی" کا یہ مستحسن اقدام کیا۔ امید کہ وہ ادبی و شعری دنیا پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گے۔ ہماچل پردیش میں اردو زبان و ادب کی نمایاں ترقیوں کے لئے نئی نئی راہیں نکالیں گے۔ وہاں اردو کے مطابع قائم ہونے چاہئیں۔ بہت اونچے پیمانہ پر اردو کا روزنامہ، ہفت روزہ اور ماہنامہ نکلنا چاہئے۔ اردو کے بڑے مشاعرے، مذاکرے، مباحثے اور کانفرنسیں منعقد ہوں۔ اردو تعلیم کا معیار بلند ہو۔ درس و تدریس کے انتظامات بہتر ہوں۔ یہ سب کام ہماچل کی اردو نئی نسل بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔

"دریافت" کی کتابت و طباعت پر دلی کے کاتب اور مطبع نے ظلم ڈھایا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں چند صفحات کا ایک ایسا مقالہ ہونا ضروری تھا جو ہماچل پردیش خصوصاً شملہ کی ماضی اور حال کی اردو سرگرمیوں پر روشنی ڈالتا۔ بہرحال، یہ بھی جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ ہر اردو دوست کو "دریافت" کی ایک کاپی ضرور منگانی چاہئے۔

۱۳۴ صفحات۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ جنرل سکریٹری بزم ادب (ہماچل) ۸۲۔ دی مال شملہ

چنبل کی چمیلی

از ——— کرشن چندر

چنبل کی چمیلی کرشن چندر کے حالیہ ناولوں میں سے ایک ہے۔ اسکی کہانی تیلی بائی کے گرد گھومتی ہے جو ایک مشہور ناچنے والی ہے لیکن ایک ڈاکو ہے جس کے سینے میں ایک عورت کا دل ہے جو اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی برائیوں اور بدنامیوں کے باوجود ایک اچھے گھر کی خواہش کو دل میں پالتی رہتی ہے لیکن جو اس سماج کے سخت اور کڑے قانون کی دیواروں سے ٹکر نہیں لے پاتی اور اس احساس کے باوجود کہ "جس طرح کا زندگی میں نے اپنے لئے چاہی تھی وہ مجھے کہاں ملی" اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتی ہے اور کلیان سنگھ سے کہتی ہے "اسی کلیان سنگھ سے جو سلطانہ ڈاکو کا رقیب تھا اور سلطانہ ڈاکو تیلی کی لڑکی کا باپ تھا" ——— "جو سلطانہ مجھے چار سالوں میں نہ بنا سکا میں وہ بننا چاہتی ہوں ——— ایک ڈاکو — سچ مچ کا ڈاکو ——— مگر اس کے سینے میں پیار کی چنگاری ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ انسپکٹر من موہن کا چہرہ ہر وقت اس کی آنکھوں میں بسا رہتا ہے۔ اس وقت بھی جب من موہن کی گولی اسے لگتی ہے۔ وہ کہتی ہے "اچھا ہے میرے سینے میں تمہاری گولی ہے اور میں تمہاری آغوش میں مر رہی ہوں"۔

کرشن چندر کا فن اب اس منزل میں ہے کہ جہاں کسی تبصرہ و تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان کی زبان کا جادو اس ناول کی ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ طنز کی ہلکی ہلکی ضربیں پڑھتے پڑھتے کچھ دیر رک جانے پر مجبور کرتی ہیں۔

۲۷۲ صفحات۔ سرورق خوبصورت (پاکٹ بک سائز) قیمت تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔ جی۔ ٹی روڈ۔ شاہدرہ دہلی ۳۲

(تاجدار احتشام)

دو بوند پانی

از ——— خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ایک بڑے افسانہ نگار ہیں، بڑے صحافی ہیں، بڑے فلمساز ہیں، بڑے ہدایت کار ہیں اور ان تمام برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے انسان بھی ہیں اور یہ ان کے ایک بڑے انسان ہونے کی خوبی ہے کہ وہ دوسروں کے دکھوں کو اپناتے ہیں۔ دوسروں کے [illegible] سے لگا لیتے ہیں۔ انہیں اپنا دکھ سمجھتے ہیں، اپنا غم سمجھتے ہیں۔

دو بوند پانی ان کی ایک فلم ہے اور دو بوند پانی ان کا ایک ناول بھی۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی [illegible] ہوا ہے ان کا فلم کو تو [illegible]

[illegible]

محفلِ اپنی

یہ تازہ شمارہ اور اس کے بعد

مارچ کا یہ شمارہ، مارچ ہی میں شائع ہو رہا ہے۔ اپریل کا شمارہ اور جلدی اشاعت پذیر ہوگا۔ اس کے بعد قومی یکجہتی نمبر اس انتہائی اہم اور تاریخی صحیفۂ یکجہتی کی کتابت مسلسل ہو رہی ہے اور ان چند مضامین کے حصول کی کوشش جاری ہے، جن کے وعدے کچھ دیر سے ہوئے۔ [illegible] کے لئے قرضوں کی درخواستیں دی گئی ہیں۔ دوسری تاریک بات اخباری کاغذ کی ہے، جو ہنوز اس قومی نمبر کیلئے نہیں ملا ہے۔ بہت بڑی تعداد میں یہ نمبر چھپے گا۔ غیر ملکی اخباری کاغذ کا تو بحران ہے ہی مگر سفید ملکی کاغذ کا تو وہ عالم ہے کہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ معمولی سفید کاغذ جو "شاعر" کے سرورق میں لگ رہا ہے، چند ماہ پہلے اسّی روپے رم تھا اور اب پونے دو سو روپے رم میں بھی بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ کاغذ کی زبردست بلیک مارکٹ جاری ہے۔ کاغذ کے تاجر کئی مہینے سے من مانی کر رہے ہیں لیکن ان سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں ٹن کاغذ کا خرچ ہے حکومت تماشائی بنی ہوئی ہے۔ اگر کاغذ کے مل مالکوں سے گفت و شنید کے بعد نرخوں کا تعین اور اس پر کڑا عمل ہو جائے تو کم از کم نفع اندوزوں کی یہ من مانی نہ رہے۔ چند ماہ اگر یہی حال رہا تو کتابوں کی طباعت بند ہو جائیگی۔ گراں قیمتوں کی وجہ سے کتابوں کی فروخت پر سخت ناگوار اثر پڑا ہے۔ اسکولوں کے کروڑوں بچے کتابوں سے محروم ہو جائیں گے۔

طویل مکتوبات، مضامین اور افسانے

نومبر ۷۴ء کے شمارہ کے سلسلے میں آئے ہوئے کئی خطوط شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ دسمبر اور جنوری کے شمارہ پر آئی ہوئی بہت سی اہم رائیں اب تک محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ حجم کی کمی کے سبب مکتوبات کے لئے چار صفحات سے زیادہ نہیں نکالے جاسکتے۔ اگر رائیں مختصر اور جچی تلی ہوں تو زیادہ لوگوں کو اظہارِ خیال کا موقع مل سکتا ہے۔ طویل مضامین اور افسانوں کی اشاعت بھی مشکل ہے۔ معمولی نظم و نثر کا کتنا زبردست دباؤ "شاعر" پر رہتا ہے۔ اس کا اندازہ قلمکار نہیں لگا سکتے۔

زرِ سالانہ [illegible]

ماہ بماہ "شاعر" کے [illegible] سالانہ ختم ہونے کی اطلاع ملی ہے [illegible]

کاغذ کیسے مہیا ہو۔ تاجر "شاعر" کے [illegible] کے خلاف ہے جو طباعت بڑی رقم اس کے لئے درکار ہوتی ہے۔ سالانہ چندہ وصول نہ ہو تو کام کیسے چلے گا!؟

آئندہ شمارے میں

مقالے:

تحقیق کے اصول اور مسائل	ہتیہ فرحت جہاں ایم اے
جارج برنارڈ شا۔ شخصیت اور فن	رحمٰن حمیدی
احتشام حسین کی تین نظمیں خدا کی نظر میں	مناظر عاشق ہرگانوی

افسانے:

بند آنکھیں		ابو اللیث جاوید
تماشائی	(انگریزی)	امار پنڈ راجر، ترجمہ: ابن آدم انجم
عکس عکس		حسین الحق
سانپ اور سیپی		سید محمد علی زیدی طالب

ڈراما:

تم	انل ٹھکر

طنز و مزاح:

امتحان	یوسف ناظم
اگر میں گدھا ہوتا	انور انصاری
پاسپورٹ کا چکر	پرویز یداللہ مہدی

نظمیں:

کرشن موہن۔ رشید عبد السمیع جلیل۔ عقیل شاداب۔ مومن خان شوق

غزلیں:

شہاب جعفری۔ کرشن موہن۔ ڈاکٹر مناظر حسن رضوی، غلام مرتضیٰ راہی۔ کیف احمد صدیقی۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری، شارق میرٹھی۔ شاہ حسین۔ علیم تسنیم۔ ضیاء الانجم، عابد مناوری۔ نشاط انصاری۔ منوہر لال ہادی۔ قدرت نواز، سلیم شیرازی

مکتوبات — نقد و نظر

محفل اپنی — رفتار

ame recorded

رفتار

علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

جامعۂ اردو کیطرف سے وزیرِ اعظم کو ڈکٹورِ ادب کی ڈگری

دہلی ۲۰ فروری ۱۹۸۰ کو ایک خصوصی جلسے میں جامعۂ اردو علیگڈھ کی طرف سے وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو ڈکٹورِ ادب DOCTOR OF LITERATURE کی اعزازی ڈگری دی۔ جامعہ کے چانسلر ڈاکٹر رفیق زکریا، وزیرِ صحت مہاراشٹر، نے پیش کی۔ ڈاکٹر زکریا نے اپنے عالمانہ خطبے میں اُردو کی اہمیت اور اُس کے موجودہ مسائل پر روشنی ڈالی۔ حکومتِ ہند کی طرف سے اُردو کے فروغ کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن کا ذکر کیا اور وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خدمات کا اعتراف کیا۔

وزیرِ اعظم نے اُردو ہی میں جوابی تقریر کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُردو ہندوستان کی عظیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ ہمارے کلچر کی اس خوبی کو کہ وہ دوسری زبانوں، سماجوں اور ثقافتوں کی خصوصیات کو قبول کر کے اپنا بنا لیتا ہے سب سے زیادہ ترجمانی اُردو ہی کرتی ہے۔ جو لوگ اُردو بولتے ہیں اُن کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہئے کہ اُن کے لئے ایسے مواقع مہیا کئے جائیں، جن سے وہ اپنے بچوں کو ابتدائی اور اُس سے اُوپر کی سطحوں پر اُردو میں تعلیم دلا سکیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ جامعۂ اُردو پھلے پھولے اور کامیابیوں کے اُونچے درجوں تک پہنچے۔

مخدوم بھون کا سنگِ بنیاد

حیدرآباد۔ ۵ فروری کو صبح مخدوم محی الدین مارگ میں کامریڈ راجیشور راؤ [illegible] نے کمیونسٹ پارٹی کی ریاستی کونسل کے ہیڈ کوارٹر "مخدوم بھون" کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس تقریب میں بہت سے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور پروفیسروں نے شرکت کی۔

اُردو مصنفین کی ڈائرکٹری کی تیاری

اُردو پروموشن فارم کے زیرِ اہتمام ایسے اُردو مصنفین کی ایک ضخیم ڈائرکٹری تیار کی جا رہی ہے جو آزادی کے بعد ڈراما، افسانہ، ناول، شاعری، تنقید، تحقیق، طنز و مزاح اور صحافت کے میدان میں اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں۔ اس ڈائرکٹری کی تیاری کے لئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر نریش

اور راج لعل ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں۔ قلمکار اپنے بارے میں ذیل کی معلومات بہم پہنچائیں۔ (۱) قلمی نام (۲) اصلی نام (۳) والد کا نام (۴) سنہ پیدائش (۵) اصلی وطن (۶) موجودہ پتہ (۷) زیادہ سے زیادہ تین قابلِ ذکر تصانیف کے نام، سنہ اشاعت، ناشر (۸) ادبی و قومی اعزاز۔

پتہ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ D.252 سروودیہ انکلیو۔ نئی دہلی ۱۶

تصدیق سہارنپوری کی وفات

بمبئی۔ ۲۵ فروری کی شب میں بمبئی کے ممتاز صحافی تصدیق احمد خاں سہارنپوری کا ۵۵ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ عرصۂ دراز سے دماغی اور قلبی عارضہ میں مبتلا تھے۔ مرحوم یوپی کے ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ علیگڈھ سے بی اے کرنے کے بعد بمبئی آ گئے تھے۔ صحافتی رنگ اختیار کی۔ روزنامہ خلافت، انقلاب، ہلال اور الہلال سے منسلک رہے۔ ہندوستان کے مشہور صحافی اور جنگِ آزادی کے بیباک رہنما حافظ علی بہادر خاں کی صاحبزادی سے شادی کی۔ اور بمبئی میں حافظ صاحب کے چھوڑے ہوئے ہلال پریس کو کافی ترقی دی۔ کئی سال سے ہی اُن کا [illegible]

تصدیق سہارنپوری بمبئی کے نئے اور پرانے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان کی ایک خاموش کڑی تھے۔ نہ خود جلسے کراتے، جلسوں میں شریک ہوتے، بحث میں حصہ لیتے، اپنے رسالے میں [illegible] تبصرے لکھ کر رسائل و اخبارات کو بھیجتے۔ بڑے ہی با مروّت، نہایت مخلص اور بے غرض انسان تھے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ایک بڑی کمی کا احساس بمبئی کے ادبی حلقوں کو [illegible]۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیگم تصدیق کے علاوہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔

ادارۂ "شاعر" اِن پسماندگان اور مرحوم کے دیگر اعزّا سے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

(دیکھئے ۔ صفحہ)

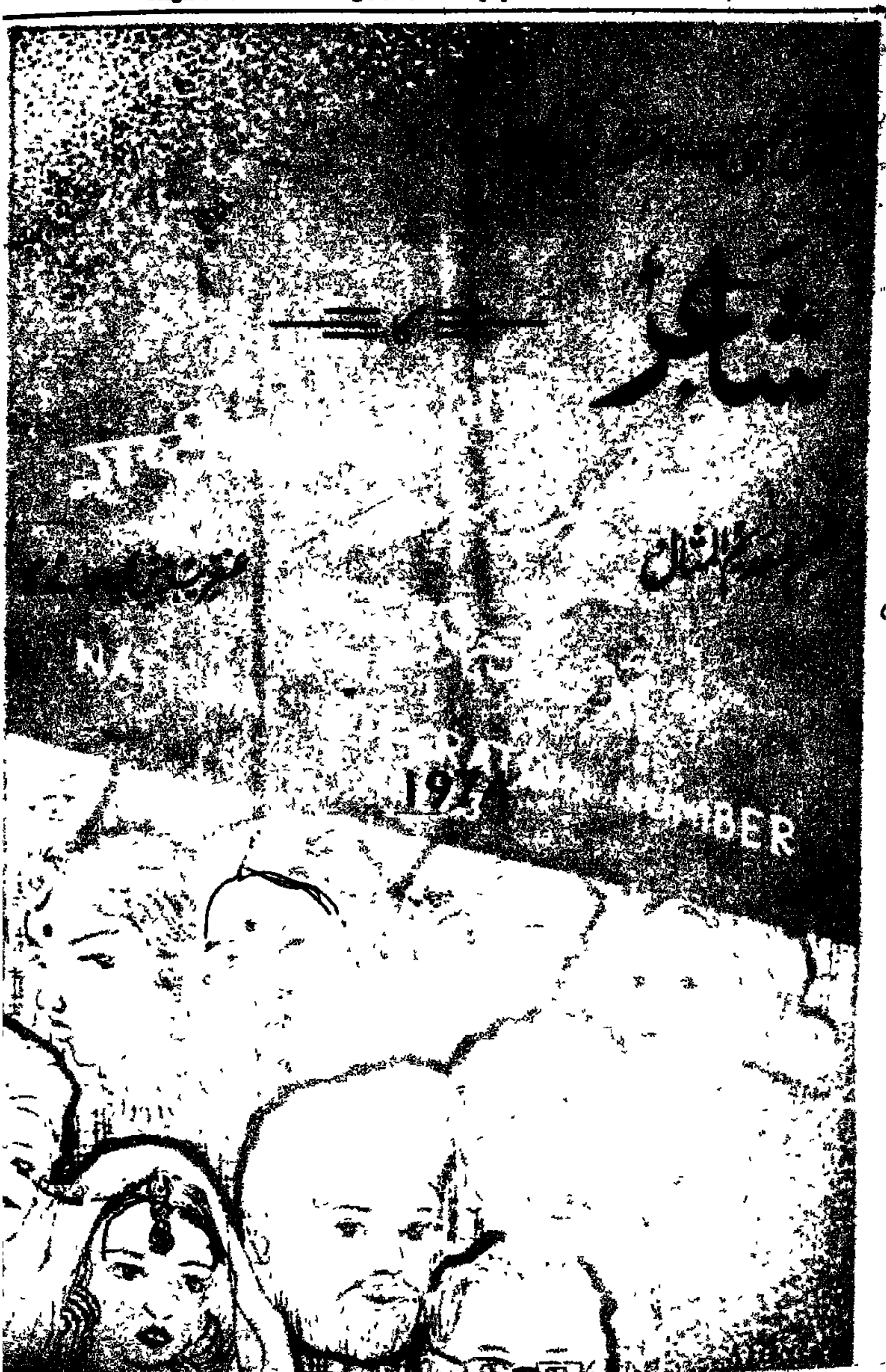
آہ ۔ مہندرناتھ

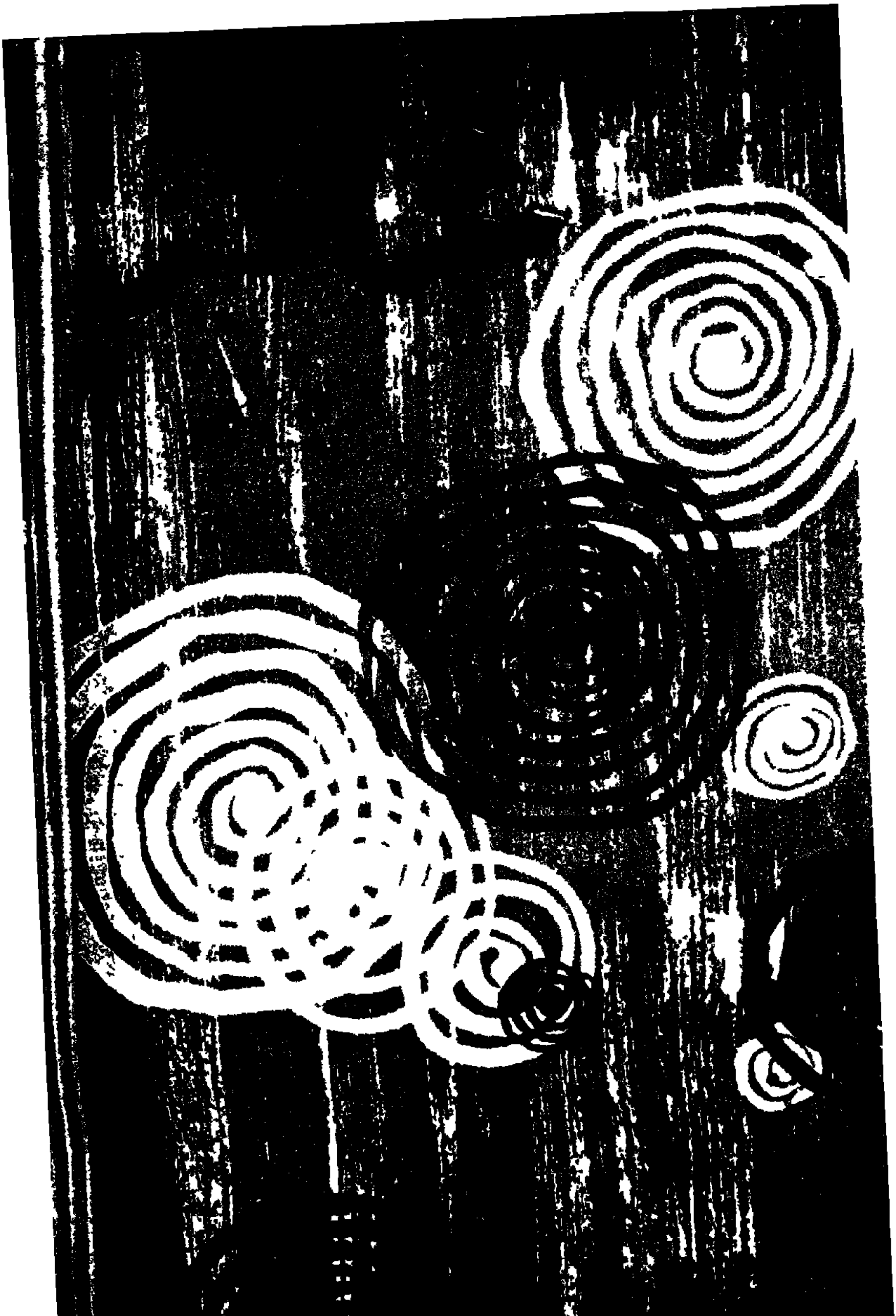
۲۱ مارچ ۔ یہ المناک اطلاع دیتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے کہ کل ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ کو میرے عزیز ترین دوست، بھائی اور "شاعر" کے رکن ادارہ ۔ کرشن چندر کے برادرِ حقیقی مہندرناتھ کا بمبئی کے ای۔ ایم اسپتال میں ہارٹ اٹیک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ۔ [illegible]

(مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو ورکس ۲۲ فورجٹ اسٹریٹ، گوالیا ٹینک، بمبئی ۳۶ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا)

...a. 10 9 years at ... the
earthquake ... ... many
...malia. ...
... (Northern plain)
...
... ...
...
...
M.ed. M.A. Urdu and
English B.A. Urdu english
...conomics
... 1985 ...
...
... 1906
... 1984
... 1984

No. [illegible] THE "SHAIR" (Monthly) BOMBAY-8. March 197[illegible]
Years of Publication) Publishing Dates 15th 16th Telephone No. 359904
Registered with the Register of Newspapers at R. N. No. 14482/57





بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
اردو کا پینتالیس سالہ علمی و ادبی ماہنامہ

شاعر
بمبئی

مدیر اعلیٰ: اعجاز صدیقی
معاون: ڈاکٹر محمد حسن

جلد ۴۵ | اپریل سنہ ۱۹۷۴ء | شمارہ ۴

مقالات

کہانیاں

طنز و مزاح

ڈراما

نظمیں

غزلیں

مکتوبات — نقد و نظر — محفل اپنی — رفتار

زر سالانہ — ۱۲ — روپے
معاونین — ۵۰ — روپے
تاحیات خریداری — ۲۰۰ — روپے
ممالک غیر سے — ۳۰ — شلنگ

فون: ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ "شاعر" قصر الادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ شاعر پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

قیمت
ایک روپیہ

قومی یکجہتی کے تمام اہم پہلوؤں

سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تاریخی، تہذیبی، لسانی، اور جمہوری

پس منظر میں ایک معنی خیز و بامقصد خصوصی اشاعت

شاعر

کا نہایت ضخیم، مثالی اور چونکا دینے والا

قومی یکجہتی نمبر

موجودہ انتشار و اضطراب کے دور میں ایک زبردست

انقلاب آفریں فکر انگیز قومی دستاویز

مضامین

قومی یکجہتی میں زبانوں کا کردار

ڈی رامانجا راؤ

ڈاکٹر گیان چند

علی جواد زیدی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

قومی یکجہتی اور سیکولرزم

ڈاکٹر بپن چندر

ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر تارا چند رستوگی

قومی یکجہتی کا سماجی پس منظر

ڈاکٹر ظ انصاری

ڈاکٹر سید محمد عقیل

قومی یکجہتی کا مذہبی پس منظر

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

ڈاکٹر رام چند تیواری

پروفیسر ہربنس سنگھ

ڈاکٹر رام آسرا راز

قومی یکجہتی میں جمہوریت کا رول

بی وی سبا ریڈی

قومی یکجہتی تاریخ اور ثقافت کے پس منظر میں

فرتش طیسانی

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

قومی یکجہتی میں اکثریت اور اقلیت کا کردار

آغا رشید مرزا

علاقائیت اور قومی یکجہتی

ڈی۔ گلشما ریڈی

قومی یکجہتی کی اوّلین شرط۔ جذباتی ہم آہنگی

ایل۔ بلیا

قومی یکجہتی کی تہذیبی و عقلی بنیاد

جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ

قومی یکجہتی میں ادب اور آرٹ کا حصہ

ایم۔ وی۔ راجگوپال

اردو ادب میں قومی یکجہتی

ڈاکٹر شارب ردولوی

ساحل مانکپوری

ہندوستان اور قومی یکجہتی کا مسئلہ

پروفیسر گورلیش چندر بھل

قومی یکجہتی کے متعلق چند باتیں

ڈاکٹر محمد حسن

قومی یکجہتی کا مسئلہ

امرت رائے

وحدت کی ماہیت ـــ قومی یکجہتی کا ایک پہلو

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ہندوستانی موسیقی اور قومی یکجہتی

پروفیسر شہاب سرمدی

عظمت حسین خاں بکش

بھارتی رقص اور قومی یکجہتی

شری متی ودھا ترویدی

ہندوستانی مصوری اور قومی یکجہتی

سعید بن محمد نقش

ٹھاکر جگت ویر سنگھ

نظمیں

افسانے

ڈرامے

———— قومی یکجہتی منشور ————

سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور
صحافیوں کے پتوں اور دستخطوں کے ساتھ

بیورو فار پرموشن آف اردو کی

مطبوعہ کتابیں

۱۔ تاریخ فلسفۂ سیاسیات — پروفیسر محمد مجیب
۲۔ تاریخ تمدن ہند — پروفیسر محمد مجیب
۳۔ تاریخ فلسفۂ اسلام — مترجم۔ ڈاکٹر سید عابد حسین
۴۔ لسانی مطالعے — ڈاکٹر گیان چند جین
۵۔ ہمارا قدیم سماج — سخی حسن نقوی
۶۔ انقلاب ۱۸۵۷ء — مرتبہ پی۔ سی۔ جوشی / مترجم۔ ایس۔ ایل گوہر
۷۔ ہمارا جسم — اکرام احمد
۸۔ چڑیاں — سلطانہ آصف فیضی
۹۔ چراغ کا سفر — سید عمر ٹونکی
۱۰۔ جانور اور ان کے بچے — چلڈرنس بک ٹرسٹ
۱۱۔ سب کے باپو — سلطانہ آصف فیضی
۱۲۔ کچھوا اور خرگوش — ڈاکٹر ذاکر حسین
۱۳۔ ہندوستان کی تحریک آزادی — مصنف۔ بین تارا سہگل / مترجم ظہور احمد خاں
۱۴۔ جیومیٹری (پہلا حصہ) مترجم۔ محمد جمیل

۱۵۔ جیومیٹری (دوسرا حصہ) مترجم۔ محمد نسیم احمد
۱۶۔ طبعیات (دوسرا حصہ) مترجم۔ ڈی۔ اے۔ انصاری
۱۷۔ حساب الجبرا (پہلا حصہ) مترجم۔ بادر حسین
۱۸۔ حساب الجبرا (تیسرا حصہ) مترجم۔ ٹی ایچ رضوی
۱۹۔ گھریلو سائنس (حصہ اول) مترجم۔ سلیم احمد
۲۰۔ گھریلو سائنس (حصہ دوم) مترجم۔ اے رحمٰن
۲۱۔ پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ اول) اطہر پرویز
۲۲۔ پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ دوم) اطہر پرویز
۲۳۔ پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ سوم) اطہر پرویز
۲۴۔ جیومیٹری (حصہ سوم) اسد الرحمٰن حسان
۲۵۔ طبعیات (فزکس) (حصہ دوم) دلدار احمد انصاری
۲۶۔ گھریلو سائنس (حصہ سوم) تاجور سامری
۲۷۔ مجموعۂ نغز — قدرت اللہ قاسم / مرتبہ محمود شیرانی
۲۸۔ تاریخ تعلیم ہند — نور اللہ نائک / مترجم۔ مسعود الحق
۲۹۔ پیسے کی کہانی (مصنف) غلام حیدر
۳۰۔ بھکاری راجہ مترجم: ساحر ہوشیارپوری

davp/511/138/73

جُرعات

جُرعۂ غم

اُس منحوس اور انتہائی المناک گھڑی کا تصور نہیں کیا جا سکتا جب ایک ہنستے مسکراتے چہرے کو موت نے ہمیشہ کے لئے کمہلا دیا۔ برادرِ عزیز از جان مہندر ناتھ کی مرگِ ناگہاں کی خبر بمبئی کے علمی، ادبی، فلمی اور تہذیبی حلقوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس نے سُنا اُس پر سکتہ طاری ہو گیا، یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

مہندر ناتھ ۱۹ مارچ (منگل) تک اچھے تھے۔ اُسی دن شام کو وہ ایک شادی کی تقریب میں گئے اور رات کو جب گھر لوٹے تو اپنے ساتھی دوست اور بھائی ایل۔ سی کپور کو دورۂ قلب میں مبتلا پایا۔ کپور سالہا سال سے حقیقی بھائی کی طرح اُن کے ساتھ رہتے آ رہے تھے۔ دونوں میں بہت گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ تین نفوس پر مشتمل اس چھوٹے سے کنبہ میں کپور کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی تھی۔ کپور کی حالت مہندر ناتھ سے دیکھی نہ گئی اور خود اُن کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ صبح ہوتے ہوتے ڈاکٹر کے مشورے سے انھیں کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل میں داخل کرنا پڑا۔ ۲۰ مارچ کا پورا دن سخت تکلیف میں گذرا۔ مگر شام کو حالت بہتر ہو گئی۔ رات کو آٹھ بجے دوبارہ قلب کا دورہ پڑا اور ڈاکٹروں کی تمام کوششوں کے باوجود ۹ بجے انھوں نے دَم توڑ دیا، نہ کسی سے کچھ کہہ سکے اور نہ کسی کی سُن سکے۔ آہ

۲۱ مارچ کو صبح ہی سے اُن کے مکان پر سوگواروں کا میلہ لگ گیا۔ مہندر کے بڑے بھائی کرشن چندر انھیں اچھا بھلا چھوڑ کر دو دن پہلے ہی دہلی گئے تھے۔ کرشن چندر کو ۱۹ کی شب ہی میں فون سے اطلاع دی گئی۔ ۲۰ مارچ کو ایک بجے دن کو وہ پلین سے بمبئی پہنچے۔ ڈیڑھ بجے لاش اسپتال سے گھر لائی گئی۔ مہندر ناتھ سفید کفن میں لپٹے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے ایک پُرسکون گہری نیند کا عالم ہو۔ موت کی کوئی نشانی اُن کے چہرے پر نہ تھی۔ دن کو ۳ بجے آہ و بکا کے شور اور سوگواروں کے ہجوم میں اُن کا جنازہ اُٹھا جس میں علمی، ادبی اور فلمی حلقوں کی ممتاز شخصیتیں شریک تھیں۔ ساڑھے چار بجے شام کو شیواجی پارک کے شمشان گھاٹ میں نیکی، شرافت اور محبت کے اُس بے مثال نمونہ کی چِتا سجائی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چتا کے شعلوں نے اُس جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جو سب کا پیارا اور محبوب تھا۔

مہندر ناتھ باون سال کے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ گزشتہ بیس پچیس سال میں اُن کے افسانوں کے ۹ مجموعے اور ۱۵ ناول شائع ہوئے۔ اُن کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ اُن کے کئی ناول اور افسانوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ غریب عوام سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ جنسی مسائل اور غریبی اُن کے محبوب موضوعات تھے۔۔۔ کئی فلموں کے مکالمے لکھے، منظرنامے تیار کئے، فلمی کہانیاں لکھیں، ابتدا میں چند فلموں میں بھی کام کیا۔ برسوں تک بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری رہے۔ ۱۲ سال سے فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ فلمی ادیبوں اور شاعروں کے مسائل کو وہ ایسی خوبی سے حل کرتے رہے اور اتنی وسیع خدمات انجام دیں کہ یہ فلمی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انجمن نوجوانانِ مصنفین بمبئی کے صدر، انجمن ترقی اُردو کے رکن اور کئی دیگر اداروں سے بھی منسلک رہے۔ نئے لکھنے والے ہوں یا پُرانے، پروڈیوسر ہوں یا ڈائرکٹر، اپنے ہوں یا بیگانے، صبح سے شام تک لوگ اُن کے پاس آتے رہتے تھے۔

میں نے سنہ ۱۹۵۰ء میں انھیں ادارۂ "شاعر" میں شامل کیا تھا لیکن جلد ہی یہ خارجی تعلق قلبی تعلق میں بدل گیا اور ۲۲ سال کی طویل مدّت میں اس رشتۂ خلوص و یگانگت میں ذرا سا بھی اضمحلال پیدا نہیں ہوا۔ مہندر جیسا دردمند، مخلص، کھرا اور سچّا دوست اور بھائی اس وسیع دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ میری زندگی کے اس خلاء کا پُر ہونا ممکن نہیں۔

مہندر ناتھ کے برادرِ معظم کرشن چندر، بہن سرلا دیوی، چھوٹے بھائی اوم اور اس دنیا میں تنہا رہ جانے والی اُن کی نیک سیرت بیوہ اندرا بھابی کا غم میرا اپنا غم ہے۔ ہم سب مل کر آہ و زاری کی سیاہ چادر ... میں لپٹے رہیں گے۔ مہندر ناتھ کی یاد ... تڑپاتی رہے گی۔ ہمارا ہی دل جانتا ہے کہ ہم نے یہ جُرعۂ غم کس طرح پیا ہے۔

مہندر کی المناک موت کو ایل۔ سی کپور کی موت نے اور بھی سنگین بنا دیا۔ مہندر ناتھ کا انتقال بدھ کے دن ۲۰ مارچ کو ہوا تھا۔ کپور اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے اور ۱۵ روز زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ... اپریل کو اس دنیا سے رخصت ہو کر مہندر سے جا ملے۔ دعا گو ہوں کہ دونوں کی روحوں کو سکون ... نصیب ہو۔

اعجاز صدیقی

شاعر بمبئی

شہابؔ جعفری

جبیں سنبھل! کہ زمیں کا ٹھکانا جاتا ہے
مہ و ستارہ سے آگے زمانہ جاتا ہے

جہاں نہ آب، نہ آتش، نہ خاک اور نہ ہوا،
عناصرانہ یہ دل، بیکرانہ جاتا ہے

جہاں سے ہوکے میں آیا ہوں واں تھا سب ظلمات
وہاں بس اک مرا آئینہ خانہ جاتا ہے

سکندرانہ یہ آئینہ عکس بیز جہات
دل اپنا سوئے خضر بدگمانہ جاتا ہے

زمیں پہ جب میں پھینکا گیا ہوں — رنجش سے
خیال سوئے بہشت اہرمانہ جاتا ہے

جو زندہ شعلہ تجھے ربِ ارنی کہتا تھا
اب اپنا توڑ لئے لنترانہ جاتا ہے

خدا گواہ، وہ دن آپڑا خدائی پر
جبیں ڈھونڈنے اب آستانہ جاتا ہے

قلندری مری پوچھو ہو داستانِ جنوں؟
ہر آستاں مری ٹھوکر سے جانا جاتا ہے

جنوں کو چھوٹ تو دو، پھر ملاحظہ کیجو
خرد کی آگ میں کیا والہانہ جاتا ہے

میں ربِ ارنی پکاروں تو "انّی انّی" پکار
کہاں تو مجھ سے الگ لنترانہ جاتا ہے

مرا جنوں پسِ محمل ہے گردباد، نہ ڈر
یہ رہزنانہ نہیں ہمرہانہ جاتا ہے

نمودِ مہر کے میلاد کی گھڑی ہے شہابؔ
زمیں کی کوکھ میں شبنم کا دانہ جاتا ہے

سید فرحت حسین

تحقیق کے اُصول اور مسائل

تحقیق کے میدان میں گامزن ہونے سے قبل جن ابتدائی معلومات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اُن میں اوّلین یہ ہے کہ تحقیق کیا ہے؟ تحقیق، ایک جدّ و جہد ہے ادب کے پوشیدہ خزانوں کو منظرِ عام پر لانے کی، ایک جستجو ہے سچائی کے حصول کی۔ تحقیق کے تمام طلبا کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے وہ ہے سچائی کی تلاش۔ اسی کے لئے وہ جدو جہد کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کی راہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ کوئی طالب علم تنقیدی تحقیق کو ترجیح دیتا ہے، کوئی تاریخی تحقیق کو۔ کچھ خود کو نقاد کہلانا پسند کرتے ہیں، کچھ محقق۔ لیکن یہ تفریق حقیقی سے زیادہ فرضی اور ظاہری ہے۔ ادب کا ہر طالب علم لاشعوری طور پر دونوں اُمور انجام دیتا ہے۔ اگر کوئی خاص فرق ہے تو صرف اظہارِ فکر کا ہے۔ نقاد کا کام ادبیات، اُس کی ماہیت، اُسلوب اور مندرجہ خیالات کو محیط ہوتا ہے۔ دوسری طرف محقق کا بیشتر تعلق واقعات اور اُن کی تاریخی حیثیت سے ہوتا ہے، جن کی حقیقت کی آگہی کے لئے تاریخ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان الگ الگ ذمہ داریوں کے باوجود تحقیق کے میدان میں نقاد اور محقق کے درمیان ایک رشتۂ ارتباط موجود ہے۔ دونوں ادبی متن کا مطالعہ کرتے ہیں، دونوں ادبی متن پر اثر انداز ہونے والی خارجی معلومات فراہم کرتے ہیں اور دونوں ہی واقعات اور مباحث کے تئیں ایک جیسے جذبہ اور جستجو کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

تحقیق کا ایک پہلو تعمیری ہے جس سے ادب پارے اور اُس کے خالق کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو تعمیری جذبے کے تحت تخریبی ہے، جس سے اُن غلطیوں کی نشاندہی کر کے انہیں دور کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے ادبی مخطوطات کے اوراق بدرنگ نظر آتے ہیں۔ ایک اچھا محقق مخصوص واقعات یا نظریات کی صداقت سے متاثر ہوئے بغیر اُن کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ اُس کے پاس خود اپنے مشاہدات سے اخذ کئے گئے محتاط شواہد کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ تحقیق میں خدمات کا سرچشمہ خود اپنی معلومات ہوتی ہیں۔ اس لئے محقق کو اپنی معلومات پر یقین رکھنا چاہئے۔ اگر اُن پر معمولی شبہ بھی محسوس ہو تو اُن کا دوبارہ جائزہ لینا ضروری ہے، اگر کوئی شبہ محسوس نہ ہو تب بھی نظر ثانی کر لینا بہتر ہے۔

تحقیق کا کام شروع کرنے سے قبل اس کا علم ضروری ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کن اُصولوں کو اپنانا اور کن مسائل کو حل کرنا ہے۔ اس واقفیت سے تحقیق کے کام میں آئندہ پیش آنے والے مسائل کو آسانی سے حل کیا جا سکے گا۔

تحقیق کے خواہشمند طالب علم کا پہلا کام عنوان کا انتخاب ہے۔ ابتدائی طور پر تحقیق کے عنوان کا انتخاب طالب علم کی اپنی پسند پر ہے۔ اس لئے اپنی دلچسپی کے عنوان سے متعلق پہلے سے مکمل تیاری کر کے اپنے پسندیدہ اُستاد سے، جس کو آئندہ نگراں بنانا ہے، اُس پر تبادلہ خیال کر لیا جائے۔ اس صورت میں طالب علم اپنی دلچسپی کا وہ عنوان بلا جھجک تجویز کر سکتا ہے جس پر اُس کا وسیع مطالعہ ہے اور جس پر وہ تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ عنوان کے انتخاب کے لئے مقرر کردہ کمیٹی میں پوری طرح تیار ہو کر جانا ضروری ہے۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو ایک سے زیادہ عنوان ذہن میں موجود رہنے چاہئیں تاکہ انتخابی کمیٹی اگر تجویز کردہ پہلے عنوان کو غیر مفید سمجھتی ہے تو اپنی پسند کا بھی دوسرا عنوان پیش کیا جا سکے۔ بہر حال ضروری ہے کہ ہر عنوان پر پہلے ہی سے کچھ دسترس ہو۔

عنوان کے انتخاب کے بعد دوسرے مسائل سامنے آتے ہیں۔ جیسے ابتدائی ببلوگرافیکل سروے کے ذریعہ یہ معلوم کرنا کہ اس عنوان پر کیا کچھ لکھا جا چکا ہے، کیا تحقیق کو نادر بنانے کے لئے مطبوعہ یا بشکلِ مخطوطات کافی مواد دستیاب ہے؟ یہ بھی فیصلہ کرنا کہ تحقیق کے دوران کہاں رہنا ہے، یونیورسٹی کیمپس میں، یا کسی دوسری جگہ (اگر تحقیق کرنے والا کسی کالج یا دوسری یونیورسٹی میں اُستاد ہو)؟ کیا وہاں لائبریری کے ذخائر کی معقول سہولیات حسبِ ضرورت حاصل ہوں گی؟ یہ اس لئے ضروری ہے کہ یونیورسٹی لائبریری بہت سے ادبی مقاصد کے لئے مفید ہو سکتی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ منتخبہ عنوان سے متعلق وہ کافی نہ ہو۔ اگر عنوان سے متعلق مطبوعہ یا قلمی مواد

ملک کے دوسرے اہم مقامات جیسے پٹنہ، رام پور، لکھنؤ، حیدرآباد اور کلکتہ یا بیرونِ ملک جیسے انگلینڈ، امریکہ، جرمنی اور پاکستان وغیرہ میں ملتا ہے تو کیا طالبِ علم ان مقامات کے سفر کے لئے وقت اور اخراجات برداشت کر سکتا ہے؟ مختصراً یہ کہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تجویز کردہ عنوان پر تحقیق کا کام دسترس سے باہر نہ ہو۔ اس لئے کوئی بہت مشکل عنوان منتخب نہ کیا جائے لیکن بہت چھوٹا عنوان بھی مناسب نہیں۔

اس کے بعد تحقیق سے متعلق مواد کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ محقق کو ببلوگرافیکل معلومات آسانی سے حاصل ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب معمولی عنوان پر بھی چالیس پچاس کتابیں ایک سال میں شائع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایک عنوان پر کتابوں کی اس قدر کثرت کی وجہ سے ببلوگرافی تیار کرنے کے لئے سخت محنت درکار ہوتی ہے۔

یہاں اس ضرورت کا اظہار کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں کوئی ببلوگرافی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری زبانوں کے برعکس اُردو زبان کے طالبِ علم کو تحقیق کے ابتدائی مدارج میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُن کو دُور کرنے میں طالبِ علم کا بہت قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ ببلوگرافی سے متعلق کام اطمینان بخش نہ ہونے کی بنا پر تضییعِ اوقات کے علاوہ طالبِ علم پر صلاحیت کی کمی کا داغ بھی لگتا ہے۔ اسلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو ادب کی ایک ببلوگرافی کی ترتیب کیلئے خصوصی توجہ مبذول کی جائے۔ میری رائے میں تحقیق کا ایک موضوع اردو ببلوگرافی کی ترتیب ہی کو بنایا جا سکتا ہے تاکہ اس تحقیق کے نتیجہ میں ایک صحیح اور جامع ببلوگرافی تیار ہو جائے۔

یہی صورتِ حال مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد کی لائبریریوں میں موجودگی سے متعلق معلومات کے وقت پیش آتی ہے۔ یونیورسٹی اور کالج کی لائبریریوں اور دوسری مشہور پبلک اور سرکاری لائبریریوں کے علاوہ بہت سی ذاتی اور شخصی لائبریریاں بھی ہیں جن میں مخطوطات اور غیر مطبوعہ و قدیم ترین مطبوعہ نوادرات موجود ہیں لیکن اُن کا عام طور پر علم نہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی راہنما کتاب بھی موجود نہیں جو اُردو ادب سے متعلق جملہ اقسام کی لائبریریوں کے سلسلے میں معاون ہو۔ اس کے علاوہ رسالوں کے مضامین اور کتابوں میں دیئے جانے والے حوالہ جات کے بارے میں بدقسمتی سے کوئی مضمون نگار یا مصنف حاشیوں پر اُن حوالوں کے اصل ماخذوں اور فراہمی کے مقامات کی صراحت نہیں کرتا۔ اس لئے اُردو میں اس روایت کی ترویج کی ضرورت ہے کہ حاشیوں پر حوالوں کے ساتھ اُن کتب و دستاویزات کی موجودگی کا مکمل نشان دیا جائے۔ اس سے تحقیق کے طالبِ علم کو مزید رہنمائی ملے گی۔ تحقیق کرنے والے کے لئے لائبریریوں کی تاریخ، اُس کے معیار اور اس میں فراہم سہولیات سے متعلق معلومات بھی بنیادی طور پر اتنی ہی ضروری ہیں جتنی کہ ببلوگرافی کی۔ جیسے کون سی لائبریری کہاں ہے؟ اُس میں کون سی اہم کتب اور مخطوطات موجود ہیں؟ اور زیادہ اہم یہ کہ کون سی لائبریری اہم تر کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ رکھتی ہے؟

اب تحقیق کے اُصولوں کی طرف آیئے۔ تحقیق میں متن کی اصلیت اور اُس کی تاریخِ تحریر کے تعین کی تفتیش سے اکثر محققین کو واسطہ پڑتا ہے۔ دستاویز کی صحت کا تنقیدی تجزیہ اور اُس کی تاریخِ تحریر کا تعین فنِ تحقیق کے اساسی اُصولوں میں شامل ہے۔ متن فہمی کی بھی یہی اہمیت ہے۔ سب سے پہلے متن کی صحت کا تیقن کر لینا ضروری ہے۔ اگر متن صحیح نہیں تو محقق کی تحقیق بے بنیاد سمجھی جائے گی۔ اور اگر متن کی تشریح درست نہیں ہے تو اغلاط پر کی گئی تنقید ایک ناقص تنقید کہلائے گی۔ متن کی صحت کا تیقن اور اُس کو مصنف کے نقطۂ نظر کی روشنی میں سمجھنے کے لئے داخلی اور خارجی شواہد سے مدد حاصل کی جاتی ہے۔ تحقیق کرنے والے کو ادب پارے یا کسی دستاویزات کے سب سے زیادہ قابلِ انحصار متن پر اعتماد کرنے میں بھی محتاط رہنا چاہیئے۔ کیونکہ تحقیق کا یہ مسلّمہ اُصول ہے کہ کسی مصنف کی قدیم ترین یا آج سے قبل شائع شدہ کتاب یا مخطوطہ کے ایڈیشن پر آنکھ بند کر کے انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات حادثاتی طور پر جیسے کاتب کے غلط پڑھنے کے نتیجے میں کوئی متن اصل سے مختلف طبع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ریسرچ کے طالبِ علم کو اس بات کا یقین کر لینا ضروری ہے کہ جس ایڈیشن سے وہ استفادہ کر رہا ہے وہ دستیاب ایڈیشنوں میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار اور انتہائی احتیاط و اہتمام کے ساتھ مرتّب کردہ ہے۔

ادبی متن کے قلمی نسخے یا مُستند مطبوعہ نسخے کے بارے میں معلومات کی فراہمی محقق کی ابتدائی تیاری کا ایک حصّہ ہے۔ متن کا مخطوطہ یا اُس کا کوئی مُستند مطبوعہ نسخہ موجود نہ ہو تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ طبع شدہ شکل میں موجود اپنے خیال کے مطابق قابلِ اعتماد اور بہتر متن پر انحصار کیا جائے۔ اس صورت میں یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ متن کے مخطوطات کے طبع شدہ زیادہ تر ایڈیشنوں میں غلط خوانی، غلط فہمی، غیر ارادی نظر اندازی، تبدیلیٔ اسلوب، بے ترتیبی

اور ان جملہ اُمور کی کثرت ہو سکتی ہے جنھیں ہم مُرتّب کی عدم ذمہ داری یا عدم صلاحیت اور کاتب کی معمولی علمیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ متن کی تصدیق کرتے ہوئے یہ بھی خیال رہنا چاہیئے کہ تحریر کا زمانہ یا تحریر کا بلا اختلاف صحیح سمجھا جانا اُس کے مُندرجات کی صداقت کا ثبوت تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔ بعض اوقات خود مصنف بھی تاریخ غلط لکھ دیتا ہے یا غلط واقعات نقل کر دیتا ہے۔ مُصنّف کے قلمی تذکرے قیمتی ہو سکتے ہیں، لیکن ان کو بجنسہٖ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

تحقیق کا کام اُس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب کسی مشہور مُصنّف سے متعلق ایک ہی واقعہ کے بارے میں بہت سی مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایسی صورت میں مُحقق کو ہر روایت کے امکان کی نہایت احتیاط کے ساتھ تفتیش کرنا ضروری ہے نیز اُن حالات کی بھی جن کے تحت مختلف روایات رائج ہوئیں۔ ایک ذمہ دار اسکالر کو ادب میں کسی غلط قول کے جڑ پکڑنے اور بڑھنے سے پہلے پہلے اُسے درُست کرنے کے کسی موقع کو نظر انداز نہ کرنا چاہئیے۔ وسیع النظر مُحقق اِس سلسلے میں ہر راوی کے کردار، قابلِ اعتمادیت، ذہنی صلاحیت، ہمدردانہ رویئے اور راوی کے ممکنہ مطمحِ نظر کی روشنی میں اُس کے قول کا جائزہ لیتا ہے۔ ابتدائی شواہد اخذ کرتے ہوئے یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ کس نے کہا؟ کیا کہا؟ کیسے کہا؟ اور کن حالات کے تحت کہا؟ یہ طے شدہ اُصول ہے کہ جن قریب ترین حالات کے تحت بات کہی گئی ہے، وہی اُس کی صداقت کا تعین کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات خود قول کی زبان اُس کی صداقت کی نشاندہی کرتی ہے۔

خطوط میں کاتبِ خط کی زبان کے مخصوص مطالب اور ابتدائی معانی کی تشریح صرف مکتوب الیہ زیادہ صحیح کر سکتا ہے۔ دوسرا پڑھنے والا اپنی معلومات کے سہارے پوشیدہ معانی تک پہنچ جاتا ہے۔ جو ضروری نہیں کہ کاتبِ خط کے اصل مدعا کے عین مطابق ہوں۔ اِس لئے محقق کے لئے مکمل اعتماد کے ساتھ عام طور پر یہ کہنا مناسب نہیں کہ بیان کردہ واقعہ کی یہ اور صرف یہ روایت صحیح ہے یا اس خط کا صرف یہی مطلب نکلتا ہے۔ ایسی اختلافی صورت میں اپنی رائے بیان کرنے کا بہتر طریقہ یہ کہنا ہے کہ "ہر روایت کا جائزہ لیا گیا لیکن دوسری روایات کے مقابلہ میں فلاں روایت کے صحیح ہونے کے زیادہ امکانات ہیں" یا "کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلقات کی روشنی میں اِس خط کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔"

خطوط یا متن کی تاریخِ تحریر اُس کی صحت کا ثبوت فراہم کر سکتی ہے۔ اِس لئے خود تاریخِ تحریر کے تعین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ بھی تحقیق کا ایک ضروری حصہ ہے۔ تاریخِ تحریر کے اختلاف کی صورت میں علمِ تعینِ تاریخ (کرونولوجی) سے مدد لی جاتی ہے۔ اِس کے ذریعہ تاریخِ تحریر کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے ظاہری اور فطری اسباب کے ذریعہ ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ اسباب دو طرح کے ہو سکتے ہیں (۱) متن یا خط پر کسی قسم کا نشان جیسے خط پر ڈاکخانہ کی مُہر یا متن پر ذاتی مُہر (۲) تحریر کا طرزِ کتابت۔ یہ بھی ایک ممکنہ نشان ہو سکتا ہے۔

خط کو لیجئے۔ اگر اِس پر ڈاکخانہ کی مُہر ہے تو اُس کی تاریخ سے خط کی تاریخ کا تعین ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ امکان پیشِ نظر رہے کہ ڈاکخانہ کی مُہر حادثاتی طور پر تاخیر سے بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر تحریر کے کاغذ پر کاغذ بنانے والی کمپنی کا واٹر مارک اور کاغذ بنانے کا سال درج ہے تو یہ تحریر درج شدہ سال سے پہلے کی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اُس کے پانچ سے آٹھ سال بعد کی ہو سکتی ہے۔ متن کے سلسلے میں ذاتی مُہر سے اجرائے مُہر کے سال سے مدد لی جاتی ہے۔ اگر مصنف کی کئی تحریریں تاریخ کے ساتھ موازنہ کے لئے پیشِ نظر ہوں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ زیرِ تحقیق دستاویز کا خطِ تحریر آیا وہ ہے جو مصنف جوانی کی عمر میں اختیار کرتا تھا یا وہ ہے جو پچاس سال کی عمر میں تھا۔ یہ فطری امر ہے کہ عمر کے فرق کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی فرق ہوتا جاتا ہے۔ جوانی کی تحریر میں الفاظ کی جو بناوٹ اور پختگی ہوتی ہے وہ ضعیفی میں قائم نہیں رہتی۔ لیکن ایسا بھی ہے کہ ایک ہی زمانہ کے خطِ تحریر میں کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً جلدی اور پریشانی کی حالت میں لکھی گئی تحریر اُس سے مختلف ہوگی جو اطمینان کی حالت میں ایک گھنٹہ پہلے لکھی گئی ہو۔ ایسی صورت میں بغیر کسی ماہر کی مدد اور بغیر خطِ تحریر کا امتحان لئے کسی فیصلہ پر پہنچنا مشکل ہے۔

خط کے مُندرجات سے اُس کی تاریخ کا تعین کرنا بھی بالکل درُست ہے۔ اِس کے علاوہ اُس زمانہ کے اخبارات، دوسرے خطوط اور بیاضات (خواہ وہ خود مُصنّف کے لکھے ہوئے ہوں یا اُس کے کسی دوست کے) اور دوسرا سوانحی مواد بھی یقینی یا تقریباً درُست تاریخ کی کنجی فراہم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بغیر تاریخ کا خط مُصنّف نے اپنے دوست کے ۱۸ ستمبر کے خط کے جواب میں لکھا اور دوست نے اُس کے مُندرجات کا جواب اپنے خط مورخہ ۳ اکتوبر میں دیا تو زیرِ بحث خط ۱۹ ستمبر سے ۲ اکتوبر کے درمیان کا تحریر کردہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اِس وقفہ کے بارے میں مزید شہادتوں

کی خرابی ممکنہ تاریخ کا وقفہ کم سے کم کر سکتی ہے۔ کاتب اور مکتوب الیہ کا اس دوران کیا محل رہا؟ یہ کہاں رہے؟ اُس زمانہ میں خط کے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کتنا وقت لگتا تھا؟ اس دوران میں سے کوئی بیمار یا لکھنے کے ناقابل تو نہیں رہا؟ خطوط کا جواب دینے میں اُن کی کیا عادات تھیں؟ جلد جواب دیتے تھے یا کچھ وقفہ سے؟

تاریخ کا تعین کرنے میں دوسری چیزیں کتاب کی شکل و صورت سے تعلق رکھتی ہیں۔ جیسے کتاب کا کاغذ، طرزِ تحریر یا طرزِ عبارت، زیب و زینت اور سرورق وغیرہ جو قدیم زمانہ میں رائج تھے۔ بہر حال ایک بغیر تاریخ متن کے ایک ایک نکتہ کا باریک بینی سے مطالعہ اور اُس کا دوسرے نمونوں سے موازنہ کر کے تحریرِ متن کی قریب ترین تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

تعینِ تاریخ کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے کچھ مفید اور نئے اقلیم بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس سے متن میں کی گئی ممکنہ خُرد بُرد بھی سامنے آجاتی ہے۔ جیسے مشہور مصنفین کے بارے میں من گھڑت روایات عام ہو جاتی ہیں، جن کا اصلیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ کچھ غیر متعلق کتابیں اُن کی تصانیف بتا کر یا اُن کی ایسی کتابیں جو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں لیکن مالی منفعت کے حصول کی خاطر خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی منسوب کر دی جاتی ہیں۔ اس لئے تحقیق کے وقت احتیاط کے خیال سے اس بات کے امکان پر نظر رکھنی چاہئے کہ ایک مخطوطہ یا کتاب جو اُس کے پیشِ نظر ہے ارادی یا غیر ارادی غلطیوں سے خالی نہیں۔ اس کی تاریخ تحریر غلط ہو سکتی ہے، اُس کا خطِ تحریر شاید متعلقہ مشہور مصنف کا نہ ہو یا زیرِ نظر ایڈیشن کا متن اُس کتاب کی نقل ہو جو ما قبل کے غلط متن میں کوئی تبدیلی کئے بغیر شائع کی گئی۔ یا دوسری صورت میں اصل متن کا خاموش اختصار ہو۔ وغیرہ۔

متن کی صحت اور تاریخ تحریر کے تعین کے علاوہ ادبی تحقیق کی دوسری اہم شاخوں میں متن کے مصنف کا تیقن بھی شامل ہے۔ اس تفتیش کی مختلف اقسام ہیں۔ اوّل مصنف کے مطالعہ کے ماخذ کا علم۔ دوئم مصنف کی عظمت اور اثرات کی تلاش اور سوئم تاریخ کے وہ مرتب میدان جن میں ادب کے طالبِ علم کو سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب اقسام ایک دوسرے پر منحصر، ایک دوسرے کی مدد سے نتیجہ خیز اور ایک دوسرے سے بُنیادی طور پر مربوط ہیں۔

متن کے مصنف کا تیقن کرنے کے لئے تفصیلی سوانحی تحقیق اتنی ہی ضروری ہے جتنی متن اور تاریخ تحریر کی۔ اس سلسلے میں جتنے بھی زیادہ سے زیادہ داخلی اور خارجی ثبوت فراہم ہو جائیں اُن کا منصفانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ داخلی ثبوت عام طور پر سب سے زیادہ معلوماتی لیکن ناقابلِ انحصار بھی ہوتے ہیں۔ ہر مصنف کا منفرد طرزِ تحریر ہوتا ہے۔ مثلاً روزمرہ الفاظ کے بجائے دقیق اور مشکل الفاظ کا استعمال یا کوئی مخصوص طرزِ اظہار۔ اگر یہ خصوصیت مصنف کی غیر اختلافی تحریر میں پائی جاتی ہے تو اختلافی اور غیر دستخطی تحریر میں اُن کا پایا جانا تحریر کو مصنف سے منسوب کرنے میں ممد ہوتا ہے۔

اب تک تیقنِ مصنف کے تجزیہ کے لئے لازمی ثبوت کی دو خاص اقسام نثر کا اُسلوب اور استعمالِ الفاظ سے کام لیا جاتا تھا۔ اب یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ محاوروں کے استعمال کی عادت سے ایک آدمی کی شخصیت اور دلچسپی کو پرکھا جا سکتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اندازِ فکر کو بھی تیقنِ مصنف کا جائزہ لینے میں شامل کر لیا گیا۔ کیونکہ اندازِ فکر بھی اُس کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ اُلجھن پیدا کر سکتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مصنف کی دو مختلف تحریروں میں دو متضاد اندازِ فکر ملتے ہیں۔ اس لئے تیقنِ مصنف کے سلسلے میں لازمی ثبوت کے لئے اس قسم کے واجبی سوالات قائم کر کے اُن کے جوابات اخذ کرنا زیادہ صحیح طریقہ ہے (۱) کیا اُس کی تخلیقات معیاری ہیں؟ (مصنف کے مستند کلام کے عمیق مطالعہ سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے) (۲) کیا اُس کی تحریر میں اُسلوب اور زبان کے مخصوص معیارات ہیں؟ نیز کیا اندازِ فکر میں مصنف کا طرز نمایاں ہے؟ (۳) کیا اُس کا کوئی خاص طرز ہے یا دوسرے مصنفین کے یہاں بھی یہ طرز پایا جاتا ہے؟

اگر یہ ثابت ہو کہ یہ طرز سب معاصرین کے یہاں پایا جاتا ہے، کیونکہ یہی اُس زمانہ کا یا اُس زمانہ کے دبستان کا طریقہ تھا تو اس صورت میں مصنف کا تیقن کرنے میں اس طریقہ سے ہمارے مدد نہیں ملے گی۔ ایسی صورت میں متن کے خالق کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے محقق کو اپنی صلاحیت اور معلومات کے اعتماد پر مصنف کا تیقن کرنا ہوگا۔ کیونکہ تحقیق کا یہ اُصول ہے کہ جب دوسرے ثبوت دلائل کسی فیصلہ پر پہنچنے میں مددگار ثابت

نہ ہوں تو محقق کو آخرکار ایک فن کار کی طرح اپنی معلومات پر انحصار اور اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اور جب ایسا آدمی جس نے مصنّف کی زندگی کے مطالعہ و مطالعہ میں کئی سال صرف کئے ہوں، یہ واضح کر دے کہ اس اختلافی متن کا اصل مصنّف کون ہے تو یقیناً اُس کی ریاضانہ محنت کا احترام کیا جائے گا۔ اگرچہ اُس کی رائے کو آخری نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بتانے کے لئے کہ اس مخطوطہ کا مصنّف وہ نہیں ہے جس کو مشہور کر دیا گیا ہے، یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ "یہ مخطوطہ اُس کے اسلوب جیسا نہیں ہے" حتمی طور پر یہ کہنا کہ اُس کا نہیں ہے مناسب نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے یہ اُس کے اسلوب جیسا نہ ہو لیکن حقیقتاً وہی اُس کا مصنّف ہو اور ہم اُن حالات کا اندازہ نہ کر سکے ہوں جن کے تحت زندگی کے کسی حصہ میں اُس کی عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ جیسے غالب اور دوسرے شاعروں کے ابتدائی اور آخر عمر کے کلام میں نمایاں تبدیلی ملتی ہے۔

یہ ضروری بھی نہیں کہ مصنّف کا طرز ہمیشہ ایک سا رہا ہے۔ آج وہ تخلیق اس لئے کرتا ہے کہ ناقدین کو اُس کی تخلیق کے کرداری اسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ دوسرے دن وہ اس لئے لکھتا ہے کہ اُس کے ذریعہ مالی امداد حاصل کرنا مقصود ہو۔ ان دونوں تخلیقات میں جو نمایاں فرق محسوس ہوگا اُس کی وجوہ کا گہرا مطالعہ اور واضح ثبوت فراہم کئے بغیر اُن پر دو مختلف مصنّفین کی تخلیق کا فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس بات کے اور بھی بہت سے دلائل ہو سکتے ہیں کہ ہم نے جو اخذ کیا ہے وہ آخری حقیقت نہیں ہے۔

داخلی شہادت کی ایک کڑی متن میں مندرج خیالات ہیں جو اسلوب کے جائزہ کے تحت کسی فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ ایک خیال جو اختلافی تخلیق میں پایا جاتا ہے وہ مصنّف کی غیر اختلافی تخلیق میں منعکس خیالات سے ملتا جلتا ہو سکتا ہے۔ اس پر انحصار اس پر ہے کہ اُن میں کتنا باہمی ربط پایا جاتا ہے۔ نیز تحقیق کے دوران بعض اوقات مصنّف کے ایسے ادبی کارناموں کا حوالہ بھی مل سکتا ہے جو درحقیقت اُس کی تخلیق ہیں لیکن اُس کے زمانہ میں غیر مطبوعہ رہے اور منظر عام پر نہ آ سکے۔

طرزِ تحریر کے سلسلہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ہم عصر یا ماقبل مصنّف نے بھی یہ طرز اختیار کیا؟ اس میں اس سوال کا مزید اضافہ کر دیا جائے کہ کیا کوئی دوسرا مصنّف بھی وہی انداز فکر رکھتا تھا جو ہمارے مصنّف کا ہے؟ اگر دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے، تب ہمیں اپنے ثبوت کے لئے متن سے باہر دیکھنا پڑے گا۔ جسے خارجی ثبوت کہا جاتا ہے۔

ایک فن کار کی طرح ادبی تحقیق کے طالب علم کو تعیّن مصنّف کے لئے اپنی رائے کے ثبوت میں خارجی ذرائع کی ممکنہ امداد حاصل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ پیشِ نظر متن کا حوالہ مصنّف نے اپنی دوسری تصانیف یا ذاتی دستاویزات میں دیا ہو۔ اگر مصنّف یہ کہتا ہے کہ اُس نے فلاں فلاں کتابیں لکھی ہیں تو ہم اُس کا یقین کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے اِن کتابوں کو اپنی تصنیف بتایا جو حقیقت میں اُن کی نہیں تھیں۔ اور ایسی بھی مثال ہے کہ اپنی ہی کتابوں کو شاید غیر معیاری ہونے کی وجہ سے اپنی تصنیف ظاہر کرنے سے انکار کیا۔

موضوع سے متعلق داخلی اور خارجی شواہد کی فراہمی کے بعد اگلا قدم ادب کے تحقیقی مطالعہ کے لئے کتاب اور اُس کے مصنّف کی قدر و منزلت، معیار اور اثرات کی تلاش ہے۔ اس میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مصنّف کے کلام نے ناقدین، معاصرین اور عام پڑھنے والوں پر کیا اثرات مرتب کئے۔ مثلاً دورانِ حیات مصنّف کی قدر و منزلت کی تاریخ، مختلف ادوار میں اس کی شہرت یا گمنامی اس بات کا جائزہ کہ مختلف ادوار میں ہر ایک نسل نے اُس کے کلام کو کس نظر سے دیکھا؟ مصنّف نے اپنے دور میں رائج ادبی اقدار کو مروّجہ اسلوب کے ساتھ اپنایا یا اُن کو نئی ہیئت دے کر حیاتِ جدید بخشی؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو کتاب اور اُس کے مصنّف کی قدر و منزلت اور اُس کے معیار و اثرات کا جائزہ لینے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس مطالعہ سے معلومات میں یہ اضافہ بھی ہوتا ہے کہ ان ادوار میں ادب کا مذاق اور معیار کیا تھا؟ ان تمام معلومات کی فراہمی کے طریقۂ کار کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔

مختصراً یہ کہ محقق کو اپنے مضمون سے متعلق ادبی تاریخ کا اتنی گہرائی اور سائنٹیفک طریقہ پر مطالعہ کرنا چاہئے کہ وہ خود کو اُس دور کا ایک فرد تصور کرنے لگے۔ تاریخ فہمی کی یہ [illegible] اور [illegible] ہی تفتیش کئے جانے والے اُمور کی اہمیت کا بھرپور علم دیتی ہے، نیز ایسی غلط روایات کو رائج ہونے سے

شاعر بجنی

موڑ دیتا ہے، جو اکثر تاریخی بددیانتی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بنیادی ضرورت اِس بات کی ہے کہ اپنے مضمون سے وابستہ دَور میں رائج الفاظ و معانی کی فہم و فراست ہو۔ کسی زمانہ کے نظریات کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کے لئے اُس دَور کی زبان کا علم اور خود کو اُس کا ایک فرد تصور کرنا اِس لئے ضروری ہے تاکہ اس زمانہ کی فضا اور ماحول کے مطابق اپنی فکر کو ڈھالا جا سکے اور اس طرح ایک صحیح اور منصفانہ تجزیہ سامنے آسکے۔ قدیم زمانہ کے اندازِ فکر کو موجودہ فکری رجحان کی کسوٹی پر پرکھنا صحیح راہِ عمل نہیں ہے۔

اِس کے بعد دوسرے عام مسائل ہیں۔ ادبی تحقیق کے جملہ پروجیکٹ خواہ وہ ریسرچ کلاس کے لئے بنائے جائیں یا پیشہ ور ادیب اپنی تصنیف کی خاطر بنائیں، سب کا ایک ہی طریقۂ اظہار ہوتا ہے جو سوال کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے اور جواب کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ ایک سوال جس کے جواب کیلئے تفتیش شروع کی جاتی ہے وہ ان واقعات پر مبنی ہوتا ہے جو متعلقہ ادبی متن میں پائے جاتے ہیں یا متعلقہ تاریخ کے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول میں ملتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے دونوں جگہ ہی پائے جائیں۔ ان واقعات کا دائرہ رومانی نغموں میں ذو معنی نفسیاتی استعارات سے لیکر ایک کتاب کے دو مختلف ایڈیشنوں کے تصنیفی اور طباعتی اختلافات تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ جن واقعات کے تحت سوال پیدا ہوا، تفتیش کرنے والا محقق جانچنے سے قبل اپنی نامکمل معلومات کے مطابق اُس کا وہ جواب تجویز کرتا ہے جو وہ زیادہ مدلل اور صحیح سمجھتا ہے۔ اُسے تحقیق کی اصطلاح میں "قرینِ قیاس" کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد محقق کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے اِس قیاس کے مخالف اور موافق مواد کا مطالعہ کرکے اپنے قیاس کے لئے ثبوت فراہم کرے۔ ابتدائی طور پر اِس کے دو اُصول ہیں (۱) اپنے قیاس سے متعلق داخلی اور خارجی ثبوت فراہم کرنا۔ (۲) جو شہادتیں قیاس کے مخالف ہوں اُن پر بہت زیادہ توجہ دینا اور اُن پر بھی جو دوسری متبادل رائے ظاہر کرتی ہیں ـــــ دونوں طرح کی شہادتوں کے بارے میں تنقیدی رویّہ اختیار کیا جائے اور ہر قسم کے مواد پر خواہ وہ اُستادانہ یا غیر اُستادانہ ہو، وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ غور و فکر کیا جائے۔

تحقیق میں ببلوگرافیکل کارڈ کا کام بھی نہایت اہم ہے۔ کارڈ کے بجائے اچھے کاغذ کی سلپ بنانا زیادہ سہولت بخش ہے۔ یہ سلپ ایک ہی سائز کی بنائی جائیں۔ مطالعہ کرتے وقت سلپ کی پیشانی پر کتاب کا نام، مصنف کا نام، ایڈیشن (اگر کوئی ہو)، مقام اور تاریخ اشاعت اور پبلشر کا نام تحریر کیا جائے۔ رسالہ کے مضمون کا مطالعہ کرتے وقت مضمون نگار کا نام، مضمون کا عنوان، رسالہ کا نام، نمبر شمار و جلد نمبر، سال و مہینہ اور صفحات کا نمبر سلپ پر تحریر کرتے رہنا چاہئے۔ سلپ پر معلومات براہِ راست اُن کتابوں یا رسالوں سے تحریر کی جائیں جو آپ کے زیرِ مطالعہ ہوں۔ کسی ببلوگرافی، کسی کتاب یا کسی دوسرے حوالہ سے حاصل کردہ معلومات درج نہ کی جائیں، کیونکہ دوسرے کی نقول میں کچھ غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ اِس لئے آپ کا یہ مواد اصل سے اخذ کردہ ہونا ضروری ہے۔ سلپ کے بائیں جانب نیچے کتاب یا رسالہ کی دستیابی سے متعلق معلومات جیسے لائبریری کا نام و مقام اور لائبریری کے نمبرات وغیرہ درج کی جائیں۔ بظاہر یہ چیزیں غیر اہم معلوم ہوتی ہیں، لیکن اِن سے معلومات تازہ اور مکمل رہنے میں مدد ملتی ہے۔ عنوان سے متعلق ہر مضمون کے لئے علیحدہ علیحدہ ایک ایک سلپ بنائی جائے اور اُوپر اُس مضمون کا عنوان تحریر کیا جائے۔

آخری چیز تحقیقی مواد کا طرزِ تحریر اور معیارِ زبان ہے۔ تحریر صاف و خوشخط اور صحیح املا کے ساتھ ہونی چاہیئے، زبان سلیس اور عام فہم۔ اُردو زبان صرف اظہارِ مُدعا کی ہی زبان نہیں ہے، بلکہ اظہارِ فن کا ذریعہ بھی ہے۔ تحقیقی مواد کی تحریر کا مطلب ایک ناقابلِ فہم تجزیہ پیش کرنا نہیں ہے، اِس لئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تحقیق کو کِس قدر دقیق زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ تحقیق کا طرزِ تحریر اُکتا دینے والا بھی نہ ہو اور غیر ضروری پیچیدہ بھی نہ ہو۔ اچھے محققانہ طرز اور ایسے طرز میں جس سے معمولی تعلیم یافتہ لوگوں کو خطاب کیا جائے کوئی فرق نہیں۔ محققانہ نثر کا معیار اُس کا عام فہم ہونا ہے۔ جملے مختصر ہوں، طویل جملے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ طوالت، ایک لفظ کو بار بار دُہرانا اور اپنے مقصد سے ہٹ جانا جیسی خامیوں کا تحقیقی مضمون یا کتاب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ اگر اقتباس کو اپنے الفاظ میں کم سے کم جملوں میں پیش کیا جاسکتا ہے تو اصل اقتباس دینے کی ضرورت نہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ تحقیقی مواد میں اقتباس کو کم سے کم جگہ دی جائے۔ ہاں اگر اپنی پہلے کہی ہوئی بات کو اقتباس کے ماخذ کی تحریر سے مربوط کرنا مقصود ہے اور اِس صورت میں اقتباس کو مختصر کرنے میں متعلقہ مصنف کی پوزیشن پر حرف آنے کا اندیشہ ہے تو اِس کے سوا چارہ نہیں کہ

لفظ بہ لفظ پُورا اقتباس پیش کیا جائے۔

لکھنے کے لئے یہ طریقہ مناسب ہے کہ پہلے ایک خاکہ بنالیا جائے اور پھر لکھا جائے۔ اِس کے بعد اُس پر نظر ثانی کر کے دوبارہ لکھا جائے۔ دوبارہ لکھتے وقت بعض اوقات ثبوت اور دلائل میں خامیاں مِل سکتی ہیں جن کو دُرست کیا جاسکتا ہے۔ نظر ثانی میں اکثر اِدھر کا پیراگراف دوسری طرف بلکہ بعض اوقات پُورا صفحہ یا پُورا مضمون یا باب ہی تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

حوالہ جات کا مقصد کتاب کی ضخامت بڑھانا نہیں بلکہ یہ مآخذ کے ثبوت کے لئے ہوتے ہیں تاکہ پڑھنے والا اگر چاہے تو خود تصدیق کر سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ بعد کے مُحققین کے لئے ایک اخلاقی امداد بھی ہے کہ اگر اُن سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو تو ذرائع کی تلاش میں آسانی ہو جائے۔ ایک رُجحان یہ بھی ہے کہ حوالہ جات کو متن میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ یہ اچھا رُجحان ہے، اِس طرح حواشی کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہ اچھی محققانہ تحریر میں چار چیزیں مُستقل حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) واقعات کی صحت و ترتیب

(۲) ٹھوس اور مضبوط دلائل

(۳) عُنوان کی اہمیت کا واضح اظہار اور

(۴) فطری، سلیس اور عام فہم نثر

تحقیقی مواد کے ابتدائیہ کو دِلکش بھی بنایا جاسکتا ہے، جیسے زیرِ بحث مسئلہ کا ابتدائی اظہار سوالیہ جُملہ سے کیا جائے یا ایسے ادبی متن کا اقتباس دیا جائے جس کا آپ کے مضمون سے تعلق ہو اور اُس پر اندر کے صفحات میں بحث کی گئی ہو۔ ابتدائیہ کی یہ صُورت بھی ہو سکتی ہے کہ عُنوان کے زمانے سے ماقبل تاریخی ماحول کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

بہرحال اچھا تحقیقی مواد اِس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ طالبِ علم مُحققین کے زُمرہ میں شامل ہونے کا مُستحق ہے۔ اُس کی مہینوں اور سالوں کی محنت اُس کے مستقبل کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتی ہے اور اُستاد کی نگرانی میں کئے گئے کام کے نتیجہ میں ایک آزاد کتاب وجود میں آجاتی ہے۔

اُردو ادب میں فنِ تحقیق پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ جو مواد موجود ہے، وہ بھی تحقیقی ضروریات کی تکمیل نہیں کرتا۔ اپنے تحقیقی طریقۂ کار کی تلاش کے دَوران ریچارڈ ڈی الٹک کی کتاب "دی آرٹ آف لٹریری ریسرچ" THE ART OF LITERARY RESERCH By RECHARD D. ELTICK اور جیک برزن اینڈ ہنری ایف گراف کی کتاب "دی ماڈرن ریسرچ" THE MODERN RESEARCH BY JACK BURZEN, HENRY F. GRAF. کے مطالعہ سے اِس تشنگی کا مزید احساس ہوا۔ زیرِ نظر مقالہ اِسی احساس کا نتیجہ ہے۔ فنِ تحقیق کا موضوع اتنا وسیع و عریض ہے کہ رسالہ کے لئے لکھا گیا یہ مختصر مضمون اِس تشنگی کا مداوا نہیں کرتا۔ اِس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

موہن موہی

طنز

یہ حقیقت ہے کہ ہم چاند پہ جا پہنچے ہیں
اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ لاکھوں انسان
اپنی دھرتی پہ ہیں بھوک کے لیے عنال
یہ جگر دوز حقیقت کہ ہے دھرتی کا ملال
اُس دل افروز حقیقت پر کیا
اک حسین طنز نہیں !

مومن خاں شوق

سخنور ہوں میں ایسا

دھڑکنیں، احساس، فکر و فن کے جگنو
آرزوؤں کے سویرے، غم کے افسانے
سانس لیتے نیم روشن اداس بجھے چہرے
مرے جذبات،
میری شاعری، میرا اثاثہ ہیں :
جنھیں
ماحول کی اُلجھن سے سُلجھاتا ہوں
خونِ دل جلا کر
مصلحت کے اِس خراب آسا جزیرے میں
گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں
شمعِ یقیں لے کر
سخن کے چاند چمکاتا ہوں
فن کے گیت گاتا ہوں

رشید عبدالسمیع جلیل

وہ اور میں

کیا شئے ہے مجھ میں کب سے ہے، کچھ جانتا نہیں
چلتا ہے کون، کس کا ہے رستہ مرا وجود
کیسا سفر ہے، ساتھ ہوں، پہچانتا نہیں

گم ہے نظر کہ سامنے منظر نہیں کوئی
احساس کا دُھندلکا ہے پھرتا ہوں بے صدا
ڈھونڈوں کسے کہ مجھ سا اُجاگر نہیں کوئی
نقطہ ہوں پھیلتا ہوں میں اپنے حساب سے
میرے عمل کا روپ ہیں خط، دائرہ، لکیر
مفروضہ ہوں کچھ اپنے سوا مانتا نہیں

ظاہر نہیں ہے وہ مگر اُس کا ظہور ہے
گذرا ہے میرے جسم کے اندر قریب سے،
رہتا ہے مجھ میں میری پہونچ سے بھی دور ہے
باہم گتھے ہوئے ہیں یہ دیرینہ سلسلے
کیا نام دوں میں ذہن کے نقلی حجاب کو
چادر کہیں وجود کی میں تانتا نہیں
معدوم ہوں عدم کو بھی گر جانتا نہیں -

افسانہ

ابو اللیث جاوید

بند آنکھیں

وہ گندی نالی سے نکل کر کولتار کی کالی چوڑی سڑک پر آ گیا۔

سڑک سنسان تھی مگر تپتی ہوئی۔ سڑک کی اس مشقت میں بھی اُسے راحت مل رہی تھی کیونکہ صدیوں تک اُسے نالیوں کی گندگیاں چپاتی رہی تھیں، اُس کے بدن کے جوڑ جوڑ میں ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل نہ جانے کب سے جاری تھا مگر زندگی کے احساس نے ہر حال میں اُس کا ساتھ دیا اور سانسوں کے تاروں کو پاش پاش ہونے سے بچائے رکھا۔

لُو کا ایک گرم جھکڑ پھر آیا اور اُس کو جھلسا کر چلا گیا۔ وہ سوچوں کے صحرا میں تسکین کا پانی تلاش کرتا رہا۔ خواہشات کی بے پناہ پیاس کا لگان چڑھا اور اُس کے قدم اُسی طرف بڑھ گئے۔ بڑھتے گئے، بڑھتے گئے اور آخر میں اُس کے پاؤں میں آبلوں نے سر اُبھارا۔ وہ کراہ پڑا۔ ویرانوں سے اُسکی آواز ٹکرائی اور باز گشت سی ہوئی۔ وہ پاگلوں کی طرح خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر آوازیں ویرانوں میں اُبھرتی رہیں۔ ایک ساتھ اتنی ساری آوازیں کہاں سے اُبل پڑی تھیں۔ بھوکی، پیاسی، ننگی، بے گھر اور بے روزگار آوازیں۔

آوازیں، آوازیں اور صرف آوازیں۔ آوازوں کا جنگل اُگتا رہا اور وہ اُس میں گھرتا چلا گیا۔ اُس کی اپنی آواز نے خاموشی کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی اور وہ بالکل بے صدا ہو گیا۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اُس کے اندر کا بند پنچھی پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ موت کے اندھیرے آسمانوں کی طرف اُڑانیں بھرنے کے لئے اپنے پر تولنے لگا۔ پنچھی اب اُڑا کہ تب اُڑا۔ اندر ہوتی ہوئی سرگرمیوں نے اُس کا سر بھاری کر دیا اور وہ بھدے سے زمین پر آ گرا۔ اُس نے دم بھر آرام کرنا چاہا مگر پیروں میں نوکیلے کانٹے چبھے اور وہ تلملا گیا۔ جب وہ اپنے آپ سے باہر نکلا تو باہر سورج کا ننگا جسم ہنس رہا تھا اور بہت سارے لوگ اُس سے پھوٹتی ہوئی کرنوں کو اپنے مٹھیوں کو اُوپر آسمان کی طرف اُٹھا کر بھینچنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ وہ بھی نزدیک چلا گیا اور اجنبی لوگوں سے دریافت کیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ ـــــ؟"

"سورج مہربان ہوا ہے۔ کرنیں سمیٹ کر تم بھی اپنی جیب بھر لو کہ یہ تمہارے آڑے وقت کام آئیں گی۔" کچھ لوگوں نے مشورہ دیا۔

اُس نے بھی کرنوں کو پکڑنا چاہا مگر وہ اِس فن سے واقف نہیں تھا۔ مایوس ہو کر فضا کی چمکتی مانگ کو دیکھتا رہا۔ بھری بھری مانگ کی کھیتی لہلہاتی رہی اور اُس کے خیالوں کا کارواں گشت کرتا رہا۔

وہ کوہ قاف کی دیواریں ڈھاتا رہا کہ اُس پار سے آنے والی روشنی کا خنجر اندھیرے کے سینے میں پیوست ہو گا۔ مگر دیوار ہر نئی صبح کو پہلے ہی جیسی کھڑی رہتی اور اندھیرا دبیز اور گہرا ہوتا جاتا۔

آسمان نے خون برسایا اور اُس کا دامن داغدار ہو گیا۔ وہ اپنے بھیگے دامن کی نمی اور خون کی بُو سے تنگ آ کر موت کی وادیوں کی طرف مڑ تا گیا۔ سامنے دھواں ہی دھواں تھا۔ چیلوں اور گدھوں کا غول سر سے گذرا اور فضائیں بدبو ہی بدبو سا گئیں۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اِس بار گھٹن کی شدت تیز نہیں تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اگر یہ دم گھٹنے کا عمل اِسی طرح جاری رہا تو آہستہ آہستہ اُس کی عادتوں میں شامل ہو جائے گا اور پھر شاید اتنی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ تکلیف کا احساس ہی سب سے بڑی تکلیف ہے، سب سے بڑی اذیت ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو تکلیف جھیلنے پر آمادہ کیا مگر ہر بار زہر یلی ہنسی نے اُس کے قدم اُکھاڑ دیئے۔ اُس نے اِس ہنسی کی تلخی کو اپنے وجود کی زبان پر مٹھاس کی لذّت کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کی مگر تلخی پھر بھی تلخی تھی۔ اُس کی زبان تو میٹھی چیز سمجھ کر مزے چکھتی رہی مگر حلق کے کناروں سے تلخیوں کی جھاگ اُتر اُتر کر اُس کے جسم کی ندی کے شفاف اور میٹھے پانی کو گدلا کرنے لگی اور اُس میں طوفانی کیفیت دھیرے دھیرے اُبھرتی رہی۔ سمندر کی اُوپری سطح پر خاموش مُسکراہٹ تھی مگر اندرونی گہرائیوں میں مدوجزر پھیل رہا تھا۔ سمندر منتھن کے لئے دیوتاؤں میں اختلافات تھے۔

اُمرت اور وِش کے پیالے آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ گئے تھے۔ اَمرت کی تلاش میں ممکن تھا زہر کا پیالہ ہی ہاتھ آتا۔ وہ اِس دور کا کوئی شنکر نہیں تھا جو اُسے پی کر نیل کنٹھ ہو جاتا۔ کوئی میرا نہیں تھی، کوئی سقراط نہیں تھا جو امر ہو جاتے۔

وہ اندھیرے اور سنسان گلی کی طرف مُڑا۔ وہاں سچائی سِسک رہی تھی، کالے کوّے کی لمبی چونچ میں سونے کی کٹوری تھی۔ قریب کی منڈیر پر وہ اِس کٹوری کو رکھ کر 'کاؤں' 'کاؤں' کا جگر خراش شور اُگل رہا تھا۔ شور سے بجلی، پانی، راشن اور مکان جیسے الفاظ بن رہے تھے۔ بھوکے، ننگے اور کمزور لوگوں کے چہروں پر دم توڑتی ہوئی مسکراہٹوں کا عکس پھیل رہا تھا۔ یہ کوا وقت کا سب سے بڑا جادوگر تھا، سب سے بڑا عجوبہ تھا۔ اُس نے سونے کی کٹوری میں اپنی چونچ ڈالی اور چند کاغذ کے ٹکڑے ہوا میں اُچھال دئے۔ سارے لوگ اُن ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک واویلا سا مچ گیا۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور ہواؤں کے تھپیڑوں کے ساتھ گزر گئے۔ شور سے نجات کے لئے وہ بھی دوڑ میں شامل ہو گیا اور دوڑتا رہا، بغیر کسی منزل کے، بغیر کسی ٹھکانے کے۔ وہ جہاں جہاں دم لینے کو رُکا، کچھ نئے چہرے دوڑ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ دوڑنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی۔

وہ جہاں رُکا وہ ایک زندہ لاشوں کا گودام تھا۔ چہروں پر آنکھیں بڑی دُور تک دھنسی ہوئی تھیں اور سُوکھے ہونٹوں پر کچھ باتوں کی پرتیں جمی ہوئی تھیں۔ پرتوں کی تہہ میں یاس کی کربناکیاں مچل رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک چہرے پر کئی چہرے چسپاں ہوئے ہیں۔ ہر چہرہ ایک ایک زمانے کا نمائندہ تھا۔ زمانہ جو بڑا ظالم ہوتا ہے، بڑا جابر ہوتا ہے۔ چہرے پر بے شمار لکیروں کا جال تھا۔ اِس جال سے خواہشوں کی چنگاریاں نکل بھاگنے کے لئے اپنے ہاتھ پیر مار رہی تھیں۔ اُس کے قدم بھی بڑے ہال کی جانب بڑھ گئے اور ناگاہ بڑے دروازہ کے کواڑ دھڑام سے بند ہو گئے۔ وہ راہِ فرار تلاش کرتا رہا مگر کوئی بھی در وا نہ ہوا۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ گرمی بڑی شدت کی تھی، ہال کی اُونچی چھت پر کافی بلندی سے ایک پنکھا گرم ہوائیں نیچے کی طرف پھینک رہا تھا۔ اُس کا جسم اور ہلکا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے گھٹن تیز ہوتی گئی اور اُس کا دَم گھٹتا سا محسوس ہوا۔ اِس بار گھٹن نے شدت اختیار نہیں کی تھی، گھٹن سے سمجھوتہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور اُس کے نئی صبح کے رنگین خواب مفلس کی جوانی

کی طرح سِسک سِسک کر دم توڑتے جا رہے تھے۔ ہال کا دروازہ شام کو کھُلا تو سارے چہرے بھیڑ بکریوں کی طرح باہر نکلنے کے لئے دوڑ پڑے۔ وہ بھی باہر نکل کر کھُلی فضا میں اطمینان کی سانس لینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دیو قامت کالا بھجنگ ہیولا اُس کے قریب آیا اور اُس کی کھُلی ہتھیلی پر چند چمکتے سکّے چپکا گیا۔ وہ کبھی اپنی ہتھیلی اور کبھی اُس ہیولے کی طرف دیکھتا رہا کہ ناگاہ اُس کی کرخت آواز گونجی ——— "یہ تمہاری موت کی قیمت ہے۔ اِن پیسوں سے زندگی خریدو۔ چاہو تو روز ہی اِتنے پیسے ملتے رہیں گے۔"

"زندگی اتنی سستی کہاں ہے؟"

"موت کی قیمت سے زندگی نہیں ملتی۔ اُس کا ایک حصہ مل سکتا ہے۔ قیمتوں کو جوڑتے رہو گے تو ممکن ہے زندگی خرید سکو۔"

وہ اُسے دیکھتا رہا۔

دوسرے دن اُسے پھر کچھ پیسوں کی ضرورت ہوئی۔ اور خود بخود اُس کے قدم موت کی دوکان کی طرف بڑھ گئے۔ مضمحل چہروں پر پھر موت طاری تھی۔ وہ پھر ہال میں داخل ہو گیا اور موت کی اذیت محسوس کرتا رہا۔ دن بھر سارے وجود پر موت طاری رہی اور جب وہ شام کو باہر نکلا تو زندگی کے کچھ آثار دکھائی دئے۔ وہ روز موت کو گلے لگاتا رہا، اپنے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالتا رہا کہ اِس کے علاوہ اور دوسری کوئی زندگی بھی تو نہیں تھی۔ اُس نے زندگی کو اِسی معنی کے ساتھ سمجھا تھا اور کتابوں کی صحت پر شک سا ہونے لگا تھا۔ دانشوروں کی بہت ساری باتیں کسی اور جہان کے لئے معلوم ہوئیں۔ جو زندگی اُس پر مہربان تھی وہ تو بالکل مختلف تھی اُن تصویروں سے جسے وہ صحیح سمجھتا رہا تھا۔ تصویر کا تاریک پہلو چاند کی تاریک زمین کی طرح اُس کے فہم و ادراک کی رسائی سے بالاتر ضرور تھا مگر آنکھوں کی بینائی تیز ہوئی تو اُس نے اندھیرے میں بھی دیکھنا سیکھ لیا تھا۔

اندھیروں کی دُھند سے جب وہ باہر نکلا تو ایک بلند عمارت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ عمارت کی اُونچائی آسمان کی بلندیوں کو اپنے شانوں پر اُٹھائے محسوس ہو رہی تھی۔ بہت سارے لوگ چیونٹیوں کی طرح قطار در قطار اُس میں سمائے ہوئے، نکل رہے تھے۔ اُس نے عمارت کی منزلیں شمار کیں۔

ایک

دو

تین . . .
چھٹیں ـــــ،

آنکھیں وہ سے بھر گئیں اور گردن اکڑ گئی۔ وہ سوچتا رہا ـــ گردن کا بوجھ کبھی بلکا نہیں ہوتا۔ نیچے زمین میں جھانکئے تو درد، اوپر آسمان کو تاکئے پھر بھی درد ـــ آخر یہ درد کیا ہے؟

کیوں ہے!؟ ـــ آئیں ـــ!! آخر یہ سب کچھ کیا ہے۔!

درد کی شدت بڑھتی رہی۔ سر کے جنگلوں سے نکل کر گردن کی وادی میں اور پھر جسم کے صحراؤں میں اُسکی اُڑیں پھیل گئیں۔ وہ اندر ہی اندر درد پیتا رہا۔ مگر درد پینے سے بھوک کی شدت اور تیز ہو گئی۔ وہ چیونٹیوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ عمارت بہت ہی شاندار تھی۔ مگر اندر ایک قیامت برپا تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں طے کرتا رہا اور پھر منزل پر بھیڑ کے سیلاب میں گھرتا گیا۔ وہ جیسے جیسے منزلیں طے کرتا رہا طبیعت نڈھال ہوتی رہی۔ جب بھوک کی شدت بڑھی تو اُس نے بند کمروں پر کھڑے دربان سے کچھ کھانے کے لئے طلب کیا۔ دربان کی آنکھوں سے شعلے لپکے جس میں اُس کا وجود جھلستا محسوس ہوا۔ اُس کی بھوک اور تیز ہو گئی۔ وہ اس عمارت سے نکل کر باہر آنا چاہتا تھا مگر اُس کا کمزور جسم لوگوں کی بھیڑ میں پھنسا رہا۔ بھیڑ کا ایک زوردار ریلا آیا اور وہ ایک دم سے اُچھل گیا اور پھر گرا تو لوگوں کے کندھوں سے آٹکا۔ کندھوں سے کندھے بدلتے رہے اور وہ ہوا میں تیرتا رہا، غبارے کی طرح۔ وہ تیرتے تیرتے چھت کے بالکل کنارے پر آ گیا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا اور اُس کا سر چکرا گیا۔ وہ عمارت کی آخری منزل پر تھا۔ اگر ہلکا سا بھی جھٹکا لگا تو وہ گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اُس نے سوچا اپنا انجام دیکھنے سے قبل ہی وہ احساس کی روشنی کھو دے تو موت بے حد آسان ہو جائے گی۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور فضاؤں کی صلیب پر لٹکا رہا۔

▲



مُحسن زیدی

○

بجھ گئے سب ہی رہ گُذر کے چراغ
روشن اِک ہیں مری نظر کے چراغ

چاہے گھر میں ہو گھُور اندھیارا
جگمگاتے ہیں بام ودَر کے چراغ

قید کرلیں مُسافرو! نہ تمہیں
سحر کرتے ہیں اِس نگر کے چراغ

شاہراہوں پہ وہ اندھیرا ہے
لے کے چلتے ہیں لوگ گھر کے چراغ

اپنی دھرتی کو جگمگائیں گے
آسمانوں سے کب اُتر کے چراغ؟

بجھ تو سکتے ہیں سبھی سب اک ساتھ
جلتے ہیں ایک ایک کر کے چراغ

خالی گھر کو نہ آگ لگ جائے
چھوڑ جاؤ نہ تیز کر کے چراغ

رہ گئی ایک شمعِ سوزِ دُرون!
بجھ گئے سب اِدھر اُدھر کے چراغ

صبح ہوتے ہی یک بیک بجھنے لگے
تھکے ہارے تھے رات بھر کے چراغ

کوئی کیسے کس چراغ کو روئے
رہ گئے سارے ہی بکھر کے چراغ

جانے کل ہوں گے ہم کہاں مُحسن
ہم بھی لوگ ہیں سحر کے چراغ

کرشن موہن

○

انساں نے کیفِ تازہ دیا ہے جہان کو
تسخیرِ فکر و عزم کیا آسمان کو

ہر آن دیکھتا ہوں تری آن بان کو
تُو بھی تو دیکھ میرے جنوں کی اُڑان کو

ایسا فقیر، ایسا قلندر ہے میرا دِل
سمجھا ہے اک حباب تموّل کی شان کو

صد حیف دل کی بات کوئی مانتا نہیں
کیوں ڈھا رہے ہیں لوگ وفا کے مکان کو

جوگی کے انگ انگ میں کیا رنگ رچ گیا
بھولا ہے میل جول میں سب گیان دھیان کو

پریت کی ڈگر چھوڑ کے پھرتا ہے شہر شہر
بیراگ میں بھی روگ لگائے ہے جان کو

آتے ہیں مسکراتے ہوئے اہلِ مدعا
مخزن سمجھ کے ایک چمکتی چٹان کو

غارت کا ترجمان سمجھتے رہے ہیں لوگ
شاخوں پہ اُنگلیوں کے درخشاں نشان کو

[illegible] سے اہلِ ہنر طرزِ زیاں
پہنچا رہے ہیں ٹھیس محبت کے مان کو

اِس رنگ [illegible] مدعی کئی
تولتا ہے گرچہ [illegible] غزل کی زبان کو

طنزیہ

یوسف ناظم

اِمتحان

جب ہم طالب علم تھے تو ہمیں سال میں صرف ایک مرتبہ فیل ہونے کی اجازت تھی۔ اب سال میں دو مرتبہ فیل ہونے کی سہولت عام کردی گئی ہے لیکن اتنی ذرا سی سہولت (جسے قلیل کہنا چاہیے، موجودہ حالات میں ناکافی ہے لیکن کہ "قلیل" کافی نہیں ہے یہ لفظ کا "حق" اُردو میں اُس وقت تو دیا گیا تھا جب اُردو بھی ایک زبان تھی — حالیہ تحقیقات کی روشنی میں اُردو اب صرف ایک رسم الخط ہے)۔ چونکہ سال میں دو مرتبہ فیل ہونے کی سہولت سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا اِس لئے مزید سہولتوں کے لئے دوڑ دھوپ جاری ہے۔ یہ دوڑ دھوپ بھی عجیب چیز ہے۔ پتہ نہیں اس کا مطلب دھوپ میں دوڑنا ہے یا دوڑ کر دھوپ میں پسینہ سکھانا ہے۔ اِس دوڑ دھوپ کا تعلق بہرحال امتحان سے ضرور ہے کیونکہ امتحان ہوتے ہی دھوپوں میں ہیں۔ امتحان کی تاریخوں کا اعلان اُسی وقت ہوتا ہے جب دھوپیں ناقابلِ برداشت ہو جائیں۔ اصلی امتحان اپریل میں منعقد ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں ماہرینِ طیور کے اندازے کے مطابق چیل انڈا چھوڑتی ہے۔ (یاد رہے کہ پرندوں اور چرندوں میں صرف چیل ہی وہ قوم ہے جو انڈا چھوڑتی ہے باقی سب لوگ انڈے دیتے ہیں)۔ جس طرح دوڑ دھوپ کا تعلق امتحان سے ہے بالکل اُسی طرح اِس انڈے کا بھی امتحان سے تعلق ہے۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں ——— دوسرا امتحان اکتوبر میں ہوتا ہے اور اکتوبر کی گرمی بھی دور دور تک مشہور ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں ہونے والے امتحان میں ہر کسی طالب علم کو شریک ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ عزت صرف اُن طالب علموں کو دی جاتی ہے جنہیں اپریل کے امتحان کا تجربہ ہو۔ (نو مشقوں کو بھی اگر چھوڑ دیا جائے تو پھر اپرنٹس اور تجربہ کار میں فرق کیا رہا)۔

اپریل کے امتحان میں فیل ہونا مشکل نہیں ہے۔ جو طالب علم اِس امتحان میں اپنی ذاتی یا موروثی قابلیت کے بل بوتے پر فیل ہونا پسند نہیں کرتے وہ امتحان دیتے وقت ایسے طالب علم کے جوابی پرچے کی نقل کرتے ہیں جو خود اعلیٰ نمبروں سے فیل ہونے کے ارادے سے امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے۔ نقل کر کے فیل ہونے والے طالب علم کو کبھی بُرا نہیں سمجھا جاتا اور اُسے بھی اکتوبر میں ہونے والے امتحان میں بیٹھنے کے شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ طالب علم اِس امتحان میں بھی اِس لئے فیل ہو جاتا ہے کہ اپریل سے اکتوبر تک کی مدت میں اُس کی بینائی اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ ٹھیک سے نقل نہیں کر سکتا۔ نقل کرنے کے لئے عقل کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی بینائی کی ہوتی ہے۔ اور آج کل بینائی کا یہ عالم ہے کہ بیٹے باپ کو پہچان نہیں سکتے۔ بس میں سفر کرتے وقت ایک نوجوان لڑکے نے اپنی سیٹ ایک ضعیف شخص کو دے دی اور جب اُس نے اُس شخص کو قریب سے دیکھا تو وہ اُس کا اپنا باپ نکلا۔ (لڑکے کو بہت افسوس ہوا اِس لئے نہیں کہ وہ شخص اُس کا باپ تھا بلکہ اِس لئے کہ اُس نے خواہ مخواہ اُسے اپنی سیٹ دے دی) لوگ کہتے ہیں کہ اگر آنکھوں کے کمزور ہونے کی یہی رفتار رہی تو آگے چل کر میاں بیوی ایک دوسرے کو چھو کر ہی پہچانا کریں گے۔ اُس زمانے تک تو امتحانوں کا سلسلہ یقیناً ختم ہو جائے گا۔ (امتحان کا نتیجہ برآمد ہو یا نہ ہو گھیراؤ اور پتھراؤ کا نتیجہ ضرور نکلے گا)۔

امتحان یوں بھی ناقص چیز ہے۔ دنیا میں جو تجربے ناکام ہوئے ہیں (کامیاب تجربہ صرف ایٹم بم کا ہوا ہے) امتحان اُن میں سے ایک ہے بلکہ یہی ایک تجربہ ہے جو بُری طرح ناکام ہوا ہے۔ کوئی غبی طالب علم امتحان میں کامیاب ہو کر گدّی پر بیٹھ جاتا ہے اور کوئی ذہین طالب علم ناکام ہو کر ردّی کے نیچے دب جاتا ہے۔ ایک کی منزل گدّی ہوتی ہے؛

معاشرے کی مدد سے امتحان میں کامیاب ہونا طالب علم کی تنہا ذمہ داری ہے بھی نہیں۔ یہ گھوڑوں کی دوڑ نہیں کہ جو سب سے تیز دوڑے وہ اوّل آجائے۔ امتحان میں تو ایک ممتحن بھی ہوتا ہے اور اگر صرف ایک ممتحن ہو تو بات سمجھ میں آئے لیکن ایک ہی پرچے کے پانچ ممتحن ہوتے ہیں اور ہر ممتحن کے گھریلو حالات الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ممتحن کنوارا ہوتا ہے، ایک کثیر العیال ہوتا ہے، ایک غیر شادی شدہ ہوتا ہے، ایک تین چار مرتبہ کا شادی شدہ ہوتا ہے اور ایک کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ ممتحن کے گھریلو حالات کا طالب علم کے جوابی پرچے پر اتنا ہی اثر پڑتا ہے جتنا پیپر ویٹ کا کاغذ پر۔ ممتحن کو اگر ناشتے میں دو انڈوں کا آملیٹ، فرنچ ٹوسٹ، مارملیڈ اور گرم چائے نصیب ہوتی ہے تو ہر طالب علم چاہے اُس نے اندرا گاندھی کو مہاتما گاندھی کی بیٹی لکھا ہو، اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوگا اور اگر ممتحن کو ناشتے میں صرف جلے ہوئے توس، اور ٹھنڈی بدمزہ چائے کے علاوہ بیوی کی گرم گرم باتیں سننے کو ملی ہوں تو ہر طالب علم چاہے اُس نے بادشاہوں اور راجاؤں کی بیویوں کے پیسے اسٹاک کی تفصیل تک صحیح لکھی ہو، فیل ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ ممتحنوں کے گھریلو حالات کو جانچنے یا جانچنے کے بعد ان حالات کو بدلنے کا کوئی نسخہ اب تک کسی حکومت کے ذہن میں نہیں آیا ہے۔

امتحان تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی۔ جب کسی شخص کو بہت زیادہ اونچی ڈگری دینے کا موقع آتا ہے تو اُس کا زبانی امتحان بھی مقرر ہوتا ہے اور اُس سے پوچھا جاتا ہے کہ اُس نے اس ڈگری کو ناجائز طور پر حاصل کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ بیان کرے۔ یہ بہت نازک وقت ہوتا ہے۔ امتحان دینے والا اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ اُس نے جو کچھ لکھا ہے، امتحان لینے والوں نے پڑھ رکھا ہے اور وہ اُسے یاد کرنے کی کوشش میں سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن وہ لوگ جنہیں معلوم ہے کہ اُن کا لکھا ہوا مقالہ کوئی بھی شریف آدمی پڑھنا پسند نہیں کرے گا۔ زبانی امتحان میں بے کھٹکے کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اُن کے زبانی جواب میں وہ سب ہوتا ہے جو اُن کے مقالے میں نہیں ہوتا۔ زبانی امتحان میں امتحان دینے والے کا نقشہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ بعد میں یہی لوگ ملک کا نقشہ بناتے ہیں۔

زبانی امتحان چال چلن کی جانچ کے لئے بھی ضروری ہے۔ چال چلن میں سے کم سے کم ایک چیز یعنی چال کا حال تو ممتحنوں کو معلوم ہی ہو جاتا ہے۔

زبانی امتحان لینے والے ممتحن ایک الگ ہی قوم کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کا پہلا سوال یہ ہوگا: مسٹر شمشاد حسین آپ کا نام کیا ہے اور شمشاد حسین کو اپنا نام اُس وقت ہرگز ہرگز یاد نہیں آئے گا۔ اس سوال پر انہیں شبہ ہوگا کہ اُن کا نام شمشاد حسین ہے بھی یا نہیں۔ زبانی امتحان دیتے وقت اُس طالب علم کا حال بُرا ہوتا ہے جو ٹرین میں یا جیل میں پیدا ہوا ہو۔ ممتحن اُس کی جائے ولادت معلوم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ ممتحنوں کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا اور نہ امیدوار اس موضوع پر کوئی روشنی ڈال سکتا ہے۔ یہ صرف والدین کے سمجھنے اور سمجھانے کی بات ہوتی ہے۔ ممتحن اس معاملے میں جتنی دلچسپی لیں گے معاملہ اُتنا ہی اُلجھتا جائے گا۔

جو طالب علم اور اُمیدوار تحریری اور زبانی امتحان میں فیل نہیں ہوسکتے انہیں ایک اور امتحان کا موقع دیا جاتا ہے۔ ایسے ڈاکٹری امتحان کہا جاتا ہے۔ تحریری امتحان کے موقع پر امتحان ہال میں مجمع ہوتا ہے کئی طالب علم لیکن صرف ایک نگران کار۔ زبانی امتحان کے موقع پر صرف ایک امیدوار اور دو یا چار ممتحن۔ لیکن ڈاکٹری امتحان میں دُو بدُو مقابلہ ہوتا ہے۔ صرف ڈاکٹر اور امیدوار۔ اس ڈوئل میں ریفری اور مددگار رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ دونوں کو تنہا نمٹنا ہوتا ہے۔ یہ امتحان بھی اگزامینیشن روم میں ہوتا ہے۔ اس امتحان میں اُمیدوار کو عام طور پر صرف سینہ پُھلانا ہوتا ہے (لیکن سینہ کے بجائے اُس کی سانس پُھول جاتی ہے) اس امتحان میں پرچہ دوبارہ نہیں جانچا جاسکتا۔ لیکن اگر اُمیدوار ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں فیل کئے جانے پر مطمئن نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو چار پانچ ڈاکٹروں کے ملاحظے کے لئے پیش کرسکتا ہے۔ (چار پانچ ڈاکٹروں کے مجمع کو میڈیکل بورڈ کہتے ہیں) اور میڈیکل بورڈ کے پاس، ناکام امیدوار کو پاس کرنے کا کوئی نسخہ نہیں ہوتا۔ سارے ڈاکٹروں کے نسخے ایک ہوتے ہیں۔

ان سارے جھگڑوں سے بہتر ہے کہ آدمی صرف عشق کے امتحان دیا کرے لیکن کامیابی سے خود کو محفوظ رکھے۔ ▲

مقالہ

مناظر عاشق ہرگانوی

احتشام حسین کی تین نظمیں خود اُنکی نظر میں

احتشام حسین نے جب شاعری شروع کی تو اُس وقت کا ادب تین طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ پہلا طبقہ رُومانی شاعری میں پُرانے سماجی بندھنوں سے ناراض ہے اور اس راہ میں سرمایہ دارانہ عہد کی تمام رعایتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے سماج کی تعمیر کسی ایسے طرز پر پسند نہیں کرتا جو عورت کی موجودہ حالت میں تبدیلی پیدا کر دے۔ نوجوان شعراء اسی نقطۂ نظر پر قائم ہیں۔ بلاشبہ اُن کے اس نظریاتی تضاد یا اُن کی اس نیم فاشیت کا بڑا سبب پُرانی جاگیرداری کی محبت، وقت کے نئے مطالبات کا احساس اور ساتھ ہی نئے سائنٹفک نظریوں کا اُن تک نہ پہنچنا ہے۔

دوسرا طبقہ جو سیاسی و اقتصادی مسائل سے بحث کرتا ہے عام طور سے قومیت سے متاثر ہے۔ بین الاقوامیت اُس پر اثر نہیں ڈالتی۔ یوں اکثر پرانے شعراء کے طرز پر یہ بھی "انسانیت" کو اپنا موضوع بناتا ہے لیکن اس گروہ کی انسانیت' رومانی اور خیالی چیز ہے، جسے خارجی دنیا کی زندہ حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اِس کا اقتصادی نقطۂ نظر بہت انقلابی ہے۔ سرمایہ داری کی تباہیوں کا اِس طبقہ کو پوری طرح احساس ہے۔ یہ اُس کے خلاف بے رحمانہ تنقید کرتا ہے مگر ساتھ ہی قومیت میں پوری طرح اعتقاد رکھتا ہے اور سوسائٹی کا مجلسی ڈھانچہ بہت کچھ پُرانے اُصول پر بنانا چاہتا ہے۔ عورت جو آج تک رومانی شاعری کا مرکزی نقطہ رہی، اُس کے خیال میں بھی محض ایک حسین تسلی ہے۔ اِس طرح سرمایہ داری کے مخالف ہو کر تو منطقی طور پر بین الاقوامیت کی تائید کرنا مگر اپنے غیر منطقی جذبات سے مجبور ہو کر مستقل قوم پرست رہنا اور موجودہ سماج کی فاشزم روایات سے ناراض ہونے کے باوجود عورت کو وہی درجہ دینا جو پُرانے جاگیرداری شعراء نے مقرر کر دیا تھا۔ ایسے منطقی تضاد ہیں کہ اُن کے مجموعہ کو صرف فاشیت ہی کہہ سکتے ہیں۔ اِن شعراء تک نئے سائنٹفک نظریئے اُردو ادب کے موجودہ انقلابی اور پرولتاری رُجحان کی وجہ سے چھن چھن کر پہنچے ہیں۔ اِن نظریات کی برہانی اور علمی حیثیت کو چیلنج کرنے کی اِن میں جرأت نہیں۔ لیکن چونکہ ذہن لاشعوری طور پر جاگیرداری کے اثرات کو آج تک چھپائے ہوئے ہے اور اُبھار طور پر وہ ان کی زندگیوں، ذہنیتوں اور ادبی سرگرمیوں پر اثر ڈالتا رہتا ہے اِس لئے وہ مجبور ہوتے ہیں کہ پُرانے سماجی نظریوں کو صحیح تسلیم کرتے رہیں۔

تیسرا طبقہ اُن انقلابی شعراء کا ہے جو نئی دنیا کے مطالبات، نئی سائنس کے نتائج، آج کے سماج کے رجحانات، فکری ساخت، اقتصادی دباؤ، حیاتیاتی اثرات، پُرانے عناصر کی دن بہ دن ناپیدگی وغیرہ کے درمیان باہمی ربط اور اُس ربط کے منطقی نتیجوں کو جانتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب بھی اسی طرح نئے حالات کی پیداوار ہیں جیسے پہلے دونوں طبقوں کے شعراء۔ مگر اِن میں اور سابقہ رُجحانات رکھنے والے ادیبوں میں یہ واضح فرق ہے کہ وہ پیدا شدہ حالات کے منطقی ربط کو نہیں سمجھتے، نہ ہی وہ اُن کمزوریوں کو محسوس کرتے ہیں جو ان کے دماغ کی گہرائیوں اور اندھیرے گوشوں میں جاگیرداری سماج اور جاگیرداری ادب نے چھوڑ رکھی ہیں۔

ابتدا ہی سے احتشام حسین کا ذہن روشن اور مُعمر رس رہا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہاں میں احتشام حسین کی تین ابتدائی نظمیں پیش کر رہا ہوں جن میں تینوں طبقوں کی جلوہ گری موجود ہے۔ اِن تینوں نظموں سے متعلق احتشام حسین نے اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار کیا ہے۔ پہلی نظم "نہ جا!" ہے۔ اس نظم کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

"یہ بات برابر سُننے میں آتی ہے کہ شاعر کا کام تخلیق ہے

شاعر بیتی

فنِ شاعری کا مقام تنقید سے برتر ہے۔ اس لئے شاعر کا نقاد
ہونا ضروری نہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ اچھی چیز کی تخلیق
بغیر تہذیب اور تنقید کا اعلیٰ ذوق رکھے ہوئے ناممکن ہے؟
اس لئے اس بحث کا دروازہ یہیں بند ہو جاتا ہے کہ
اچھا شاعر اچھا نقاد بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ چند
جملے میں نے اس لئے عرض کئے ہیں کہ مجھے بھی اپنی دو
ایک نظمیں آپ کے سامنے پیش کرنی ہیں اور میں چاہتا
ہوں کہ انہیں سنانے سے پہلے یہ بعض باتیں اپنے
نظریۂ شاعری اور ان نظموں کے متعلق کہہ دوں تو شاید
میرے لئے بھی آسانی ہو اور آپ کے لئے بھی۔

شاعری میرے خیال میں نہ تو زندگی کی محض
تصویر کشی ہے اور نہ محض تنقید، بلکہ سماجی زندگی میں
انسانی اعمال اور افعال کے ذریعہ سے آگے بڑھنے اور
پھیلنے کی جو طاقت چھپی ہوئی ہے، اس سے پیدا ہونے
والے مثبت اور منفی اثرات کا ایسا حسین اظہار ہے جو
سننے اور پڑھنے والے دونوں پر اپنا جادو چلائے اور
اس سے شاعری میں حقیقت اور واقعیت، تنقیدیات
اور حسن سب ایک ساتھ پیدا ہو کر انسان کے ترقی کرنے
والے محسوسات اور اعمال میں خاص طور سے تحریک پیدا
کریں گے۔ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعری چاہے
روحانی، انفرادی اور ذاتی تجربات کا اظہار کرتی ہو یا
اجتماعی ہو اور کسی گہرے مضمون پر حاوی ہو لیکن ہر
حال میں اس کے اندر وہ شعور اور آگاہی موجود ہوگی جو
جماعتی زندگی کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اور بہت سے
مسائل کا حل تلاش کرتی ہے لیکن چونکہ حسن کاری اس کا
ایک ضروری جزو ہوتی ہے، جو خود موضوع کے ساتھ خلوص
رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ فنونِ لطیفہ میں
شمار کی جاتی ہے اور مقصد رکھنے کے باوجود دیرپا اور
عالمگیر ہو جاتی ہے۔ شاعری کا یہ معیار پیش کرنے کے
بعد مجھے اپنی نظمیں پیش کرتے ہوئے ایک طرح کی
ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ اس مقصد کو
حاصل کرنے اور اس معیار تک پہنچنے کی کوشش کے سوا
اور کچھ نہیں ہیں۔ خاص کر یہ نظم جس کا عنوان "نہ جا" ہے
ایک خالص جذباتی دور کی یادگار ہے۔ یہ نظم [illegible]
کو شاہ گنج اور الٰہ آباد کے درمیان سفر کرتے ہوئے
لکھی گئی۔ اس زمانہ میں میں بی اے کا طالب علم تھا، جذباتی
حیثیت سے بیدار لیکن تنقیدی صلاحیتیں صرف اس
حد تک تھیں کہ میں سیدھی سادی حقیقت نگاری کو کافی
سمجھتا تھا۔

"نہ جا" ایک رومانی نظم ہے، اس پر کسی گہرے مفہوم کا شک بھی
نہیں ہو سکتا لیکن اپنے موضوع اور اظہار دونوں میں خلوص رکھنے کی
وجہ سے اس کی انفرادیت زائل ہو گئی ہے اور وہ ہر اس شخص کی کہانی
بن سکتی ہے جو زندگی کے کانٹوں سے اپنا دامن الجھا رہا ہے۔ اس نظم میں
ایک پلاٹ بھی ہے اور اس میں میں نے تسلسل قائم رکھ کر اپنے تجربہ کو
پوری سچائی کے ساتھ پیش کرنا چاہا ہے۔ اس کا معاشرتی پس منظر
ایک متوسط طبقہ کا ہے جہاں ایسی بیت کی یادوں کے انبار ہوتے ہیں۔
ایک بات اور عرض کر دوں کہ ۱۹۴۲ء سے آج تک میں نے بہت کچھ
سیکھا اور سمجھا ہے۔ اس نظم کے بعض لفظ اور مصرعے بدلنا مناسب
معلوم ہوتا ہے لیکن اسے اسی طرح پسند کرتا ہوں جیسے یہ اپنی پہلی شکل
میں تھی ——— نظم یہ ہے ؎

تیرے چھٹنے کا سماں اس وقت ہے پیشِ نظر
دیکھ کر وہ خوفِ رسوائی سے ہر سو دیکھ کر
میرا دامن تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھنا اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

مسکرائی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے
اُف [illegible] ہے
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفاک ہے
اشک بھر کے [illegible] تیرا وہ کہنا "نہ جا"

وہ [illegible]
[illegible] "نہ جا"

ایک آویزش سی تھی اقرار اور انکار میں
ہو رہا تھا کچھ دیر تک تو میں اُلجھن انکار میں
ناگہاں تیری صدا گونجی در و دیوار میں
چھا گیا ہستی پہ میری تیرا وہ کہنا "نہ جا"

میری کشتی سرِ ساحل آ گئی گرداب میں
پھر اُٹھی تیری محبت کی دلِ بیتاب میں
تھا عجب ہنگامہ، وہ بھی زندگی کے باب میں
مُڑ کے دیکھا اور پھر کر مُنہ تیرا وہ کہنا "نہ جا"

میری کچھ مجبوریاں رُکنے سے مانع ہو گئیں
جاگ کر ساری تمنائیں یکایک سو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں
سُن کے بھی میں کچھ نہ بولا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

شوقِ دنیا نے ترے پہلو سے بہکایا مجھے
سبز باغ اِک دولت و ثروت کا دکھلایا مجھے
تیرے دردِ عشق کو اُدبار بتلایا مجھے
کچھ اثر آخر نہ لایا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

لیے ہاتھوں سے اپنا خونِ دل کرتا ہوا
تجھ کو مضطر چھوڑ کر میں نامراد رخصت ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی شیریں صدا
دُور جانے پر بھی مُڑ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

ہے تجھے اتنی محبت میں کبھی سمجھا نہ تھا
اب سے پہلے میرا جذبِ آرزو سچا نہ تھا
دیکھتا ہوں وہ کہ جو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
وہ محبت کی تفسیر اور تیرا وہ کہنا "نہ جا"

تیرا اظہارِ محبت، وقتِ رخصت بار بار
ہے مرے عہدِ محبت کی وہ زرّیں یادگار
جس پہ کرتا ہوں ہوا ترے میں [illegible] نثار
یاد ابھی تک [illegible] تیرا وہ کہنا "نہ جا"

دوسری نظم [illegible] ہے
اس نظم سے متعلق [illegible]

"یہ دوسری نظم بھی بظاہر رُومانی ہے، بعض اوقات تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ رُومان کی ایک ہلکی سی چاشنی نظم کے اثر میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کا موضوع رُومانی نہیں ہے بلکہ اس کی تحریک میں رُومان شامل ہو کر کچھ غائب سا ہو گیا۔ یہ نظم مئی ۱۹۴۲ء کی ہے اور ظاہر ہے کہ تقریباً ایسے ہی زمانے میں کہی جا سکتی تھی جب جاپانی فوجی شہنشاہیت کا خطرہ چین سے بڑھ کر پُرسے بحرالکاہل پر پھیل گیا اور ایک سیاہ گاڑھے دُھوئیں کی طرح ہندوستان پر بھی پھیلنا چاہتا ہے۔ جرمنی اور جاپان صرف اسی لئے دنیا پر عرصۂ حیات تنگ کر دینا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے جانوں سے کھیلنے کا کافی سامان فراہم کر لیا ہے۔ قوموں کی آزادیاں ختم ہو رہی ہیں اور زندگی کرب اور بے چینی کی منزلوں سے دیوانہ وار گذر رہی ہے، ایسے میں محبت کا ذکر کچھ بے وقت کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کا (میرا) خیال ہے کہ انسانوں کی مجموعی طاقت اس جرمن اور جاپانی خطرے سے مقابلہ کرنے میں صرف ہونی چاہئے ورنہ انسانیت اندھیرے اور ظلم کے ایک ایسے گڑھے میں گرا دی جائے گی جہاں سے نکلنا مشکل ہوگا۔ یہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے دوسری ترقی پسند تحریکوں کو کچھ دنوں کے لئے پسِ پُشت ڈالنا پڑا ہے۔ محبت کو ملتوی کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ برداشت کرنے اور اُس کے لئے پہلے ایک بہتر اور سازگار فضا پیدا کرنے کا سوال ہے۔ اس نظم کی بحر دماغ کی تھکن اور تذبذب کا پتہ دیتی ہے جو یقیناً موجودہ حالات کی وجہ سے شاعر کے (میرے) دماغ میں پیدا ہو گیا ہے۔"

نظم یہ ہے ؎

میں نے محبت کی ہے مگر، اِس وقت نہ اِس کا ذکر کرو
وہ تنہا میرا غم ہے، اِسے تنہا مجھ کو ہی اُٹھانے دو
جس درد سے ہم سب مضطر ہیں آؤ کچھ اُس کا ذکر کریں
سر جوڑ کے بیٹھیں کچھ سوچیں، اِس سے بچنے کی فکر کریں

یہ کیسی بھیانک تاریکی ہر سمت سے گھیرے لیتی ہے
یہ کیسی ہوا ہے حیوانوں کو جو درسِ تباہی دیتی ہے
تاریک دھوئیں کی بارش میں دم گھٹتا ہے انسانوں کا
جائیں بھی کدھر بہرہ سے پر پہرہ ہے یہاں طوفانوں کا
شہروں کی خموشی آبادی ہیں کیوں ہلچل ہے بیزاری ہے
کیوں رنگ اُڑے ہیں چہروں کے کیوں وحشت سب پر طاری ہے
یہ کیسے دھندے رقص کناں ہیں دھول سا چھایا جاتا ہے
یہ کون قیامت کے سُر میں بھیانک گانے گاتا ہے
یہ کیسے خون کے دھبے ہیں جو ناچ رہے ہیں صد ا میں
یہ کیسے خونی باجوں کی آواز بسی ہے ہواؤں میں
یہ کیسی درد کی ٹیسیں ہیں جو ہر دل کو تڑپاتی ہیں
بارود کی بُو میں اُلجھی ہوئی کیوں گرم ہوائیں آتی ہیں
بچوں پہ یتیمی آتی ہے ماؤں پہ رنڈاپا آتا ہے
کیوں بادِ سحر کا ہر جھونکا پیغام جلائی لاتا ہے
یہ سب کچھ دیکھ کے اپنا غم بھی شاید ذہن میں آئے گا
ہونٹوں سے آہیں نکلیں گی دم سینے میں گھبرائے گا
کڑکی تھی شجنوں کی جو بجلی پھر سر پہ کڑک ہی جائے گی
جو دل میں دبا کر رکھی تھی وہ آگ بھڑک ہی جائے گی
جو باہم گذری ہیں راتیں وہ راتیں یاد آئیں گی مجھے
جو اب تک لذت دیتی ہیں وہ باتیں یاد آئیں گی مجھے
جن میں غم کھو جاتا تھا وہ سپنے مجھ پر چھائیں گے
جو وصل کی رات میں برسے تھے ساون کے وہ بادل آئیں گے
بکھری ہوئی ان نغموں کی کانوں پہ صدائیں آئیں گی
ہر سدھن ٹوٹ کے ہم تم کو اس دنیا میں پہونچائیں گی
میں تھوڑی دیر تڑپ لوں گا، غم سہہ لوں گا، خوں رو لوں گا
اک بوجھ سا دل پہ ہوگا مرے کچھ دیر نہ ہنس کر بولوں گا
لیکن حب اور بڑے دکھ میں دنیا کو گھرا پاؤں گا
میں اپنے غم کے اندھیرے سے فوراً باہر آجاؤں گا
یہ درد سے پگھلا دل میرا ہر سانچے میں ڈھل جائے گا
جو صرف اپنے کام آتا ہے اوروں کے بھی کام آئے گا
یوں دیکھ کے نوعِ انساں کو پستی کی اندھیری منزل میں

غلاف بادِ سحر اٹھتی ہے یک موجِ جنوں میرے دل میں!
احساس مکمل ہو جائے گا جلد ایسا وقت بھی آئے گا
یہ آتشِ غم بجھ جائے گی یہ دورِ ستم مٹ جائے گا
جب امن و اماں کے دور ہوں گے جب عیش و عشرت کی راتیں
اُس وقت سُناؤں گا اکثر میں عشق و محبت کی باتیں!!

اور تیسری نظم "رندِ نصیحت مشرب" ہے۔ اس نظم سے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

"جو لوگ حضرت جوش ملیح آبادی کو قریب سے دیکھ چکے ہیں اُن کے لئے تو یہ تمہید بیکار ہے۔ لیکن دوسرے حضرات کے لئے اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

شام ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہوتا ہے کہ جوش کی نظریں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی ہیں، دیواروں سے اُترتی ہوئی دھوپ کو دیکھتی ہیں۔ اور جس طرح ایک زاہد و عابد رحمت کدۂ خداوندی کی جانب جانے کی تیاریاں کرتا ہے، جوش بالکل اُسی طرح بلکہ غالباً اُس سے زیادہ جوش و خروش سے "رحمت کدۂ بادہ فروشاں" کی جانب چلنے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ نغز تلخ تر ہو جاتا ہے۔ دورِ خوانی تیز ہو جاتی ہے اور آتشِ شوق بھڑک اٹھتی ہے۔ کائنات سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہے۔ ذہن اور عقل کی باگیں ڈھیلی کر دی جاتی ہیں اور مبارک ہیں وہ لوگ جو اس وقت اُن کی محفل میں بار پاتے ہیں!

کچھ ایسے مخصوص لوگ ہوتے ہیں، جنہیں وہ سمجھتے ہیں اور جو ان کو سمجھتے ہیں۔ باتیں کبھی استعاروں اور اشاروں میں ہوتی ہیں کبھی اتنے صاف الفاظ میں کہ سوچنے کی ضرورت نہ پڑے۔ تنقید کا تازیانہ آہنی ہو جاتا ہے۔ نرم اور خوبصورت جملے، اشعار، بجلی کے جھٹکوں کی طرح محسوس ہونے والے طنز، قہقہے اور آنسو، گرم گفتگو، ناز و نیاز، رنگین کہانیاں، زندگی کے چھوٹے لمبے واقعات کی یاد، نظموں کی شانِ نزول کا تذکرہ، حواس اور بدحواسی کا عجیب تیز امتزاج، ان سب سے ایک ایسی فضا تیار ہوتی ہے کہ دنیا اور سمجھنے کے علاوہ کوئی اور جہان پیدا ہوتا ہے۔ لوگ کسی اور سیارے پر پہنچ جاتے ہیں۔

اُس وقت میں بھی ہوتا ہوں۔ تھا، جسمانی مفہوم میں نہیں فضائی مفہوم میں، ایسی محفل میں شامل بھی اور اس سے الگ بھی، کبھی کبھی جوش کو مجھ پر ترس آتا ہے۔

یہ لڑکا ذہین ہے، تیز ہے، پڑھا لکھا ہے، بہت کچھ کر سکتا ہے، لیکن بس ایک کمی ہے، پینے کی ہمت نہیں کرتا۔ اور ایسی ہزاروں باتیں۔ جوشؔ مجھے عزیز رکھتے ہیں۔ شاید اس لئے ترس اکثر آتا ہے ۔۔۔ جوشؔ کہتے ہیں، دن کام کے لئے ہے، رات آرام کے لئے، دن بھر دماغ کی مشین چلتی ہے۔ رات کے وقت اس میں تیل دینا چاہئے۔ میں کہتا ہوں ضرور تیل دینا چاہئے لیکن رات کو فرصت کے لئے دن بتانا پڑتا ہے۔ اس وقت زندگی ایسی منزل میں ہے۔ ٹوٹ جائیں افراد کی زندگی کی مشینیں مگر کام ہونا چاہئے ۔۔۔ جوشؔ کہتے ہیں، بحث مباحثہ سے غریبوں کی شراب نہ خراب کرو۔ میں ان ہی کی رباعی پڑھتا ہوں ؎

اب خواہشِ لذّات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی
دَر کس کے لئے کھٹکھٹا رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اور میری سوگواری سے کبھی کبھی محفل کی فضا اُداس ہو جاتی ہے۔"

نظم یہ ہے ؎

مت بار بار پوچھ، میں کیوں سوگوار ہوں
ہوتا ہے مجھ کو شک تری صحبت پہ بار ہوں
اے دوست لطفِ بزم میں کھو جاؤں کس طرح
آتی نہیں ہے نیند تو سو جاؤں کس طرح
ہاں سچ ہے مجھ پہ فکر کے بادل سے چھائے ہیں
خود میں نے اپنے گرد یہ حلقے بنائے ہیں
اب تجھ سے کیا بتاؤں ہے کس موڑ پر نظر
کہرے کی دھند میں مجھے درپیش ہے سفر
جب سے نکھر کے آئے ہیں دنیا کے بیش و کم
لرزاں ہے شمعِ عیش سرِ رہگذارِ غم
آنکھیں کھلی ہیں، بند انہیں کیسے میں کروں
غم کی اندھیری رات کو دن کس طرح کہوں
جب ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی پھرے حیات
جام و سبو میں غرق کروں کیسے کائنات
کانٹے بچھے ہیں راہِ محبت میں دُور تک
غم کے اثر سے زہر ہے موجِ سرور تک

کیسی رُکی رُکی سی ہے اس زندگی کی رَو
کتنی بجھی بجھی سی ہے شمعِ طرب کی لَو؟
اللہ رے زندگی کا نظر آفریں جہاد
جام و سبو کو دیکھ کے آتا ہے خون یاد
کیسے میں یہ کہوں کہ نہیں جانتا ہے تو
ارزاں تری شراب سے انسان کا ہے لہو
تیری نظر تو ناقدِ رازِ حیات ہے
تیرے مشاہدے میں تو ایک ایک بات ہے
انساں کے غم میں خون جلایا کیا ہے تو
بہتر جو راہ ہے وہ دکھایا کیا ہے تو
رستہ بدل کے عیش کی منزل پہ جانا اب
سنگین حقیقتوں کو فسانے بنانا اب
ہے ابرِ تیرا سایہ فگن کائنات پر
لہرا رہا ہے موت کا پرچم حیات پر
میں دیکھتا ہوں خون میں لتھڑی جوانیاں
سنتا ہوں روز درد میں ڈوبی کہانیاں
کتنے دلوں میں حسرتِ فردا بنی ہے داغ
اکثر اندھیری رات میں گُل ہو گئے چراغ
سونے کے زرد زرد خداؤں کا راج ہے
محنت کشوں کے فَرق پہ کانٹوں کا تاج ہے
آندھی کی زَد پہ آج تمدّن کا ہے چراغ
لوٹ رہا ہے سینۂ انسانیت کا داغ
جھلسی ہوئی ہے نکہتِ گُل، گرم ہے ہَوا
دَم گھٹ رہا ہے، ذہن کی مسموم ہے فضا
ہے عقل و دل پہ سایۂ افکار کیا کہوں
یاد آ رہے ہیں تیرے ہی اشعار کیا کہوں

"بیگانۂ حقیقتِ انفاس ہوشیار!
ہر سانس ایک عالمِ صد انقلاب ہے
ہر جنبشِ نگاہ ہے اک انقطاعِ فصل
ہر لمحہ ایک منزلِ روزِ حساب ہے
جی بھر کے بزمِ عیش میں ارماں نکالنا

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

ضیا فتح آبادی

توبہ ناکردہ گناہوں سے کئے جاتا ہوں میں
دامنوں کے چاک اشکوں سے سئے جاتا ہوں میں،

تا دمِ آخر، بہ فیضِ گردشِ شام و سحر
جامِ زہرابِ غمِ دوراں پئے جاتا ہوں میں

کون سورج سے ملائے آنکھ توڑے شب کا دل
روشنی دینے لگے بجھتے دیئے جاتا ہوں میں

تلخیاں، تنہائیاں، مایوسیاں، محرومیاں
بے مزہ ہے زندگی، پھر بھی جئے جاتا ہوں میں

چشمِ آئینہ مجھے اچھی طرح پہچان لے
اک نہ اک دن واپس آنے کے لئے جاتا ہوں میں

تیرے پاس آکر ہزاروں رنگ کے صدمے سہے
دور تجھ سے، وقت کے بہروپئے جاتا ہوں میں

خانہ ویرانی کا عالم ہیئتِ آوارگی
ہو کوئی تو کھولے در، دستک دیئے جاتا ہوں میں

اتنا بکھرا، اتنا ٹوٹا، دلِ طلسمِ زیست میں
نغمہ خواں آیا تھا، گاتا مرثیئے جاتا ہوں میں

ہر قدم پر سجدہ کرتا تا درِ ساقی ضیا
جانے کیا کیا دل میں امیدیں لئے جاتا ہوں میں

ضیا فتح آبادی

ناآگہی کے ہاتھ میں کب تک عنانِ وقت
کیا سرنگندہ بیٹھے ہیں دانشورانِ وقت

کن منزلوں میں گم ہے ابھی کاروانِ وقت
ہیں پتھروں کی راہ میں شیشہ گرانِ وقت

میری نوائے غم کی جہاں تک ہے دسترس
صحرا میں گونجتی ہے وہاں تک اذانِ وقت

طولِ شبِ فراق سے آگے ہے دو قدم
بازیچۂ حیات میں کارِ جہانِ وقت

آگے نکل گیا تو نہ پھر ہاتھ آئے گا
اپنے قدم سنبھل کے رکھیں ہمرہانِ وقت

کیا پاؤں حادثات کے پتھراؤ سے نجات
ہر سمت ہے محیط زمین آسمانِ وقت

ہے انتظار میں کسی فرہاد کے ہنوز،
اک ضربِ تیشہ کے لئے کوہِ گرانِ وقت

چیرا جو اُس کا دل تو کھلا راز یہ کہ ہے
ہر ذرہ رہگذار کا اک کہکشانِ وقت

یہ نظمِ بزمِ زیست بھی ہے اے ضیا عجیب
ہیں اختیارِ وقت میں ناقدردانِ وقت

حسین الحق

عکس عکس

میں شیشے کے مکان میں قید ہوں اور سہسرام سے آیا ہوا خط بار بار میری نظروں کے سامنے جلتا ہے..... بجھتا ہے..... جلتا ہے..... بجھتا ہے..... شیشوں پہ اُجالوں اور اندھیروں کے عکس ہیولے سائے اُبھرتے ہیں ڈوبتے ہیں، بہر چہار جانب آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں اور ایک سحر زدہ فضاؤں میں گھرے ہوئے پل کٹ رہے ہیں۔

باہر دُھند دُھند تک بارش بکھری ہوئی ہے، درختوں پر، درختوں کے پتوں پر اور شاخوں پر اور بارش کی دُھند میں کھوئے ہوئے مکانات پر اور شاہراہوں پر اور راستوں کے دونوں طرف ایستادہ بجلی کے کھمبوں پر، سائے میں بارش کے قطرے چمک رہے ہیں اور دُھند میں آہستہ آہستہ سب کچھ کھوتا جا رہا ہے۔

میرے اندر بھی صدیوں سے دُھند چھائی ہوئی ہے، آج تک کچھ بھی واضح نہ ہو پایا، کوئی چہرہ، کوئی شبیہ، کوئی نقش یا سب.... کچھ روشن، کچھ مدھم، اور میں اس بھری پُری کائنات کا ایک حصہ بن کر بھی کچھ اس سے الگ، کچھ اس سے متصل۔ آشو پوچھتے ہیں "کائنات، تمہیں رہ رہ کے کیا ہو جاتا ہے؟"

میں کیا جواب دوں کہ میرے من میں تو چوبیس گھنٹے اندھیرا رہتا ہے اور اس اندھیرے میں میں پُرسکون رہتی ہوں، سب کچھ غائب، نامعلوم، مگر چند لمحے، چند جان لیوا لمحے ایسے بھی نکل آتے ہیں جب من میں کچھ ستارے جھلملانے لگتے ہیں، کچھ سائے، کچھ شبیہیں، ایسا کچھ جو جانا بوجھا بھی ہو اور انجانا بھی اور تب اُن لمحوں میں آشو مجھ سے پوچھتے ہیں "کائنات تمہیں رہ رہ کے کیا ہو جاتا ہے؟"

میں انہیں کیا بتاؤں کہ ان کیفیتوں سے تو میں خود بھی واقف نہیں، بے نام احساس، انجانی کیفیت، قاتل لمحے، میں بھی چاہتی ہوں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے، یہ کچھ بھی نہ رہے، بیاہ کر آیا ہوا شیش محل، سدا بہار بیڈ روم، یہ ریڈیوگرام، یہ آرام دہ پلنگ، یہ سب کچھ فضا میں یوں اُڑ جائے جیسے روئی کے گالے اور ان کی جگہ.... ان کی جگہ میں کیا چاہتی ہوں... مجھے کیا چاہنا چاہیے؟ مجھے نہیں معلوم، میں تو جیسے اک سحر کی اسیر ہوں... بلّوریں... شیش محل میں... اندھیرے اُجالے کے اس چکر میں میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟ یہی نا کہ میں سوچتی ہوں، سوچنے پر مجبور ہوں، میں دیکھتی ہوں، دیکھنے پر مجبور ہوں، میں محسوس کرتی ہوں، محسوس کرنے پر مجبور ہوں.... اس مجبوری کا کیا علاج ہے؟ شاید کچھ بھی نہیں، شاید بہت کچھ، صحیح کیا ہے اور غلط کیا، مجھے نہیں معلوم۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں اس وقت بھی سب کچھ محسوس کر رہی ہوں، باہر دُھند میں کھوئے ہوئے مناظر، کمرے میں کھیلتی ہوئی میری اکلوتی بیٹی، تیزی کے ساتھ گھومتا ہوا پنکھا، بجتا ہوا ریڈیو، الماری میں رکھے ہوئے خوبصورت کھلونے، عید اور میری بیٹی کی سالگرہ پر آئے ہوئے GREETINGS سب کچھ دیکھ رہی ہوں، سب کچھ محسوس کر رہی ہوں، پھر بھی ایسا احساس ہو رہا ہے جیسے یہ سب کچھ میرے لئے نہیں، جو ان سب کے لئے نہیں، میرے لئے وہ ہے جسے آج.... ابھی ابھی میں نے پہچانا ہے

تم کہاں تھے دوست؟ جاڑے اور برسات کی شدید اندھیری، سرد اور بلائی راتوں میں ڈر ڈر کر میں آشو سے لپٹ لپٹ کر سوئی، لیکن تم نے اُس وقت بھی مجھ سے نہیں کہا۔ "کائنات میں یہاں ہوں!"

اور میں یہی سمجھتی رہی کہ مجھ پر آسیب کا سایہ ہے۔ آشو کہتے "تمہیں وہم ہو گیا ہے کائنات!" میں نے آشو کی بات کی آج تک تردید نہیں کی، اس لئے خاموش رہتی تھی، مگر میں اسے وہم کیسے سمجھ لیتی، میں نے تو یہ سب کچھ شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا، میں اُس کے لمس سے واقف ہوں۔ میں لاکھوں کروڑوں میں اُن دو آنکھوں کو پہچان سکتی ہوں، میں یہ کیسے کہہ دیتی کہ "یہ تیرا وہم ہے کائنات" اِن اُجاڑ اور بے رونق دنوں سے پہلے کبھی بھی ایسا

ہوا تھا تقدیر کو کیا لیتی۔ مگر شادی سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، شادی کے بعد بھی سالوں تک میں اپنے دوستوں، داروں میں بکھری رہی، ہر لمحہ ایک نیا ہنگامہ، تمام دن شادمانیاں اور شب کی خوشیوں میں آشو سا پیار، میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ سچ ہونا تھا وہ ہوا کہ جب اس دوردراز مقام پر آشو کا ٹرانسفر ہوا اور آشو کے جانے کے بعد دن بھر مجھے تن تنہا رہنا پڑا تو ایک دن مجھے ایسا احساس ہوا کہ میرے بغل میں کوئی آکر بیٹھ گیا ہے، میں گھبرا کر چیخ اٹھی.. جلدی سے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔"

"کون ہو تم؟ کون ہو تم؟" میں چیخ اٹھی، لیکن جواب میں بس خموشی اور میری طرف تکتی دو آنکھیں... خموش... ساکت.... سپاٹ آنکھیں..."

"آپا!" میں نے چیخ کر آپا کو پکارا، اور وہ دوڑی دوڑی آئی لیکن میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی۔

"بی بی جی۔ آپ کو وہم ہوتا ہے کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

لیکن میں تو دیکھ رہی تھی کہ وہ اب بھی کھڑا ہے، میں نے گھبرا کر آشو کے نمبر ڈائل کئے۔

"ہیلو ہیلو... آشو تم آجاؤ.... تم آجاؤ آشو۔"

"ہیلو کائنات کیا بات ہے —؟ کیوں گھبرا رہی ہو؟ طبیعت خراب ہے کیا؟"

"نہیں آشو، طبیعت ٹھیک ہے... پر تم آجاؤ آشو!"

"لیکن کیوں کائنات؟ شادی ٹھیک ہے نا؟ بات کیا ہے؟"

"ہاں آشو سب ٹھیک ہے، پر تم آجاؤ!"

"پاگل ہوئی ہو.... ابھی مجھے فوراً سائٹ پر جانا ہے۔"

"نہیں آشو! تم آجاؤ.... پلیز آجاؤ!"

"پگلی کہیں کی... میں ایک گھنٹہ میں آرہا ہوں۔" اور آشو نے فون رکھ دیا۔

"ہیلو ہیلو.... آشو.... ہیلو ہیلو۔" میں چیختی رہ گئی لیکن لائن کٹ چکی تھی۔

میں نے پھر نمبر ڈائل کئے لیکن معلوم ہوا کہ آشو سائٹ پر جا چکے ہیں اور وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے اپنی ساری طاقت یکجا کی اور بغل میں پڑی ہوئی لاٹھی اس پر چلائی لیکن لاٹھی اس پر سے گذرتی ہوئی یوں فضا میں لہرا گئی جیسے دھوئیں یا سائے پر گذری ہو۔

وہ یونہی خموش ساکت کھڑا رہا... بس میری طرف تکتی دو آنکھیں.... ساکت .... سپاٹ آنکھیں۔

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا، میں کسی نہ کسی طرح اپنے بستر پر گئی اور شدید گرمی کے باوجود سر سے پیر تک چادر تان کر اپنی دانست میں اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر وہ اسی طرح خموش کھڑا رہا اور میں لرزتی رہی اور جب آشو آئے تو میں بے ہوش پڑی تھی۔ آپا نے بتایا کہ میں دیر تک بے ہوش رہی، ہوش آیا تو آشو میرے پاس تھے اور کوئی بھی نہیں تھا، اس روز آشو رات بھر میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوسرے دن میں نے ضد کر کے آشو سے دو دن کی چھٹی کی درخواست دلا دی۔ ان دو دن میں میری طبیعت بھی ٹھیک ہو گئی اور آشو نے بھی مجھے خوب خوب INTERTAIN کیا اور میں نے بھی یہی سمجھا کہ وہ یونہی میرے دماغ کا ایک خلجان تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی، میں بھول چکی کہ کوئی تھا جو دو دن پہلے میرے بغل میں آکر بیٹھ گیا تھا مگر نظر نہ آیا تھا، پھر کئی دن گذر گئے، کچھ بھی نہ ہوا، زندگی پھر پرانے انداز سے بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔

آشو آفس جا چکے تھے، ان کا کھانا نوکر لے کر جا چکا تھا، میں قطعی بے کار تھی، اس لئے الماری سے البم نکالا اور یوں گھر اور بچپن کی یادوں میں گم تھی کہ اچانک احساس ہوا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے.... نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑا تھا... خموش... ساکت .... بس میری طرف نگراں دو آنکھیں...." ساکت .... سپاٹ آنکھیں....

میں بہت ڈر گئی، جلدی جلدی کسی طرح سے البم الماری میں رکھا اور شاذی کو لئے ہوئے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ جہاں آپا اپنے باقی کام نپٹ رہی تھی اور میں آشو کے لئے شام کا ناشتہ تیار کرنے لگی، میں نے آپا سے بے سر و پا باتیں شروع کر دیں، ایسی باتیں جن سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

اور چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ میں پھر اکیلی ہوں۔

آہستہ آہستہ یہ اس کا معمول بن گیا، ہر خالی، اکیلے اور اداس لمحے میں وہ آکر کھڑا ہو جاتا اور پھر جب میں کسی کام یا کسی بات

میں مصروف ہو جاتی تو وہ چلا جاتا۔

ایک دفعہ زوردار بارش ہو رہی تھی، میں ورانڈے میں کرسی بچھائے بیٹھی تھی، وہیں پر میری بیٹی اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی کہ وہ قدرے بارش میں بھیگتا ہوا آتا نظر آیا، میں دوڑتی ہوئی آیا سے ایک پیالی گرم گرم چائے کے لئے کہہ کر اندر گئی کہ اُسے تولیہ لاکر دوں مگر الگنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سامنے ہی آشو کا اُدھ سِلا کرتا نظر آیا اور میں کمرے ہی میں مشین کھول کر کرتا سینے لگی۔ کچھ دیر بعد آیا چائے لے کر آئی تو اُس کا خیال آیا۔ جی چاہا کہ باہر جاکر دیکھوں، مگر میں اپنی نظریں جھکائے کرتا سیتی رہی، اور جب آیا چائے کی پیالی رکھ کر واپس چلی گئی تو آہستہ سے چائے کو کھڑکی سے نیچے گرا دیا۔

تو یہ سب کچھ اِدھر چند دنوں سے چل رہا ہے اور جب سے یہ سب کچھ چل رہا ہے، تب سے میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ کبھی یہ ساری کائنات بہت پیاری لگنے لگتی ہے اور کبھی یہ سارا کھڑاگ فینٹسی کے علاوہ کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔

ایک مرتبہ آشو سے کہا بھی کہ کوئی ہے جو میرے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن نظر نہیں آتا۔"

تو آشو ہنس کر کہنے لگے: "اتنا پڑھ لکھ کر بھی ایسی وہمی ہو تم کائنات۔"

میں انہیں کیا بتاتی کہ یہ سب کچھ تو مجھ پہ گزرا ہے... کبھی شدید گرمیوں میں، چلچلاتی ہوئی دھوپ میں وہ پسینے پسینے آیا اور کچھ دیر مجھے دیکھ کر چلا گیا... کبھی کٹکٹاتی ہوئی سردیوں میں ایک پرانا کوٹ پہنے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا آیا، کچھ دیر رہا پھر واپس ہو گیا... کبھی ایسا ہوا کہ شام زینے زینے اُتر رہی ہے، میں زینے زینے اُترتی ہوئی اس شام کو دیکھنے میں محو ہوں کہ وہ چپکے سے آکر بغل میں کھڑا ہو گیا ہے.... اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ بہت دن گزر جانے پر بھی وہ نہیں آتا تو میں جیسے اُس کا انتظار کرنے لگتی ہوں اور جی چاہتا کہ وہ آئے تو اُس سے پوچھوں کہ "کیوں جی، اتنے دن کہاں تھے؟"

اور کبھی کبھی خوف بھی آتا کہ کون ہے جو مجھ میں بھی نہیں، مجھ سے بھی نہیں، مگر بھی مجھ سے الگ نہیں... "

کیسا عجیب ہے یہ سب کچھ.... کتنی پُر اسرار ہے یہ کائنات.... کس قدر بے معنی اور بے مطلب ہے یہ زندگی... یہ زندگی جو میں جی رہی ہوں اس کا حاصل کیا ہے؟ یہ جو کچھ حاصل ہوا... آشو، اور میری بیٹی شاذی، اور یہ دولت، آرام و آسائش، نت نئی پارٹیاں، تقریبات یہ رنگ برنگی دنیا... ان سب کا حاصل کیا ہے؟

اب تو کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ گیروا لباس پہن کر گھر گھر صدا لگاؤں... یہ دنیا رین بسیرا بابا... یہ دنیا رین بسیرا! لیکن یہی سب کچھ جو میں سوچتی ہوں اگر لوگوں سے کہوں تو لوگ یہی کہیں گے: "تو پاگل ہو گئی ہے کائنات!" اور میں سوچتی ہوں کہ اب میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی ایسی دُبدھا اور کشمکش میں کوئی جی بھی کیسے سکتا ہے؟ من میں کچھ... باہر کچھ... اور مَن میں بھی جو کچھ ہے وہ جانا پہچانا نہیں.... دھندلا دھندلا.... سایہ سایہ! اور ابھی ابھی جو کچھ جانا بوجھا بنا ہے یہ کیسا دُکھ دائی ہے کہ ... "کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ کوئی۔" میں دریچوں کے شیشوں سے اپنا چہرہ ٹکا دیتی ہوں.... میری آنکھ سے پانی کی ایک لکیر شیشوں کو نم کر رہی ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ پانی کی اس ایک لکیر میں میرا پورا وجود ہچکولے کھا رہا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر سہسرام سے آیا ہوا خط پڑھتی ہوں۔

"وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔"

میں بار بار اس جملے کو دُہرا رہی ہوں۔ وقار تمہیں بہت بہت یاد کرتا ہے... وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے... وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔

میں بار بار یہ جملہ دُہرا رہی ہوں اور بار بار یہ کوشش کر رہی ہوں کہ اس خیال کو جھٹک کر کنارے پھینک دوں۔

آخر وقار کے یاد کرنے سے اور میری اس پریشانی سے کیا تعلق۔ ایسے کتنے وقار دنیا بھر میں کتنی کائناتوں کو یاد کرتے رہتے ہوں گے۔ تو اس سے دنیا بھر کی ساری کائناتوں پر آسیب کا سایہ تو نہیں ہو جاتا، اور پھر میری یہ دوست بھی عجیب لڑکی ہے، اُس پاگل لڑکے کا ذکر کوئی اتنا ضروری تو نہیں تھا کہ ہماری آپس کی گفتگو میں بھی وہ موضوع بنے.... اور آشو بھی خوب ہیں، خط پڑھ کر کہنے لگے: "بھئی یہ وقار تمہیں اب تک بھولا نہیں ہے، اُسے کبھی کبھی خطوط کیوں نہیں لکھ دیا کرتی ہو؟"

"ہُشش.... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا

اور آشو ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میری دوست کی تحریر پھر چمکنے لگتی ہے
"وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے"
میں پھر سرگوشیوں میں کہتی ہوں... وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے.....
وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اور میں ایک بار پھر بند دریچوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی ہوں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے، اور اندر میں ہوں اور میری چپ ہے اور اس کے کھلونے ہیں اور میرے ارد گرد کی دنیا ہے، اور چھت میں لٹکتا، گھومتا، چکر لگاتا ہوا پنکھا ہے۔ پنکھا اپنی پوری رفتار سے گھوم رہا ہے لیکن کمرے کے اندر گھٹن بڑھتی جا رہی ہے... چاروں طرف حبس... فضا زنداں کی... میری سانس رک رہی ہے، کچھ عجب سا محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی فوراً یہ سب کچھ رک جائے گا... ختم جائے گا!
اور ایسی ہی ایک حبس زدہ شام میں میں نے وقار سے پوچھا تھا، .. یوں ہی مذاقاً پوچھا تھا —
"تمہیں کون سی لڑکی پسند ہے وقار؟"
اور وہ مجھے بہت دیر تک دیکھتا رہا .. خموش .... ساکت پھر آہستہ سے پوچھا
"خفا تو نہیں ہو جائے گا کائنات؟"
میں کچھ نہیں پائی۔ "بھلا میں خفا کیوں ہونے لگی؟" میں نے ہنس کر کہا
"نہیں آپ وعدہ کیجئے کہ آپ خفا نہیں ہوں گی۔"
"چلو بھئی وعدہ رہا۔"
اور تب وہ دوڑتا ہوا گیا اور کمرے سے آئینہ اٹھا کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔
مجھے اس بدتمیزی پر سخت غصہ آیا اور میں نے آئینہ اٹھا کر پھینک دیا اور اُسے سخت وسست کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ بہت دنوں تک میرے یہاں نہیں آیا۔
میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، نہ میرے پاس اس قسم کی فضول اور واہیات باتوں کے لئے وقت تھا اور نہ خود وقار اس قابل تھا کہ اس کے سلسلے میں اس قسم کی کوئی بات سوچی جا سکے۔
پھر کچھ دنوں بعد میرے یہاں ایک تقریب میں سب لوگوں کے ساتھ وہ بھی آیا... خموش خموش... گم سم... میں نے جب بھی دیکھا تو اُسے اپنی طرف دیکھتا پایا... پھر اس کے بعد جب بھی وہ آتا، یا جہاں بھی وہ نظر آتا، میں نے ہمیشہ اُسے چپ چپ پایا... کبھی اُس نے مجھ سے پھر کچھ بھی نہیں کہا۔ بس اپنی طرف نگراں — خموش آنکھیں... جیسے ان آنکھوں کے سہارے میرے پورے وجود کو وہ اپنے اندر جذب کرنے لگا.... مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا... میں نے اپنی دوستوں کو بھی یہ سب کچھ بتایا اور شادی کے بعد آشو کو بھی یہ سب کچھ سنایا تو وہ بھی بہت ہنسے۔
میں ایک بار پھر اپنے ذہن کو ان واہیات خیال سے آزاد کرانے کے لئے سر کو جھٹکتی ہوں.... ابھی ابھی آشو آئیں گے اور ان کے ساتھ مجھے جانا ہے۔ شہر کے مشہور ماہر نفسیات کے یہاں، آشو کا خیال ہے کہ یہ ایک وہم ہے اور اس وہم کا علاج دوا یا دعا سے نہیں بلکہ نفسیاتی تجزیے ہی سے ممکن ہے۔
میں پھر شیشوں سے باہر دیکھتی ہوں، باہر بارش بہت تیز ہو گئی ہے، سب کچھ پانی میں تر بتر ہو رہا ہے، میں شیشوں سے گال چپکائے باہر کی طرف دیکھ رہی ہوں.... مسلسل دیکھے جا رہی ہوں.... بلا وجہ، بلا مقصد... کیوں؟ شاید مجھے کسی چیز کی تلاش ہے... کس چیز کی؟ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں... بس میں دیکھے جا رہی ہوں... مسلسل دیکھے جا رہی ہوں .... اور تب اس دھندلے، بارش کی مسلسل، تیز اور گہری شبیہ کے درمیان سے ایک اور شبیہ ابھرتی ہے۔
وہ چلا آ رہا ہے۔ بارش میں بھیگتا ہوا... سر سے پیر تک بارش میں تر بتر ہو رہا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے، جیسے کوسوں کا سفر طے کر کے آ رہا ہو۔ لیکن اُس کے دوڑنے کا انداز وہی پہلے جیسا ہے.... وہ دوڑ رہا ہے سڑک پر.... اور دیکھ رہا ہے میری طرف... خموش.. سپاٹ.... بےزبان آنکھیں — جیسے ان آنکھوں کو گونگا کر دیا گیا ہو... اور میں چونک کر اٹھتی ہوں... میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں... کچھ سائے... کچھ شبیہیں... کچھ رنگ... ایک کے بعد ایک.... ایک کے بعد.. ظلم... ایک کے بعد ایک ظلم... تیزی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سے گزرتی چلی جا رہی ہیں، میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو پہلا آئینہ کے سامنے سے ہٹ جاتے ہو، نے خدا کی تحریر چمکنے لگتی ہے....

"وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔"
میں سرگوشیوں میں کہتی ہوں: "وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے..... وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے ..... وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے..... وقار ..... وقار"!

تب اچانک مجھے بہت ساری شامیں، صبحیں، اور دوپہریں یاد آجاتی ہیں.... ایک اُداس خوش شکل چہرہ.... بولتی بولتی آنکھیں — میری جانب نگراں آنکھیں.... جیسے آنکھوں کے سہارے ہی وقار مجھے اپنے اندر جذب کرلینا چاہتا ہو.... اور سڑک پر دوڑتا ہوا اور میری طرف دیکھتا ہوا یہ شخص جو اب دروازے تک پہنچ چکا ہے۔ وقار... اور یہ..... وقار اور یہ... وقار اور یہ۔"
اور تب میں بے ساختہ دوڑتی ہوں اور آج پہلی مرتبہ دروازہ کھول دیتی ہوں.... وہ اندر آجاتا ہے.... میں آہستہ سے اپنی دوست کا خط چاک کرکے دریچے سے باہر پھینک دیتی ہوں کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی — اور تب اسی لمحہ آشو دروازے پر دستک دیتے ہیں۔

"آپا دروازہ کھول دو۔" میں کمرے میں سے آپا کو پکار کر کہتی ہوں اور خود سوچتی ہوں کہ آشو آئیں گے تو اُن سے کہوں گی کہ "میں کسی ماہرِ نفسیات کے یہاں نہیں جاؤں گی۔
اور آشو اب کمرے میں آگئے ہیں، مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے جیسے کمرے میں نہ میں ہوں، نہ آشو ہیں، یا پھر کمرے میں اک بھیڑ جمع ہے، اس چھوٹے سے کمرے میں شاید ڈھیر سارے لوگ چلے آئے ہیں.... باہر بارش بہت تیز ہوگئی ہے، ہواؤں کا زور اور بھی بڑھ گیا ہے، دریچوں کے شیشوں سے ہوائیں ٹکرا ٹکرا کر بار بار آواز پیدا کر رہی ہیں۔ شاید وہ اندر آنا چاہتی ہیں، لیکن ناکامی اُن کا مقدر ہے۔
اور اندر میں ہوں، اور آشو ہیں، اور کوئی نہیں ہے، اور بہت بھیڑ ہے.. اتنی گھٹن... اتنا حبس.... ایسا لگتا ہے جیسے آج سب کچھ رک جائے گا... تھم جائے گا!!
اور میں سوچتی ہوں کہ اس شام اور اُس شام میں فرق ہی کیا ہے! اور اب مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا ہے..... میں آشو کے شانے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگتی ہوں۔

"آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جایا کیجئے آشو.... مجھے بہت ڈر لگتا ہے.... بہت ڈر لگتا ہے۔"
اور جب آشو مجھے اپنے قریب کرکے میری پیٹھ تھپتھپانے لگے اور مجھے سمجھانے لگے تو میرا جی چاہا کہ میں آشو سے کہوں —
"آشو آپ باہر چلے جائیے، بارش بہت تیز ہے، وہ بارش میں بھیگ رہا ہوگا —!!" ▲

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر شدہ)

بقیہ صفحہ ۲۷ - احتشام حسین کی تین نظمیں

اُدھڑا سا اک خیال پریشاں سا خواب ہے

(وجہ شعر)

تو نے یہ کہہ کے آگ لگائی ہے بارہا
تیری صدا دماغ پہ چھائی ہے بارہا
ذوقِ عمل کو یوں ہی ابھارا کیا ہے تو
تصویرِ آرزو کی سنوارا کیا ہے تو
پردہ نگاہِ شوق پہ اب ڈالتا ہے کیا
جب تُو نے خود حیات سے پردہ اٹھا دیا
بزمِ طرب میں ساتھ ترے کیسے ہوں ہم
جب زندگی کے بوجھ سے اُٹھتے نہیں قدم
دل چاہتا ہے صاحبِ فکر و نظر ہوں میں
بڑھ کر جہادِ زیست میں سینہ سپر ہوں میں
مانا بدل سکوں گا نہ میں نظمِ کائنات
ممکن ہے ساتھ ہی نہ مرا دے مری حیات
ممکن ہے ڈوب جائے ستارہ امید کا
فتح و ظفر کی آئے نہ میری طرف ہوا
منزل پہ جا سکوں گا نہ میں اس کا غم نہیں
لیکن عمل کی راہ پہ چلنا بھی کم نہیں
مرتا ہوں راہِ زیست پہ چلنے ہی دے مجھے
علم و عمل کی آگ میں جلنے ہی دے مجھے
تُو بے خبر ہے اس سے تو اے دوست حیف ہے!
میرے غرورِ تشنہ لبی میں بھی کیف ہے! ▲

عقیل شاداب

جشن

یہ مرے شہر، مرے ملک کے رہنے والے
کتنا مہمان نوازی کا سلیقہ ہے انہیں
آج پھر جشن ہے گھر گھر سے دھواں اٹھتا ہے
آگ روشن ہے گلی کوچوں میں بازاروں میں
شہر کی مانگ میں سیندور ہے تازہ تازہ
شور ہے سڑکوں پہ اور دھوم ہے بازاروں میں
گدھوں کے قافلے پھر آئے ہیں مہمان بن کر
خود کو تہذیب کا رکھوالا یہ کہنے والے
کتنا مہمان نوازی کا سلیقہ ہے انہیں
یہ مرے شہر مرے ملک کے رہنے والے!

عقیل شاداب

میرا دشمن

جتنے وار کئے تھے میں نے اپنے جانی دشمن پر
گھاؤ نہ جانے کیوں اتنے ہی میرے دل نے کھائے تھے
میں نے جتنے کانٹے بوئے تھے غیروں کی راہوں میں
خارزار اتنے ہی میرے رستے میں اگ آئے تھے
نام پہ ملک و مذہب کے میں نے جتنی نفرت کی تھی
اس سے زیادہ میری روح پہ بوجھ بڑھا تھا نفرت کا
جتنی بے رحمی سے میں نے مجبوروں کو لوٹا تھا
کال پڑا تھا جانے کیوں اتنا ہی مجھ پر شدت کا
جتنا خون بہایا میں نے اپنے تحفظ کی خاطر
زندہ رہنا اتنا ہی مجھ پر پل پل دشوار ہوا!
ظلم اور جبر سے جتنی بھی طاقت حاصل کرنی چاہی
اتنے ہی خطرات بڑھے، میں اتنا ہی لاچار ہوا
میں نے بیکاروں کے ہاتھوں سے جتنی روٹی چھینی
اتنی ہی شدت سے میں خود جنم جنم کا بھوکا تھا
جتنا میں نے اپنے حریفوں کو ننگا کرنا چاہا
اتنا ہی میں دنیا والوں کی نظروں میں ننگا تھا
شاید میرا نفس ہی میری بربادی کا باعث تھا
کوئی اور نہیں تھا [illegible] اپنا دشمن تھا

طنزیہ

پرویز یداللہ مہدی

پاسپورٹ کا چکّر

جب چوتھی جگہ بھی پانچ مختلف ذرائع سے بات چلانے کے باوجود محض پاسپورٹ کی وجہ سے ہمارا رشتہ طئے نہ ہو سکا تو ہیں پاسپورٹ کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اور ہم اپنی سوتیلی خالہ کے سوتیلے سمدھی کی اس بات پر آنکھ، بلکہ ناک کان سب کچھ موند کر ایمان لے آئے کہ واقعی پاسپورٹ کے بغیر آج کسی بھی ڈگری یافتہ نوجوان کو جینے کا حق نہیں۔ اور بدقسمتی سے ہم ڈگری یافتہ بھی ہیں اور پچھلے چار سال سے مسلسل بے کار بھی، اس لئے ہر ڈگری یافتہ کی طرح حواس باختہ ہیں۔ سچ ہے جن نوجوانوں کا مستقبل زلفِ جاناں اور رُخِ لیلیٰ کی طرح تاریک ہوتا ہے انھیں وقتی طور پر خوش کرنے کے لئے ہماری یونیورسٹیاں، ڈگریاں عطا کرتی ہیں، جن کا مول کاغذ کے ایک حقیر پُرزے سے زیادہ نہیں ہوتا ــــ کہتے ہیں گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے، لیکن یہ ڈگریاں تو دال برابر بھی نہیں ہوتیں۔ جس طرح گھر کی مُرغی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے اُسے گھر سے باہر کسی مارکیٹ یعنی "چوک مُرغاں" میں لایا جاتا ہے، اُسی طرح ان ڈگریوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے آج کا ہر ڈگری یافتہ نوجوان ملک سے باہر جانے پر اُتاولا نظر آتا ہے، لیکن اس کے لئے پاسپورٹ شرطِ اوّل ہے ــــ!

پاسپورٹ دراصل اپنے آپ کو قانونی طور پر ایک ملک سے دوسرے ملک میں "امپورٹ ایکسپورٹ" کرنے کا اجازت نامہ ہے، البتہ بعض اصحاب اس قدر باہمّت ہوتے ہیں کہ بغیر پاسپورٹ کے اپنے آپ کو اِدھر سے اُدھر امپورٹ ایکسپورٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طریقۂ کار کو "اسمگلنگ" کہتے ہیں۔ ایسے اصحاب کے متعلق پڑھا لکھا طبقہ اچھی رائے نہیں رکھتا۔ اور ایسے طبقہ کو اپنے ملازم کرنے کے لئے پاسپورٹ [illegible] ہے لیکن آج کے پُر آشوب دور میں پاسپورٹ بنوانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے، بلکہ ڈیری فارموں کی برکات نے تو جوئے شیر لانا نسبتاً آسان کر دیا ہے لیکن پاسپورٹ حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے شیر کے مُنہ سے نوالہ چھیننا۔ جو اصحاب اس ناقابلِ تسخیر مُہم پر جا کر ناکام لوٹ چکے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ یہ تو ایک آگ کا دریا ہے اور اس میں ڈوب کے جانا پڑتا ہے، چنانچہ بیشتر بدنصیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاتے ہیں اور جو خوش نصیب زندہ لوٹ آتے ہیں وہ مرزا غالب کی زبان میں فرماتے ہیں ؎

بس کہ مشکل ہے اِسی کام کا آساں ہونا

ایک صاحب کی بدنصیبی ملاحظہ فرمایئے، کمند اُس وقت ٹوٹ گئی دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا۔ یعنی پاسپورٹ تو بن چکا تھا، لیکن صرف اِسی لئے اُن کے حوالے نہیں کیا گیا کہ پاسپورٹ والی صحت مند تصویر اور موصوف کی بگڑی ہوئی صُورت میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ اُن کی یہ دُرگت اُنہی چکّروں نے بنائی تھی جو پاسپورٹ کی پیروی کے سلسلے میں اُنھیں لگانے پڑے تھے ــــ اِس کے برعکس ایک صاحب کے بارے میں سُنا ہے کہ جس وقت پاسپورٹ بن کر اُن کے ہاتھوں میں پہنچا، وہ بسترِ مرگ پر پڑے اِس مصرع کی تفسیر بنے ہوئے تھے ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے

اور پھر رہا سہا دم بھی پاسپورٹ دیکھتے ہی مارے خوشی کے آنکھوں ہی کے راستہ نکل گیا ــــ گویا اُن کے حق میں وہ جہنم کا پاسپورٹ ثابت ہوا۔ اگر پاسپورٹ کی اجرائی کا مسئلہ اسی طرح غضب ڈھاتا رہا تو کیا عجب کہ آگے چل کر بچے کے پیدا ہوتے ہی پاسپورٹ کے لئے درخواست دینی پڑے گی تاکہ اُس کے جوان ہونے تک کم از کم پاسپورٹ مل جائے ــــ!

یہ تو غیر معروف کے تجربات و مشاہدات تھے۔ اب ذرا آپ بیتی ملاحظہ فرمایئے۔ جب چند گھر میں بچوں کی محض پاسپورٹ کی وجہ سے چلتے پھرتے کی بات، ہماری تو قدیم شادی کے مسئلے کو ملتوی کر کے، محض پیاس کے تقاضے بغیر ہی پاسپورٹ کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ بڑی محنت سے ایک عدد درخواست تیار کر کے پاسپورٹ کے دفتر پہنچے کہ منکہ مسمی فلاں ابن فلاں ابن فلاں کو جو پچھلے چار سال سے مسلسل بیمار ہے، ایک عدد بین الاقوامی پاسپورٹ درکار ہے ــــ متعلقہ کلرک نے ایک عدد فارم ہمارے حوالے کیا۔ جب ہم نے اُس کا بغور مطالعہ کیا تو یہ "گریٹ حاتم طائی کے عجیب و غریب سوالنامے" کا بھی چچا نکلا۔ وہ سوالنامہ تو صرف سات سوالات پر مشتمل تھا جبکہ اس فارم پر سوالوں کا ایک سلسلۂ لامتناہی تھا۔ اور چونکہ ہم حاتم طائی نہیں بلکہ منیر شاہی تھے، اس لئے کسی پاسپورٹ یافتہ حاتم طائی کی تلاش میں نکل پڑے اور پھر کئی جوڑ جوتے اور چپلوں سے پاؤں دھونے کے بعد ایک عدد ماڈرن حاتم طائی سے ملاقات ہوئی۔ جب انھیں ہماری پریشانیوں کا علم ہوا تو وہ اپنے آپ کو بجائے حاتم طائی کے فرعون و شداد تصور کرنے لگے ـــ اور کافی منتوں، خوشامدوں اور دعوتوں کے بعد اُن کا دل پسیجا۔ کسی نہ کسی طرح فارم کی خانہ پُری مکمل ہوئی۔ اب صرف کسی آئی۔ اے۔ ایس آفیسر کے دستخط کا مرحلہ باقی تھا جس کے بارے میں ماڈرن حاتم طائی صاحب نے فرمایا کہ یہ مُرغابی کے انڈے برابر موتی حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ جسے صرف منیر شاہی ہی کو حاصل کرنا ہے ـــــ چنانچہ کسی آئی۔ اے۔ ایس آفیسر کی تلاش میں اِس منیر شاہی کی کیا درگت بنی ملاحظہ فرمایئے ـــ ہم جو کبھی اِس قدر بھاری بھرکم اور گول مٹول تھے کہ محلّے بھر میں "گوشتے" کے نام سے مشہور تھے، اس بھاگ دوڑ کے طفیل "گوشتے" سے "سِینکیہ" اور پھر کباڑی کے کباب میں تبدیل ہوگئے۔ اور پھر اِس سے پہلے کہ یہ درگت "ہماری" "تُربت" بنا کر چھوڑتی ایک آئی۔ اے۔ ایس آفیسر کو ہمارے حالِ زار پر رحم آگیا، چنانچہ انھوں نے ہمیں پورے مہینہ بھر تک اپنے گھر سے دفتر، دفتر سے کلب اور کلب سے گھر تک کسی پتنگ کی طرح ڈور سے کھلوانے کے بعد ہماری مُراد پوری کی۔ ہم نے فوراً فارم داخلِ دفتر کیا اور اِس خوشی میں کے ہنڈ رسے

میں مبتلا رہے کہ بہت جلد ہمارے ہاتھ میں پاسپورٹ ہوگا اور پھر ہم کسی شپ یا جہاز میں بیٹھے "انگلینڈ بس" سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے امریکہ کی طرف پرواز کر رہے ہوں گے

لیکن ہفتہ بھر بعد بجائے پاسپورٹ کے ایک مراسلہ ہاتھ میں آیا تو ہم "بغیر پیراشوٹ" کے خیالِ [illegible] سے حقیقی فرش پر آ گرے ـــ اس مراسلے کے ذریعہ ہم سے ایک عدد صداقت نامہ طلب کیا گیا تھا جو ہمیں اُس میٹرنٹی ہاسپٹل سے حاصل کرنا تھا جہاں ہم تولد ہوئے تھے۔ یہ مسئلہ ہمارے لئے ٹیڑھی کھیر تھا کیونکہ ہم کسی ہسپتال میں نہیں بلکہ گھر میں پیدا ہوئے تھے، ایسی صورت میں صداقت نامہ کہاں سے لاتے اور بغیر اس کے ہمارے حالِ زار پر رحم فرما کر صداقت نامے کے بجائے اگر اُس دایا کو پیش کرنے کے لئے کہا جاتا جس کے ہاتھوں ہم تولد ہوئے تو ہم اُس دایا کو ڈھونڈنے کے بجائے اگر ہم بغیر پاسپورٹ ہی کے امریکہ یا لندن کی طرف رُخ کر کے پیدل ہی نکل کھڑے ہوتے تو ایک نہ ایک دن وہاں ضرور پہنچ جاتے مگر لیکن اُس دایا کو ڈھونڈنا ناممکن ہے، بلکہ ہماری جگہ میاں کولمبس جنھیں امریکہ دریافت کرنے کی پاداش میں زندگی میں جیل کی کال کوٹھڑی اور مرنے کے بعد تاریخی حیثیت حاصل ہوئی ہے، اُن کی روح بھی اگر عالمِ [illegible] واپس آکر اُس دایا کو ڈھونڈنے کی مہم پر نکل جائے تو ہو سکتا ہے وہ ایک عدد امریکہ اور دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں، لیکن اُس دایا کا سُراغ نہیں پا سکتے۔ کیونکہ گمان غالب ہے کہ وہ ہم جیسوں کی پیدائش کراتے کراتے خود ناپید ہو گئی ہوگی ـــ اسی نکتہ پر پہنچ کر ہم نے جھلا کر سوچا کہ ہم اب تک کیوں زندہ ہیں؟ ہمیں بھی اُس دایا کے ساتھ مر جانا چاہئے تھا ـــ لیکن بدقسمتی سے چونکہ زندہ ہیں، اس لئے اپنے زندہ رہنے کی پاداش میں کچھ نہ کچھ سزا بھگتنا ضروری ہے۔ بہرحال ہم جاگ کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کا حل تلاش کرتے رہے، اُدھر مرزا صاحب کے مرغ نے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے حسبِ معمول فجر کی بانگ دی، اِدھر ایک عدد حل نکل آیا ـــ دواخانے اور دایا کے جنجال سے بچنے کے [illegible] کہ دواخانہ جانے [illegible] سانپ بھی [illegible] تھی۔ لیکن

لگے تھے کہ ابھی یہ بھیانک خیال آیا کہ اگر بہ زندہ درگور والے کو پیش کرنے کا
حکم صادر فرمایا گیا تو ہم بےموت مارے جائیں گے — پہلے
جہاں سے چلے تھے پھر وہیں موجود، نہ سانپ مر رہا تھا نہ لاٹھی ہی ٹوٹ
رہی تھی، بلکہ سانپ بھی پھن کاڑھے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہا تھا
اور لاٹھی بھی ہمارے ہی سر پر اُٹھی ہوئی تھی —— ابھی
ہم اِس مسئلہ کا حل ڈھونڈ ہی نہیں پائے تھے کہ ایک اور مراسلہ
کسی 'دستی بم' کی طرح ہمارے ہاتھوں میں پہنچ کر پھٹا جس سے
کچھ دیر کے لئے ہمارے ہوش و حواس سب کچھ معطل ہو گئے —
اِس مراسلہ کے ذریعہ ہمارے والد صاحب کی تاریخِ پیدائش کے
تعلق سے ایک عدد صداقت نامہ طلب کیا گیا تھا۔ لیجئے ایک
نہ شد دو شُد، اپنی ہی تاریخِ پیدائش کے چکّر میں ہم تیزی سے
اپنی تاریخِ رحلت کے قریب ہوتے جا رہے تھے کہ اب والد صاحب
کی تاریخِ پیدائش کا صداقت نامہ کہاں سے لاتے۔ اگر یہ ہمارے
بس میں ہوتا تو نہ صرف والد صاحب اور دادا، پردادا بلکہ سارے
اجداد کا شجرۂ حسب و نسب حاصل کر کے اُن لوگوں کے مُنہ پر
دے مارتے، لیکن یہاں تو دادا سے اوپر ایک دم بلیک آؤٹ تھا
اور پھر دادا سے اُوپر سارے اجداد کے نام کون یاد رکھے۔ اِس
دَور میں کسے اتنی فرصت ہے، باپ ہی کا نام یاد رہ جائے تو
بہت غنیمت ہے۔ ہم نے پاسپورٹ آفس کے ارباب مجاز کو
مُنہ توڑ جواب دینے کے لئے والد صاحب اور دادا مرحوم دونوں
کے صداقت نامے بلدیہ سے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن
اِس سے پہلے کہ اِس پر عمل درآمد شروع کرتے، اِس نئے خیال نے
ہمیں چونکا دیا۔ ہم چونکہ دادا صاحب کے انتقال کے فوراً بعد
تولّد ہوئے تھے اِس لئے ہمارا نام اُنہی کے نام پر رکھا گیا تھا۔
ایسی صورت میں دادا صاحب کا صداقت نامہ پاسپورٹ آفس
میں داخل کرنا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف
تھا۔ یقیناً یہ کہہ کر ہماری درخواست منسوخ کر دی جاتی کہ فلاں
ابن فلاں کے ایک صداقت نامے پر تاریخِ پیدائش درج ہے
اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدیوں پہلے کی پیدائش ہیں، اِس
لئے اِس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اب تک زندہ نہ ہوں گے،

لہٰذا جب وہ زندہ ہی نہیں ہیں تو پھر پاسپورٹ کی یہ درخواست
کوئی معنی ہی نہیں رکھتی، اِس لئے منسوخ کی جاتی ہے —!
ہمیں تو اِس تصور ہی سے وحشت ہونے لگی اور اِس وحشت
سے ابھی چھٹکارا بھی نہیں ملا تھا کہ ایک اور مراسلہ موصول ہوا۔
اِس کے ذریعہ یہ وضاحت طلب کی گئی تھی کہ آیا ہم حیدرآباد دکن
میں پیدا ہوئے ہیں یا حیدرآباد سندھ میں۔ ہمارا جواب نافوری
تھا، ہم نے سوچا، ہم ایسے شہر میں پیدا ہی کیوں ہوئے جس کے
نام کا ایک اور شہر بھی روئے زمین پر موجود ہے
ویسے اِس بات کی وضاحت کوئی مشکل نہیں تھی، لیکن اِس کے
باوجود اس بات کی کیا گیارنٹی کہ پاسپورٹ ہمیں مل ہی جائے گا۔
ہو سکتا ہے اِس وضاحت کے بعد یہ پُوچھا جائے کہ ہم واقعی پیدا
ہوئے بھی ہیں یا نہیں —؟
اِس سے پہلے کہ پاسپورٹ کا یہ چکّر بغیر پاسپورٹ کے ہمیں
ملکِ عدم کی طرف روانہ کر دیتا، اِس مراسلہ بازی سے تنگ آ کر
ہم نے ایک دن باحسرت و یاس کچھ یوں، اپنا استعفا پیش
کر دیا

میں پاسپورٹ آفس سے دست بستہ گزارش کرتا ہوں کہ
جس نامعقول نے پاسپورٹ کے لئے درخواست دی تھی وہ بدنصیب
آپ کی مہربانیوں سے اِس جہانِ فانی سے پُوری طرح کوچ کر چکا
ہے، لہٰذا خدا کے واسطے اب یہ مراسلہ بازی بند کیجئے ——!
اِس طرح ہم نے اپنی طرف سے اس مسئلہ کو ختم تو کر دیا لیکن
اب بھی یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ ایک دن پاسپورٹ آفس سے اِس
قسم کا مراسلہ ضرور موصول ہو گا۔
محترم — پاسپورٹ کی منسوخی کے لئے درخواست
موصول ہوئی، لیکن جب تک آپ اپنی موت کا کوئی ٹھوس ثبوت
یا گواہ نہیں پیش کریں گے، ہم مراسلہ بازی بند نہیں کر سکتے۔ ہاں
جس دن آپ اپنی موت کا سرٹیفکٹ پیش کرنے میں کامیاب
ہو جائیں گے، ہم بھی پاسپورٹ کی منسوخی کے آرڈر جاری
کر دیں گے ——!!

▲

ڈاکٹر احسن رضوی

ابھی عزمِ سفر ٹوٹا نہیں ہے
شکستِ دل شکستِ پا نہیں ہے
بہر صورت میں آگے بڑھ رہا ہوں
یہ رستہ گو مرا دیکھا نہیں ہے
ہمارے گھر میں سب ہی جھانکتے ہیں
کسی کھڑکی پہ اب پردہ نہیں ہے
جسے اک عمر کا حاصل سمجھ لوں
مرے جیون میں وہ لمحہ نہیں ہے
شجر سارے برہنہ ہو چکے ہیں
کدھر جائیں کہیں سایہ نہیں ہے
سرِ راہ ہے کئی آنکھیں لگی ہیں
ادھر سے وہ ابھی گزرا نہیں ہے
ٹٹولیں اپنے دل کو ہم بھی احسن
کہ رنجش اس سے یکطرفہ نہیں ہے

غلام مرتضیٰ راہی

میری قسمت کا لکھا کم ہے کیا
اس قدر میرا پتہ کم ہے کیا
کیا تہہِ آب ابھی باقی ہے
کچھ مرا دستِ رسا کم ہے کیا
چاک کرتی ہے پہاڑوں کے جگر
آبشاروں کی ادا کم ہے کیا
سو گناہوں سے مری جان بچی
ایک نیکی کا صلہ کم ہے کیا
لڑکھڑاتے ہیں مرے پاؤں مگر
عالمِ نشہ مرا کم ہے کیا
کس بلندی پہ ہے شمعِ احساس
جھلملاتی ہے ہوا کم ہے کیا
آگ روشن ہے مرے سینے میں
راکھ کا ڈھیر بھلا کم ہے کیا

مقالہ

رحمٰن حمیدی

جارج برنارڈ شا —— شخصیت اور فن

جارج برنارڈ شا بین الاقوامی ادب کا عظیم ادیب، مقتدر ڈراما نویس اور مایۂ ناز فلسفی تھا۔ وہ اپنے دَور کا ایک کامیاب نقیب ہی نہیں بلکہ مستقبل کا بہترین نبّاض بھی تھا۔ اپنی بے مثال ذہانت اور اپنے منفرد فنّی کمالات کے باعث اُس کا شمار نہ صرف مشاہیرِ عالم میں ہوتا ہے بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ ادیبوں اور ڈراما نگاروں کی صف میں ممتاز و منفرد مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے فنّی کمالات اور نادر و نایاب تخلیقات کی وجہ سے عاشقانِ فن اور اہلِ علم کی نگاہوں میں محبوب روزگار تھا۔ عوام و خواص کے درمیان وہ اپنے دَور کا مقبول ترین فنکار تھا۔

برنارڈ شا آئرلینڈ کی راجدھانی ڈبلن میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ اُس کا باپ ایک کمپنی میں رینٹ کلکٹر کے عہدے پر فائز تھا اور شراب نوشی کا عادی تھا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشہ میں ڈوبا رہتا۔ اُسے صرف شراب کی بوتل سے اُنسیت تھی، گھر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بیوی بچوں سے وہ ہمیشہ دُور دُور رہتا۔ شا کی ماں کے مزاج میں بھی بہت کڑوا اور تیکھا پن تھا۔ وہ بات بات پر آگ بگولہ ہوجاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آئے دن گھر کے اندر اختلافات رُونما ہوتے اور معمولی معمولی باتوں پر گھر میں طوفان برپا ہوجاتا۔ چنانچہ ایک بار یہ اختلاف اتنا شدید ہوگیا کہ برنارڈ شا کی ماں اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر بیٹی کے پاس لندن چلی گئی، جہاں وہ اپنی بیٹی کی وساطت سے لندن کے ایک میوزک اسکول میں ملازم ہوگئی۔ وہ فنِ موسیقی کی ماہر تھی اور اُسے یہ پیشہ عزیز بھی تھا۔ برنارڈ شا تنہا اپنے باپ کے ساتھ رہ گیا۔ اُسوقت برنارڈ شا کی عمر بہت کم تھی۔ اُسے ماں کی شفقت و محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ برنارڈ شا نے زندگی کے ابتدائی بارہ سال شرابی باپ کے شراب آلود ماحول میں صرف ضرور کٹے لیکن شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھا۔ اُسے شراب بُو سے نفرت تھی۔ دراصل اُس کے صحت مند جسم کے اندر ایک صحت مند ضمیر تھا۔ اُس نے اپنے کردار سے یہ ثابت کردیا کہ اگر اولاد کے اندر صحت مند فیصلے کی جرأت اور صحت مند ضمیر کی حرارت موجود ہو تو وہ آبائی عادات و خصائل اور تخریبی عناصر کا شکار نہیں ہوسکتا۔ برنارڈ شا کی زندگی کا یہ پہلو ماہرین نفسیات کے لئے بجائے خود ایک تحقیقی دلچسپی رکھتا ہے۔

ایک غیر معمولی دل و دماغ کا بچہ اِس ماحول کو کب تک برداشت کرتا۔ آخر کار برنارڈ شا اپنے باپ کے نازیبا سلوک اور ناقابلِ برداشت زدوکوب سے تنگ آکر لندن اپنی ماں کے پاس بھاگ آیا۔ لیکن یہاں بھی اُسے طعن و تشنیع کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ اُس کی ماں اپنی ماہانہ تنخواہ سے شا کو جیب خرچ دینے لگی۔ لیکن صبح و شام اُسے نااہلی اور بیکاری کے طعنے بھی سننے پڑتے۔ بات بات پر ماں اور بہن جھگڑا کرنے کے لئے تیار ہوجاتیں اور دونوں نے اُسے "نِکھٹّو" کا خطاب دے دیا۔ یہ خطاب برنارڈ شا کو بہت ناگوار گذرتا۔ لیکن اپنے حالات کی ستم ظریفی سے مجبور ہو کر وہ ہر درد و الم کو صبر و تحمّل سے برداشت کرتا رہا۔ مگر خصوصیت سے "نکھٹّو" کا لفظ اُس کے رگِ احساس میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ اُس نے ملازمت کے لئے دو چار کمپنیوں کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن اُسے ہر دروازے پر ناکامی ہوئی۔

بیس سال کی عمر میں برنارڈ شا نے ایک پیشہ ور ادیب کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن اپنے ارادے میں بُری طرح ناکام ہوا۔ اُس نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے [illegible] اشاعت کیلئے مدیرانِ جرائد کی خدمت میں بھیجا لیکن اسکی

ہر تخلیق مسودے کسی شکریے کے بغیر واپس آجاتا۔ مگر شا شکستہ خاطر نہ ہوا۔ اُس نے چند پبلشرز سے براہِ راست ملاقات کی اور اپنی تخلیق کی اشاعت کے لئے اصرار کیا۔ لیکن سبھی نے اشاعت سے معذوری ظاہر کردی۔ صرف ایک پبلشر جس کے پاس برنارڈ شا لندن کے ایک لارڈ کا سفارشی خط لے کر گیا تھا بڑے خلوص سے ادبی صلاحیت اور علمی استعداد پیدا کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کہی کہ قلم کار کی شہرت حاضری کی قیمت بادشاہوں کے تخت وتاج سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ برنارڈ شا پبلشر کے مشورے سے بے حد متاثر ہوا، کیونکہ اُس وقت اُس کے پاس آئرلینڈ کے چرچ کی صرف ابتدائی تعلیم کی سند تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے تمام مسودات جوں کے توں الماری میں بند کردئے اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے برٹش میوزیم کا انتخاب کیا۔ میوزیم کی لائبریری میں اُس وقت چالیس لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ وہ ہر روز صبح کی چائے پی کر میوزیم آجاتا اور اپنے ذوق کی کتابیں ڈھونڈھ کر نکالتا۔ اور جب تک سیر حاصل مطالعہ نہ کر لیتا انہیں خود سے جدا نہ کرتا۔ اسی لائبریری کی وساطت سے برنارڈ شا نے کارل مارکس، فریڈرک نطشے، سیموئل بٹلر اور ہنری ابسن کے فکر و فلسفہ کا نہایت انہماک سے مطالعہ کیا۔ خصوصیت کے ساتھ ناروے کے فلسفی ہنری ابسن سے بے حد متاثر ہوا۔ اُسی کے فکر و فلسفہ نے برنارڈ شا کے ڈراموں کو نئی فکری اور فنی بصیرت عطا کی۔ ابسن کا نظریہ تھا کہ ڈراموں کے ذریعہ سماج کے مصائب و نقائص کا خوش اسلوبی سے سدِّ باب کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کے ذریعہ سوسائٹی کے امراض و مشکلات کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ اور عوام میں جرأت ہمت اور استقلال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ برنارڈ شا نے اس نظریے کو قبول کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ انقلابی اشتراکیت کی جگہ تدریجی اشتراکیت سے کام لینا چاہئے۔ یہ بین الاقوامی برادری کے لئے مفید ہوگا۔ اُس کا نظریہ تھا کہ بیماری اخلاقی ہو یا جسمانی، اُس کے اسباب میں فکر و پریشانی کے علاوہ غربت کو بھی دخل ہے۔ اُس کی نگاہ میں غریبی ماہرینِ طب کا ایک خاص موضوع ہونا چاہئے کیونکہ یہی غریبی تمام بیماریوں اور جرائم کی جڑ ہے۔ وہ نطشے کے انسانِ کامل کا بھی قائل تھا۔ اُسے سیموئل بٹلر کے اس فلسفے سے اتفاق تھا کہ موجودہ سماج نفاق کا شکار ہے۔ یہ نفاق گھر کی چہار دیواری میں بھی نمودار ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ برٹش میوزیم نے برنارڈ شا کی ادبی اور فنی صلاحیت کو جلا بخشی۔ اور اسی میوزیم کی سند کی وساطت سے برنارڈ شا نے نوبل پرائز کی رقم حاصل کی۔

برٹش میوزیم کے مطالعاتی دور سے فارغ ہو کر شا نے اپنی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز کیا اور پھر پبلشرز نے اُسے خاطر خواہ معاوضہ دیا۔ برنارڈ شا کی بیشتر تصنیفات و تالیفات نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ پروفیسر [illegible] نے اپنی کتاب A SHORT HISTORY OF ENGLISH DRAMA میں شا کا اولین ڈراما "وڈورز ہاؤس" (WIDOWER'S HOUSE) تسلیم کیا ہے جو ۱۸۸۰ میں منظرِ عام پر آیا تھا اور آخری ڈراما "بائنٹ بلینز" (BUOYANT BILLIONS) ثابت کیا ہے جو ۱۹۴۹ میں منظرِ عام پر آیا۔ ان دونوں ڈراموں کے درمیان [illegible] کی حیثیت نقاد، تخلیقی فنکار اور عظیم فلسفی کے روپ میں اُجاگر کیا۔ ویسے برنارڈ شا کو اولین مقبولیت سٹرڈے ریویو SATURDAY REVIEW کی وساطت سے حاصل ہوئی جس میں اُس نے مستقل طور پر نہایت بے باکی سے چونکا دینے والے مقالات تحریر کئے۔

انگریزی ادب کے بیشتر نقادوں نے بھی برنارڈ شا کا اولین ڈراما "وڈورز ہاؤس" ہی تسلیم کیا ہے جس کی بنیاد [illegible] پر رکھی گئی ہے۔ اور نہایت فنکارانہ انداز میں کرداروں اور ان کے مکالموں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعہ برنارڈ شا نے اپنی [illegible] سے [illegible] کرایا۔ یہ ڈراما کرداروں، ایکشن، مکالمات، کشمکش اور پیشکش کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ ۱۸۹۸ میں برنارڈ شا نے کینڈیڈا CANDIDA تحریر کیا ہے جس میں انسانی مسائل کو شدت سے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس ڈرامے میں [illegible] موجود ہیں۔ لیکن یہ موضوع اور تاثر کے اعتبار سے "وڈورز ہاؤس" سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ یہ ڈراما دنیا کے [illegible] کی نسبت [illegible] میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور ۱۹۰۳ میں اسی ڈرامے کے خالق کی حیثیت سے [illegible]

اپنے دور کے انتقالی دور میں جب کہ برنارڈ شا نے اپنے ڈراموں کو [illegible] "[illegible]" (THE MAN OF DESTINY) پیش کیا جس میں نپولین کے [illegible] پیش کیا۔

اس ڈرامے کے مصنف [illegible] (THE DEVIL'S DISCIPLE) "ڈیول ڈسپل" اور [illegible] سیزر اینڈ کلیوپیٹرا" کے علاوہ ڈراموں میں بھی برنارڈ شا نے بہت [illegible] کی تصویر کشی اور [illegible] کی ہے۔ تاریخ [illegible] کو [illegible] رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اقتباسات، عہد برنارڈ شا کے بعد سے شیکسپیئر کے تاریخی ڈراموں سے قریب ہیں۔ برنارڈ شا یہ دعویٰ کر کے شیکسپیئر سے بلند ہے گیا ہے۔ نقادوں نے کہ فنی تکنیک تحت ان سے بلند کی گئی ہے کہ برنارڈ شا کے ان ڈراموں میں وہ فنی [illegible] نہیں جو شیکسپیئر کے تاریخی ڈراموں میں پائی جاتی ہے۔ انگریزی ادب کے نقادوں نے [illegible] برنارڈ شا کے اس رویے سے اختلاف کیا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ شا نے شیکسپیئر کے ڈراموں کی تکنیک سے متاثر ہو کر یہ تاریخی ڈرامے تحریر کیے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہمیں کا کہ ڈراموں میں ملتی ہیں۔ یہ کہ برنارڈ شا کا شہرۂ آفاق ڈراما "مین اینڈ سپرمین" (MAN & SUPERMAN) پہلی جنگ عظیم کے بعد عوام کے سامنے آیا۔ فنی اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ڈراما نے انگلینڈ اور امریکہ [illegible] میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ انگریزی ادب کے نقادوں نے بھی اسے شاہکار کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ اس ڈرامے نے ثابت کر دیا کہ برنارڈ شا کا فن لازوال ہے اور اس کے یہاں بے پناہ فنی عظمت پنہاں ہے۔ خصوصیت سے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ "ڈان جوان ان ہیل" (DON JUAN IN HELL) میں لازوال فنی تکنیک ملتی ہے۔ اس ڈرامے میں اعلیٰ طبقے کی عکاسی کی گئی ہے لیکن زندگی کی حیثیت سے [illegible] تصویر بھی [illegible] ابھرتی ہے۔ یہ ڈراما فنی اعتبار سے اس قدر عظیم ہے کہ دنیا کے صدر سے چند شاہکار ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈراموں کی تاریخ میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے اور آج بھی عوام میں یہ ڈراما بے پناہ مقبولیت رکھتا ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے برنارڈ شا نے کئی اچھے ڈرامے تحریر کیے۔ ۱۹۰۴ء میں "جان بلز ادر آئی لینڈ" (JOHN BULL'S OTHER ISLAND) ۱۹۰۵ء میں "میجر باربرا" (MAJOR BARBARA) ۱۹۰۸ء میں "گیٹنگ میریڈ" (GETTIN MARRIED) ۱۹۱۰ء میں "میسالائنس" (MISALLIANCE) ۱۹۱۲ء میں "اینڈروکلیز اینڈ دی لائن" (ANDROCLES AND THE LION) اور "پگ میلین" (PYGMALION) اور ۱۹۰۶ء میں "دی ڈاکٹرز ڈائلیما" (THE DOCTOR'S DILEMMA) وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کی اپنی اپنی جداگانہ فنی خصوصیت اور اہمیت ہے اور ان کی فنی عظمت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جو غیر معمولی فنی بلندی "مین اینڈ سپرمین" میں نظر آتی ہے وہ دوسرے ڈراموں میں نہیں ملتی۔ اور یہی ڈراما ہے جس میں برنارڈ شا کا عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے جو ڈرامے کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا۔

جنگ عظیم کے دوران (۱۹۱۴-۱۸) برنارڈ شا نے صرف ایک ڈراما "ہارٹ بریک ہاؤس" (HEART BREAK HOUSE) تحریر کیا۔ یہ ایک طرح کا طنز آمیز المیہ ڈراما ہے جس میں جنگ کے گھناؤنے حادثات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں شا نے "بیک ٹو میتھوسیلا" (BACK TO METHUSELAH) کا سلسلہ لکھا جس میں اس کی تخلیقی صلاحیت کی عمدہ مثال نظر آتی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں "سینٹ جون" (ST. JOAN) تحریر کیا۔ یہ ڈراما شا کے کئی ڈراموں سے زیادہ مقبول ہوا لیکن اس کی تکنیک میں وہ فنی [illegible] نہیں جو "مین اینڈ سپرمین" میں نظر آتی ہے۔

جب برنارڈ شا شہرت و عزت کی بلندیوں تک پہنچ گیا تو اس نے اپنی شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس نے اپنے آخری دور کے ڈراموں کو صرف [illegible] شہرت کی خاطر بے تحاشا فروخت کر دیا۔ اس کے پبلشر نے بھی انکار نہ کیا کیونکہ اسے اتنی خطیر رقم مل رہی تھی۔ ایک وقت ایسا تھا جب ان ڈراموں کو پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شا کے آخری دور کے ڈرامے "دی ایپل کارٹ" (THE APPLE CART) "ٹو ٹرو ٹو بی گڈ" (TOO TRUE TO BE GOOD) "دی ملینیئرس" (THE MILLIONAIRES) اور "جنیوا" (GENEVA) فنی اعتبار سے کمزور اور خامیوں سے بھرپور ہیں۔ ان میں تکنیک اور مکالموں کی بھی خامیاں ہیں۔ انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ "مین اینڈ سپرمین" کے خالق نے اس قسم کے [illegible] ڈرامے کیوں کر تحریر کیے۔ اگر یہ ڈرامے شائع نہ ہوئے ہوتے تو برنارڈ شا کا درجہ ڈراما نگاروں میں اور بھی بلند ہوتا۔

چونکہ برنارڈ شا [illegible] وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ حالانکہ وہ ایسے شہر اور سماج میں سانس لیا تھا

جہاں کارخانوں کی چمنیاں اور سگریٹ کا دھواں ایک ساتھ اُٹھتا تھا، لیکن اُس نے دنیا والوں کو بتایا کہ سگار اور سگریٹ حیاتِ انسانی کے لئے سخت مُضر ہے۔ اُس نے خود کبھی سگریٹ یا سگار اپنے ہونٹوں سے نہیں لگایا۔ وہ اپنے قول پر زندگی بھر قائم رہا۔ وہ تو چائے اور قہوہ کو بھی انسان کے لئے مُضر سمجھتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حفظانِ صحت کے اُصولوں میں ماہرینِ طب سے بھی زیادہ باریک بین تھا۔

مصر کے مشہور ادیب سلامہ موسیٰ نے برنارڈ شا کو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۲ء کی درمیانی مدت میں لندن میں دیکھا تھا۔ ایک متفکر آدمی، آنکھوں میں زندگی کے عزم کی روشنی، چہرے پر داڑھی۔ سلامہ موسیٰ کا بیان ہے کہ شا کی داڑھی ایک مُرخ شعلہ تھی۔ برنارڈ شا نے داڑھی مذہبی جذبات کے تحت نہیں رکھی تھی، بلکہ اُس کا خیال تھا کہ داڑھی کا تعلق مرد کی جمالیات سے ہے۔ اُس نے اعلانیہ کہا: "داڑھی مرد کا جمال ہے، اِس سے مرد کی شناخت کا ظاہری ثبوت فراہم ہوتا ہے۔" لیکن برنارڈ شا کے چند دوستوں نے بتایا کہ اُس کے چہرے پر بچپن کے زمانے سے چیچک کے داغ تھے۔ وہ دنیا کا نقاد تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُس کے چہرے پر ناقدانہ نگاہ ڈالے۔ اِس بیان کی صداقت کچھ مشکوک سی ہے کیونکہ برنارڈ شاہ نے ہمیشہ تصنع اور ظاہرداری سے احتراز کیا۔ وہ ہر شئے کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کا عادی تھا۔ چنانچہ جب اُس کی ماں کا انتقال ہوا تو وہ اُس کے جنازہ میں ہنستا ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے دوستوں نے سخت ملامت کی تو وہ اور زیادہ ہنسنے لگا۔ تجہیز و تکفین کے بعد اُس نے بتایا کہ باپ نے شراب کے نشے میں ٹھوکر مار کر گھر سے نکال دیا اور ماں چھوٹی سی عمر میں بے سہارا چھوڑ کر لندن صرف اپنے آرام و آسائش کی خاطر چلی آئی۔ اُس نے شوہر اور بیٹے کو اپنی خدمت سے نہ صرف محروم رکھا بلکہ سماج کے روبرو ذلیل و رسوا بھی کیا۔ اسی لئے وہ اپنی ماں کے جنازے پر ہنس رہا تھا۔ اُس نے کہا: "صحت مند معاشرہ ماؤں کی ذمہ داری ہے، جو ماں ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پُورا نہیں کرے گی اُس کے جنازے پر سماج رونے کے بجائے ہنسے گا۔"

برنارڈ شا نہایت صاف گو اور حقیقت پسند تھا۔ چنانچہ ایک بار جب وہ ایک جلسے کو خطاب کر کے ڈائس کے نیچے آیا تو ایک اجنبی نے کہا۔

"دنیا تمہاری تنقید کی زد پر ہے ؟"

برنارڈ شا نے جواب دیا

"تمہارا خیال صحیح ہے — !"

اُس شخص نے پھر پوچھا

"اور ملکہ — ؟؟"

برنارڈ شا نے جواب دیا "ہاں — ملکۂ برطانیہ بھی !"

اُس آدمی نے حیرت سے پوچھا: "تب دنیا میں تمہاری تنقید کی زد سے کون باہر ہوگا — !؟"

برنارڈ شا نے بے پروائی سے جواب دیا: "صرف دو آدمی — !!"

وہ شخص چونک پڑا، "کیا کہا، دو آدمی، کون سے دو آدمی — !؟"

برنارڈ شا نے بے ساختہ جواب دیا: "ایک میں اور ایک میری بیوی — !!"

برنارڈ شا کی عظمت سے دنیا کے تمام پڑھے لکھے لوگ اچھی طرح واقف ہیں، لیکن خود شا کو اپنی عظمت و بلندی کا احساس نہ تھا۔ مذکورہ واقعات سے بھی برنارڈ شا کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ حالانکہ برنارڈ شا نے نہ کسی کالج میں تعلیم پائی تھی اور نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری اُس کے پاس تھی، نہ کسی اکاڈمی کی ممبری اختیار کی۔ اُس نے نوبل پرائز سے ملنے والی بڑی رقم بھی برطانیہ کے ایک ثقافتی ادارے کو عطیئے کے طور پر دیدی تھی۔ اُس نے ڈراما نگار کی حیثیت سے اپنا ایک تھیٹر بھی قائم کیا تھا۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے نئے نظریات اور جدید رجحانات سے دنیا کی رہنمائی کی۔ برنارڈ شا نے محبت کی شادی ضرور کی لیکن بیوی کے قُرب سے تیس سال تک احتراز کیا۔ اُس نے فرائڈ کے جنسی نظریات کو مطلق قبول نہیں کیا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ جنسی بھوک نئی نسل کو موت کے گڑھے میں ڈھکیل [illegible] ہے کہ اُس نے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر ملاحظہ کیجئے)

شاعریہ

رونق دکنی سہمانی

جلوؤں میں کھو گئی ہے نہ جانے نظر کہاں | ایسے میں اب کسی کو کسی کی خبر کہاں
دنیا ہے کور چشموں کی، اہلِ نظر کہاں | موتی بکھیرتی ہے تو اے چشمِ تر کہاں
نفرت کا زہر سادہ دلوں میں نہ گھولیے | ان تلخیوں میں لذتِ شیر و شکر کہاں
قدموں کی آہٹیں نہیں آپس میں ہم مزاج | رہرو کو پاسداریِ رہبر مگر کہاں
تمہید پر ہے لفظ و بیاں کی شگفتگی | آنچ نہ جس میں ہو وہ حقیقت میں گہر کہاں
اپنی نظر پہ اتنا بھروسہ نہ کیجیے | اٹھ جائے اعتماد تو پھر معتبر کہاں

ملتی ہے چل کے شہرِ خموشاں سے یہ سڑک
رونق یہ وقت شام کا اور تم ادھر کہاں

کیف احمد صدیقی

غلط کہ دستِ ارض و سماں میں قتل ہوا
مرا وجود خود اپنی خلا میں قتل ہوا
میں اپنے عصر کے صحرا کا ہوں وہ سناٹا
مثالِ موج جو سیلِ صدا میں قتل ہوا
ہر ایک سمت نیا لشکرِ یزیدی تھا
کسے خبر کہ میں کس کربلا میں قتل ہوا
عجیب بات ہے آبِ حیات پی کر بھی
تڑپ تڑپ کے میں راہِ بقا میں قتل ہوا
یہ اتفاق جو کل بچ گیا تھا آندھی سے
وہ اک پرند بھی دشتِ ہوا میں قتل ہوا
ہر ایک شعر کو اے کیف جاودانی کر کے
میں قتل گاہِ ادب کی فضا میں قتل ہوا

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

دل پہ برسوں سے مرے کوہِ گراں ہے کوئی
مجھ کو صد پارہ کرے، سحر بیاں ہے کوئی
گھر میں بیٹھے رہو، ہنگام ہے گلشن گلشن
شاخ سے ٹوٹنے کو برگِ خزاں ہے کوئی
چھپ گئے چھوڑ کے ہم کو لق و دق صحرا میں
راستہ کوئی نہ قدموں کا نشاں ہے کوئی
سنگ اٹھایا بھی نہیں جم گئے بازو میرے
آئینوں میں مری جانب نگراں ہے کوئی
تھپکیاں دیتی ہے دریا کی ہوا جسموں کو!
کیا خبر اس کو یہاں سوختہ جاں ہے کوئی

کہانی
(انگریزی)

امارینـد رامـر
ترجمہ: انجمن آرا انجم

تماشائی

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا اور پتھر کی طرح ساکت اور خاموش سڑک چمکتی ہوئی چٹان کی مانند نظر آ رہی تھی۔ چند لوگوں سے بھری بس سڑک پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ ایک بنگالی خاتون کے دو بچے گرجا کے نزدیک اُوپر نیچے ہو رہے تھے۔ مسافر باہر کے قدرتی مناظر اور بارش اور کہرے سے ڈھکی ہوئی قریب کی پہاڑیوں کی دلکشی میں کھوئے ہوئے تھے۔

دونوں بچے جو دوڑتے دوڑتے تھک گئے تھے اپنی ماں کے قریب بیٹھ گئے۔ بس کے ایک کونے میں سفید لباس پہنے ایک عمر رسیدہ بوڑھی باہر کی دلفریبیوں سے بے نیاز بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ سب سے بالکل بے تعلق ہو کر وہ اپنے پیروں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ تنہا سفر کر رہی ہو اور سمندر کی تلاطم خیز خاموشی میں گھری ہو۔ لیکن کبھی کبھی جب بارش تیز ہو جاتی ہے اور بس بہت آہستہ چلنے لگتی ہے تو درد کی ایک لہر اُسے اندر ہی اندر بے چین کر دیتی ہے۔

بس اب تیزی سے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی پانی کے چھپاکے کی آواز آ جاتی تھی۔ بارش قریب قریب ختم ہو گئی تھی مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اُس بوڑھی نے اپنے قریب ہی کے مسافر سے وقت پوچھا۔ وقت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ پریشان سی ہو گئی۔ ایک دو گھنٹے بعد ہی میں وہ ایک عالیشان مکان کے سامنے ہو گی۔ یہ سوچتے ہی جیسے اُس کے اندر کا سکون بکھر گیا۔ تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی یا پھر... اُس کے آگے سوچنا اُسے مشکل ہو گیا۔

ایک لمحے کے لئے وہ بے بس ملامت بھری کیفیت سے نکل گئی اور ماضی کی خواب آلود کانپتی لرزتی یادوں میں کھو گئی۔ میلے کپڑے پہنے ہوئے ایک لڑکا دوڑتا ہوا اُس کے پاس آتا ہے اور رُک جاتا ہے۔ وہ کچھ کہنے کے لئے گہرے گہرے سانس لے رہا ہے۔ وہ اُس کی بات کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ الفاظ کو ٹھیک سے ادا نہیں کر پا رہا ہے۔ بالآخر اُس کی آنکھیں مسکرا دیں جس پر وہ لڑکا شرما گیا۔

"بیٹے آخر کیا بات ہے؟ تم کیوں دوڑے چلے آ رہے تھے۔ تم گر جاتے اور چوٹ آ جاتی تو۔ مجھے بتاؤ آخر بات کیا ہے؟"

"اماں! وہ ..." بچہ اُس کی نظر بچا بچا کر دیکھ رہا ہے کہ کہیں اُس کی مسکراہٹ غائب تو نہیں ہو گئی۔

"بول نا! بیوقوف۔"

یہ سنتے ہی بے اختیار اُس کے منہ سے الفاظ نکلنے لگے۔ "اماں اسکول سے ہر ایک بچہ اُن پہاڑیوں کی طرف جا رہا ہے جہاں وہ مندر ہے اور جس کے آگے بڑی سی جھیل ہے۔ مگر تم نے مجھے وہاں نہیں جانے دیا۔ ماسٹر صاحب اور بچے سب وہاں جا رہے ہیں۔ کیا میں جا سکتا ہوں؟ اماں اگر تم جانے کے لئے منع کرو گی تو میں پیچھے رہ کر گزارا کر لوں گا مگر ان لوگوں سے میں کہہ دوں گا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اُس کی آواز سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ رو پڑے گا۔ ماں خوب سمجھ رہی ہے۔

"اچھی بات ہے۔ خوشی سے جاؤ۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا تم یہ بات کہہ رہے ہو۔ ماسٹر صاحب ساتھ جا رہے ہیں نا۔ اور دیکھو جلد واپس آ جانا۔"

وہ خوشی سے دوڑتا ہوا چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

خواب ٹوٹ گیا۔ سامنے [illegible]۔

مگر بچوں اور چار دہائیوں کے تھکا دینے والے عرصے پر بہہ گئے —— بس چلی جا رہی تھی۔ وہ جو ایک سا مختصری کچھ اب ور ہو گیا تھا اور اونچی حیثیت کا مالک تھا۔ مشکل ہی سے کوئی بات ایسی ہو جس کی اُس نے خواہش کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ وہ حیرت زدہ سی تھی کہ وہ نازک مزاج لڑکا جو شرما کر آنکھیں جھکا لیتا تھا اب اونچی حیثیت کی شان و شوکت میں پل گیا ہوگا۔

اُس نے اپنے تھیلے پر نظر ڈالی۔ جس میں اخبار سے لپٹا ہوا ایک مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اُس میں گھی میں بنے ہوئے لڈو تھے جو نریندر کو بہت پسند تھے یہاں تک کہ کالج کے زمانے میں بھی نریندر اُن لڈوؤں کے مزے کو نہیں بھولا تھا

بس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی منزل پر رک چکی تھی۔ دوسرے مسافر ایک دوسرے کو بے قراری سے دھکا دے رہے تھے مگر بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ سارے مسافر ایک ایک کر کے اتر رہے تھے۔ اُس نے اپنے بوجھل قدموں کو حرکت دی اور پھر نیچے اتر گئی۔

گھر پہنچتے پہنچتے تقریباً رات ہو گئی تھی۔ پورے گھر میں ایک سکوت طاری تھی اور سامنے کے برآمدے میں بتی روشن تھی مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاں سامنے کے دروازے سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس کے قدموں کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور بڑی مشکل سے وہ اندر داخل ہوئی۔

جیسے ہی بڑھیا نے اندر قدم رکھا نریندر کی بیوی اُوشا اُس کے پاس آئی اور رسمی طور سے نمستے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "ہائے اماں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ جی۔ آپ کب آئیں؟ اندر آ جائیے۔" اُس نے ملازم کو بلایا اور بالائی کمرے کی صفائی کے لئے ہدایات دینے لگی۔ "اماں آپ اس کے ساتھ جائیے۔ میں بعد میں آؤں گی۔ میرے شوہر کے چند دوست آج شہر آئے ہوئے ہیں اس لئے ہم نے ڈنر پر مدعو کر رکھا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" وہ جلدی سے چلی گئی اور بڑھیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اُداس و ملول وہ ملازم کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں پہنچ گئی جس میں ایک بستر، ایک میز اور ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ پیچھے کی جانب ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمرے میں بھر گئی۔ وہ خالی الذہن ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔

نیچے کا کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ نریندر کی بیوی کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ نریندر کی مسکراہٹ پارٹی کو زندگی بخش رہی تھی۔ ایک گھنٹے کے قریب ہو گیا تھا۔ نریندر کی بیوی اس کشمکش میں مبتلا تھی کہ وہ کس طرح نریندر کو اُسکی ماں کی آمد کی اطلاع دے۔ جب سارے مہمان رخصت ہو گئے تو نریندر نے اطمینان بخش جمائی لی اور بیوی سے بولا: "لوگ بہت اچھے موڈ میں تھے آج۔ پارٹی بہت اچھی رہی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہاں بہت اچھی رہی۔" اُوشا یہ کہتے ہوئے رکی اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "میں مجمع کے درمیان تم کو یہ نہیں بتا سکی تھی کہ آج شام تمہاری اماں آئی ہیں۔ کیا تم اُن سے اس وقت ملو گے۔"

ایک لمحے کے لئے نریندر نے سوچا کہ اوشا کوئی خاص بات کہنے والی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے بے نیازی کی ایک لہر نے اس مسئلے کو مختصر کر دیا۔ "اچھا۔ میں اسی وقت مل لوں گا۔ کل میں بہت مصروف رہوں گا۔ وہ اوپر کے کمرے میں ہیں نا؟ وہ ابھی تک اُسی پرانی دنیا سے چمٹی ہوئی ہیں جیسے گزرے ہوئے عرصہ ہو گیا۔"

اُوشا خاموش رہی۔ نریندر اٹھا اور زینے کی طرف مڑ گیا۔

جیسے ہی بوڑھی نے اُس کے قدموں کی پہلی چاپ سنی وہ دروازے میں سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر نریندر اُس کے پیر چھونے کے لئے تھوڑا سا جھکا۔ اُسے بوڑھی نے روک دیا اور بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ کمرے کے اندر جاتے ہوئے اُسے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں نریندر چلا نہ جائے اور پھر آنے کو کہہ جائے۔

خود پر قابو پاتے ہوئے اُس نے کہا "میرے بچے چند منٹ تو ٹھہر جا۔ تو ٹھیک تو ہے؟"

اُسے ہر لمحہ بڑا قیمتی معلوم ہو رہا تھا اور خود کو بہت کمزور سی محسوس کر رہی تھی۔

"ماں یہاں کیسے آنا ہوا۔" نریندر نے سوال کیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اس کے علاوہ اُسے بات چیت کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ چند اِدھر اُدھر کے سوال یوں ہی کر ڈالے۔

"میں پریشان ہوگئی تھی۔ تُو نے اتنے دن سے کوئی خط کیوں نہیں بھیجا؟"

"مجھے یہاں بہت کام ہے اور میں آفس میں تنہا ہوں۔"
نریندر یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"ہاں یہ تو میں جانتی ہوں۔ اسی وجہ سے تجھے دیکھنے یہاں آگئی۔ میں تیرے لئے کچھ چیزیں لائی ہوں۔ اِس میں تیرے پسندیدہ لڈّو بھی ہیں۔ وہ دیکھو ڈبّے میں رکھے ہیں۔"

نریندر بے نیازی سے بڑبڑایا اور اُٹھ کر چلا گیا۔ "اپنے کمرے ہی میں رکھوا ان کو۔ میں پھر آؤں گا تو کھاؤں گا۔"

"بہت اچھا" وہ منہ ہی منہ میں بولی اور پھر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

نریندر نے جاتے ہوئے کمرے پر ایک مختصر نظر ڈالی۔ پھر اُس کے قدموں کی چاپ آہستہ ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔
وہ بے بس اور مجبور سی ہوکر رہ گئی۔ اُس پر جیسے سکتے کا عالم طاری ہوگیا ہو۔ لمحے گذرتے رہے۔ قدموں کی چاپ پھر سنائی دی۔ ملازمہ کھانے کی پلیٹ لئے آرہی تھی۔ میز پر پلیٹ رکھ کر وہ چلی گئی۔ واپسی میں جب وہ چائے لائی تو دیکھا میز پر کھانا ویسے ہی رکھا ہے۔ بھری پلیٹ دیکھ کر اُس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا اور کام میں لگ گئی۔

اُسی وقت اُوشا اندر آئی۔

"آپ نے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھئے تو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"میں کھانے ہی والی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پلیٹ پر جھک گئی۔ بڑی کا ٹکڑا اُس کے حلق میں پھنس گیا۔ بڑی مشکل سے وہ اُسے نگل سکی۔

اُوشا کمرے کی سجاوٹ دیکھ رہی تھی۔ چائے پیتے وقت اُوشا نے اپنی ساس سے کہا: "آپ یہاں آرام سے ہیں نا۔ کمرے میں کافی ہوا آتی ہے۔"

چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ درد کی ایک لہر اُس کے سینے کے پار ہو جاتی تھی۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ لوگ غیر ضروری تکلّف سے کیوں کام لیتے ہیں۔ خلوص اور پیار سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں کیسی ہوں اور میرا چہرہ اتنا اُداس کیوں ہے؟۔

کچھ دیر بعد اُس نے کار کی آواز سُنی اور پھر وہ بیٹھ گئی۔
پھر کوئی آرہا تھا۔ وہ ملازمہ ہی تھی۔
اُوپر آکر ملازمہ مہذب مسکراہٹ کے ساتھ بولی: "آپ اوپر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں گی۔ میرے ساتھ آئیے تو گھر کا باقی حصہ دکھاؤں۔"

جب دونوں گھر کی ہر چیز دیکھتی جا رہی تھیں تو اُس نے محسوس کیا کہ ملازمہ نے اُس کے دل کی بات بھانپ لی ہے اور اُس بیٹے نے جس کے لئے وہ آئی تھی ....

بڑھی تنہا اور خاموش کمرے میں بیٹھ گئی۔ کافی دیر بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح کی بس چھوٹنے کا وقت معلوم کرے گی۔ اگر کسی نے اُس سے پوچھا بھی کہ وقت معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے تو اس کا جواب یہ دے گی کہ بیٹے کو دیکھنے آئی تھی۔ اب دیکھ لیا لہٰذا جا رہی ہوں۔ مگر ساتھ ہی اُسے یہ شک بھی تھا کہ کوئی اِس بات کی پروا بھی کرے گا یا نہیں کہ وہ بس کا وقت کیوں پوچھ رہی ہے
تھوڑی دیر بعد ملازمہ کھانا لئے چلی آئی۔ کچھ منٹ تک انتظار کرکے وہ چلی گئی۔ بڑھی نے مشکل سے ایک چپاتی کھائی۔ اُس نے اور کچھ نہیں چھوا۔ ملازمہ کے آجانے کے بعد اُس نے ایک گلاس پانی پی لیا۔

"آپ نے کوئی چیز کھائی بھی۔" وہ زور سے بولی۔ "آخر کیا بات ہے۔ آپ کو یہ چپاتی پسند نہیں ہے۔"
ملازمہ نے پلیٹیں اُٹھائیں اور چلی دی۔
بڑھی نے بتّی بجھائی اور بستر پہ دراز ہوگئی۔ تھکن سے اُس کی بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ سوگئی۔

دوسری صبح کو ناشتے پر نریندر نے اچانک اپنی ماں کو یاد کیا۔ "کیا وہ اب تک اوپر ہیں؟"

"جی ہاں۔ کچھ دیر پہلے وہ بس کا وقت پوچھ رہی تھیں۔"

"انہیں اکیلا رہنا پسند نہیں۔ اچھا سُنو اس لفافے میں پچاس روپے ہیں۔ جب وہ جانے لگیں تو دے دینا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ ایک گھنٹے میں مجھے میٹنگ میں جانا ہے۔" اُس نے جلدی سے لفافہ دیا

اور کار سے کر روانہ ہو گیا۔

ناشتہ ختم کر کے اوشا نے اُوپر جانے کے لئے سوچا۔ وہ اُسی سمت گئی جس سمت سے نریندر کی ماں آ رہی تھی۔

جیسے ہی وہ قریب پہنچی بوڑھی نے کہا "بس دس بجے چھوٹتی ہے۔ نریندر یہاں ہے؟ اِس سے پہلے کہ کہیں چلا جائے میں اُسے دیکھ لینا چاہتی ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے ہچکچائی۔ "وہ کسی کام سے ابھی ابھی چلے گئے ہیں۔" پھر وہ بے ربطی سے بولی "آج آپ جا رہی ہیں؟"

"میں نے تم سب کو دیکھ لیا ـــــ بس کافی ہے۔ پھر کبھی آ جاؤں گی۔ اور اگر میں کچھ عرصے تک نہ آ سکوں تو تم سے کم کبھی کبھی خط بھیج دیا کرنا تاکہ تمہاری خیریت معلوم ہو جایا کرے۔"

اوشا جواب تلاش کرتی رہی مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس نے ایک لفافہ پکڑا دیا۔ "اِسے لے لیجئے۔"

لفافہ کھلا ہوا تھا۔ اُس میں سے نوٹ نظر آ رہے تھے!

"نہ۔ نہ" بوڑھی نے احتجاجاً کہا۔ "میں اِس کا کیا کروں گی۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ تم سب اچھی طرح ہو۔" اُس نے ایک لمحے کے لئے لفافہ پکڑا اور پھر اوشا کو واپس کر دیا۔ اوشا تھوڑی دیر ہچکچائی پھر آخر کار لفافے کو رکھ لیا۔

جب بس تیزی سے دوڑ رہی تھی تو اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھے مگر وہ تھے کہ بہتے چلے جا رہے تھے کئی منٹ اسی طرح گذر گئے۔ جب اُس نے آنکھوں کو صاف کیا تو اپنے سامنے کنڈکٹر کو دیکھا جو ہاتھ میں ٹکٹ لئے کھڑا تھا۔ ▲

بقیہ: صفحہ ۴۲ - "برنارڈ شا"

ادیبوں میں سب سے زیادہ طویل عمر پائی۔

برنارڈ شا کی نگاہ ہر شئے پر ناقدانہ رہی۔ شاید ہی دنیا کی کوئی شئے ایسی ہوگی جو اس کے دائرۂ تنقید سے باہر ہو۔ اُس کی تنقید میں زخم اور مرہم دونوں کا لطف تھا۔ اُس کی صحت مند اور شگفتہ تلخی ہوئی تنقید کا اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جارج برنارڈ شا نے زندگی بھر دوسروں پر تنقیدی حملے کئے لیکن کسی کو گھائل نہیں کیا۔ یہ اُسکے تنقیدی تحور کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ دراصل وہ حیاتِ جاوید کا ایک بے مثال شعلہ تھا جس کے اندر زندگی کی روشنی تھی، حسرتِ تعمیر کی تڑپ تھی اور انسانیت کی چیخ پکار تھی۔ اُس کے جسم و جاں میں ایک سیمابی کیفیت اور رقصِ شرر کی سی حالت تھی۔ جب وہ اسٹیج پر آتا تو سامعین اُس کی شعلہ بیانی سے مبہوت اور مسحور ہو جاتے۔ جب وہ صفحۂ قرطاس پر اپنے خیالات بکھیرتا تو ایسا لگتا کہ پھول جھڑ رہے ہیں اور صفحات کے صفحات الفاظ کے جواہرات کی آرائش سے گلزار ہو رہے ہیں۔ وہ جہاں جاتا علم و فن کی قابلِ صد احترام روشنی اُس کے وجود کے ساتھ جگمگاتی ہوئی جاتی اور وہ جس محفل میں بیٹھتا علم و ادب کی شمعیں فروزاں ہو جاتیں۔ اُس کے جوہر پر شفقت و محبت کا ایسا نُور تھا، جس نے ہزاروں اور لاکھوں شکست خوردہ اور مایوس انسانوں کو نئی زندگی دی اور حیات کے حقیقی اسرار و رموز سے آگاہی بخشی ـــــــ دنیا کا یہ عظیم رہنما، عظیم مفکر، عظیم ڈرامانگار اور عظیم انسان ۱۹۵۰ء میں ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا۔ ▲

شاعر نمبر

علیم مسرور

دوستو! تم ہی کرو اہلِ سخن کی خاطر / ہم تو گھر بیچ چکے حرمتِ فن کی خاطر
آبرو کیا بچی مرے دستِ جنوں میں اُس کی / پیرہن دے دیا غیروں کے کفن کی خاطر
کتنے دروازے ہیں وا، کتنے دریچے ہیں کھلے / ایک اُمید کی ننھی سی کرن کی خاطر
کیا تعجب کہ سرِ راہ ترے دیوانے / پیرہن نوچ لیں خوشبوئے بدن کی خاطر
غم میں ہنسنے کی بنا میں نے ہی ڈالی ہے مگر / رو بھی لیتا ہوں کبھی رسمِ کہن کی خاطر

کیا سنوارے خمِ گیسو وہ خرد ہو کہ جنوں
پڑ گئی لاکھ گرہ ایک شکن کی خاطر"

شاہ حسین

سورجوں کا غالباً وہ شہر تھا
میں چراغ لے کے جس جگہ گیا
عمر بھر کہاں نہ ڈھونڈتا پھرا
پاس ہو کے بھی وہ دور دور تھا
طے شدہ ہر ایک سمت کھو گئی
تھک کے چل دیا ہر ایک راستہ
بے گماں منزلوں کی چاہ میں
بے اماں راستوں پہ چل پڑا،
قطرہ قطرہ خونچکاں تھی رات! میں
بوند بوند، جذب جذب ہو گیا
شہر شہر پھیلتا رہا دھواں
چہرے سب دھواں ہوئے، یہ کیا ہوا
تشنہ لب، کنارِ آب، تشنہ لب
پانیوں سے کھیلتا وہ چل دیا
پتھروں کی بارشوں میں گلبدن
بھیگتا رہا — بدن چھلک اُٹھا
یہ مری کہاں کہاں تلاش ہے!
شاہ تیرے ساتھ تھا، میں ساتھ تھا

منوہر لال ہادیؔ

کون کہتا ہے کہ محرومِ اثر ہے فطرت
فعل کی شرط ہے، فردوسِ نظر ہے فطرت
گاہ بھرتی ہے یہ خونریز حوادث برپا
گاہ غمخوار و مسیحائے بشر ہے فطرت
کہیں طغیانِ ستم ہے، کہیں طوفانِ بلا
ایسا لگتا ہے کہ آمادۂ شر ہے فطرت
کبھی مختارِ دو جہاں نظر آتی ہے
اور کبھی آدمی کی دستِ نگر ہے فطرت
یہ ستاروں کا تبسم، یہ بہاروں کا جمال
زیست کی دھوپ میں اک سایۂ تر ہے فطرت
وقت کا قافلہ دن رات چلے جاتا ہے
اک عجب سلسلۂ شام و سحر ہے فطرت
سینکڑوں بھید چھپے ہیں کہ کوئی کیا سمجھا
جتنی سمجھی ہے، اُس سے بھی [illegible] ہے فطرت
پا رہا ہے شعور اب سے اُجالا ہادیؔ
مرکزِ آگہی و علم و نظر ہے فطرت

اَنِل ٹھاکر

قسم

کردار

جوسف
ٹوسی
آنٹی
فادر (PRIEST)

گرجا گھر کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ لوگ عبادت ختم کر کے دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں۔ گفتگو کی آواز آہستہ آہستہ (FADE) ہوتے ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے کچھ قدم چلنے کے بعد آواز رکتی ہے اور دروازے کو ہلکے سے تھپتھپانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

فادر :- (اندر سے) COME IN

(دروازہ کھلنے کی آواز)

جوسیف :- GOOD MORNING FATHER

فادر :- GOOD MORNING MY SON
کہو جوسیف کیسے آنا ہوا۔

جوسیف :- فادر..... میں.....

فادر :- کیا بات ہے۔ تم بڑے پریشان نظر آ رہے ہو؟

جوسیف :- میں..... میں اپنی غلطی، اپنے گناہ کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔

فادر :- I WANT TO CONFESS

فادر :- ٹھیک ہے بیٹھو۔ کہو تمہیں کیا کہنا ہے؟

جوسیف :- فادر میں کچھ دنوں سے بہت پریشان ہوں کبھی کبھی یہ ذہنی پریشانی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دیواروں سے سر ٹکرانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ایسی غلطی، ایک ایسا گناہ جس کے لئے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پل بھر میں مجھ سے ہو گیا۔

فادر :- کہو بیٹے ایسی کون سی بھول، ایسا کون سا گناہ جانے یا انجانے تم سے ہو گیا ہے، جو تمہیں ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہے؟

جوسیف :- کیسے سمجھاؤں؟ اُس کے منہ سے نکلا وہ ایک لفظ "قسم"..... اِس لفظ "قسم" نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ جب سے وہ لفظ میں نے سنا ہے، میرے کانوں میں وہ ایسے گونج رہا ہے جیسے کسی کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر وادیوں میں گونج اٹھتی ہے۔

(قسم..... قسم..... قسم کی بازگشت کی آواز کا effect اُبھرتا ہے اور fade down ہو جاتا ہے۔)

جوسیف :- سنا آپ نے..... سنا فادر آپ نے؟ اِس گونجتی ہوئی آواز کو؟ قسم..... قسم..... میں (ذرا اونچی آواز میں) ہاں میں..... میں ہی ذمہ دار ہوں اُس کا۔ میری وجہ ہی سے وہ..... اُفوہ..... کیسے کہوں فادر؟ وہ سب سوچتا ہوں تو ایسے لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا (روتے ہوئے) میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے سکون چاہئے۔ سکون.....

فادر :- صبر کرو میرے بیٹے صبر کرو۔ سکون عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کے لئے دل و دماغ کا شانت ہونا لازمی ہے اور دل و دماغ کو شانتی تب نصیب ہوتی ہے جب انسان خلوصِ دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرو اور پھر عبادت میں دل لگاؤ، یقیناً تمہیں

شگون ملے گا۔ کہو میرے بچے! کہو God Bless you

جوسیف:۔ تین مہینے کی بات ہے (ہلکی موسیقی) اُس سنڈے میری ڈیوٹی دوسری SHIFT میں تھی۔ صبح گیارہ کے قریب میں یہ سوچ کر گھر سے نکلا کہ چلو آج Soza's انکل کے گھر چلا جائے۔ میں Soza's انکل کے گھر پہنچا، اُن کے گھر کا دروازہ کھُلا تھا اور اندر سے آنٹی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ (موسیقی)

آنٹی:۔ لوسی ۔۔۔ لوسی ڈارلنگ، خالی بوتلیں تو ذرا دینا۔۔

جوسیف:۔ گڈ مارننگ آنٹی۔

آنٹی:۔ کون؟ جوسیف! گڈ مارننگ۔ آؤ آؤ بیٹے بہت دنوں کے بعد آئے ہو کہیں باہر گئے تھے کیا؟

جوسیف: نہیں آنٹی، گیا تو نہیں، البتہ جانا ہے۔

آنٹی: کہاں جانا ہے؟

جوسیف: عنقریب پٹیالہ جانا ہے۔ اسپورٹس ٹریننگ کیلئے۔

آنٹی۔ تو تو تم اب بہت بڑے اسپورٹس مین ہو گئے ہو بیٹے۔

جوسیف: یہ تو سب آپ بڑوں کی دعا ہے۔

آنٹی: GOD BLESS YOU ___ تم بیٹھو بیٹے میں ذرا ۔۔۔۔

جوسیف: کہیں باہر جا رہی ہیں آنٹی؟

آنٹی: سوسائٹی جا رہی ہوں۔ سُنا ہے آج مٹی کا تیل دینے والے ہیں، جو دو ایک بوتل مل جائے (انھیں صبح اسکول جانے کی جلدی رہتی ہے۔ مٹی کا تیل رہا تو چولھا جلانے میں ذرا آسانی ہوتی ہے۔

جوسیف: انکل اسکول گئے ہیں کیا؟

آنٹی: ابھی کچھ دیر پہلے اسٹیشن گئے ہیں۔ میل ٹرین سے اُن کا کوئی انسپکٹر آنے والا ہے۔ کل اسکول کا انسپکشن ہے نا۔ کہنے لگے صاحب آ رہے ہیں اُن کے کھانے کا کیا کریں گے؟ میں نے فوراً کہہ دیا۔ اب کے آپ صاحب کو کھانا ہوٹل ہی میں کھلائیے گا ___ ویسے تو آج تک ہم ہی کھلاتے آئے ہیں بیٹے۔ مگر اب ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے (ذرا آہستہ سے) سب ٹیچروں نے پانچ پانچ روپیہ دیکر چندہ جمع کیا ہے۔ صاحب کو لنچ اور ڈنر دینے کے لئے۔ یہ تو کل رات اُن کے اسکول کے دو فرنانڈیس ٹیچر آئے تھے وہ کچھ کھُسر پھُسر کر رہے تھے تو بات میرے کانوں میں پڑی۔ ورنہ یہ مجھے تھوڑے ہی کچھ بتاتے ہیں۔ اچھا تو میں چلوں۔۔۔۔ OH!, GOD BLESS ME ___ لوسی۔ لوسی ڈارلنگ

لوسی:۔ (اندر سے) آئی ممی

آنٹی: اچھا یاد آیا بیٹے آج لوسی نے کٹ لیٹس بنائے ہیں۔ آئے ہو تو کھا کر ہی جانا۔

لوسی: کس سے کہہ رہی ہو ممی؟ ہائے جوسیف۔

جوسیف: ہیلو

آنٹی: لوسی ڈارلنگ اپنے ہاتھ کے بنے وہ کٹ لیٹس تو کھلانا جوسیف کو

لوسی: یہ اسپورٹس مین کٹ لیٹس وٹ لیٹس تھوڑے ہی کھاتے ہیں (ہنستی ہے) انھیں تو چاہئے گوشت، انڈا، ملک، فروٹس بادام وغیرہ وغیرہ۔ کیوں مسٹر بھگوڑے عرف کرارٹمیل چیمپئن

آنٹی: بس کر۔ جب دیکھو انٹ شنٹ بکے جاتی ہے (لوسی ہنستی ہے) کئی بار کہا ہے اب تو چھوٹی نہیں ہے۔ ذرا تمیز سے پیش آیا کر، جب دیکھو کھی کھی کھی کھی ۔۔۔۔۔

رہنے دو آنٹی، ہنس لینے دو۔ شادی کے بعد تھوڑے ہی ملیں گی یوں ہنسنے کو اسے۔

جوسیف: واہ! شادی کے بعد عورتیں ہنستی نہیں کیا؟

آنٹی: ہنستی ہیں عورتوں کی طرح، تیری طرح نہیں۔ شادی کے بعد ایسے ہی ہنستی رہی تو کھوٹے روپیہ کی طرح لوٹا دی جاؤگی۔ ہاں ارے جوسیف بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو بیٹھو ۔۔۔۔ ماریہ کیسی ہے؟ اور چارلس؟

جوسیف: دونوں مزے میں ہیں۔

آنٹی: اچھا تو میں چلوں۔ نہ جانے کتنی دیر ٹھہرنا پڑے قطار میں۔ لوسی ڈارلنگ جوسیف کو کٹ لیٹس دے اور ہاں گئے سال کے انگور سے جو وائن تُو نے بنائی ہے وہ بھی دینا ذرا چکھنے کو ۔۔۔۔ اچھا تو میں ہو آؤں۔

جوسیف:۔ آنٹی ذرا سنبھل کر ریل کی پٹریاں کراس کرنا۔ میل کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

آنٹی: :۔ ارے یہ کس سے کہتا ہے رے تو۔ بیٹے ۲۵ سال پہلے تیرے انکل بیاہ کے لائے تھے۔ تب سے اسی مکان میں رہنے آئے ہیں۔ نہ جانے ان ۲۵ سالوں میں کتنی بار یہ ریل کی پٹریاں کراس کی ہیں۔ ان ۲۵ سالوں میں کیا کچھ نہیں بدلا سبھی کچھ تو بدل گیا ہے۔ نہیں بدلیں تو صرف دو چیزیں۔ ایک یہ ریل کی پٹریاں جو زمین کے سینے سے چمٹی ہوئی ہیں، دوسرے تیرے انکل۔ جب میں آئی اُس روز بھی ٹیچر تھے اور آج بھی ٹیچر ہی ہیں (آہ بھر کر جاتے جاتے) اوہ GOD BLESS ME

لوسی: (گلا کھنکھار کر) کہیئے مسٹر بھگوڑے، آپ کٹ لیٹس ٹھنڈے پسند کریں گے یا گرم؟

جوسیف: دیکھو لوسی، اب آنٹی نہیں ہیں۔ زیادہ بولیگی تو پیٹ پیٹ کر طبیعت صاف کر دوں گا۔

لوسی: مسٹر بیٹنے پٹخنے کا کام دھوبی کرتا ہے اسپورٹس مین نہیں (ہنستی ہے)

جوسیف: دیکھو، ہاں

لوسی: (ہنستے ہوئے) ارے جاؤ مسٹر بھگوڑے۔

جوسیف: ٹھہر تو سہی

لوسی: (بھاگتے ہوئے) یہ کوارٹر میل کی دوڑ تھوڑے ہی ہے جو تم مجھے پکڑ لوگے۔ (ہنستی ہے)

جوسیف: ہاتھ میں تو آ۔ پھر دیکھ مزا

(بھاگنے دوڑنے، چیخنے چلانے اور لوسی کے قہقہوں کی آوازیں)

لوسی: (پکڑے جانے سے) او۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔ ی۔۔۔ چھوڑ دو بھی، یہ کیا کرتے ہو۔ میرے ریشم جیسے بال خراب کردو گے۔۔۔ چھوڑ دو بھی۔۔۔ چھوڑ دو نا۔

جوسیف: (نقل کرتے ہوئے) چھوڑ دو نا۔۔۔۔ اب پھر کبھی کرو گی بکواس؟

لوسی: نہیں کروں گی بابا۔۔۔ نہیں کروں گی بس۔ اب تو چھوڑ دو میرے بال۔۔۔۔ (ملتجیانہ لہجے میں) چھوڑ دو نا۔ پلیز۔

جوسیف: اچھا جاؤ بخش دیا۔

لوسی: کتنے اچھے بال ہیں میرے۔ سب خراب کر دئیے۔

جوسیف: سچ مچ بال تو تیرے بڑے ملائم اور خوبصورت ہیں۔

اُوں۔۔۔ معلوم ہے۔ رہنے دو اب۔

جوسیف: جھوٹ نہیں کہتا۔ تیری قسم ویسے تو تو بھی کم نہیں۔۔۔۔ اسکاچ وہسکی ہو جسے دیکھنے سے ہی نشہ۔۔۔۔

لوسی: you silly۔۔۔۔ چلو ہٹو۔ ہم نہیں بولتے تم سے۔۔۔

(جوسیف قہقہہ لگاتا ہے)

جوسیف: اسکاچ وہسکی

لوسی: (زبان نکال کر) لے۔۔۔ بے۔۔۔ بے۔۔۔ بے۔ بھگوڑے

جوسیف: پھر کیا شروع، اسکاچ وہسکی

لوسی: بھگوڑے۔ بھگوڑے۔ بھگوڑے

جوسیف: ٹھہر تو سہی۔۔۔۔ اب کے تو۔۔۔۔۔

(بھاگ دوڑ۔ چیخیں۔ قہقہے)

لوسی: (ہانپتے ہوئے) Oh God میں تو مر گئی۔

جوسیف: اب کہاں جاؤ گی؟ اب تو میری باہوں میں ہو

لوسی: (ہانپتے ہوئے سانس چھوڑ کر) میں تو تھک گئی۔۔۔ باپ رے

جوسیف: اب کہو میں بھگوڑا ہوں یا تو اسکاچ وہسکی۔

لوسی: اوں۔۔۔ ہوں۔ چھوڑ و بھی۔۔۔۔ چھوڑ دو نا۔

جوسیف: نہیں کہتی؟ کہو۔۔ دیکھو ہاں۔۔۔ کہو، ہو نا اسکاچ وہسکی کہو۔۔۔۔

لوسی: یہ۔۔۔۔ یہ کیا؟ نہیں نہیں۔۔۔۔ جوسیف نہیں۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔ for God sake یہ کیا کر رہے ہو؟

اوہ۔ او۔ او (چیخ کر) نہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔۔۔۔

(لوسی کی آخری نہیں کے ساتھ ہی قریب سے ٹرین WHISTLE دیتی ہوئی تیزی سے گزر جاتی ہے۔ ٹرین کی آواز میں لوسی کی آواز ڈوب جاتی ہے۔ ٹرین کی آواز دھیرے دھیرے Fadedown ہوتی ہے)

جوسیف:۔ (درد بھری آوازمیں) ٹرین کی آواز میں سب کچھ
کھو گیا نادر . . . . سب کچھ لٹ گیا . . . . سب کچھ
. . . . کسی کا کردار . . . . کسی کی عصمت

نادر :۔ ہوں . . تمہاری اور لوسی کی جان پہچان کب . . . . .

جوسیف: میری اور لوسی کی جان پہچان کئی سالوں سے رہی ۔ اُسکی
cousin سے میری شادی ہوئی اس سے بھی پہلے کی ۔
تب سے میرا آنا جانا رہا ہے اُس گھر میں ۔ مگر ہم نے کبھی
ایک دوسرے کے لئے ایسا نہیں سوچا ۔ یہ میں بائبل پر
ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں ۔ میں نے اُس کی ہنسی کو ہمیشہ
چرچ کی موسیقی کی طرح پاک سمجھا ۔ پھر بھی یہ سب کیسے ہو گیا!
یہ سب کیسے ہو گیا ۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ۔

نادر: اِسی لئے تو کہا گیا ہے کہ انسان کو ہر وقت چوکنا رہنا
چاہیئے، شیطان اندھیرے کے سائے کے مانند اُسکے
ساتھ رہتا ہے ۔ تم ذرا بے خبر ہوئے نہیں کہ گمراہ کر دیا ۔
خیر، جو ہونا نہیں چاہیئے تھا ۔ ہو گیا، اب تمہیں چاہیئے کہ
تم لوسی کو سمجھا کر بات وہیں پر ختم کر دو ۔ اور . . . .

جوسیف:۔ یہی تو سب سے بڑی ٹریجڈی ہے نادر، بات وہیں
سے شروع ہو رہی ہے جہاں آپ اُسے ختم کرنے کو
کہہ رہے ہیں ۔

نادر: میں سمجھا نہیں ۔

جوسیف: اُس حادثے کے کچھ دنوں بعد میں اسپورٹس ٹریننگ کیلئے
پٹیالہ چلا گیا دو مہینوں کے لئے ۔ وہاں جا کر میں سب کچھ
بھول گیا ۔ ٹریننگ کے بعد جب میں لوٹا تو میری ملاقات
لوسی سے ہوئی ۔ اُس نے مجھ سے اگلے روز ملنے کیلئے
کہا، میں تعلقات بڑھانا نہیں چاہتا تھا ۔ اِس لئے ٹالنا چاہا،
مگر اُس نے جس درد بھرے انداز میں دعوت کو دہرایا، میں
مجبور ہو گیا ۔ دوسرے روز اتوار تھا ۔ ہم چرچ جانے کے
بجائے صبح سویرے باغ میں چلے ۔ میرے پہنچنے سے
پہلے ہی وہ وہاں پہنچ چکی تھی ۔

(موسیقی)

(پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں)

جوسیف: مجھے دیر تو نہیں ہوئی ؟

لوسی: نہیں تو ۔

جوسیف: بیٹھو . . . . . کہو کیا بات ہے ؟

لوسی: کل تمہیں دو مہینوں بعد دیکھا تو کتنی تسکین ہوئی . . . . کتنا
انتظار کروایا تم نے !

جوسیف: دیکھو لوسی ۔ اس روز انجانے میں ہم سے جو کچھ ہوا وہ ایک اتفاق تھا
محض ایک حادثہ تھا اور میں حادثے کو تعلقات بنانا نہیں چاہتا ۔
تم اس حادثہ کو بھول جاؤ بھول جاؤ کہ ہم کبھی . . . .

لوسی: بھول جاؤں ؟ یہ تم کہہ رہے ہو جوسیف !

جوسیف: ہاں میں کہہ رہا ہوں لوسی، تم یہ مت بھولو کہ میں شادی شدہ
ہوں، ایک بچہ ہے میرا ۔

لوسی: یہ میں نہیں جانتی کیا ؟

جوسیف: تو پھر تم ہی بتاؤ ۔ میں تم سے ناجائز تعلقات کیسے رکھ
سکتا ہوں ۔ مجھے معاف کرو لوسی ۔ میں مجبور ہوں ۔

لوسی: تم شادی شدہ ہو اِس لئے مجبور نہیں، بلکہ ایک مرد ہو اِس لئے
آزاد ہو اور میں مجبور ہوں اِس لئے کہ میں ایک لڑکی ہوں ۔۔
ایک کنواری لڑکی جو گناہ کرنے کے بعد اپنے داغدار دامن کو
چھپا نہیں سکتی جوسیف . . . . . جوسیف میں ماں بننے والی ہوں ۔۔

جوسیف :۔ کیا ؟ ! کیا کہہ رہی ہو ؟

(کوّے کی کائیں کائیں کی آوازیں)

لوسی: ہاں جوسیف، تم جسے ایک اتفاق، ایک حادثہ کہتے ہو وہ
میرے لئے ایک رشتہ، ایک اَن چاہا رشتہ بنتا جا رہا ہے ۔
جسے نہ چاہتے ہوئے بھی دو مہینوں سے میں اپنے خون سے
سینچ رہی ہوں ۔ اور جس کے لئے . . . . .

جوسیف: جس کے لئے میں ذمہ دار ہوں، یہی نا ؟

(کوّے کی کائیں کائیں کی آوازیں)

لوسی: نہیں، میں اِس کے لئے تمہیں پوری طرح سے خطاوار تو نہیں
سمجھتی . . . . اور پھر میں نے تمہیں آج . . . . . یہاں پر
اِس لئے تو بلایا نہیں کہ ہم فیصلہ کریں کہ خطاوار کون ہے ۔

جوسیف :۔ تو پھر۔ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

لُوسی : میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ . . . .

جوسیف: کہ

لُوسی : جو داغ میرے دامن میں لگا ہے اُسے میں اور چُھپا نہیں سکتی کیونکہ میری بے چینی، کمزوری اور اُلٹیوں سے ممی کو شک سا ہونے لگا ہے۔ تم سوچو جوسیف اُنھیں پتہ چل گیا تو؟ . . . . ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو؟ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ ایک ٹیچر کی بیٹی . . . اوہ جوسیف۔ تمہیں کچھ کرنا ہی ہوگا جوسیف۔ پلیز۔

جوسیف: میں کیا کر سکتا ہوں۔

لُوسی: (غصّہ سے) یہ میں تمہیں بتاؤں کہ کیا کر سکتے ہو۔

جوسیف: (چڑچڑاہٹ کے ساتھ) میری تو سمجھ میں نہیں آتا . . . . ماریا کو پتہ چل گیا تو . . . . . اچھا پھنسا میں بھی . . . .

(کوّے کی کائیں کائیں کی آواز)

لُوسی: ٹھیک ہے، اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا میں خود . . . .

جوسیف. تو کیا تم یہ بات ممی سے . . . .

لُوسی: یہ سوال پوچھنے کا حق تمہیں اب نہیں پہنچتا۔

جوسیف: (غصّہ سے) کیسی بات کرتی ہو۔ اس بات کا علم اگر لوگوں کو ہو گیا تو صرف تم ہی بدنام ہو گی اور میں کیا بچا رہوں گا؟ میں تو مارا جاؤں گا۔

لُوسی: (نفرت سے) میں . . . . میں . . . میں . . . میں شادی شُدہ ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں مارا جاؤں گا۔ ہُنھ۔ کتنے خود غرض ہو تم! میں پوچھتی ہوں اتنا ہی ڈر تھا تو کیوں کہا تھا مجھے اسکاچ وہسکی۔ کیوں تعریف کی تھی میرے بالوں کی؟ کیوں لیا تھا مجھے میری مرضی کے خلاف اپنی باہوں میں؟ اسی لئے کہ . . . . .

جوسیف: (نرم پڑ کر) سُنو لُوسی۔ جھگڑنے سے کیا ہوگا؟ مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو۔ میں دو چار دنوں میں کچھ نہ کچھ راستہ نکال ہی لوں گا جس سے سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

لُوسی :۔ (آہ بھر کر) ہونہہ کچھ بھی کہہ لو۔ سانپ یا سانپ کا بچہ۔ . مگر اتنا یاد رہے کہ میں اب اس سانپ کے زہر سے اپنے بدلتے رنگ کو اور زیادہ دن زمانے کی نظروں سے چُھپا نہیں سکتی۔

(کوّے کی کائیں کائیں کی آواز)

(موسیقی)

جوسیف :۔ (آہ بھر کر) قادرہاؤس سے لوٹتے ہوئے میں پریشانیوں کا اُبلتا ہوا ایک سمندر اپنے ذہن میں بھر لایا۔ . عجیب غریب خیالات میرے ذہن میں اُبھرتے اور ڈوبتے جاتے . . . . خوفناک خیالات . . . پریشان کن خیالات . . . . ایک دو بار تو میں نے یہاں تک سوچا کہ کسی نہ کسی بہانے اُسے ٹرین کی پٹڑیوں کے قریب سے باتیں کرتے ہوئے لے جاؤں اور . . . . ٹرین کے عین گذرتے وقت . . . . اُفوہ! کیسا خوفناک خیال تھا وہ . . . . دس بارہ روز تو میں مارا مارا پھرتا رہا کہ کچھ کر سکوں، کچھ ایسا انتظام کہ بات بھی بنے اور بدنامی بھی نہ ہو۔ اور آخر میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ ایک جگہ میں نے انتظام کر ہی لیا۔ البتہ اُس کے لئے مجھے کافی بڑی رقم، ماریا کے گہنے رہن رکھ کر جمع کرنی پڑی . . . . میں اس بات کی خبر دینے لُوسی کو وقت پر تیار رہنے کے لئے، کہنے اُس کے گھر گیا . . . .
میں گھر میں داخل ہوا۔

(موسیقی)

(لوسی کے کراہنے کی آواز)

آنٹی :۔ (پریشانی سے) سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ God bless you شاید تیرے ڈیڈی آ گئے ڈاکٹر کو لے کر . . . .

لُوسی: (کراہتے ہوئے) تم کہیں مت جانا ممی۔ تم میرے پاس ہی رہو

آنٹی: اچھا اچھا میری بچی، میں کہیں نہیں جاتی . . . کون ہے جوسیف۔ میں تو سمجھی . . . .

جوسیف: کیوں کیا بات ہے آنٹی؟ . . . کیا ہوا لُوسی کو؟

آنٹی: کیا بتاؤں بیٹے . . . لُوسی نے . . . . لُوسی نے زہر کھا لیا ہے۔

جوسیف :۔ زہر!!! (اپنے سے) کیوں؟

آنٹی : کیا معلوم تب سے پوچھ رہی ہوں مگر کچھ نہیں بتا رہی ہے دکھ سے بتاؤ بیٹی، ایسی کیا بات ہو گئی؟ ایسی کون سی تکلیف تھی تجھے جو تو نے ایسا کام کیا۔ لوسی ڈارلنگ ایسا کیوں کیا تو نے؟

لوسی : ممی ... کیا بتاؤں ممی۔

آنٹی : تجھے میری قسم لوسی بتا کیا بات ہے۔ کیا دکھ تھا تجھے اس گھر میں۔ ایسی کون سی تکلیف دی تجھے میں نے اور تیرے ڈیڈی نے؟

لوسی : ممی، پلیز ممی ... مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے ... مگر

آنٹی : بتا، بتا لوسی (روتی ہے) کیا بات ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے) تو بہت دنوں سے پریشان نظر آتی تھی ... تجھے کھانا اچھا نہیں لگتا تھا ... تجھے وہ اُلٹیاں ... (لوسی سے) کیا، کیا تو ... تو؟

لوسی : ہاں ممی (روتی ہے) ہاں ممی۔ میں ...

آنٹی : تو ماں بننے والی ہے؟ (لوسی زور زور سے روتی ہے) Oh God یہ کیا کر دیا تو نے لوسی ... بتا کون ہے وہ۔ کون ہے وہ جس نے تجھے تباہ کیا۔ کون ہے جس نے تجھے یہ زہر پلایا بتا کون ہے وہ؟

لوسی : ممی، مت ... (کراہتی ہے) وہ؟ م ... یہ مت پوچھو۔

آنٹی : کیوں نہ پوچھوں؟ بتا کون ہے وہ؟ ... مائی گاڈ ... کیڑے پڑیں اس کلموہے کے جسم میں جس نے ہمیں بڑھاپے میں یہ دن دکھایا۔ بتا لوسی۔ اُس سُور کی اولاد کا نام بتا مجھے ... میں زندہ جلا دوں گی اُسے ... بتا لوسی بتا، مجھے اُس کا نام بتا۔

لوسی : میں ... اُس کا ... نا ... م ... نہیں بتا سکتی ممی۔

آنٹی : کیوں نہیں بتا سکتی، جس نے تجھے کہیں کا نہ رکھا اُس حرامزادے کا نام تو کیوں چھپا رہی ہے۔

لوسی : نہیں ممی نہیں (ہانپنے لگتی ہے) کیسے بتاؤں ...

نہیں اُس کا نام ... نا ... م ... نہیں

آنٹی :۔ (سمجھاتے ہوئے) اچھا مجھے نہیں بتاتی نا سہی جوسیف کو بتا کون ہے وہ (جوسیف سے) جوسیف، تم ... ارے جوسیف تم کہاں چل دئے۔

جوسیف :۔ میں ... میں تو ڈاکٹر ...

آنٹی :۔ ڈاکٹر تو اب آتے ہی ہوں گے۔ اُن کے آنے سے پہلے تم پوچھو اِس سے کون ہے وہ۔

جوسیف :۔ میں؟؟؟

آنٹی :۔ ہاں ہاں بیٹے تم تو گھر کے آدمی ہو (لوسی سے) بتا بیٹی، جوسیف کو بتا (جوسیف سے) پوچھو جوسیف۔

جوسیف :۔ لوسی ... (تھوک نگلتا ہے) ب ... بتاؤ لوسی

آنٹی :۔ بتا لوسی۔ تم تو جوسیف کو بہت مانتی ہو نا، اُس کی عزت کرتی ہو نا؟ تجھے جوسیف کی قسم ہے۔ بتا لوسی۔

لوسی :۔ نہیں ... تم ... سوچو جوسیف ... اس کا بیوی کو پ۔ تہ (ہانپتی ہے) اُس ... کی ... زند ... زندگی ...

آنٹی :۔ تم اسے اپنی قسم دو جوسیف اور پوچھو۔ دو قسم۔

جوسیف :۔ لوسی ... تمہیں، تمہیں میری ق سم۔ بتاؤ کون ہے؟ (اونچی آواز میں) کون ... ہے وہ؟

لوسی :۔ تم (تم کی آواز گونجتی ہے) ... تم تو ... کم ... بس کم۔ مت پوچھو۔ جوسیف ... میں ... میں ... تم ... ہاری ... بہت ... سی ... عزت ... کرتی ہوں نا۔ تم تو ... جا ... ن ... تے ... (ہچکی کے ساتھ بات ادھوری رہ جاتی ہے)

آنٹی :۔ (چیخ کر) لوسی!!! (روتے ہوئے) یہ کیا کیا تو نے لوسی ڈارلنگ (آنٹی کے رونے کی آواز Fadedown ہو جاتی ہے)

(موسیقی)

جوسیف :۔ نادر (گلا بھر آتا ہے) اُس نے جاتے جاتے بھی ... جاتے جاتے بھی ... اِس ... تم ... میں سب کچھ کہہ دیا ... بس ایک وہ لفظ "تم" ...

(دوسری کی آواز میں تم تم کو بخشا ہے) اور Jesus Christ نے اپنی سکون بھری آغوش میں لے لیا۔

فادر:۔ میرے بچے تم نے اپنے گناہ کا سچے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس لئے میں جو کہتا ہوں اسے دہراؤ۔

Our Father, Hail Mary and Glory to the Father.

جوسیف:۔ (دھیمی آواز میں دہراتا ہے) Our Father, Hail Mary and Glory to the Father.

فادر:۔ میں مقدس باپ، اس کے بیٹے عیسیٰ مسیح اور ماں Mary کی مہربانیوں کے نام پر تمہیں تمہارے گناہوں کے احساس سے آزاد کرتا ہوں۔ تم جو گناہ کر چکے ہو اُن پر ماں Mary کی نظرِ عنایت ہو۔ وہ تمہیں اُن سے چھٹکارا دلائے۔ اُس کی مہربانیوں میں اضافہ ہو۔ سدا تمہاری زندگی شاد آباد رہے اور تمہیں اس کی مقدس آغوش میں سکون ملے (پیچھے سے چرچ میں گائے جانے والے دکھ بھرے عبادت کے گیت کی آواز پہلے سے اونچی ہے)

جوسیف:۔ (کچھ دیر بعد) ماں Mary، Jesus Christ تم رحمدل ہو، اس گناہگار کے گناہوں کو بخشنے والے ہو اور مائی گاڈ۔ تم تو مجھے بخش دو گے ...... فادر وہ تو مجھے بخش دیں گے مگر اُس کو میں کیا جواب دوں گا؟ ..... اُس کو ..... وہ مجھے کبھی ..... کبھی معاف نہیں کرے گا کبھی نہیں۔

فادر:۔ کون میرے بچے؟

جوسیف:۔ میرا ضمیر۔ میرا ضمیر ....

(چرچ میں گائے جانے والے عبادت کے گیت کی آواز زوروں سے اُبھر کر چھا جاتی ہے)

ممتاز شکیب

لمحوں کی دستک

کچھ دنوں سے عجیب آوازیں
شور کے قافلوں سے بچتی ہوئی
سہمی سہمی اُداس راہوں سے
یُوں دبے پاؤں بڑھ کے دروازہ
کھٹکھٹاتی ہیں بند کمرے کا
جیسے بچھڑا ہوا کوئی اپنا
کہہ رہا ہو
گلے سے لگ جاؤ

رات کی بیکراں خموشی میں
قتل ہوتی ہیں گر کہیں شمعیں
کوئی آواز تک نہیں ہوتی
قطرہ قطرہ لہو ٹپکتا ہے
ڈھونڈے سے نشاں نہیں ملتا
سڑکیں شفّاف
پیرہن اُجلے
شہر کی تیرگی کے مارِ سیاہ
چاٹ لیتے ہیں خون کے دھبّے
دستکیں دے رہا ہے سنّاٹا
خون جھلکنے لگا دریچوں سے
شور کیسا ہے
چیخ کس کی ہے۔
کون قاتل ہے،
کس کا قتل ہوا
چلئے اٹھ کر تو دیکھ لیں آؤ
بڑھ کے دروازہ کھول دیں آؤ۔

(ہندی نظمیں) ترجمہ: مسلم بن رزاق

ڈائری کا ایک ورق

روی ناتھ سنگھ

سڑک کی موڑ کا
موٹا پیڑ گر پڑا
پڑوسی کا کتا
آنجہانی ہو گیا
گھر سے
بیرنگ چٹھی آئی
اک بڑے نیتا نے
بھاشن دیا
سچ مچ بڑا بُرا دن تھا آج کا

ایش ٹرے

آکشے جین

چھوڑ جاتے ہیں مجھ میں
کچھ لوگ تھکاوٹ
کچھ لوگ، یادیں
کچھ لوگ، تلخیاں
کچھ لوگ، اسکیمیں
کچھ لوگ، کچھ بھی

افسانچہ
(مختصر)

سید محمد علی زیدی طالب

سانپ اور بچپن

وہ بڑی آسانی سے سو جاتا ــــ شور میں ہنگامے میں بیچ بازار میں۔ نیند گویا اُس کی پلکوں پر لیٹی رہتی ــــ!
جیسے ہی فرصت ہوئی، پلکیں ملیں اور نیند پھسل کر آنکھوں میں سما گئی۔
بیٹھے بیٹھے، کتاب پڑھتے پڑھتے اور کبھی کبھی تو وہ باتیں کرتے کرتے سو جاتا۔ وہ آنکھیں ــــ جو خواب آور گولیوں کو نیند کی بستی میں بلاوے کے لئے بھیجتیں اور ناکام ہو جاتیں ــــ! اُسے بڑی حیرت، حسرت اور شاید حسد سے تاکتی رہتیں۔
لوگ سوچتے ــــ!
یہ کیوں سو جاتا ہے ــــ؟
اسے اتنی آسانی سے اتنی گہری نیند کیوں آجاتی ہے ؟؟ ــــ
قیاس آرائیاں جنم لیتیں ــــ
"یہ کوئی بہت ہی اونچا نشہ کرتا ہے ــــ"
مگر نشہ کرتے تو اُسے کسی قریبی دوست نے بھی نہیں دیکھا ــــ حتّٰی کہ کسی قریبی دشمن نے بھی نہیں ــــ!
"شاید اُس میں روحانیت بڑھ گئی ہے ــــ اُس نے اپنے افکار، اپنی پریشانیوں اور اُلجھنوں پر قابو پالیا ہے ــــ"
مگر نہیں وہ تو ــــ وہ تو کچھ ایسا مجذوب بھی نہیں دکھائی دیتا ــــ!!
پھر کیا بات ہے ــــ؟ اُسے نیند کیوں آجاتی ہے ؟؟ ہمیں کیوں نہیں آتی ــــ ؟؟؟
نیند ــــ نیند ــــ نیند ــــ
یہ دنیا بھی عجیب ہے دوسرے کی نیند کے پیچھے اپنی نیند اُڑا بیٹھی۔ ہر جگہ، ہر وقت۔ ہر موقع پر ــــ یہی تذکرہ یہی بات ــــ!
آخر ایک دن جب میں بھی اِس سوالیہ نشان کی سولی پر چڑھ گیا ــــ تو میں نے بغیر کسی تمہید کے اُس سے پوچھ ہی لیا ــــ
"میرے دوست ــــ! تمہیں اتنی آسانی سے نیند کیوں آجاتی ہے"
اُس نے مجھے دیکھا ــــ مسکرایا ــــ ہنسا اور پھر قہقہہ لگا کر ذرا درویشانہ شان کے ساتھ بولا۔
"کیا تم بھی ایسی ہی نیند چاہتے ہو ــــ؟"
"ہاں ــــ!" میں نے جیسے کشکول پھیلا دیا
"بچپن میں مجھے جنگل میں ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا اُس کے زہر سے میں قسطوں میں مرتا رہتا ہوں ــــ"
میں سوچ رہا ہوں کہ اب سانپ اور بچپن کہاں سے لاؤں ــ ؟؟

عابد مناوری

اتنے رُخ اپنے دیکھ کے حیران ہوں بہت
آئینہ توڑ کر میں پشیمان ہوں بہت

صحرا ہے دل مرا یہ کوئی جانتا نہیں
سب کی نظر میں شہر ہوں گنجان ہوں بہت

کرتا رہا میں اس کا تعاقب تمام عمر
یہ سچ ہے دوستو کہ میں نادان ہوں بہت

مجھ سے ملا رہا ہے مجھے کوئی اِس طرح
جیسے میں اپنے آپ سے انجان ہوں بہت

کچھ اور بڑھ گیا مرا احساسِ تشنگی
چھو کر سمندر آج پشیمان ہوں بہت

عابدؔ ہے مثلِ شہرِ خموشاں مرا وجود!
آباد اتنا ہو کے بھی ویران ہوں بہت

ضیاء الانجم پرتاب گڑھی

دل آئینہ ہے تو ہر عکس کو اتارے گا
فریب کچھ تو حقیقت کا روپ دھارے گا

ہمارے پاؤں کے تلوؤں نے یہ کہا ہم سے
جو راستہ ہے وہ منزل کو خود پکارے گا

فرازِ سنگ سے پھوٹیں گے آب کے سوتے
لہو بدن میں اگر ہے تو جوش مارے گا

یہ احتیاط یہ شرطِ وفا یہ پابندی
شگفتگیِ ذات کوئی کس طرح گزارے گا

ہزار دل صدمۂ جاں کاہ سے گزر کر بھی
مرا ضمیر نہ ہارا ہے اور نہ ہارے گا

مژہ پہ اشک کے قطرے لرز رہے ہیں ضیاؔ
پھر آج کوئی بہت پیچھے سے تیر مارے گا

شارق میرٹھی

پہلے تھی اور آج یہ دنیا کچھ اور ہے
اب وقت اور کچھ ہے زمانہ کچھ اور ہے

ساقی کی بخششوں کا کرے انتظار کون
اب اپنی تشنگی کا تقاضا کچھ اور ہے

ساقی تری نوازشِ پیہم کا شکریہ
لیکن ہمارے غم کا مداوا کچھ اور ہے

بس یہ نہیں کسی نے ستایا تو رو لئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنا کچھ اور ہے

محدود اس کے گیسو و رخ تک نہ کر اسے
اے دل مرا مقامِ تمنا کچھ اور ہے

دیکھی ہے ہم نے اللہ [illegible]
شارقؔ [illegible] ہے

طنزیہ

انور انصاری

اگر میں گدھا ہوتا

(پروفیسر رشید احمد صدیقی سے معذرت کے ساتھ)

بہت ممکن ہے آپ میرے انشائیے کے عنوان ہی سے اپنی ناگواری کا اظہار شروع کر دیں اور مجھے اوّل درجے کا گدھا اور بیوقوف سمجھنے لگیں۔ مجھے گدھا اور بے وقوف سمجھنے میں آپ سو فیصدی حق بجانب ہوں گے کیونکہ زمانے کا یہی دستور ہے کہ لوگ اپنے آپ کو دانا اور عقلمند سمجھتے ہیں اور دوسروں کو گدھا اور بے وقوف۔ میں بھی آپ کے حسنِ تخیل کی داد دیتا ہوں' میرا اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش! اگر میں گدھا ہوتا تو کیا محسوس کرتا، حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آئے دن میرا سابقہ پڑھے لکھے گدھوں سے پڑتا رہتا ہے جو زندگی میں نت نئے شگوفے کھلانے سے باز نہیں آتے اور تہذیب و تمدن' علم و حکمت' مذہب و ملت' شعر و ادب کی قدریں بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ حد تو یہ ہے کہ کچھ گدھوں نے زندگی کی قدروں کے پرکھنے کا نیا معیار بھی قائم کر لیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خواہش تھی کہ کاش! اگر وہ چور ہوتے تو بڑا مزہ آتا کیونکہ صدیقی صاحب کا قول ہے کہ اس دنیا میں چوروں کی کمی نہیں ہے کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں چور موجود نہ ہوں۔ اسی لئے پروفیسر موصوف کی خواہش تھی کہ وہ پکّے اور اوّل درجے کے چور بن جائیں تاکہ چوری میں اپنا کمال دکھانے کیلئے اُن سے تعویذ مانگتے اور پناہ بھی۔ آپ رشید صاحب کو کچھ بھی کہہ لیں اور جو چاہیں انھیں سزا دیں مگر اُن کے یقینِ محکم کو آپ متزلزل نہیں کر سکتے۔ رشید صاحب کا عقیدہ ہے کہ چوری کے بہتیرے فوائد ہیں۔ چوری سے آپ فلسفی' ادیب' تاجر' شاعر غرض کہ سب کچھ بن سکتے ہیں۔ اگر آپ چوری کو فروغ دیں گے تو یوں سمجھئے اس سے شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوگا جیسے بے روزگاری کا فروغ بیداری [illegible] ملک یا قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی بے روزگاری سے لگایا جا سکتا ہے۔ خیر رشید صاحب کی بات آپ جانے دیں۔ بات میری بے وقوفی کی چل رہی تھی اور گدھا بننے کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ گدھا بننا کیوں پسند نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح دنیا میں چوروں کی کمی نہیں ہے اُسی طرح اس دنیا میں گدھوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی لئے میرا گدھا ہونا بھی تعجب یا دلچسپی کی بات نہ ہوگی۔ ذرا آپ اپنے افعال' کردار' میلانات اور خیالات کا جائزہ تو لیں کہ آئے دن آپ سے کس قسم کی حرکات سرزد ہو رہی ہیں۔ آپ اگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر جھانکنے کی کوشش کریں گے تو آپ کی صورت یقیناً کسی گدھے سے ملتی جلتی ہوگی۔

میرے قبیلے کے گدھے یوں تو ہر میدان میں اپنا کرتب دکھا رہے ہیں مگر لیڈری' شاعری' منافع خوری' سود بازاری اور رشوت خوری کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ جس قوم میں لیڈر اور شاعر زیادہ ہوں گے وہاں گدھوں کی آبادی میں بھی خاصا اضافہ ہوگا۔ جس طرح لیڈروں اور شاعروں کی اقسام کا احاطہ کرنا مشکل ہے' اسی طرح گدھوں کی اقسام کا تعین کرنا بھی تکلیف دہ مسئلہ ہے۔ آپ ہی سوچئے' ہمارے ملک میں صحیح آبادی کا اندازہ کس کو ہے' اور کون ڈاکٹر ایسا ہے جسے ٹھیک ٹھیک ہندوستانیوں کے مختلف امراض کا پتہ ہے۔

اکثر سوچتا ہوں کہ دھوبی اور گدھے میں عرصۂ دراز سے چولی دامن کا رشتہ کیسے موجود ہے۔ دھوبی بغیر گدھے کے رہ نہیں سکتا ہے اور گدھے کا گذارہ بھی کم و بیش بغیر دھوبی کے ناممکن نظر آتا ہے۔ یوں تو دھوبی کپڑا جلانے اور پھاڑنے میں اپنا ثانی نہیں



...ہیں کہ جب مل بیٹھے ہوں تو وقت کا شیرازہ بکھیرنے اور تہذیب و ثقافت کو الگ یا ہلاک کرتے ہیں۔

خدا کے کارساز نے جب اس عالم کی تخلیق کی تو اُس نے سوچا کہ اگر یہ دنیا کو اس حیثیت سے دیا جائے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ چنانچہ چرندوں، پرندوں اور انسانوں کی تخلیق کے علاوہ حضرتِ جلالہ نے گدھوں کی تخلیق بھی ضروری سمجھی کیونکہ اگر خالقِ مطلق صرف انسانوں کی جماعت پر اکتفا کرتا تو ابلیس کے بہکائے ہوئے رشتہ دار بیچارے گدھوں کا کیا ہوتا۔ گدھوں کی تخلیق سے یہ انسان اپنے مکروہ پہلوؤں کو آسانی سے روپوش کرنے کی سعی کرتا ہے اور سارا الزام گدھوں کے سر تھوپ دیتا ہے اور اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھتا ہے۔ جیسے کچھ رئیسوں اور دولت مندوں کو دولت کے غرور میں اپنے آپ کو زیادہ طاقتور، عقلمند، قوم پرست، فلسفی اور صاحب فراز ہونے کا ڈھونگ رچاتے دیکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دولت سے انسان سب کچھ خرید سکتا ہے۔ مگر اس معاملے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دولت اور عقل میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ گدھے دولت مند ہو سکتے ہیں مگر عقلمند نہیں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ میری بات کو بلاوجہ ایک معمولی سی بات سمجھ کر ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور مجھے خواہ مخواہ کا گدھا سمجھ رہے ہیں۔ ویسے ہنسنا اور رونا کسے نہیں آتا مگر ہنسنے اور رونے کا بھی وقت مقرر ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے موقع بے محل گدھے خود تو ہنستے ہیں مگر دوسروں کو رُلاتے ہیں۔ جانے دیجئے آپ کی انا کی تسکین کی خاطر اگر میں تھوڑی دیر کے لئے گدھا بن جاؤں تو اس میں کون سی ہنسی کی بات ہوگی۔ کچھ نہ ہونے سے گدھا ہونا تو بہر حال بہتر ہے۔ ▲

چندہ ختم ہونے کی اطلاع

آپ کا سالانہ چندہ اپریل [illegible] کے اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا بکرم آئندہ سال کے لئے ۱۷/- روپے منی آرڈر سے جلد از جلد بھیج کر ممنون کیجئے۔ امید کہ آپ تجدید خریداری ضرور کریں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کیجئے۔ تجدید خریداری منظور نہ ہو تو بذریعہ خط مطلع فرمائیے ورنہ آئندہ شمارہ حاضر نہ ہو سکے گا۔

نشاط انصاری

○

اُونچا ہوا ہے کرب کا معیار ذہن میں
پھیلا ہے جب بھی درد کا کہسار ذہن میں

پژمردگی کو خوف نہیں میری ذات کو
جب تک انا کا ہے شجرِ چھتنار ذہن میں

فن کی صلیب شانوں پہ لے کر ہوا نڈھال
ہے عہد آشنا سا جو فنکار ذہن میں

دُعا تو دے اِسکو کوئی عصائے خلوص سے
نفرت کے پتھروں کی ہے دیوار ذہن میں

ٹکڑوں کی سرزمیں نظر آئی ہے خونچکاں،
حرف و صدا ہیں برسرِ پیکار ذہن میں

جُزوِ پیمبری ہے نئی شاعری نشاط
کیسے پنپ سکے گی یہ بیمار ذہن میں

ندرت نواز

○

ایک اشارے کے ساتھ بکھرے ہیں
ہم بھی شبنم کے چند قطرے ہیں

پستیوں کی عنایتوں کو سلام
عظمتوں کے سوال اُبھرے ہیں

سب کے سب غیر لگ رہے ہیں ہمیں
جس قدر زندگی کے چہرے ہیں

چیختے پھر رہے ہیں سنّاٹے
سُننے والوں کے کان بہرے ہیں

ہم تو ویرانیوں کے دشت ہیں بھی،
خود کو شاداب کر کے گزرے ہیں

برف کا [illegible] ایک ٹکڑا ہے
لطف [illegible] ٹھہرے ہیں

سلیم شیرازی

○

سنگ اُٹھائے ہوئے پھرتی ہیں یہاں بھی گلیاں
ہم نے سوچا تھا اِسی شہر میں بس جائیں گے

کوئی صحرا ہو کہ گلشن ہو غرض کیا ہم کو
ہم تو بادل ہیں جہاں چاہیں گے برس جائیں گے

یہی خوش فہمیاں دل ہی میں چھپائے رکھو
یہ حسیں پھول یہاں تو ہیں جھلس جائیں گے

ہم کو معلوم نہ تھا شور میں تنہائی کے
اپنی آواز بھی سُننے کو ترس جائیں گے

مکتوبات

● اس سال میں فروری اور مارچ کے شمارے موصول ہو چکے ہیں۔ فروری کے شمارے میں تابعدار احتشام کا طنزیہ مضمون "ہمکس" بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کا مقالہ "گیت کی تکنیک" موضوع سے پورا انصاف کرتا ہے۔ حفیظ جالندھری کا نقل کیا ہوا گیت "تو ہی سب کا پالن ہار" دراصل حفیظ کے نمائندہ گیتوں میں نہیں ہے۔ یہ حفیظ کی اُن چھوٹی چھوٹی کتابوں میں شامل ہے جو بچوں کے لئے ہیں۔ حفیظ کے نمائندہ گیت "نغمہ زار" "سوز و ساز" "تلخابۂ شیریں" اور "چراغِ سحر" میں ہیں۔ عنوان چشتی صاحب کو تجزیہ کے وقت حفیظ کا یہ گیت نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

کاہن مرلی والے

نند کے لال

بنسری بجائے جا

مارچ کے شمارے میں تاج بیگم کا افسانہ "درگاہ کے صدقے" ہمارے سماج کے ایک ایسے پہلو کی تصویر ہے جس سے ہم میں سے اکثر واقف نہیں۔ اس جیسی "غریب سفسارہ" کی نہ جانے کتنی تصویریں تاج بیگم کے مرقعِ خیال میں ہوں گی۔ اُردو ادب اس طرح کی ادبی تخلیقات کے انتظار میں ہے۔

پولیس انسپکٹر، بیڈ۔ ینیڈنسی روڈ، سرینگر (کشمیر) جگن ناتھ آزاد

● مارچ ۱۹۸۰ء کے شمارے میں کئی اہم کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ صفحہ ۴۴ میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب "غالبیات کے چند مباحث" پر تبصرہ پڑھا۔ غالبیات کے سلسلہ میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔ اور ابھی حال میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اس کتاب پر انعام بھی دیا ہے۔ دیوانِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ ایڈیشن کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ دیوان مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری انجمن ترقی اُردو سے شائع ہونے والا ہی تھا کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا اور انجمن ترقی اُردو نے اپنے دیوانِ غالب کی اشاعت روک دی۔ ڈاکٹر سحر صرف اتنا لکھ کر اس منزل سے گذر گئے ہیں۔ دیوانِ غالب کے نظامی ایڈیشن چھ مرتبہ شائع ہوئے۔ نظامی بدایونی نے کچھ تو راس مسعود مرحوم کے ایماء پر اور کچھ انگریزی داں طبقے کے مذاق کو دیکھتے ہوئے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ چھ ایڈیشن بارہ سال کے عرصہ میں شائع کئے تھے۔ ان میں غلطیاں بہت کم تھیں۔ کتابت و طباعت عمدہ تھی۔ کاغذ صاف اور چکنا تھا۔ ہر ایک ایڈیشن پر نیا مقدمہ لکھا گیا تھا۔ غالب کی تصویر اور ایک غیر مطبوعہ خط بھی شاملِ کتاب تھا۔ تیسرے ایڈیشن سے ڈاکٹر سید محمود کا معرکہ آرا مقدمہ بھی شائع کرنا شروع کر دیا تھا جو نظامی بدایونی مرحوم نے خاص طور پر اُن سے اس دیوان کے لئے لکھوایا تھا۔ ایک انگریزی ایڈیشن بھی نظامی پریس بدایوں نے دیوانِ غالب کا بڑے سائز میں جلی حروف میں شائع کیا تھا۔ نیز غالبیات کے سلسلہ میں دو اہم کتابیں بھی شائع کی تھیں جنکے نام نکاتِ غالب اور مرثیۂ مرزا غالب ہیں۔ سہارنپور کے ایک شاعر نے غالب کی بیشتر غزلیات پر تضمین کی تھی اور یہ مجموعہ بھی پہلی مرتبہ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن کی تفصیلات یہ ہیں۔ (۱) پہلا ایڈیشن ہوا ۔ ۱۹۱۵ء (۲) دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۸ء (۳) تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۰ء (۴) چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۲ء (۵) پانچواں ایڈیشن سنہ ۱۹۲۳ء (۶) چھٹا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء

اُمید ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا ذکر تفصیل سے کریں گے اور نظامی پریس بدایوں کے متعدد ایڈیشنوں کی نشاندہی کر کے اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

محلہ سوتھہ بدایوں مبشر علی صدیقی

● مارچ کا شاعر ملا۔ افسانہ "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا" بھی پڑھا۔ الفاظ دل کو چھوتا ہے۔ ہر پہلو سے مکمل ہے۔ احتشام حسین کے قول کے مطابق "مقصدیت افسانہ کا اہم جز ہوتی ہے" سو خوب ہے۔ پیرایا نظم بھی خوب رہا۔ "جگجیون" نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا۔ رضاء الجبار صاحب نے STREAM OF CONSCIOUSNESS AND CLIMAX پر کافی دھیان دیا ہے۔ مگر SUSPENSE۔ برقرار نہیں رکھ سکے۔ فروری کا E. M. FOSTER کے مطابق درست تاثر کی فروعی ہے۔ افسانہ بالکل CONVENTIONAL ہو کر رہ گیا ہے۔ جدیدیت کا رنگ غائب ہے۔ [illegible]

کہانی کار صوبۂ بہار ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ کی تانے بعد واقعات بہار یونیورسٹی کے ایک صاحب ہی کی ہے۔ پتہ نہیں کیا گڑبڑ گھٹالا ہے۔ ہاں اگر وہ اس سے ناواقف ہیں تو میں ان کے ذہن کی داد دیتا ہوں کہ افسانہ میں بھی حقیقت کا رنگ بھرا جاسکتا ہے۔

مقالات بڑے اچھے لگے۔ غزلوں کا سلسلہ اس مہینے کچھ زیادہ متاثر نہیں کرسکا۔ آج کی غزل میں REAL APPROACH TO LIFE ہونا چاہیئے۔

ڈی ملاری جمال پور معرفت رائے پور بہادر پور ضلع مظفر پور — احسان اللہ داہم،

● مارچ کا شاعر ملا۔ سب سے پہلے "تجربات" پڑھے۔ دورِ حاضر کی حقیقت کو آپ نے جس جرأت اور حوصلے سے پیش کیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو اور بھی طاقت ور اور نڈر بنائے۔ ملک میں ایک نئی تبدیلی رونما ہو۔ بھوک اور عذاب غربت و افلاس کا انت ہو۔

اس شمارہ میں قیوم خالد کی کہانی "بڑا یا غم" نعیم فاروقی کی ترجمہ "سیڑھیوں کی گفتگو" اور محترمہ تاج بیگم کی کہانی "درگاہ کے دروازے پر" (جو حقیقت کی عمدہ تصویر کشی ہے) پسند آئیں۔ نظموں میں جناب متین سروش کی نظم "سوداگرانِ اجل کی آواز" تنہا تماپوری کی "پہلا سبق" اور یعقوب راہی کی "فتح کی شام" پسند آئیں۔ غزلوں میں حیدری پرتاب گڑھی، ظہیر غازی پوری، شوکت پردیسی اور نقیب اکبر کی غزلیں اچھی لگیں۔

گورنمنٹ اردو اسکول، چکر مد ضلع دھارواڑ — ظہیر الدین ظہیر

ترائیلے نہیں گجرے

● تازہ شمارہ ابھی پورا نہیں پڑھ پایا ہوں۔ منشورات میں کشمیری کہانی "درگاہ کے دروازہ پر" اچھی کہانی ہے۔ نظموں میں فرحت کیفی کے دو ترائیلے پڑھے۔ ترائیلے TRIOLEN فرانسیسی شاعری کی ایک خوبصورت مگر دشوار صنف ہے جس میں عموماً آٹھ اشعار ہوتے ہیں۔ ان کی ترکیب کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ دوسرے شعر کا مصرع چوتھے میں اور پہلے دوسرے کی ساتویں اور آٹھویں میں [illegible] احمد ندیم قاسمی اور نریش کمار شاد وغیرہ نے بھی ترائیلے لکھے ہیں۔ ترائیلے کی ترکیب ہی دراصل اس کا حسن ہے۔

فرحت کیفی کے دونوں ترائیلے (قومی ترانہ اور ابلیس کا سرمایہ داروں سے خطاب) اوّل تو سات سات اشعار پر مشتمل ہیں، دوئم یہ کہ ان کی ترکیب بھی ترائیلے کی ترکیب سے بالکل مختلف ہے۔ میرے خیال میں انہیں "ترائیلے" نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ مختصر نظمیں ہیں۔

بندرشین واڑی کیپا ڈنڈ جیل روڈ مظفر پور — ابواللیث جاوید

● اب کچھ اُن دونوں نظموں کے بارے میں جو مارچ کے شمارہ میں شائع ہوئی ہیں۔ دراصل وہ دونوں نظمیں "ترائیلے" نہیں بلکہ "گجرے" ہیں جو سات مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ ترائیلے کی ہیئت کچھ اور ہوتی ہے اور اُس میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں۔ کاتب* سے شاید سہواً ایسا ہوگیا ہے۔ ازراہِ کرم اپریل کے شمارہ میں قارئین کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے اُس کی تصحیح فرمادیں۔

ٹی اے وایچ کمپنی۔ گڈ کارنر۔ مدراس ۱ — فرحت کیفی

● مارچ کا شمارہ ملا۔ "تجربات" گو مختصر ہیں، مگر ہر ذہین قاری کا ذہن اس سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ انقلاب بغیر کسی اصول، آداب، قاعدے اور ضابطے کے مہمل ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو بغیر کسی مقصد اور منزل کے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ یہی حال سماج دشمن عناصر دشمنوں اور کچھ ادیبوں اور شاعروں کا بھی ہے۔ وہ بغیر کسی آداب اصول کے ملک میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

کشمیری ادیبہ تاج بیگم کی کہانی بے حد پسند آئی۔ یاسین عباسی اور رضا الجبار کے افسانے بھی اچھے ہیں۔ ڈاکٹر کاظمی نے کوثر چاند پوری کی شخصیت کا بھرپور جائزہ نہیں لیا ہے۔ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ جناب متین سروش اور تنہا تماپوری کی نظمیں بے حد پسند آئیں۔ نظر برنی کا ڈراما "پولیس انسپکٹر" ڈراما کے فن پر پورا نہیں اُترتا ہے اور نہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ارشد صاحب کا انشائیہ ایک کامیاب انشائیہ ہے۔

مجموعی طور سے "شاعر" کا یہ شمارہ بھی گراں قدر ہے۔

اولڈ ہزاری باغ روڈ۔
مقابل چونا بھٹی۔ رانچی ۲ — امداد انصاری

* کتابت کے اس سہو کا افسوس ہے۔ ادارہ

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شبِ پیر

از ـــــــــــ سید حرمت الاکرام

"شبِ پیر" حرمت الاکرام کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے اگر اسے منتخب مجموعہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کی ۵۵ نظمیں اور ۱۹۶۰ء تک کی ۹۹ غزلیں شامل ہیں۔ آج کی عام روش کے مطابق اگر انہیں پھیلا دیا جائے تو دو مجموعے بن سکتے ہیں۔ چونکہ حرمت الاکرام اُن وسائل سے محروم ہیں جو اُن سے کم درجے کے شعراء کو مل جاتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی نظموں اور غزلوں کے الگ الگ مجموعے شائع نہ کر سکے۔

۲۷ سال کا زائیدۂ فکر شعری سرمایہ کسی شاعر کے مجموعی مطالعہ کے لئے نہ صرف کافی ہے بلکہ اُس کے معیار و مقام کی تعیین میں بھی معاون ہو سکتا ہے۔ حرمت الاکرام اُردو کے اُن گنے چنے شعراء میں سے ہیں جنہوں نے مسلسل شعری انہماک سے کام لیا ہے اور جن کی شاعرانہ اہمیت کے سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں: "اُجالوں کے گیت" اور "کلکتہ ایک رباب" کی اشاعت سے حرمت الاکرام کی شاعرانہ حیثیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوا تھا لیکن صحیح معنوں میں ہمارے ذہن کو اُن کے شعری ارتقا کی طرف وہ نظمیں اور غزلیں منتقل کرتی ہیں جو گذشتہ پانچ چھ سال میں ادبی رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ اب "شبِ پیر" کی اشاعت سے تنقید و تبصرہ کا امکان وسیع تر ہو رہا ہے۔ اُمید کہ انہیں جانبدار اور مصلحت پسند نقیدوں کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ حرمت الاکرام کو نہ ترقی پسند گروہ میں شامل کیا گیا اور نہ جدت پسند حلقۂ شعراء میں۔ اس لئے وہ گروہی پروپگنڈے سے بھی محروم رہے ہیں۔ خود انہیں یہ فن آتا نہیں ہے۔

بہرحال ــــ حرمت الاکرام کو اُردو کے ممتاز شعراء کی صف میں تو جگہ ملنی چاہیے بلکہ صرف عظمتِ فن کی رہ جاتی ہے ــــ عظمتِ فن کے لئے (۱) فکر و احساس و شعور کی پختگی (۲) اسلوبی جدت و ندرت و تازگی (۳) فنی بصیرت اور عصری آگہی' ضروری ہوتی ہے۔ حرمت الاکرام کی شاعری میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ اگر ہم "قدیم کلاسیکیت" اور "جدید کلاسیکیت" کی دو اصطلاحیں تسلیم کر لیں تو حرمت الاکرام پر آخر الذکر اصطلاح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور مظہر امام کی یہ چھوٹی سی رائے ــــ

"موضوعات کے اعتبار سے اُن کی شاعری انسان کے داخلی اور خارجی تصادم کا آئینہ خانہ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے جو اس کربناک عصر کے تلخ حقائق کو شہد آگیں بنانے اور افراد کے درمیان شکست ہوتے ہوئے رشتوں کو آمیز کرنے کا فن جانتا ہے۔

حرمت الاکرام کی شاعری فکر و احساس اور تفکر و وجدان کا خوبصورت اتصال ہے۔ فلسفیانہ آمیزش کے باوجود اُن کے شعری پیکروں کا خمیر لطیف و نازک، سجل اور شیتل ہے۔"

"شبِ پیر" میں شائع شدہ پرانی نظموں اور غزلوں کی بحث میں اگر ہم نہ پڑیں اور صرف ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء (کم و بیش دس سال) تک کی نظموں اور غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیں تو جو اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ "اکبری فکر" کی شاعری نہیں ہے' نہ اس پر اُس تقلید و روایت کا اثر ہے جو موجودہ اُردو شاعری میں عام ہے۔ حرمت الاکرام کا شعری آہنگ متاثر کرتا ہے۔ یہ سنجیدہ اور پُر وقار لہجہ کی شاعری ہے۔ اس میں تفکر و ترنم' استعاروں' تشبیہوں' کنایوں' ترکیبوں اور لفظوں کی خوش وضعی دامنِ دل کھینچتی ہے۔ غزلوں کے اشعار ہوں یا آزاد اور پابند نظمیں' سب میں لفظ و معنی اور صوت و آہنگ کے حسن کے ساتھ فکر کی گہرائی اور فنی بصیرت ملتی ہے۔

"شبِ پیر" کی اشاعت اُردو کے شعری سرمایہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اس شعری مجموعہ پر دو ہزار روپے کا انعام بھی دیا ہے۔

صفحات ۲۴۰ ـــــــــــ قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ: حرمت الاکرام [illegible]

ارتعاشِ

از ——— سیّد شمیم گوہر

یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ غزل نگار کی عمر صرف پچیس سال اور شاعری کی عمر محض چار سال ہے۔ شمیم گوہر ادبی، تاریخی، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کا ذہن جھکاؤ کلیتاً جدیدیت کی طرف ہے اور وہ رسم و تقلید کی ابتدائی منزل سے گزر رہے ہیں۔ ان کی غزلیات کے مطالعہ سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ جو چند باتیں یا چند خیالات ان کے ذہن کو گھیرے ہوئے ہیں، وہ انہی کو اُلٹ پلٹ کے شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں ؎

کمرہ ہی کا فرش کتنا خالی اکیلا ہے ۔۔۔ وہ ابھی دیکھیے چھت پر نظر آنے لگی

بر سرِ بام کئی روز سے وہ آئی نہیں ۔۔۔ اب یہاں لگ بھی چاند نکل جانے سے

آہ وہ بکا سے ساری فضائیں لرز اٹھیں ۔۔۔ شاید کوئی بزرگ بچھڑ کے کا مر گیا

ہر شخص غم زدہ ہے محلہ کا اے شمیم ۔۔۔ شاید ہوئی ہے موت کسی نوجوان کی

آنکھیں کھلیں تو خود کو اکیلا گمان کیا ۔۔۔ نشہ تمام رات کا نالی میں اُتر گیا

جو رات آج مجھ پہ نہ کچھ بھی چڑھا نشہ ۔۔۔ کل کی شراب میں تو زبردست تھا نشہ

یہ کیا ضرور کہ رستے میں بھی تو اضع ہو

ہم اپنے گھر میں بہت اہتمام کرتے ہیں

مجھے شعورِ ضیافت تو کچھ نہیں لیکن

جب آپ آ ہی گئے ہیں تو آئیے صاحب!

قطع نظر اس سے کہ یہ شاعری کس معیار کی ہے، تبصرہ نگار شاعر کی بدخیالی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے۔ شمیم گوہر کے کرو ذکر و اسلوب اور ناپختہ ذہن کی جھلک ہر غزل میں موجود ہے۔ علمی و فنی خامیاں بھی جا بجا پائی جاتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کئی کئی استادوں کی نظر سے ان کا کلام گزر چکا ہے۔!

رسم مزاج پرسی کی آئے وہ جب نبھانے ۔۔۔ کہنا کہا طبیعت اب ٹھیک ہو رہی ہے

جو قصّہ نواز ہمیشہ سے بیکار ہے ۔۔۔ اب وہ کھانی سنتے ہیں بیمار کی طرح

دنیا کے گیت نہ ہم کو سنائیے صاحب ۔۔۔ پھر آپ یہ دکھ نہ حل سکے جگائیے صاحب

قاتل کا کھوج میں پریشان نہ دیکھیے ۔۔۔ اپنے لہو کو خود ہی اچھالا کر جناب

کوئی معمولی ذوق و شعور رکھنے والا شخص بھی ایسے اشعار کو شاعری کا درجہ نہیں دے سکتا۔ معلوم نہیں کس [illegible] نے شمیم گوہر کو اپنا وحشی کا کلام شائع کرنے پر مجبور کیا؟ ڈاکٹر سیّد محمد عقیل نے بھی اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے"۔

"ارتعاشِ" میں دو چار شعر ایسے بھی نظر آتے ہیں جو شمیم گوہر کی ذہانت اور ان کے شعری شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ اُمید کہ وہ کم از کم اس بات کا خیال رکھیں گے جن کا نمونہ یہ دو شعر ہیں ؎

لہجے کی سادگی کو لپیٹ کے آگیا ۔۔۔ وہ شخص کچھ عجیب طرح جو گمان تھا

آنا تھا کچھ کو جو کسی کی گواہی کے واسطے ۔۔۔ ہر آستین پہ تیرے لہو کا نشان تھا

۱۱۲ صفحات قیمت ۲ روپیے ۵۰ پیسے۔ ملنے کا پتہ: کتابستان چوک۔ الہ آباد

شمعِ خلوص

از ——— محمد عباس خان سفیر

یہ ایک معمّر اور مشاق شاعر کا مجموعۂ کلام ہے۔ محمد عباس خان سفیر کا قیام دہرہ دون میں ہے۔ ان کا سلسلۂ شاعری مرزا داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ قدیم کلاسیکی شاعری کا جو انداز و اسلوب تھا وہی ان کا انداز و اسلوب ہے۔

یہ مطلب آشنا دنیا، یہ ظالم بے وفا دنیا

شریکِ عیش کر لیجے، شریکِ غم نہیں ہوتی

عدم کے جانے والے قافلے دن رات چلتے ہیں

مگر اس انجمن کی دلکشی کچھ کم نہیں ہوتی

سلاست، سادگی اور روانی سفیر صاحب کے کلام کا خاصّہ ہے۔ چونکہ وہ خود متّقی، پرہیزگار، خوش اخلاق و خوش گفتار ہیں اس لیے ان کے کلام میں بھی پاکیزہ خیالات ہے۔ مگر یہ روایتی شاعری سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کے صاحبزادے جبّار جمیل نے اچھا کیا کہ اپنے والد کے شعری افکار کو محفوظ کر دیا۔

۲۲۴ صفحات ۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ: اورینٹ بک ڈپو۔ پلٹن بازار ۔ دہرہ دون

بقیہ صفحہ ۶۶ درفشار

کا انتقال ہو گیا۔ وہ یہاں بغرضِ علاج آئے ہوئے تھے۔ مرحوم ایک خوش فکر شاعر، ساحلی کالج کے اور نہایت کامیاب ڈاکٹر تھے۔ عوام و خواص میں ان کی مقبولیت بے پناہ تھی۔ چند سال پہلے بڑے اہتمام سے ان کا مجموعۂ کلام شائع ہوا تھا۔ وہ مولانا ناطق گلاؤٹھوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حق مغفرت کرے۔

محفلِ اپنی

اپریل ۸۴ء کا یہ شمارہ

اپریل کا یہ تازہ شمارہ پھر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ تاخیر کی کئی وجہ ہیں جن کی صراحت نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ جہاں تک اس شمارہ کے مشمولات کا سوال ہے نثر اور نظم کے دونوں حصے بھرپور ہیں۔ تحقیق کے اصول پر جو مقالہ شائع ہو رہا ہے اس سے جامعاتی سطح پر کام کرنے والوں کو کافی فائدہ پہنچے گا۔ اتنے شرح و بسط سے تحقیق کے اصول پر اب تک کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ تین اچھے طنزیہ و مزاحیہ مضامین جمع ہو گئے تھے وہ بھی بیک وقت شائع کئے جا رہے ہیں۔ نظمیں کم ہیں لیکن غزلیں زیادہ اور فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ کئی افسانے بھی متاثر کرنے والے ہیں۔

پچھلے شمارہ مارچ ۸۴ء میں ایک کہانی "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں "کسی کو کس سے متاثر ہو کر" لکھا ہوا ہے۔ کہانی نگار یاسین عباسی نے لکھا ہے کہ ان کی یہ کہانی بالکل طبع زاد ہے اور اس پر کسی مغربی کہانی نگار کا اثر نہیں ہے کسی نے ان کی کہانی کے آخر میں یہ جملہ لکھ دیا تھا۔ اور وہ اسی طرح چھپ بھی گیا۔ قارئین اس جملہ کو کاٹ دیں۔

قومی یکجہتی نمبر

"قومی یکجہتی نمبر" مئی اور جون کا مشترک شمارہ ہوگا اور کافی ضخیم۔ یہ جون کے وسط تک قارئین کو مل جائے گا چونکہ اخباری کاغذ کا مسئلہ نہایت نازک ہے اور اس اہم مسائلی نمبر کو بڑی تعداد میں چھاپنا ہے، اس لئے اس میں مزید ایک عام شمارہ شامل کر دیا گیا ہے "قومی یکجہتی نمبر" کے بعد جولائی میں عام شمارہ نکلے گا۔ قارئین اس بات کو نوٹ کر لیں۔

مہندر ناتھ کی یاد میں

"شاعر" کا جولائی یا اگست کا شمارہ رفیقِ ادارہ مہندر ناتھ کے لئے وقف کیا جائے گا۔ تمام ادیبوں سے عموماً اور مہندر ناتھ سے قربت و محبت رکھنے والے قلم کاروں سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ مئی کے آخر تک اپنے مضامین بھیج کر اس اشاعت کو کامیاب بنائیں۔

قومی یکجہتی منشور

جن احباب نے "قومی یکجہتی منشور" کی کاپیاں طلب کرا کے اب تک واپس نہیں

کا جواب ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے نام کی تاریخ کریں اور اپنے شہر کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے اس پر دستخط کرا کر فوراً بھیج دیں۔ جن شہروں میں منشور کی کاپی نہ پہنچی ہو، ان کے لئے دفتر سے طلب کر لی جائے۔

ایک کارِ ثواب

"شاعر" کا "قومی یکجہتی نمبر" ایسے وقت میں نکل رہا ہے جب کہ ملک میں یکجہتی اور اس کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہر اُردو داں کا فرض ہے کہ وہ اس مجموعۂ یکجہتی کو اپنے حلقۂ احباب و اعزا تک پہنچائے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے افراد کو (جن سے قربت ہو) یہ نمبر پڑھنے کے لئے دیا جائے اور اُردو نہ جاننے والوں کو پڑھ کر سُنایا جائے۔ "قومی یکجہتی نمبر" کو اپنے شہر کے اسکولوں، کالجوں اور تمام لائبریریوں میں پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر کے آپ ایک بڑا کارِ ثواب انجام دیں گے۔ اس سے بڑی نیکی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

رفتار

(علمی۔ ادبی۔ تہذیبی خبریں)

اتر پردیش اُردو اکادمی کے انعامات

اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے ۹۰ مصنفین کو ان کی ۸۳ء میں شائع شدہ کتابوں پر ایک لاکھ تین ہزار روپئے کی مجموعی رقم بطور انعام دی ہے۔ پانچ کتابوں پر تین تین ہزار روپئے کے، تیرہ کتابوں پر دو دو ہزار روپئے کے، بارہ کتابوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے، اکتیس کتابوں پر ایک ایک ہزار کے اور چالیس کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دئے گئے ہیں۔ کتابوں پر ان انعامات کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام حسین مرحوم۔ ل۔ احمد اکبر آبادی اور شیام موہن لال جگر کو ان کی طویل علمی، ادبی اور شعری خدمات پر پانچ پانچ ہزار روپے کے انعامات بھی دئے ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے انعامات

دہلی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۳ء کے لئے کلیم الدین احمد کو ادبی تنقید میں۔ قاضی عبدالستار کو ناول اور افسانہ میں اور ڈاکٹر گیان چند جین کو غالبیات پر پانچ پانچ ہزار روپئے کے انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان [illegible] انتقال

یہ خبر بڑے رنج و افسوس [illegible] مبتی [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] ہیں

مہاراشٹر کا فوک آرٹ

فوک آرٹ عوام کے متحرک تصور اور حسی شیسٹر زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ملک آزادی کے بعد سے اس کے تمام میدانوں میں ہندوستانی قوم کی زیست نو کا عالم سیلاب آگیا اور مہاراشٹر اس میں پیچھے نہیں رہا۔

دو [illegible] تماشہ اور پوارٹے یہی مہاراشٹر کی ایک زندہ حقیقت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فوک آرٹ ہیں مگر ان کو پیش کرنے میں جو اعلیٰ درجہ کا فن اور مہارت پیش کی جاتی ہے۔ وہ اپنا درجہ الگ رکھتا ہے۔ تماشہ ایک قسم کا فی البدیہہ ڈرامہ ہے جو کہ ایک ایسی تھیم کے گرد گھومتا ہے جو کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کو چند کردار مختلف لوگوں کا کیریکٹر کر کے پیش کرتے ہیں جس میں نہ تو سیٹ ہیں اور نہ ہی پوشاک میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ اور پھر وہ اسٹیج چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اس میں ایک گروپ دوسرے گروپ سے فی البدیہہ نظموں کے ذریعہ سوال و جواب کرتے ہیں جس میں [illegible] معنی ہوتے ہیں اور اکثر ذو معنی ہوتے ہیں۔

لونی' ایک قسم کا فوک نغمہ ہوتا ہے جو کہ اداکار گاتا ہے اور اس کا مطلب حرکتوں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہیں سامعین کو بتاتا ہے ——— 'پواڑہ' ایک رزمیہ ہوتا ہے جو کہ موقع پر ہی روایتی افسانوں کے نظم کیا جاتا ہے۔ جس میں مرہٹہ تاریخ کی بہادری کے کارنامے شامل ہوتے ہیں یہ دو قسم کے فوک نغمے یعنی 'لونی' اور 'پواڑہ' عوام کے ذہنوں پر کافی اثر رکھتے ہیں

عام عقائد و روایات

مہاراشٹر کے عوام کے عقائد و روایات جو کہ عام طور پر ہندوستانی عقائد و روایات کا ہی ایک حصہ ہے مگر اپنی کچھ انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں۔ کسی طرح حقیقتاً اور سچ پوچھیے تو روایتی عوام کے متحرک تصور اور باطنی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں خیال کے طور پر پایا جاتا ایک مذہبی نغمہ ہے جو کہ قومی ہیرو [illegible] [illegible] بابی راؤ پیشوا اور تانیاجی ملسورے [illegible] ہے۔ پواڑہ مرہٹی زبان کی ملایت [illegible] کے

مطابق بدلتا رہتا ہے اور آج کل پواڑہ سماجی اصلاح کے لئے بھی اسی طرح گایا جاتا ہے۔ جس طرح کہ یہ متذکرہ ہیروؤں کے لئے گایا جاتا رہا ہے۔ اس کی مخصوص موسیقی بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ مگر سننے والے صرف سننے والے ہی نہیں ہوتے بلکہ دل اس مقصد کے لئے جس کے لئے وہ گایا جاتا ہے دھڑکنے لگتے ہیں اور خیالی طور پر وہ اسی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کو نظم کرنے اور گانے والے شاہیر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جن کو عوام کی زبردست عقیدت حاصل کرتے ہیں۔ ان شاہیروں کے پاس بہت سی پرانی فوک کہانیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں اور یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر گھوم گھوم کر فضا میں ایک عجیب سی زندگی جگاتے رہتے ہیں۔

انہیں کی ایک شاخ کیرتن اور بھجن بھی ہے۔ جو کہ خصوصی طور پر مذہبی مقامات مذہبی اجتماع وغیرہ میں گایا جاتا ہے۔

ریاستی تماشہ مہوتسو

ریاستی تماشہ مہوتسو حکومت کی جانب سے ہر سال منتخب مقامات پر منعقد کیا جاتا ہے۔ تماشہ مہاراشٹر کا ایک پرانا فوک آرٹ ہے اور حکومت اس کو گذشتہ نو سال سے منظم کر رہی ہے۔ تاکہ اس کو تعلیم یافتہ شہری آبادی میں شہرت دی جائے۔ اور تماشہ نگاریوں کے معیار اور درجہ کو بلند کیا جا سکے۔ اس فیسٹول میں منتخب سنگیت پارٹیوں اور ڈھولکی، بھانڈوں کو حصہ لینے کے لئے دعوت دی جاتی ہے۔ اور ان کو کئی نقد اور دستی انعامات دیئے جاتے ہیں۔ حکومت مہاراشٹر ان فیسٹول پر سالانہ ۵۰۰۰۰ ہزار روپے سے زیادہ صرف کرتی ہے۔

اسی طرح حکومت فیسٹول آف فوک آرٹس بھی سالانہ منعقد کرتی ہے۔ جو کہ فوک آرٹس کی حوصلہ افزائی کی اس کی پالیسی کے

(بقیہ صفحہ ۰، پر دیکھئے)

ستا مرہٹی

مہاراشٹر میں اصلاحاتِ آراضی

اصلاحاتِ آراضی ہماری ترقی پذیر سوسائٹی میں بڑی معاشی اور سماجی اہمیت کی حامل ہیں جس سے زراعتی پیداوار کے لئے ضروری ڈھانچہ مہیا ہوتا ہے۔ نیز تقسیمِ آراضی میں فرق دور کرنے میں مدد ملتی ہے اور آبادی کے کمزور طبقات کو فوائد ملتا ہے ریاستی حکومت نے مختلف قانونی اور عملی اقدامات کے ذریعہ ریاست اور کسان کے درمیان بیچ کے آدمی کو ختم کر دیا ہے۔ ان اقدامات کے باعث دستیاب اراضی بے زمین مزدوروں کی بازآبادکاری میں صرف کی گئی ہے۔ ملکیتِ اراضی کی نگرانی سے زمین کاشتکاری کی بہتری ہوئی ہے

آزادی سے قبل ہمارے سماج کے زراعتی ڈھانچہ میں مختلف لگان داریاں موجود تھیں جس کے باعث ریاست اور اصل کسان کے درمیان "بچولی" پیدا ہو گئے تھے۔ کاشتکار ماتحت لگاندار تھا۔ جسے نہ کوئی ضمانت حاصل تھی نہ کھیتی باڑی کو سدھارنے کے لئے کوئی محرک تھا "بچولی" یعنی زمیندار، وطن دار اور جاگیردار وغیرہ کاشتکار سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔

گذشتہ ۲۵ سال کے دوران ریاستی حکومت نے اصلاحات اراضی کے لئے متعدد قانونی اور عملی اقدامات کئے ہیں۔

درمیانی واسطے کا خاتمہ

حکومت نے بتدریج انعام کے خاتمہ کی کارروائی شروع کی۔ ایک دیواستھان، انعام کے سوا تمام انعامات اور لگان داریاں ختم کی جا چکی ہیں، ان لگان داریوں اور انعامات کے خاتمہ کے باعث ۷۷، ۷۸، ۶ ، ۶۷ ہیکٹر اراضی رعیت واری بنادی گئی۔

اراضی لگانداری خاتمہ کے قوانین کے مطابق یہ اراضی اُن اشخاص کو جو مالک تھے سُموری قبضہ قیمت کی ادائیگی پر دوبارہ دی جاتی ہے ان قوانین کی رو سے ایسی اراضی جو کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ہے نیز جس پر کوئی فرد حق نہیں رکھتا ہے۔ سرکاری قرار دی گئی ہے۔ قوانین کے تحت مقررہ مدت میں قبضہ قیمت کی عدم ادائیگی پر بھی اراضی حکومت کے قبضہ میں آجائے گی ایسی اراضی صرف ان اشخاص کو دی جاتی ہے۔ جو اصل قبضہ دار ہیں حکومت کی تحویل میں اراضی اس شرط کو اگر کوئی جزیا جاتی مقاصد کے لئے دی جاتی ہے۔ ان اقدامات کے باعث تقریباً ۸۰۰، ۹، ۸۰، ۱۵ ہیکٹر اراضی حکومت کی تحویل میں آئی۔

لگانداری قوانین

ریاست کے تین خطّوں میں تین مختلف قوانین لگان داری لاگو ہیں یعنی بمبئی لگان داری اور زراعتی اراضی ایکٹ ۱۹۴۸ء مغربی مہاراشٹر کے علاقہ میں حیدرآباد لگان داری اور زراعتی ایکٹ ۱۹۵۰ء مراٹھواڑہ علاقہ میں اور بمبئی لگان داری زراعتی اراضی (ودربھ علاقہ) ایکٹ ۱۹۵۸ء ودربھ علاقہ میں نافذ ہے۔ یہ قوانین کم و بیش یکساں ہیں۔

مغربی مہاراشٹر میں یہ اصلاحی قانون یکم اپریل ۱۹۵۷ء ودربھ میں یکم اپریل ۱۹۶۱ء اور یکم اپریل ۱۹۶۳ء اور مراٹھواڑہ میں ۵۷-۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۹ء میں مختلف تاریخوں سے لاگو ہوا۔

چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۳ء تک ۱۱،۸۰،۰۰۰ ہیکٹر آراضی کے معاملے میں ۱۹۰ ، ۷۰ ، ۱۱ لگان دار مالک قرار دیئے جا چکے ہیں۔ لگان دار کو لازمی خریداری اراضی حق دیتے وقت زمیندار کو آخری موقع دیا گیا کہ وہ ذاتی کاشت کے لئے اپنی آراضی لے لیں دوبارہ حصول اراضی کے لئے درخواستیں کی گئیں ۴۳۹۲۲ درخواستیں میں سے ۴۲۹۷۲ درخواستوں کا ۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء تک فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ ۲۶۱۴۹ زمیندار اپنی اراضی دوبارہ حاصل کر چکے ہیں جس کا رقبہ ۱۴۷۸۴۲ ہیکٹر ہے یہاں اعداد شمار سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست میں لگانداری قوانین کی عمل درآمد تکمیل کے قریب ہے۔

ملکیت [illegible]

[illegible]

کیٹ کی حد پر عائد ہوا تھا اُسے دوبارہ مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء سے نافذ العمل ہے۔ اس ایکٹ کے تحت آبپاشی اراضی دو فصلوں اور ایک فصل میں دھان آبپاشی اراضی ہے اور اسی پر اکثر ۱۰،۲۷ اور ۴۸ ایکڑ ذیلی تقریباً ۲ ... ، ۰۰ اور ۱۹۲ ہیکٹر کی حد مقرر کی گئی ہے۔ خشک فصل اراضی کے مقابلے میں مقامی علاقہ جات کے، ضلع اقسام زمین۔ اور حد بندی ۱۶، ۲۷، ۸۴، ۹۶، ۱۰۸، ۱۱۲ اور ۱۲۶ ایکڑ ذیلی تقریباً ۴، ۴۴، ۸، ۱۸، ۳۲، ۳۶، ۳۸، ۲، ۴۳، ۶، ۲۵ اور ۴۴ ہیکٹر) رکھی گئی ہے۔

ایکٹ کے آغاز سے ۱۲۷۵۳ مالکان نے حد بندی رقبہ سے زائد اراضی کے تعین کے لئے نقشہ جات داخل کئے ہیں۔ ان میں سے ۲۲ ہزار کے معاملے میں جہاں مین ہو چکی ہے اور ۲۲ ہزار ہیکٹر اراضی فاضل قرار دی گئی ہے۔ اس رقبہ میں سے ۳،۴۰۰ ہیکٹر اراضی جو جائنٹ اسٹاک شکر کمپنیوں کی اراضی میں سے فاضل قرار دی گئی ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ فارمنگ کارپوریشن کو دی گئی ہے۔ ۱۷۴ ہیکٹر اراضی ۱۲،۲۱۱ بے زمین اشخاص اور ۵۷ سوسائٹیوں کو تقسیم کی گئی ہے۔ اراضی حکم امتناعی وغیرہ میں ملوث ہے اور بقیہ تقسیم کی جا رہی ہے۔

نئی پالیسی سے مطابقت کے تحت اس ریاست نے اگست ۱۹۷۲ء میں ایک بل پاس کیا جس کا مقصد زمین کی حد میں کمی کرنا تھا۔ اس پر صدر ہند کی منظوری کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس بل میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی چاہے وہ زمین سرکاری ذرائع سے سینچی جاتی ہو یا نجی ذرائع سے۔ پہلے جو زمین پمپ کے ذریعے سینچی جاتی تھی اس کی حد ۱۸ ایکڑ مقرر کی گئی اور جو زمین ایک فصل میں پمپ کے ذریعے سینچی جاتی تھی اس کی ۲۷ ایکڑ مقرر کی گئی خشک فصل والی زمینوں کے سلسلے میں کوکن اور دوسرے اضلاع کے دھان والے علاقوں میں حد ۳۶ ایکڑ طے کی گئی اور دوسرے اضلاع کے دوسرے خشک علاقوں میں ۴۸ ایکڑ اور دوسری خشک فصلوں والے علاقوں میں ۵۴ ایکڑ کی حد مقرر کی گئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ حد بندی کے اس قانون کی رو سے تقریباً ... لاکھ ہیکٹر اراضی فاضل قرار دی جائے گی جو کہ بے زمین اشخاص کے درمیان تقسیم کی جائے گی۔ ایکٹ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ کسی ... [illegible] ... یہ رکھی گئی ہے کہ ... [illegible] ... حصہ ... [illegible] ... شیڈولڈ کاسٹس ... [illegible] ... [illegible]

محفوظ کیا جائے گا۔

زمینوں کی چک بندی

زمینوں کی چک بندی کی مہم کے دوران کاشتکاروں کی بکھری ہوئی زمینوں کو یکجا کیا گیا تاکہ ایک بہتر کاشتکاری ہو سکے۔ اس طرح سے جو بڑی رقبہ کی زمین بنی اسنے زمین مالکان کو زمین سدھارنے کے لئے اکسایا۔ ریاست کے تقریباً ... ۳۵ گاؤں میں چک بندی کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ جس کے تحت ۱۰۱۱۷۰۰ لاکھ ہیکٹر اراضی آئی ہے۔ یہ اسکیم مغربی مہاراشٹر میں پوری طرح سے یکم اپریل سنہ ۱۹۶۰ء میں اور وعدر بھ اور مراٹھواڑہ علاقوں میں یکم اپریل ۱۹۵۹ء میں شروع ہوئی اس اسکیم کا نفاذ ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء تک ۹۲ء۹ لاکھ ہیکٹر کا علاقہ رکھنے والے ۱۴۰۹ گاؤں میں ہو چکا تھا بقیہ کام اُمید ہے کہ آئندہ بارہ سے تیرہ سال کے دوران مکمل ہو جائے گا۔ اور نفاذ کی مشنری کو زیادہ مضبوط کرنے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

سرکاری بیکار جنگلاتی زمین کی کاشتکاری کے لئے تقسیم

ریاست کی تشکیل کے بعد موجود بیکار سرکاری زمینوں کو کاشتکاری کے لئے بے زمین افراد میں تقسیم کرنے کے مناسب اقدامات کئے گئے اس مقصد کے لئے خصوصی قوانین وضع کئے گئے جس میں زمین کے الاٹمنٹ کے لئے مناسب طریقہ کار متعین کیا گیا مقامی بے زمین آبادی کو سرکاری بیکار زمین حاصل کرنے کے کافی مواقع فراہم کرنے کے مد نظر اصل ترجیحات سنہ ۱۹۷۱ء میں دوبارہ شروع کی گئیں۔ اس کے علاوہ کاشتکاری کے لئے جنگلاتی زمین کا کافی بڑا حصہ مہیا کیا گیا۔ یکم مئی سنہ ۱۹۶۰ء سے ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۱ء کی مدت کے دوران ۸۶۹۸۰ ہیکٹر بیکار سرکاری اور جنگلاتی ... ۱۳۰۳۳۲ لوگوں میں تقسیم کی گئی۔ اس میں سے تقریباً ۴۲ فیصدی زمین پسماندہ طبقات میں تقسیم کی گئی۔ اس کے علاوہ ... ہیکٹر اراضی محفوظ کی گئی تاکہ ... ہند پاک جنگ کے دوران کام آنے والے جوانوں کے خاندانوں میں تقسیم کیا جا سکے۔

بے زمین مزدوروں کی باز آبادکاری

حکومت نے ہمیشہ بے زمین افراد کو کاشتکاری کے لئے زمین ہی حاصل نہیں کرائی بلکہ ان کو مختلف قسم کی امداد بھی دے رہی ہے تاکہ

ان کو مستقل باز آبادکاری بھی ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے دو اسکیمیں یعنی جنگلاتی اراضی پر زراعتی مزدوروں کی باز آبادکاری اور زراعتی مزدوروں کی آدرش بستیاں تعمیر کرنے کی اسکیم بھی زیر عمل لائی جا رہی ہے۔ پہلی اسکیم کا نفاذ ۶۶-۱۹۶۵ء میں شروع ہوا۔ ۷۱-۱۹۷۰ء کے مالی سال کے اختتام تک ۲۹۰۰۵ ایکڑ جنگلاتی اراضی پر ۱۰۳۶۵۳ لاکھ روپے کے صرفہ سے ۲۴۰۴۳ خاندانوں کو بسانے میں مدد دی گئی تھی۔ پانچویں منصوبے میں اس اسکیم کے لئے ۱۲۲۰۰ لاکھ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۲۶۳۰۰ ایکڑ اراضی پر کاشتکاروں کے لئے ۱۶۷۰ خاندانوں کو بسایا جائے گا۔ دوسری اسکیم پر عمل آوری ۶۹-۱۹۶۸ء مالی سال سے شروع ہوئی اور ۷۳-۱۹۷۲ء کے اختتام تک ۱۲۰۰۵ لاکھ روپے کے صرفہ سے ۲۵ آدرش بستیاں قائم کی گئیں۔ حکومت پانچویں منصوبہ میں مزید دس آدرش بستیاں قائم کرنے کی تجویز رکھتی ہے جس سے ۵۰۰ خاندانوں کو فائدہ ہوگا

بے زمین دیہاتیوں کے گھروں کے لئے جگہ

حکومت مہاراشٹر نے دیہی علاقوں میں لوگوں کو گھروں کے لئے جگہ فراہم کرنے کی مشکلات کو مناسب اہمیت دی ہے۔ ۱۹۶۱ء سال میں ریاستی حکومت نے گاؤں تھانوں کی توسیع کا ایک دس سالہ پروگرام شروع کیا کیونکہ بڑھتی ہوئی آبادی سے پرانے گاؤں تھانوں میں گنجائش بہت کم رہ گئی تھی اور ساتھ ہی یہ بات بھی مدنظر تھی کہ خانہ بدوش قبائل کو مستقل بستیوں میں بسایا جاسکے اور سیلاب سے متاثر ہونے کے اندیشے والے گاؤں دیہوں کو دوسری جگہ فراہم کی جاسکے۔ اس اسکیم کی ۷۱-۱۹۶۱ء کی مدت کے دوران ۷۵ء۱۳ لاکھ روپے کے صرفہ سے ۶۵۰۰ مواضعات میں یہ کام کیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں حکومت ہند نے دیہی علاقوں بے زمین مزدوروں کو مکانات کے لئے جگہ فراہم کرنے کی اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ریاستی حکومت نے پانچویں منصوبہ کے اختتام تک پانچ لاکھ خاندانوں کو مکان کے لئے جگہ فراہم کرنے کی تجویز رکھی ہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء تک تقریباً ۱۴،۶۱،۱۲۶ مکانوں کے لئے جگہ کا الاٹمنٹ ہو چکا ہے۔ ان میں ۹۶۸۰۳ جگہیں پسماندہ طبقات کے لوگوں کو دی گئیں۔

زمین سدھار کا اثر

ہماری ریاست میں تقریباً ۲۵ سال سے زمین سدھار کے مختلف اقدامات پر عمل آوری کی جاتی رہی ہے۔ بالکل صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان اقدامات کا ریاست کی زراعتی پیداوار پر کیا اثر پڑا ہے۔

بہرحال یہ تو بلا شبہ کہا جاسکتا ہے کہ زمین سدھار اقدامات نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کے لئے کاشتکاروں کی زبردست حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں سماجی انصاف کے مقصد کے حصول میں کافی مدد ملی ہے۔ لگ بھگ ۲۰ لاکھ اراضی زمین سدھار اقدامات کے تحت آ گئی جو کہ کل ملکیت کا تقریباً ۲۰ فی صدی ہوتا ہے۔ زمین سدھار اقدامات کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ کاشتکاروں کو زمین کا اصل مالک بنایا جائے یہ مقصد کافی حد تک حاصل کیا جا چکا ہے۔ زمین کاشتکار کی ہو پالیسی ریاست میں ایک حقیقت بن گئی ہے۔

بقیہ: مہاراشٹر کا لوک آرٹ صفحہ ۶۷

مطابق ہے۔ اس فیسٹول میں روایتی لوک ناچ، تماشا، رقص وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کی آمد نے ہر میدان میں ہندوستان میں ایک نئی زندگی کی روح پھونکی ہے اور مہاراشٹر اس میں پیچھے نہیں ہے۔

شاہ لک ایڈیٹر پبلشر صاحب نے
یونیورسل فائن لیتھو پریس سے چھپوا کر
ٹھاکر دوار۔ بمبئی سے
شائع کیا

THE SHAIR
(... of Publication) Publishing Date ... 16th ... Telephone No. ...
Registered with the Register of ... at R. ... No. 14482/57

...E ARE DOING OUR BEST TO GO AHEAD !

Maharashtra State has continued to forge ahead, ...ndaunted in the face of natural calamities and eco...omic difficulties which have beset its path and has ...trived hard to keep up its pace of progress.

...The potential capacity for food production has ...one up to 79 lakh tonnes.

Irrigation potential has gone ... to 10.07 lakh ...ctares.

About 3... [illegible] ...ies, ... [illegible] ..., are ...oviding emp... [illegible] about ... [illegible] persons.

About 16,5... [illegible] ...ges have ... [illegible] ...fied and ...5,000 pumps have been ener... [illegible]

But...the population has gone up by ...0... crores ...etween 1961 and 1971. This growth in population ...ill neutralise the pace of development.

Family Planning is a *must* if we are to reap ...e benefits of development in full measure.



... and Public Relations, Sachivalaya, Bombay-400 032.



اردو ادبیات کا تیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ
یادگار علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم)

شاعر

مدیر
اعجاز صدیقی

معاون
ڈاکٹر محمد حسن

جلد-۴۵ | مئی جون ۱۹۷۴ء | شمارہ-۴-۵-۶

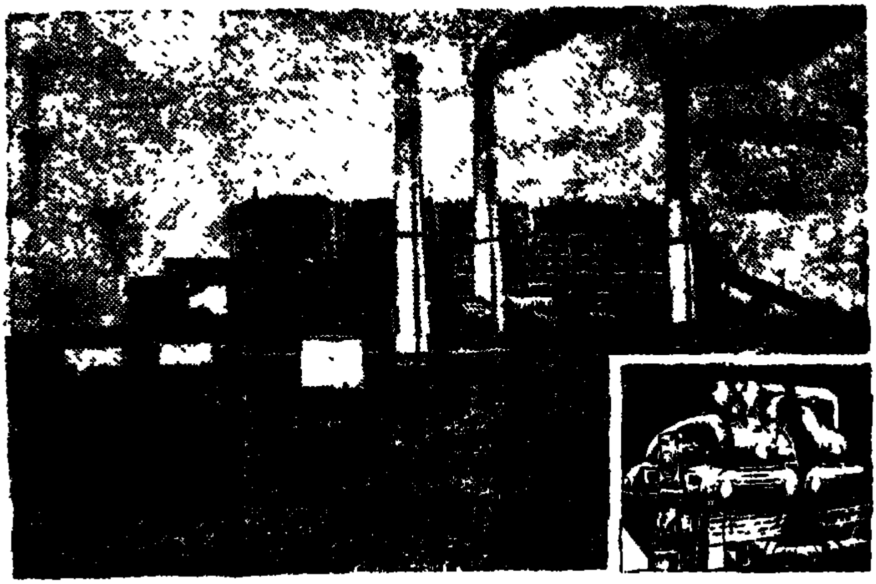
۱۲ ـــ روپے
۵۰ ـــ روپے
۲۰۰ ـــ روپے
۳۰۰ ـــ ...

فون
۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ:-
ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتہ:-
ماہنامہ شاعر پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

قیمت
ایک روپیہ

ایک کامیاب تھرمل پاور اسٹیشن کے بعد دوسرا...



سنتل دیہہ کے بعد چندر پورہ

صرف ۱۵۰۰ دن کے اندر ہی ۱۲۰۰۰۰ کلو واٹ بجلی ملک کے مشرقی حصہ میں فراہم کرادی گئی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ میں مغربی بنگال کے سنتال دیہہ مقام پر ۱۲۰۰۰۰ کلو واٹ کی اہلیت والے تھرمل سیٹ نے کام شروع کیا۔ فروری ۱۹۷۴ میں ۱۲۰۰۰۰ کلو واٹ کی ہی اہلیت والے ایک دوسرے سیٹ نے بہار میں دامودر ویلی کارپوریشن کے تحت چندر پورہ میں کام شروع کیا۔

[illegible] صنعتی اور [illegible] ضروریات کی تکمیل کے لئے ہے۔ چندر پورہ سیٹ دوسرے [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] کی برقی ضروریات کو پورا کرے گا۔

[illegible]

سے ۳ سنتل دیہہ میں اور ۲ چندر پورہ میں لگیں گے۔ [illegible] پارلی اور تامل ناڈو میں [illegible] کے تھرمل پاور اسٹیشن بھی بھوپال کارخانے کے ذریعہ فراہم کئے گئے آلات اور ساز و سامان سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آسام میں نام روپ، گجرات میں [illegible] [illegible] مدھیہ پردیش میں [illegible] کے تھرمل اسٹیشن [illegible] اترپردیش میں [illegible] کے نیوکلیئر پاور اسٹیشن بھی بھوپال کارخانہ میں بنی ہوئی مشینوں سے مزین کئے جا رہے ہیں۔

BHEL BHOPAL

عوام کے لئے برقی طاقت

بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ

(بھارت سرکار کا ایک ادارہ)

بھوپال

[illegible]-3372- Urd

نظمیں

افسانے

جرعات

اُردو کے ادبی رسائل کو بچایئے

ادب و شعر کے فروغ اور عصری تحریکوں کو آگے بڑھانے میں جتنا حصّہ ادبی رسائل کا ہوتا ہے، اُتنا نہ کتابوں کا ہوتا ہے نہ [illegible] کا، نہ ادبی محفلوں کا۔ ہر زبان کے ادبی رسالے اپنی زبان کے ادب کی نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ [illegible] ہر دور میں ان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ادب و شعر کا فروغ ہی نہیں، بلکہ ادیبوں اور شاعروں کے افکار و خیالات کو اہلِ ذوق تک پہنچانے، اُن کی شخصیتوں کو عظمت و برتری دلانے اور انھیں محبوب بنانے میں بھی ادبی رسائل کا زبردست حصّہ [illegible] ہے۔ [illegible] ان سے نہ صرف ادبی ذوق کی تربیت ہوتی ہے بلکہ اہلِ ذوق کی پیاس بھی بجھتی ہے۔ اگر ادبی رسالے نہ ہوں تو ادب کا [illegible]

تقسیم کے بعد اُردو کے معیاری ادبی رسائل کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ اس معاملے میں پاکستان، ہندوستان سے آگے نکل گیا۔ ستائیس اٹھائیس سال کی طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی ہمارے ملک میں معیاری ادبی رسائل بہت کم ہیں۔ حالانکہ اُردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد کافی بڑھی ہے۔ ایک طرف تو ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، دوسری طرف ان کا حلقۂ اشاعت نہایت محدود [illegible] تک ادبی رسائل کے مسئلے پر اجتماعی طور سے اُردو والوں نے سوچا ہی نہیں۔ یہ رسالے اپنے ہر شمارہ میں اپنی زبوں حالی کی طرف [illegible] کی توجہ مبذول کراتے رہتے ہیں، مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔ اس کے باوجود یہ چند ادبی رسائل اپنے وقار اور معیار کو قائم رکھے ہوئے تھے ــــــ مگر۔

گذشتہ چند ماہ میں ملک جس شدید بحران میں مبتلا ہوا ہے، اُس کا اثر سب سے زیادہ اُردو کے ادبی رسائل پر پڑا ہے [illegible] قیمتیں دُگنی کر دی گئی ہیں۔ صفحات کم کر دینے کے باوجود یہ رسالے سخت نقصان سے نکل رہے ہیں، ان کی اشاعتوں میں [illegible] پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی زندگی کتنی ہے؟!

اخباری کاغذ کی ہوشربا گرانی کا یہ عالم ہے کہ ۳۰ × ۴۰ سائز کا ایک رِم جو ۱۹۷۳ء کے وسط تک [illegible] میں آتا تھا، [illegible] کی مقرر کردہ کنٹرول قیمت (مع ٹیکس اور دیگر اخراجات) چھیالیس سینتالیس روپیہ فی رِم مل رہا ہے۔ یہ قیمت ابھی اور بڑھے گی۔ اخباری کاغذ کی کمیابی الگ پریشان کن ہے۔ دیسی سفید کاغذ کی قیمت اس سے دُگنی ہے۔ یہی نہیں بلکہ طباعتی و اشاعتی سلسلے کی ہر چیز [illegible] آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ محصولِ ڈاک کی شرحوں میں اضافے نے ڈاک خرچ کو ڈیوڑھا کر دیا ہے۔ دفتر کے دیگر اخراجات بھی اسی تناسب [illegible]

کیوں کر زندہ رہ سکیں گے اُردو کے ادبی رسائل؟؟

معاصر "شاہکار" (ماہنامہ) نے اپنے تازہ شمارہ میں موجودہ حالات کے پیشِ نظر اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کو توجہ دلائی ہے۔

"اس سلسلے میں مصنفین کے علاوہ ناشرین میں مکتبہ جامعہ اور نسیم بک ڈپو کو انعامات دے کر اکاڈمی نے اشاعتی اداروں کی [illegible] بھی تسلیم کی ہے۔ مگر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اُردو کے رسائل بھی اُردو کی نشر و اشاعت کا اہم کام کر رہے ہیں۔ جن کی طرف [illegible] کی نظر ابھی نہیں پڑی ہے۔ ہر سال اکاڈمی تقریباً سو کتب خانوں کو اُردو کتابیں خریدنے کے لئے عطیہ دیتی ہے۔ [illegible] ہے کہ ان کتب خانوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ اُردو کے تمام ادبی رسائل یا کم از کم اُتر پردیش میں شائع ہونے والے ادبی [illegible] تجویز اچھی ہے اور ہم بھی اس کی پُر زور تائید کرتے ہیں لیکن اس گذارش کے ساتھ کہ جس طرح اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ہندوستان بھر کے مصنفین کی کتابوں پر انعامات دیتی ہے، اُسی طرح ہندوستان بھر کے معیاری ادبی رسائل کو ان کی تعداد [illegible] اپنی طرف ... نیز یہ کہ اُتر پردیش کی لائبریریوں کو ... صرف اُتر پردیش کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔

ہم آج ... کے سلسلے میں یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک "انجمن اُردو ادبی رسائل" قائم کی جائے [illegible] کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جا سکے۔

اعجاز صدیقی

اک چراغ اور بجھا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

مہندر ناتھ کی موت کے بعد، مجھ میں کسی اور صدمے کے برداشت کی تاب نہ تھی۔ صدمات کی بھی ایک حد و انتہا ہوتی ہے! برادرم مہاشے اختر مظفر نگری، برادرم سراج الدین ظفر، فرقت کاکوروی۔ سید احتشام حسین اور سجاد ظہیر کی یادیں کچھ کم تڑپانے والی نہ تھیں کہ سلام مچھلی شہری داغِ مفارقت دے گئے۔ ان میں سے کس کی عمر تھی مرنے کی؟ کس سے روح و قلب کا رشتہ نہ تھا۔ ان میں سے کس کس کے اُٹھ جانے سے میری محفل اُجڑ گئی، میرے قہقہے چھن گئے، میرے علمی و ادبی کاموں کو نقصان پہنچا۔ یہ کس سے کہوں، کسے بتاؤں، کیسے بتاؤں؟ اُن سال اور لمحوں کو کس طرح گرفت میں لاؤں جو ان سب کے ساتھ بتائے۔ کتنے مرثیے لکھوں، کس کس کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کی حسرت بھری داستانیں قلمبند کروں! میں سمجھتا تھا کہ سلام کی موت کا سانحہ آخری ہوگا اور میری زندگی میں مزید ناسور پیدا نہ ہوں گے مگر مہندر ناتھ کی مرگِ ناگہاں نے پھر میری روح کو کچل اور مسل کر رکھ دیا۔ ۲۰ مارچ کو مہندر کا انتقال ہوا تھا۔ اپریل اور مئی میں کئی بار بعض موقعوں پر وہ اتنی شدت سے یاد آئے کہ آنسو روکے نہ رک سکے۔ شاید میرے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ میرے دلدار مجھ سے جدا ہوتے رہیں اور میں آنسو بہاتا رہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ خود میری صحت کا کیا حال ہے اور میں اندر سے کتنا ٹوٹ چکا ہوں۔ شب و روز تڑپ تڑپ کر بہ جبر اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتا ہوں۔

مئی کا مہینہ حد درجہ ہنگامی اور پریشان کن تھا۔ بڑے صاحبزادے میاں تاجدار احتشام کی شادی کی تاریخیں قریب۔ ریلوے ہڑتال کی وجہ سے بمبئی کی زندگی مفلوج، کاروبار بند۔ خود بخار اور کھانسی میں مبتلا۔ اُلٹے ہاتھ پر ایک بڑا پھوڑا نکلا ہوا۔ ۷ مئی کو بخار ۱۰۴ ڈگری تک پہنچ گیا۔ گھر میں مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ۔ شادی کا ہنگامہ۔ اور جب بخار کم ہوا تو بچوں نے ڈرتے ڈرتے وہ تار دکھایا جو کئی دن میں بمبئی پہنچا تھا اور جس میں بیٹی راشدہ نے لکھا تھا کہ ۸ مئی کو اُن کے والد نثار اٹاوی کا انتقال ہو گیا۔

برادرم نثار اٹاوی بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔ ! میری زبان سے اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا اور دل پر ایک گہری مگر خوش سوگواری چھا گئی جو اب تک چھائی ہوئی ہے اور نہ جانے کب تک چھائی رہے گی۔ زندگی کے میلے تو ازل سے لگتے رہے ہیں اور ابد تک لگتے رہیں گے مگر غم خوردہ دل بہر حال غم خوردہ ہوتے ہیں۔ ان میلوں اور مکروہاتِ زندگی میں گھرے رہنے کے باوجود زخموں کی ٹیک میں کمی نہیں ہوتی، یہ تو رستے ہی رہتے ہیں

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"؟

نثار اٹاوی مرحوم سے کم و بیش ۳۰ سال کا نہایت گہرا قلبی تعلق تھا۔ والدِ مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں انھیں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اپنے استاد کے بھی بہت چہیتے تھے، بڑا دخل تھا اُنھیں حضرتِ علامہ کے مزاج میں۔ وہ بڑے ہی خدمت گزار، سعادت مند، معاملہ فہم اور علمی و فنی و ادبی نکات و معاملات تک جلد پہنچ جانے والے لوگوں میں سے تھے۔ ذہنِ رسا پایا تھا، پڑھتے رہتے تھے، اپنے دور کی ادبی تحریکوں پر نظر رکھتے تھے۔ تقسیم سے پہلے جب قصر الادب آگرہ میں تھا تو نثار اٹاوی مہینے دو مہینے میں آگرہ ضرور آتے تھے۔ مجھے اپنے

اُستاد کے عِلاوہ سے پڑ کبھی کسی مشاعرہ اور تقریب کے جلسے سے۔ تقسیم سے صرف ایک سال پہلے ۱۹۴۶ء میں علامہ صاحب قبلہ نے اُنھیں لکھا کہ گزشتہ بیس پچیس سال میں آئے ہوئے خطوط سے کئی بورے بھر گئے ہیں۔ اِن میں سے اہم خطوط گرمیوں کی تعطیلات میں آکر چھانٹ دیجئے۔ چنانچہ وہ آئے، بیس دن آگرہ میں رہے اور تنہا اِس بڑے کام کو انجام دیا۔ اُنھیں جب جب کسی فردی کام یا مشورے کے لئے بلایا گیا وہ فوراً آئے۔

میرے بمبئی منتقل ہونے کے بعد ہر مرحلے پر اُن سے خط و کتابت رہی۔ میرے غموں اور دُکھوں میں اُن کے محبت بھرے خطوط بڑی ڈھارس بندھاتے تھے۔ ہر چند اُن کے کالج میں شروع ہی سے "شاعر" جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنے لئے بحیثیت خریدار الگ سے "شاعر" منگاتے تھے۔ "شاعر" کی جلدیں بنواکر رکھتے تھے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا مگر اُن کے اصرار کے آگے میری ایک نہیں چلتی تھی۔ میری صحت اور میرے ذاتی معاملات سے اُنھیں گہری دلچسپی تھی۔ میرا رویّہ بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ بمبئی آجانے کے بعد چار پانچ بار اُن سے ملاقات ہوئی۔ دو بار میں اٹاوہ گیا۔ دو بار وہ بمبئی آئے۔ آخری بار اکتوبر ۱۹۷۲ء میں وہ بمبئی آئے تھے۔ یہاں مُرسنگار سمندر کا کُل ہند مشاعرہ تھا۔ میں نے منتظمین سے کہہ کر اُنھیں مدعو کرا دیا اور ایک معقول نذرانہ بھی دلا دیا۔ بہت سے مقامی اور غیر مقامی شعرا کے پڑھ لینے کے بعد اُن کی باری آئی۔ جب اُنھوں نے اپنے قطعات سُنائے اور غزل پڑھی تو اتنی داد ملی، اتنی داد ملی کہ میرا دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ وہ بیرونی مشاعروں میں کم ہی جاتے تھے لیکن جس مشاعرے میں بھی شریک ہوئے اپنی جدّتِ فکر و اُسلوب سے سُننے والوں کو متاثر کیا۔ میں ذاتی طور پر مشاعروں کی داد اور "نا داد" کو اہمیت نہیں دیتا۔ نہایت معمولی شعروں پر میں نے سامعین کو چیختے ہوئے اور اعلیٰ پایہ کے اشعار کو بغیر کسی داد کے سر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مشاعرہ کی داد کو شاعری کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح داد تخلیق کے کاغذ پر منتقل ہونے کے بعد ہی ملتی ہے۔ اور اُسی سے ادبی حلقوں کی ایک رائے بنتی ہے۔ شاد اٹاوی مرحوم دیگر رسائل کو اپنا کلام کم ہی بھیجتے تھے۔ وہ کہتے ہی کم تھے اور جب بھی کوئی تازہ غزل ہوتی تھی "شاعر" کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ "شاعر" میں چھپنا اُنھیں بہت پسند تھا۔ نومبر ۱۹۸۳ء کے "شاعر" میں اُن کی آخری غزل —

ہنسو نہ مجھ پہ بڑا بدنصیب ہوں یارو	جہانِ جہلِ خرد کا ادیب ہوں یارو
ٹپک رہا ہے لہو اُنگلیوں کے ناخن سے	قلم بدست ہوں پھر بھی عجیب ہوں یارو
دل و جگر ہیں کہ سینے میں جھولتی لاشیں	میں اپنے دور کی زندہ صلیب جیسا یارو

خود اُن کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اِس غزل پر علمی و ادبی حلقوں نے (...) پسندیدگی اور اُن کی صحت کے تعلق سے فکر و تشویش کا اظہار کیا تھا۔ بالآخر وہی ہوا، جس کا خود اُنھیں اور مجھے اندیشہ تھا۔ اُنھوں نے گلے کے کینسر کا علاج دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں کرایا۔ کبھی افاقہ محسوس کیا اور کبھی مرض بڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ گوالیار میں گلے کا آپریشن کرانا چاہتے تھے۔ مگر ڈاکٹروں کی ہڑتال کی وجہ سے وہ بھی نہ ہو سکا۔ سال گذشتہ جب وہ دہلی میں تھے تو کشمیر کے سفر سے واپسی پر میں دہلی رُکا تھا تاکہ اُن سے ملاقات ہو جائے۔ مگر میرے دہلی پہنچنے سے پہلے ہی وہ اٹاوہ واپس جا چکے تھے۔ اُنھیں دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ میں نے بمبئی واپس آکر اُنھیں ایک تفصیلی خط لکھا۔ کافی انتظار کے بعد اُن کا ۳۰ نومبر ۱۹۸۳ء کا خط ! خود اُن کے قلم سے لکھا ہوا مجھے ملا تھا۔ خط ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔ اِس میں کئی اہم باتیں ہیں۔ طویل علالت کے باوجود اُن کی تحریر میں کوئی فرق نہ تھا۔ مرحوم کے خطوط بڑی تعداد میں میرے یہاں محفوظ ہیں۔ اُن میں کئی خطوں کی حیثیت تاریخی ہے۔ اور یہ نہایت اہم معاملات کے سلسلے میں ہیں۔ یہ خطوط دوسرے مشاہیر کے خطوط کے ساتھ کبھی نہ کبھی ضرور شائع ہوں گے۔

عشرت منزل ۔ نورنگ آباد ۳۰/۱۱/۱۹۸۳ء
اٹاوہ

برادرِ گرامی منزلت۔

عزیزہ رافعہ کی شادی کے موقع پر آپ کا ٹیلی گرام اور اُس کے بعد محبت بھرا تحفہ مل گیا تھا۔ اِس کے چند روز بعد ایک نہایت تفصیلی

خط بھی نظر نواز ہوا مگر میں بوجہ ایک علالت کے بروقت جواب نہ لکھ سکا، معذرت خواہ ہوں۔

ظفر کی شادی بخیر وخوبی انجام پاگئی۔ چونکہ یہ میرے گھر میں پہلی شادی تھی اس لئے باوجود سادگی کے پندرہ سولہ ہزار روپیہ خرچ ہو گیا اور اس طرح اب تک کا جمع سرمایہ ختم کر بیٹھا۔ ابھی تین لڑکیاں اور دو لڑکے اور باقی ہیں۔ اُن کا اللہ مالک ہے۔ میری طبیعت ٹھیک ہے گلے میں تو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، البتہ ابھی خشکی بہت ہے، زبان اور تالو خشکی سے چپکتے محسوس ہوتے ہیں۔ حلق میں چپچپاہٹ رہتی ہے، خشک چیز حلق سے بدقت اُترتی ہیں۔ ان تکالیف کے علاوہ نزلہ مستزاد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلے کی نالیوں میں بلغم جمع ہے اور اس وجہ سے آواز میں بھاری پن رہتا ہے۔ ۱۸ دسمبر کو پھر دہلی جاؤں گا check up کے لئے طلب کیا گیا ہوں۔

ادھر میرے ریٹائرمنٹ کی تاریخ یکم جولائی ۱۹۸۲ء ہے۔ توسیع ملازمت کے لئے درخواست دے رہا ہوں۔ اگر صحت نے ساتھ دیا تو کچھ نہ کچھ توسیع ہو جائے گی۔ بصورت دیگر معاش کے لئے بھی کچھ وسائل تلاش کرنا ہوں گے۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی ایسی صورت حالات پیدا کر دے گا کیونکہ اُس نے زندگی میں ہر قدم پر میری مدد کی ہے اور ہر بگڑا ہوا کام سنوارا ہے۔

ظفر کی شادی کے بعد چوتھی کی رسم ادا ہوئی۔ میں بڑودہ نہیں گیا۔ لڑکی گھر آگئی تو سسرال والے دوبارہ آکر رخصت کرا لے گئے۔ ادھر مشاعروں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ۱۴ نومبر کو مشاعرہ تھا۔ اس مرتبہ میں نے عمومی شعراء کے علاوہ زبیر رضوی، شہریار اور بشیر بدر کو بھی بلا لیا تھا۔

۱۷ نومبر کو کالج JOIN کر لیا۔ پرنسپل صاحب ہمیشہ کی طرح ازحد مہربان ہیں۔ صرف دو گھنٹے پڑھانے کو دئے ہیں، مفت کی تنخواہ پا رہا ہوں۔ تین دن کالج گیا تھا۔ ۲۰ نومبر کو غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا، گرنے سے کولہے میں چوٹ آئی، خدا کا شکر ہے کہ فریکچر نہیں ہوا، صرف گوشت کچل گیا۔ آج تک چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ مگر آج صبح سے افاقہ محسوس کر رہا ہوں، انشاء اللہ تین چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہ سب پچھلی بیماری کی عطا کردہ نقاہت کا نتیجہ ہے، ابھی اُٹھنے بیٹھنے میں آنکھوں کے نیچے اندھیرا آجاتا ہے اور کبھی کبھی چکر سے آنے لگتے ہیں۔

بیماری کے زمانہ میں آپ کے بہت افزا خطوط نے بڑا سہارا دیا۔ آپکی اور بھابی صاحبہ کی دلسوزی اور غمگساری باعث تسکین رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ احباب و اعزا کی دعاؤں ہی نے مجھے بچا لیا، میرے شہر والوں نے میرے لئے (جب تک دہلی میں رہا) صبح و شام نمازوں میں اجتماعی دعائیں کیں۔ بہت سے شاگرد اور احباب دن رات بے چین رہے اور کئی کئی بار بھاگ بھاگ کر دہلی گئے۔ دہلی سے واپسی پر مجھ پر جو قیامت آزما ایام گزرے ان میں صبح سے آدھی رات تک [illegible] پرنسپل صاحب سب ہی احباب میرے بچانے کے لئے کوشاں رہے۔ میں ان سب کا احسان تاعمر نہ بھول سکوں گا۔ ظفر کی شادی کے ایام میں بھی بستر پر ہی صاحب فراش رہا۔ جملہ انتظامات احباب ہی نے انجام دئے۔ شعراء اکثر اہل وطن کی بے وفائیوں کا شکوہ کیا کرتے ہیں، مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی انسان دشمن نہ پیدا کرے تو اُس کے لئے ہر جگہ دارالامان ہے۔

آپ کے پچھلے خط میں کشمیر، چنڈی گڑھ، شملہ، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ کے سفر کا مفصل تذکرہ تھا۔ سفر کے دوران آپکی اور بھابی صاحبہ کا جو کچھ عزت افزائی ہوئی وہ میرے لئے باعث مسرت ہے، مگر جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات تو آپکا مقدر بن چکے ہیں۔ کاغذ کی گرانی اور نایابی نے "شاعر" کو یقیناً خطرے میں ڈال دیا ہوگا۔ اس دور میں بڑے بڑے اخبارات کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔

اگر صحت ٹھیک رہی تو انشاء اللہ اسی سال مئی جون میں بمبئی کا ایک سفر ہوگا، ظفر کو بڑودہ سے لیکر بمبئی کی سیر کراتا ہوا اٹاوہ واپس آؤں گا۔ اس دور دور رشتہ کا یہی تو ایک فائدہ ہے۔

بھابی صاحبہ سے سلام کہئے۔ بچوں کو دعائیں۔

آپ کا مخلص
نشور اٹاوی

---

۱ امان اللہ خاں شیروانی، پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ

بارے یا اُن ہی باتوں کے بجائے اُنھوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ اب وہ بمبئی کی تعمیر کے بجائے آسمانوں کی سیر کرتے ہوں گے۔ [illegible] دانائی اور جہانبانی و جہانگیری کے دعووں کے باوجود انسان نہیں جانتا کہ وہ کب اس دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ [illegible] شاعری بہت [illegible] کو [illegible] ہو جائیں گے۔ مگر اس خط کے پانچ ماہ بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، بے شمار ارمانوں اور آرزوؤں کو دل میں لئے ہوئے۔

میں نے مرحوم کے [illegible] خط کا جواب دے دیا تھا اور اُس کے جواب میں جنوری [illegible] میں اُن کا ایک کارڈ بھی آیا تھا جو اس وقت مل نہیں رہا ہے۔ اس میں اُنھوں نے اُس شمارہ کے نہ ملنے کا بھی تذکرہ کیا تھا جو سلام مچھلی شہری مرحوم کی یاد میں نکلا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے وقفوں وقفوں سے دو تین خط لکھے۔ اُن کی حالت جاننے کے لئے مضطرب رہا۔ کافی دن کے بعد بیٹی رافعہ نے مجھے ۳۰ اپریل [illegible] کو ذیل کا خط لکھا۔

اٹاوہ — ۳۰ اپریل [illegible]

محترمی چچا میاں۔ آداب

کل آپ کا خط ملا جس سے پتہ چلا کہ اس سے پہلے کا خط جس میں میں نے ابّا کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا آپ کو نہیں ملا۔ آپ کی طبیعت خراب سن کر افسوس ہوا۔

ابّا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اب تو بس اللہ کا ہی بھروسہ ہے کیونکہ یہاں تو کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ہی نہیں اور جو ہیں بھی تو انھوں نے بھی کہہ دیا ہے کہ اب بدن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ باہر لے جانا بیکار ہے۔ ویسے ابّا اب بمبئی میں دکھانا چاہتے ہیں مگر ابھی اُن کی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ منٹ بھی کسی کے سہارے سے بیٹھ سکیں۔

دن رات چت لیٹے رہتے ہیں۔ کروٹ بھی نہیں بدل پاتے اور نہ ہی کسی سے بات کر سکتے ہیں۔ ہر وقت بیہوشی جیسا عالم رہتا ہے۔ منہ سے کوئی بھی چیز کھا پی نہیں سکتے۔ اس لئے ربر کی نلی ناک کے ذریعہ پیٹ تک ڈالی گئی ہے۔ اُسی سے رس، سوپ، دودھ اور پانی وغیرہ دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی ڈاکٹر آپریشن نہیں کرے گا اور اس مرض کی دوا تو کوئی ہے ہی نہیں۔

اس وقت وہ بیہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ خط میں لکھ رہی ہوں یعنی آپ کی بھتیجی رافعہ۔

گھر میں سب بڑوں کی خدمت میں میرا آداب کہہ دیجئے۔

آپ کی بیٹی

رافعہ صدیقی

اس خط کے صرف ۷ دن بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اٹاوہ کے لوگوں اور خصوصاً اُن کے اہل و عیال پر کیا گذری ہوگی جو اپنے شہر کی محبوب شخصیتوں میں سے تھے۔ تعلیمی خدمات کے علاوہ اُن کی سیاسی اور سماجی خدمات بھی قابلِ تحسین اور چونکہ وہ بڑے [illegible] تھے اس لئے کسی سے بگاڑ کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ سے اُن کی وابستگی بہت دیرینہ تھی اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اسلامیہ ہائی اسکول سے انٹر کالج ہونے تک اس مشہور درسگاہ کے عروج و ترقی میں مرحوم کی مساعی کو بڑا دخل تھا۔ کالج کی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ فنڈ کے لئے اُنھوں نے کئی بار وفد کی شکل میں دورے بھی کئے۔ سرمایہ فراہم کیا۔ اس تعلیمی ادارہ کی حیثیت تاریخی ہے۔ جب یہ اسکول تھا تو اس سے بڑی بڑی شخصیتیں فارغ التحصیل ہو کر نکلیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ ہند نے بھی یہیں تعلیم پائی تھی۔ اس کا ہاسٹل ممتاز ترین ہاسٹل سمجھا جاتا تھا۔ محمڈن کالج علیگڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی کی طرح اس کی شہرت تھی۔ بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجنے پر فخر و مسرت محسوس کرتے تھے۔ اس کے منیجر مولوی بشیر الدین نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی۔ مولوی صاحب کو میں نے دیکھا ہے۔ کافی معمر اور گراں گوش تھے مگر ایک حرکت کے [illegible] کی

[illegible] وقت موجود [illegible] اسکول سے وابستہ رہے۔ پھر انھوں نے [illegible] ایم اے کیا اور اسکول [illegible] کے بعد شعبۂ اردو کے صدر بنائے گئے۔ [illegible] پرنسپل ہو گئے۔ سب [illegible] پرنسپل [illegible] کے ساتھ [illegible] شادی نے [illegible] تصنیفی [illegible] ہندی زبان [illegible] جانتے تھے۔ [illegible] اٹاوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ [illegible] کا اکبر آباد و آگرہ ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ [illegible] دستگیر اکبر آبادی۔ [illegible] اکبر آبادی۔ سیماب اکبر آبادی۔ [illegible] اکبر آبادی۔ خادم علی خاں اختر اکبر آبادی۔ سید سخاوت [illegible] اکبر آبادی۔ برجموہن دیال شاہم اکبر آبادی۔ حکیم [illegible] شباب [illegible] مظہر اکبر آبادی۔ محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی۔ مولوی حامد حسن قادری، پروفیسر عابد حسین فریدی۔ محمود اکبر آبادی، پروفیسر [illegible] فاروقی۔ [illegible] رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، شاہد صدیقی، [illegible] ہیت سے [illegible] وہاں موجود تھے۔ [illegible] یگانہ چنگیزی بھی چند سال آگرہ میں مقیم رہے۔ ہر روز شعر و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اکبر آباد کی اس مرکزیت کا اثر اس سے قریب چھوٹے شہروں، خیر آباد، شکوہ آباد [illegible] اٹاوہ پر بھی پڑا۔ ان شہروں [illegible] خاصی تعداد میں تھے۔ رات بھر مشاعروں کی محفلیں جمتی تھیں۔ اٹاوہ کے [illegible] مجھے "بابڑ" کا نپور اور لکھنؤ جیسے [illegible] شہروں کے اثرات [illegible] اٹاوہ پر [illegible] چند سال اٹاوہ میں رہے۔ حضرت بیدم شاہ وارثی اٹاوہ کے بلند پایہ صوفی شاعر [illegible] [illegible] اٹاوہ کا نام [illegible] اٹاوی نے روشن کیا۔

[illegible] اٹاوہ [illegible] والد مرحوم علامہ سیماب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے تھے اور چند ہی سال میں فارغ الاصلاح [illegible] [illegible] پیدا [illegible] بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ انھوں نے ہندی بحر اور سادہ ہندی زبان میں بھی متعدد غزلیں کہیں۔ یہ غزلیں [illegible] بہت مقبول ہوئیں۔ اور پھر [illegible] "ہم الخلائق" (مرقع میرے پیار کی) کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں بھی ہیں۔ [illegible] ماہ و انجم" کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کو بھی اچھے تبصرے ملے تھے۔ لیکن [illegible] [illegible] بالکل بچا یا تھا اور ایک ایسا موڑ دیا تھا جو فکر و اسلوب کے اعتبار سے اردو غزل کے معیار جدید کا [illegible] انھوں نے تربیت کر کے اپنے بعض اچھے [illegible] دیا جو استاد کی [illegible] مرتبہ گئے تھے۔ نثر بھی خاصی لکھ لیتے تھے۔ ادبی تحریکوں پر نظر تھی۔ قدیم ادب [illegible] کیا تھا۔ اچھا خاصا کتب خانہ تھا اور اس میں "شاعر" کے مجلد فائلوں کو بڑے شوق سے رکھتے تھے۔

[illegible] بہت سال [illegible] ہے۔ نثار مرحوم ہی اس کے کنوینر ہوتے تھے۔ تقریباً سب ہی مشاہیر شعراء [illegible] ملازم تھے [illegible] کرتے تھے۔ سید خلیق، ملنسار، شیریں زبان مرنجاں مرنج انسان تھے۔ اسنا قد، چھریرا بدن۔ مشاعروں میں [illegible] اور [illegible] تھے۔ ترنم میں پڑھنا چھوڑ چکے تھے اور دس بارہ سال سے تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ کیا اساتذہ اور کیا طلباء سب ہی ان کے گرویدہ تھے۔ گلے کی تکلیف کئی سال سے تھی۔ کلاس میں زور سے پڑھانے یا مشاعروں میں بلند آواز سے [illegible] پڑھنے کے [illegible] جایا کرتی تھی۔ اسی نزلہ کا سبب سمجھا گیا۔ بعض ادویات کے استعمال سے افاقہ بھی ہو جاتا تھا مگر کسے معلوم تھا کہ ان کے گلے میں [illegible] ان کی نا وقت موت کا سبب بنے گا۔

ایسا [illegible] کہاں [illegible] ہیں؟ میرے [illegible] نثار اٹاوی کی ذات مایۂ ناز تھی۔ مجھے ان سے [illegible] محبت [illegible] ہم ایک دوسرے سے [illegible] مشورہ طلب کرتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر میرا اور میری مالی [illegible] کا احترام [illegible] کبھی کسی [illegible] پیدا نہیں ہوئی۔ ان کے اٹھ جانے سے حلقۂ سیمابیہ میں اپنی حد تک ایک اندھیرا سا محسوس کر رہا ہوں۔ [illegible] ہے [illegible] کی موت کا خلا، [illegible] کی موت کا خلا، جمیل مظہری کی موت کا خلا، [illegible] ناظر کی موت کا خلا —

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ کیجئے)

جگن ناتھ آزاد

○

آشیانے سے خلائے بیکراں تک آگیا
دل یقیں سے چل کے پھر وہم و گماں تک آگیا

اے چمن والو! چمن والو! کوئی سوچو علاج
کارواں گل کا بہاروں سے خزاں تک آگیا

کیا خبر کیا جستجو بیتاب رکھتی ہے مجھے
یوں تو میں ساحل سے موجِ بے اماں تک آگیا

پھر متاعِ درد کا بازارِ جاں میں شور ہے
گوہرِ ہر سود پھر جیبِ زیاں تک آگیا

داغِ رسوائی سے اپنی پاکئ دامن بچا
تیرا کچھ کچھ ذکر میری داستاں تک آگیا

کیا خبر چلنا زمیں پر اس کو آیا یا نہیں
آدمی یوں تو زمیں سے آسماں تک آگیا

دیکھئے اب کون سی منزل ہو اس کے روبرو
دل کہ تھا یکسر فغاں، ضبطِ فغاں تک آگیا

کارواں تک اب پہنچنے ہی کو ہے آزاد تو
تو کہ آوازِ رحیلِ کارواں تک آگیا

جگن ناتھ آزاد

○

بارہا دل کو یوں کہہ کہہ کے سمجھانا پڑا
عازمِ کعبہ! اگر رستے میں بت خانہ پڑا!

آج گاندھی کل حسین ابنِ علیؓ پرسوں مسیحؑ
ایک قصہ اور کتنی بار دہرانا پڑا

دیکھ کر اِس دور کے انسان کی طرزِ حیات
بے خطا ہوتے ہوئے بھی مجھ کو شرمانا پڑا

چند ہی لمحے گزرنے پائے تھے توبہ کئے
جس طرف اٹھے قدم رستے میں میخانہ پڑا

یاد ہے ساقی! تری محفل ابھی تک یاد ہے
قطرے قطرے کے لئے جب دل کو ترسانا پڑا

بلبل و گل کی سخن میں دیکھ کر بیتابیاں
مجھ کو یہ سب اپنے ہی لفظوں میں دہرانا پڑا

کیا کہوں دنیا سے میں چھپ کر کبھی [illegible] ہوا
ایک شیشہ [illegible] پڑا

موج آخر موج ہے ساحل پہ [illegible]
موج کو ساحل سے [illegible] جانا پڑا

افسانہ

انور قمر (بمبئی)

ہاتھیوں کی قطار

اپنے کمرے کی مغربی سمت میں کھلنے والی کھڑکی کے پردے سرکانے کے بعد بیرام جی کو جب روشنی کا مینار نظر نہ آیا اور خیال مغرب کی سمت نظر دوڑانے پر انھیں مچھیروں کی جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے چراغ بھی نظر نہ آئے تو انھوں نے پریشان ہو کر اپنی کمزور انگلیوں سے کھڑکی کی کنڈی سرکائی اور بڑی مشکل سے دھکے دے دے کر کھڑکی کھولی۔ ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ بارش کی بوچھار کمرے میں آئی اور پلک جھپکتے میں بیرام جی کو شرابور کر گئی۔ اپنی عادت کے مطابق بیرام جی نے گندی سی گالی دی اور گھبرا سا منہ بنا کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ کھلی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنا بھول گئے اور کھڑکی بند کر دینے کے بعد بھی انھیں یاد نہ رہا کہ انھوں نے کھڑکی کیوں کھولی تھی۔ اس وقت تو انھیں اپنے بھیگے ہوئے کپڑے بدلنے کی فکر کھائے جا رہی تھی اور ساتھ ہی گیلا فرش پونچھنے کا تھکا دینے والا کام اُن کے سر پر آن پڑا تھا۔ پینسٹھ سال کی عمر کے آدمی کو اپنے معمول سے زیادہ جو بھی کام کرنا پڑتا ہے، وہ اُسکے لئے سوہانِ روح ثابت ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد بیرام جی فرش پونچھ کر، اور کپڑے بدل کر، تھکے ہارے ایک آرام کرسی پر اسی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئے۔

بیرام جی گھنٹہ بھر قبل پونا سے لوٹے تھے۔ انھوں نے آتے ہی اپنے کمرے کی ہر چیز سے گرد جھاڑی تھی۔ فرش پر جھاڑو پھیری تھی۔ پلنگ کی چادر بدلی تھی۔ مٹکے کا باسی پانی پھینک کر تازہ پانی بھرا تھا۔ داخلی دروازے کی باہری چوکھٹ پر دودھ کی بوتل رکھ چھوڑی تھی اور دروازہ کی باہری کنڈی ہی سے ایک تھیلی لٹکا دی تھی کہ صبح دودھ والا اُس بوتل میں دودھ اُنڈیل دے اور پاؤ والا اُس تھیلی میں پاؤ چھوڑ جائے۔ انھوں نے اپنے [illegible] کہ صبح نیند سے بیدار ہو کر بغیر کسی جھنجھٹ کے، اُس پر چائے کا پانی دم دیا جا سکے۔

انھیں جب ان چھوٹے بڑے کاموں سے فراغت نصیب ہوئی تھی تو حسبِ معمول اپنی تھکن دور کرنے اور اپنے یارِ دیرینہ کو اپنی واپسی کی اطلاع دینے کی خاطر اُنھوں نے کھڑکی سے پردہ سرکایا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ سمندر کی طوفانی موجوں میں گھرا روشنی کا مینار (جسے سالہا سال سے روزانہ دیکھتے دیکھتے انھیں اُنسیت ہو گئی تھی) کتنا پُراسرار اور خوفناک لگتا ہوگا۔ لیکن انھیں وہاں سیاہی کی پھیلی ہوئی طویل چادر کے سوا جب کچھ اور نظر نہ آیا تھا تو انھیں اپنی آنکھوں پر دھوکہ ہوا تھا۔ اس لئے فوراً انھوں نے مچھیروں کی بستی پر نظر ڈالی تھی جہاں شام ڈھلے چراغ روشن ہو جاتے تھے اور رات بھر روشن رہتے تھے۔

بیرام جی نے سیکڑوں راتیں اسی طرح اس آرام کرسی پر اسی کھڑکی کے پہلو میں بیٹھ کر گذاری تھیں۔ وہ راتیں جب اُن کا بوڑھاپا دن میں اُن کے جسم کو تھکنے نہیں دیتا تھا اور موت و تنہائی کا ڈر انھیں سونے نہیں دیتا تھا۔ یا اُن کے جسم کے مضمحل اعضا، اُن کی جوانی کی لغزشوں نے تو جنہیں اور لاپرواہیوں کے برتنے کے سبب درد سے چور ہو کر اُن تھوں میں فریاد کرنے لگتے تو بیرام جی کا دل گھبرا جاتا اور بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگتیں۔ لیکن راتیں گذرنے میں جب اپنا وقت لیتی تو بیرام جی اپنے پلنگ سے اٹھ کر اُس آرام کرسی پر جا بیٹھتے اور سمندر کی ہولناکیوں، چیرہ دستیوں اور ظلم رانیوں میں گھرے اُس روشنی کے مینار کو دیکھ کر اپنا مورلی MORALE بلند کرتے۔

وہ اپنے دل کو تسلی دیتے کہ نہ گھبرا، اس تاریکی سے، نہ ڈر اس تنہائی سے، صبح ہونے کو ہے۔

(دیکھ کر اُن مچھیروں کی جھونپڑیوں میں زندگی ہمک رہی ہے)

جہاں اُن کے قہقہے، اُن کے بچوں کی رونے کی آواز، اُن کی عورتوں
کی کسک اور دبی دبی سی ہنسی گونج رہی ہے۔
یہ ثبوت ہے زندگی کا جو سمندر کے اتنے قریب ہے۔
اور روشنی کا وہ ثابت قدم مینار،
جسے سمندر کی جوان لہروں کا بل ایک جنبش بھی نہ دے سکا،
تو پھر تو خوف سے کیوں متزلزل ہوا جا رہا ہے۔

یوں سوچتے سوچتے برام جی کی آنکھ لگ جاتی اور جب صبح کو وہ آنکھ ملتے بیدار ہوتے تو انھیں اپنے کو بجائے پلنگ پر لیٹنے کے، اُس کرسی پر پاکر حیرت ہوتی پھر وہ مسکرا کر جمائی لیتے، اٹھ کھڑے ہوتے اور ٹنکیر کی ڈبیا ٹیبل پر سے اٹھا کر دانت مانجنا شروع کر دیتے۔

جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا، اپنی ماں کی دیکھا دیکھی ٹنکیر ہی سے دانت مانجا کرتے تھے۔ اور اس عمر کو پہونچ کر بھی، جب کہ اُن کے منہ میں دانت نہیں، دانتوں کے آثار باقی رہ گئے تھے، وہ بلاناغہ دن میں دو مرتبہ اُن پر ٹنکیر پھیرا کرتے تھے۔

دانتوں پر ٹنکیر پھیرتے پھیرتے وہ کمرے کے اِس کونے سے اُس کونے تک ٹہلتے رہتے۔ دس پندرہ منٹ تک اِس عمل کو جاری رکھنے کے بعد انھیں اپنے پیٹ میں سے کوئی ثقیل چیز نیچے سرکتی محسوس ہوتی اور جب وہ چیز سرکتے سرکتے کافی نیچے پہونچ جاتی تو وہ لیٹرین LATRINE میں چلے جاتے اور بغیر دروازہ بند کئے، بڑی دیر تک اپنے پیٹ کو سکیڑتے سمیٹتے رہتے۔ انھیں قبض کی دائمی شکایت تھی، جس روز بھی انھیں کھل کر اجابت ہو جاتی، اُس روز وہ بڑے خوش و خرم رہتے، گویا اُن کی دلی مراد بر آئی ہو ورنہ اِس انتظار میں اکڑوں بیٹھے رہنے کے وہ طویل لمحے انھیں اپنی زندگی میں کئے گئے کسی بھی انتظار سے کٹھن لگتے۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے برام جی محسوس کر رہے تھے کہ وہ خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ موسلا دھار مینہ کھڑکی کے شیشوں پر تڑاتڑ برس رہا تھا ہوا کے تھپیڑے کھڑکی کو چوکھٹ سمیت اکھاڑ دینے پر تُلے تھے۔ سمندر کی چنگھاڑ کے ساتھ ساتھ بادلوں کی گھن گرج بھی سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھار بجلی کی چمک میں سامنے میلوں تک پھیلے ہوئے سمندر اور روشنی کے مینار کے بجائے برام جی کو ہاتھیوں کی فوج کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ایسی بھیانک رات اُن کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ انھوں نے کرسی سے اٹھ کر پہلے تو گرم سویٹر پہنا۔ پھر اپنے گنجے سر پر مخمل کی گول ٹوپی رکھی اور زرتشت کی تصویر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی تیزی سے بڑبڑانے کے انداز میں کچھ دعائیہ کلمات پڑھنے لگے۔

دُعا ختم کر کے انھوں نے رحم طلب نظروں سے زرتشت کی تصویر کو دیکھا تو اُن کی نظر اس تصویر پر نصب، چوبیس گھنٹے روشن رہنے والے سرخ بلب پر جا پڑی، جو کسی خونی آنکھ کی طرح انھیں گھورتا نظر آیا۔ نظریں فوراً نیچی کر کے وہ پھر اُسی کرسی پر جا بیٹھے اور تسبیح اٹھا کر کلمات زرتشت کا ورد کرنے لگے۔

ورد کے دوران وہ بڑبڑائے جا رہے تھے۔

ایسی بھیانک رات تو میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ پینسٹھ سال بیت گئے مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے، لیکن کبھی میں نے اپنے دل میں اتنا خوف محسوس نہیں کیا۔

کیا میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں؟

یا بہت کمزور ہو چکا ہوں؟

یا میرا دل اتنا نازک ہو گیا ہے کہ اِس تھپیڑے سے طوفان باد و باراں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو مجھے اکیلے نہیں رہنا چاہیے۔ پُونا سے رخصتی کے وقت [illegible] ٹھیک ہی کہتی تھی کہ کوئی نوکر رکھ لوں جو میری دن رات دیکھ بھال کرتا رہے۔ یا پھر اُس کے یہاں بقیہ دن کاٹ دوں۔

یہ تو قطعی ناممکن ہے۔

بیٹی شادی کے بعد پرائی ہو جاتی ہے۔ اُس کے گھر تو مہمان بن کر بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہنا چاہیے۔ اور میں تین مہینے بِتا کر آ رہا ہوں۔

جمشید کیا سوچتا ہوگا؟

لیکن وہ کیا کرے؟ مجھے اپنے باپ کا خیال چاہیے ہے۔ خواہ مخواہ میں ایسے خیالات اپنے ذہن میں کیوں لا رہا ہوں؟

میں سوچ رہا تھا ... مجھے کس بات کی تکلیف ہے یہاں؟

فرصت [illegible] ملتی ہے کرلے

آتا بچّوں سے؟ اُتھر پلنگ سب بھی سات ہیں۔ رہا گھر کا کام سو وہ بھی تو کر دیتا ہو جسم میں چستی کہاں سے آئے؟
اب پہلے جیسا کھانا بھی تو کم کھاتا ہے۔
پھر آج کل کے نوکروں کا کیا بھروسہ؟
کب گھر والوں کو مار دیں اور پونجی جمع کر کے چلتے بنیں۔
اسماعیل موٹر والے کا کیس تو سامنے ہے۔
نا بابا نا — میں باز آیا ان نوکروں سے!

بیرام جی نے محسوس کیا کہ اُن کے ذہن و قلب نے رات کی بد خوابیوں کا اثر قبول کر کے اپنی قوت برداشت بڑھا لی ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھے اور میز کی دراز کھول کر، اس سُرخ بلب کی دُھندلی روشنی میں تین مہینے پہلے خرید کر رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ڈن ہل کا لمبا چوڑا پیکٹ اُن کے ہاتھ آیا۔ پھر انھوں نے اسٹو کے پاس رکھی ہوئی ماچس اور پلنگ پر پڑا ہوا بلینکیٹ اُٹھایا اور کرسی پر آ بیٹھے۔

پہلے تو انھوں نے بلینکیٹ کھول کر اپنے پیروں پر پھیلا دیا اور اُس کا ایک حصّہ اپنے سینے تک لے آئے۔ سگریٹ کی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور ماچس جلا کر سلگایا۔ پہلے ہی کش کے ساتھ تمباکو کی عربی کھجور جیسی خوشبو اُن کے نتھنوں کی راہ پھیپھڑوں میں پہونچی تو انھیں ایسا سکون ملا کہ وہ بھیانک طوفان اچانک تھم گیا ہو، احساسات کی تاریکی اچانک چھٹ گئی ہو اور سمندر کی اٹکھیلیاں کرتی لہروں میں پھر امید روشنی کا مینار ان سے باتیں کر رہا ہو۔

باتیں بیرام جی کی زندگی کا سب سے بڑا جُز تھیں۔ انھیں باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ باتیں..... اچھی اور بُری باتیں — بے تکی اور SENSIBLE باتیں، اخباری اور کتابی باتیں۔ گھر کی اور دنیا کی باتیں۔ سماجی باتیں، مذہبی باتیں، سینما اور تھیٹر کی باتیں، سطحی باتیں، گمبھیر باتیں، طلاق کی باتیں اور خاص معاملات کی باتیں۔ وہ باتیں کرنے کے شوق میں اپنے اسکول کے زمانے میں کئی بار کلاس روم سے باہر نکالے جا چکے تھے۔ [illegible] ٹیچروں نے اُن کی اسکول رپورٹ پر FAIR [illegible] CONDUCT سے بہتر

کبھی کوئی ریمارک نہیں دیا۔ ایک مرتبہ اپنے دوست کے ہمراہ اُس کے مکان کے سلسلے میں چلنے والے کیس کی HEARING کے دوران باتیں کرتے ہوئے جج کو ڈسٹرب کرنے کے جرم میں کورٹ روم سے باہر نکال دیئے گئے تھے۔

کلکٹر کے آفس میں انھیں لوگ اسی لئے چاہتے تھے کہ وہ بڑی دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور آفس کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتے تھے۔ کلکٹر نے انھیں کئی بار ٹوکا تھا کہ وہ اسٹینوگرافر اسٹاف ممبرز کو ہر وقت جمع نہ رکھیں، آفس کے کام میں حرج ہوتا ہے۔ لیکن ہر بار بیرام جی اپنی سر کی ہڈی کمانی دار عینک NOSE BRIDGE پر اور جھکی ہوئی ٹوپی سر پر ٹھیک سے جما کر مسکراتے ہوئے اپنے باس کو دیکھتے اور TYPICAL پارسی انداز میں کہتے۔

"جاوا دے نی ڈیکرا، بکاؤ چھے، ماری پاسے پرابلم لئی آویا کری چھے، اوں تے لوکو نے ADVICE آپو چھوں"
(ترجمہ: جانے دو بیٹا، بکتے ہیں۔ میرے پاس اپنے پرابلم لیا کرتے ہیں۔ میں انھیں مشورے دیا کرتا ہوں۔)

یہ سن کر کلکٹر بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر پاتا اور انھیں ہاتھ کے اشارے سے DISMISS کر دیتا تھا۔

ایسا باتونی شخص اپنے بڑھاپے کے حصار میں قید، اپنے ناساز حالات کا شکار، لائٹ ہاؤس سے باتیں نہ کرے تو کس سے کرے؟ خود نہ بڑبڑائے تو بچپن سے پرورش پائی ہوئی اس توانا خواہش کی تکمیل کیوں کر کرے؟

پچھلے دس سالوں میں اُن کی زندگی میں جتنے مدّوجزر آئے، اتنے کسی سمندر میں نہ آئے ہوں گے۔ ماں باپ گزر گئے۔ اُن کے پیچھے بیوی بھی چل دی۔ اکلوتی بیٹی جو شادی کے بعد بھی ساتھ رہا کرتی تھی، اپنے میاں کے نئے کاروبار کے تحت دوسرے شہر میں منتقل ہو گئی۔ نوکری سے ریٹائر ہوئے تو روز کے ملنے جُلنے والوں کے چہرے دیکھنے کو ترس گئے۔ مہنگائی بڑھی اور پنشن ناکافی ہوئی تو پُرکھوں کا مکان آدھے سے زیادہ کرایہ پر اُٹھا دیا۔ غرض یہ کہ بھرا پُرا گھر اُجڑ گیا۔ ہنستی کھیلتی زندگی پر خزاں کی افسردگی چھا گئی۔ نہ یار، نہ رشتہ دار، کوئی بھولے سے نہیں پھٹکتا۔ پاس پڑوس والے انھیں خبطی سمجھ کر کنی کاٹتے یا

کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو صرف

"بیرام جی کیم چھو ؟ سارو چھو"

اور سائب جی کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

کون تھا جس کی رفاقت میں یہ چند گھنٹے گزار سکتے؟ یا اپنے دل کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے۔ گنتی کے چند لوگ تو تھے جن سے انھیں چوبیس گھنٹوں میں واسطہ پڑتا تھا۔ کئی بار اُنھوں نے دودھ والے، پاؤ والے اور اخبار والے کو اپنی باتوں میں اُلجھانا چاہا۔ لیکن وہ کب تک اِس بوڑھے کی باتوں میں اپنے کام کے وقت دلچسپی لیتے؟ تھوڑی دیر تک تو وہ بڑے صبر سے اُن کی باتیں سُنتے اور پھر دوسروں کے گھر اپنے مال کی ڈلیوری میں دیر ہو جانے کا بہانہ بنا کر رخصت ہو جاتے۔

بیرام جی کے معمول میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ناشتہ کر کے ہواخوری کو نکلا کرتے تھے۔ برس کے بارہ مہینے، اُن کی صبح کی سیر اٹل تھی۔ برسات میں چھتری اور سردی میں اوور کوٹ اوڑھے وہ نیپینسی روڈ NEPEONSEA روڈ سے ہارکینس روڈ تک جاتے۔ یہ فاصلہ کسی صورت میں دو میل سے کم نہ تھا لیکن بیرام جی خراماں خراماں اسے طے کر لیا کرتے تھے۔

دراصل اُنھیں اس علاقہ سے دلی لگاؤ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا یہ لگاؤ؟ بیرام جی کا بچپن اسی علاقہ میں گذرا تھا۔ کیسا شاداب اور پُرفضا مقام تھا وہ! سرسبز و شاداب پہاڑیوں پر واقع! سمندر سے گھرا ہوا، جہاں بل کھاتی ہوئی سڑکیں اوپر سے نیچے کسی چھرے کی صورت بہتیں۔ دُور دُور بنے ہوئے بنگلوں کو نیچے سے دیکھ کر گمان ہوتا کہ گویا ایک دوسرے سے غیر متعارف انگریز ٹوپیاں پہنے ہوئے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اور رات جب کیس کے ہنڈولے ان پُرپیچ راستوں پر روشن ہو جاتے تو نیچے سے دیکھنے والا سمجھتا کہ بہت سے جگنو اُس پہاڑی پر مختلف قطاروں میں بیٹھے ہیں۔

[illegible] اس علاقہ کی آبادی بہت کم تھی۔ وہاں رہنے والے زیادہ [illegible] لوگ بڑے بڑے سرکاری دفتروں میں کام کرتے

اُن کا خاندان بڑا ہوتا تھا کم از کم پندرہ بیس افراد پر مشتمل۔ ایک شخص کماتا، دوسرے کھاتے تھے۔ انھیں فکر کاہے کی تھی؟ وہ زمانہ آج کا زمانہ نہیں تھا خوف و اندیشوں کا زمانہ! وہ بے فکری کا زمانہ تھا۔

بیرام جی کا باپ کلکٹر کے دفتر میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ ہزار روپے تنخواہ، موٹر گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر، سب کچھ تو تھا۔ بیرام جی BEPTAST ہائی اسکول میں پڑھنے کو جایا کرتے تھے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی تو یہ اپنے دوستوں کو، جو بمبئی کے گرد و نواح میں رہتے، اپنے گھر دن گزارنے بلا لیا کرتے تھے۔

مکان کے پچھواڑے کھلا میدان تھا، بیرام جی اور اُن کے دوست وہیں اسٹمپس گاڑ کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ کھیلتے کھیلتے دوپہر ہو جاتی تو کھانا بیرام جی کے گھر ہی پر ہوتا، جس کا انتظام اُن کی ماں اپنی نگرانی میں کرتیں۔ چکن دھان سک، کباب، پاپڑ اور کچھ مزید انھیں آئسکریم یا فروٹ جیلی پیش کی جاتی۔

خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد بیرام جی اور اُن کے دوست بنگلہ کے برآمدے میں صوفوں پر دراز ہو جاتے، گراموفون آن کر دیا جاتا اور سہگل کا گیت "سو جا راجکماری..." سو جا بڑے شوق سے بار بار سنا جاتا۔ سہ پہر کو چائے پی کر یہ سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوتے۔

کہتے ہیں کہ کھلے میدان سے آسمان کا نظارہ کرنے کا لطف صرف وہی شخص جانتا ہے جو میدان کی ہری گھاس پر دو گھنٹے تک لیٹا ہو اور مسلسل آسمان کو تکتا رہا ہو۔ ایک بے کنار وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ نیلے آکاش میں سفید بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گالوں سے اُڑتے چلے آتے ہیں اور بہت بلندی پر اُڑتی ہوئی چیلیں اپنے پھیلے ہوئے پروں کو جنبش دیئے بغیر اپنا توازن سنبھالے سمندر میں چلنے والی کشتیاں سی لگتی ہیں۔

بیرام جی اکثر میدان میں لیٹے آسمان کو گھنٹوں دیکھا کرتے تھے۔ اور غروب کا منظر؟ ہاں وہ بھی [illegible] دونوں دیکھنے کا شوق [illegible]

[illegible] کرتا تھا، [illegible] تھے۔

گزشتہ دس سالوں سے برام جی محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے کھیل اور قدرت کے میدان، وہ جنگلے، وہ پہاڑیاں، وہ بل کھاتی سڑکیں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جا رہی ہیں اور اُن کی جگہ دیو پیکر آہنی شکنجے کی سیمنٹ اور سپاٹ عمارتیں کھڑی ہوتی جا رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ قدرتی حسن پامال ہوتا جا رہا ہے۔ اب نہ تو سبزہ ہے نہ درخت، نہ پھول ہیں نہ پتے۔ نہ چڑیاں ہیں نہ گلہریاں۔ نہ تتلیاں ہیں نہ بھنورے۔ نہ گرگٹ ہیں نہ مینڈک، کچھ بھی تو نظر نہیں آتا! او گاڈ، وہ سب کہاں گئے؟ کیا ہوئے؟ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ کئی دنوں تک وہ اس فکر میں رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ کتنا ہو چکا ہے؟ اور کتنا ہونا باقی ہے؟
اس کی کوئی انتہا بھی ہے؟ اس کا کوئی خاتمہ بھی ہے؟
یا یہ اسٹیل اور سیمنٹ کا جنگل جو ہر لمحہ اور ہر پل اپنے پھیلاؤ میں بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان کی ہر سانس کا احاطہ کر لے اور اس کا جینا دوبھر کر دے۔ یہ تو اُس کے ذہن، قلب اور شعور پر ظلم کا پہاڑ بن کر ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے اس کی مخالفت کرنی ہی پڑے گی۔

انھوں نے مختلف اخباروں کے ایڈیٹروں کو خط لکھے اور بڑی مدلل باتوں سے ثابت کیا کہ آدمی اپنی خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں شہر کے ساتھ بدسلوکیاں کر رہا ہے۔ اگر فوراً نئے مکانات کی تعمیر نہیں روکی گئی، خود غرض عمارتی ٹھیکیداروں کے منصوبوں کی پیمائش نہیں روکی گئی، اُن کے منصوبوں کی مذمت نہیں کی گئی تو یہ شہر اسٹیل اور سیمنٹ کا جنگل ہو کر رہ جائے گا جس میں اژدہوں اور بھوتوں کے ہیبت ناک جانور رہنے لگیں گے جن سے انسان خوفزدہ ہو کر [illegible] رہ جائے گا۔

برام جی کے خطوط ایڈیٹروں نے بڑے اہتمام سے شائع کئے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اُن کے خط کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگایا کہ اگر اس سلسلے میں شہر کے معروف معزز شہری کوئی مہم چلانا چاہیں تو ادارہ اُن کے منصوبے کی تائید کا وعدہ کرتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد [illegible] برام جی کے خیالات کی تائید میں شائع ہوئے [illegible]۔ ad hoc کمیٹی بنائی گئی۔ ایک میونسپل باڈی کے تحت شہر کے مختلف اداروں کیلئے کئی چھوٹی بڑی کمیٹیوں کا قیام ہوا۔ ان کمیٹیوں نے ہر نئی بننے والی نئی عمارت پر اپنا مورچہ بھیجا۔ عمارتی ٹھیکیداروں کے دفتروں کے سامنے بھوک ہڑتالیں کیں اور ایسی کاز کے لئے خود سوزی کرنے والے دو تین ممبروں کو پولیس نے گرفتار کیا۔
نتیجہ لاحاصل رہا۔
لائنز کلب نے اپنے ہر علاقہ میں سیمینار منعقد کئے، لیکن لاحاصل کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ عمارتیں بنتی رہیں، بنتی گئیں اور آئے دن ذرا ذرا سی جگہوں پر بنتی گئیں۔

سیر کو جاتے ہوئے برام جی جب بھی کسی عمارت کی بنیاد پڑتے دیکھتے تو اُن کے دل سے آہِ سرد نکل پڑتی تھی۔ اب تو اُن کا جی سیر میں بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ جس حسنِ قدرت کو دیکھنے نکلا کرتے تھے، وہ تو ان عمارتوں کے آہنی وجود تلے دفن ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے انھیں اُن عمارتوں کی بالکنیوں میں کوئی دانت مانجھتا، کپڑے سکھاتا، یا شب خوابی کے لباس میں چائے پیتا نظر آتا تھا۔ راستہ پر موٹر گاڑیاں، اور بسیں دندناتی ہوئی اُن کے بہت قریب سے گذر جاتیں اور برام جی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑا جاتی تھیں۔ وہ انسان کے اس ظالمانہ رویہ پر لعنت بھیجتے گھر لوٹ جاتے تھے۔

اب تو انھوں نے صبح کی سیر کو بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ بس اُسی کھڑکی کی بغل میں بیٹھ کر کبوتروں کی غٹرغوں پر رہا نگی، آتی پرندوں کی اُڑان اور غروب کا منظر دیکھا کرتے تھے اور اپنے ہم دمِ دیرینہ کو اپنے دل کی باتیں سنا کر تسکین پا لیتے تھے۔

دن کا اُجالا دبے پاؤں اُسی کھڑکی کی راہ برام جی کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے برام جی کو آرام کرسی پر سوتا پایا۔ اُن کے چہرے پر سفر کی تکان، رات کی بے خوابیوں کا اثر اور خطرناک اندیشوں کا ملال کچھ بھی تو نہ تھا۔ اُن کی پائینتی کے قریب کئی جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور BUTTS پڑے تھے۔
تھوڑی دیر بعد برام جی نیند سے بیدار ہوئے تو انھیں پھر

(باقی صفحہ ۵۳ پر دیکھئے)

کرشن موہن

○

بڑھ چلی ہے پیاس دَورِ جام ہونا چاہیئے
کچھ جوابِ گردشِ ایام ہونا چاہیئے

دِل کو اُسکی یاد ہی سے کام ہونا چاہیئے
لب پہ اُس کا نام صبح و شام ہونا چاہیئے

شوق کی رفعت یہی ہے عشق کی عظمت یہی
آدمی کو شہر میں بد نام ہونا چاہیئے

انگلیاں اُٹھیں جہاں جاؤں تمہارے شہر میں
میری رُسوائی کا چرچا عام ہونا چاہیئے

کہہ رہے ہیں اگلے وقتوں کے یہ سادہ لوح لوگ
شاعری میں کچھ نہ کچھ پیغام ہونا چاہیئے

شوقِ خوش آغاز پر تھا نا ناز سمجھے تھے ہم
داستانِ دِل کو خوش انجام ہونا چاہیئے

گو وصالِ یار کی خواہش خیالِ خام ہے
زیست کو نظرِ خیالِ خام ہونا چاہیئے

عشق ہی صید و تم ہوا عشق ہی وقتِ الم
عشق ہی کو موردِ الزام ہونا چاہیئے

کرشن موہن لُطف جب ہے آدمی ایسے جیئے
اِک جہاں حسنِ عمل کا رام ہونا چاہیئے،

طُرفہ قریشی

○

بھُلا دے اگلے رنج و غم نشاطِ دل کی باتیں کر
نہ رو ماضی کا رونا، حال و مستقبل کی باتیں کر

کِسی کی گمرہی پر نکتہ چیں ہونے سے کیا حاصل،
تو اپنی راہ اپنے جادہ و منزل کی باتیں کر

سمجھ میں آئے گا ماحولِ غم کیا چند لفظوں میں
کُشادہ خاطری سے تنگنائے دِل کی باتیں کر

بغیر ناخُدا کشتی کنارے لگ نہیں سکتی
سرِ ساحل کی باتیں یا لبِ ساحل کی باتیں کر

بجز یک لمبی خاموشی نتیجہ کچھ نہ نکلے گا
سحر سے شام تک دُنیائے آب و گِل کی باتیں کر

یہ دنیا ہے، یہاں کے سارے رستے دیکھے بھالے ہیں
جہاں انسان بھٹک جاتا ہے اُس منزل کی باتیں کر

بہت ہی اضطراب انگیز ہیں ماضی کے افسانے
نہ چھیڑ اُن کو قرارِ جانِ شکستہ دل کی باتیں کر

نتیجہ خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں ناداں
کبھی جلوے کی باتیں کر، کبھی محفل کی باتیں کر

فضا بکھری ہوئی ہے نا قصوں کا دور دورہ ہے
سمجھ کر سوچ کر طُرفہ کسی کامل کی باتیں کر!

مقالہ

ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال)

اُردو میں ببلیوگرافی

اُردو میں منظم تحقیقی کام کے فروغ کے ساتھ ساتھ ببلیوگرافی کی ضرورت بھی روز افزوں محسوس کی جا رہی ہے۔ ببلیوگرافی سے مراد حوالوں کی وہ فہرست ہے جس کی مدد سے کسی خاص موضوع سے متعلق تحریرات کی جانب ضروری نشاندہی ممکن ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری علم کے ذخیرے میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور آج کے مشینی دور میں ان اضافوں کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ علم کے ہر شعبے میں نئی گنجائشیں واضح ہو رہی ہیں، نئی تحقیق کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں، نئی دریافتیں ہو رہی ہیں اور نئے امکانات اُبھر رہے ہیں اور بے شمار مختلف اور متعدد تحریرات میں ظاہر ہو رہے ہیں، جنھیں آج کے چھاپے خانے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ کتابوں، رسائل اور اخبارات کی شکل میں چھاپ کے جدید ترین ترسیل و رسائل کے ذرائع کی مدد سے وسیع سے وسیع تر دائرے میں پھیلا رہے ہیں۔ چنانچہ جوں جوں معلومات کا یہ ذخیرہ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے، یہ بھی ضروری ہوتا جا رہا ہے کہ زیادہ سہولت کے ساتھ فائدہ اُٹھانے کی غرض سے اس ذخیرے میں کوئی تنظیم اور ترتیب لائی جائے اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر آج ببلیوگرافی کی تیاری کی جانب توجہ دی جا رہی ہے۔

ببلیوگرافی کی اصطلاح، تحریرات کے متعلق حوالوں کی مختلف اشکال کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن اُردو میں ابھی ببلیوگرافی کا کام اپنے ابتدائی دور میں ہے، اس لئے زیادہ پیچیدہ اشکال کے معیاری نمونے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ فی الحال اُردو میں ببلیوگرافی کی بحث کو ببلیوگرافی کی دو اہم شکلوں تک محدود رکھنا مفید ہوگا۔

ببلیوگرافی کی ایک قسم شماری کتابیات کہی جاتی ہے اور کتابی حوالوں کے ایک بہت بڑے میدان کا احاطہ کرتی ہے۔ اس نوعیت کی ببلیوگرافی میں کسی خاص موضوع سے متعلق تحریرات کے حوالوں کے شمار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان حوالوں کے تحت جو تفصیلات بیان کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔ اگر کسی کتاب کا حوالہ درج کیا جا رہا ہے تو اس کے لئے بالترتیب مصنف یا مرتب کا نام، پھر کتاب کا نام، ناشر کا نام اور مقام و سنہ اشاعت تحریر کیا جاتا ہے۔ اگر حوالہ کسی رسالے میں شائع ہونے والی تحریر کا ہے تو بالترتیب مصنف کا نام، پھر تحریر کا عنوان، رسالے کا نام، مقامِ اشاعت، جلد نمبر اور شمارہ نمبر، تاریخِ اشاعت اور ان صفحات کا نمبر جن پر یہ تحریر پھیلی ہوئی ہے، درج کیا جانا ضروری ہے۔ شماری کتابیات کی موضوعات اور ترتیب کے لحاظ سے متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں کسی ایک مصنف کے اعتبار سے تیار کی جانے والی ببلیوگرافی سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس قسم کی کتابیات دو حصّے کئے جا سکتے ہیں۔ اولاً ایسی ببلیوگرافی جو مصنف کی اپنی تصانیف پر مشتمل ہو اور دوسری وہ ببلیوگرافی جس میں اُس مصنف سے متعلق تحریرات کو شامل کیا گیا ہو۔ بعض اوقات یہ دونوں حصّے یکجا رکھے جاتے ہیں اور بعض مواقع پر طوالت یا کسی دوسری مصلحت کے پیشِ نظر کوششیں کسی ایک حصّے پر مرکوز رکھی جاتی ہیں۔

اُردو میں جن مصنفین کی ببلیوگرافی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ان میں غالب کا نام سرِ فہرست ہے۔ سب سے پہلے مولانا [illegible] نے "اشارات" کے عنوان سے رسالہ "عالمگیر" کے جلد ۲ [illegible] کے شمارے میں ایسی تحریرات کے بارے میں اشارات درج کئے جو اُس وقت تک غالب پر شائع ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر کام پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور عتیق الرحمٰن صدیقی نے شروع کیا جو کہ "غالب نما" کے عنوان سے "اردوئے معلّٰی" کے غالب نمبر [illegible] میں شامل کیا گیا۔ اسی زمانے میں نثار احمد فاروقی، عبداللطیف اعظمی اور ابو سلمان شاہجہاں پوری نے غالبیات

شمارہ

ببلیوگرافی مرتب کر کے اپنی کتابیات مختلف رسائل میں شائع کیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے دوران پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے "غالبیات" کے عنوان سے اپنی ببلیوگرافی شائع کی۔ کتابی شکل میں غالب کی یہ پہلی ببلیوگرافی تھی۔ غالب صدی تقریبات کے دوران ہی بعض دوسرے اداروں کی جانب سے غالب ببلیوگرافی کی اشاعت کے منصوبوں کا اعلان کیا گیا۔ پاکستان میں سید ابوالحسن قیصر نے "غالب نما" کے عنوان سے پاکستانی رسائل میں غالب سے متعلق تحریرات کی فہرست شائع کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے سید معین الرحمٰن کے مرتب کئے ہوئے "اشاریۂ غالب" کا پہلا حصہ جاری کیا گیا جو کہ تحریرات غالب پر مشتمل ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے محمد انصار اللہ کی "غالب ببلیوگرافی" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ببلیوگرافی غالب کی اپنی تحریرات اور غالب سے متعلق تحریرات کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں غالب صدی کے دوران شائع ہونے والے رسائل کے خصوصی شماروں اور دیگر تصانیف بھی مندرج ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ببلیوگرافی غالب پر اب تک موجود والوں میں سب سے زیادہ مبسوط ہے۔ اگر اس کی ترتیب و تنظیم پر زیادہ توجہ دی گئی ہوتی تو یہ کتاب بلا شبہ ایک معیاری ببلیوگرافی بن سکتی تھی۔ کچھ رسالوں نے بھی اپنے غالب نمبروں میں ببلیوگرافی کے لئے گنجائش پیدا کی۔ بمبئی کے رسالے "شاعر" اور لاہور کے رسالے "کتاب" میں مفید اشارے اور مضامین شامل کئے گئے۔

اُردو کے دوسرے شاعروں پر اتنے وسیع پیمانے پر ببلیوگرافی مرتب کرنے کا کام نہیں کیا گیا جتنا غالب پر ہوا۔ اقبال پر ملک نذیر احمد کی "کلید اقبال" کے نام سے ایک ببلیوگرافی شائع ہوئی ہے۔ میر انیس پر پہلے ضمیر اختر نقوی نے رسالہ "ماہ نو" کے انیس نمبر میں "گنجینۂ انیس" کے نام سے ایک ببلیوگرافی شائع کی تھی۔ گذشتہ سال عبدالقوی دسنوی نے "انیس نما" کے عنوان سے کتابی شکل میں ایک زیادہ مکمل ببلیوگرافی چھاپی ہے۔

جن نثر نگاروں کی ببلیوگرافی تیار کی گئی ہے ان میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سید احتشام حسین اور کرشن چندر شامل ہیں۔ شبلی کی کتابیات اسحاق نعمانی نے "ادیب" کے شبلی نمبر میں جو کہ ستمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ "مقالہ نما برائے شبلی" اور "کتب نما برائے شبلی" کے زیر عنوان پیش کی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف کی فہرست عبدالقوی دسنوی کے اپنے کتابچے "ایک اور مشرقی کتاب خانہ" میں اور "مقالات علامہ سید سلیمان احمد ندوی" کے عنوان سے مضامین کی فہرست "معارف" مئی ۱۹۶۶ء میں شائع کی ہے۔

مولوی عبدالحق کے مضامین کا اشاریہ اشرف علی نے تیار کر کے "قومی زبان" کے بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۱ء میں شامل کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ببلیوگرافی ابوسلمان شاہجہان پوری نے "نقوش امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد" کے نام سے "اردو ادب" کے مختلف شماروں میں پیش کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریرات پر خود میں نے ایک تفصیلی ببلیوگرافی مرتب کی ہے۔ سید احتشام حسین کی تحریرات پر مشتمل ایک مکمل ببلیوگرافی پروفیسر دسنوی نے بڑی محنت سے تیار کی ہے جو کہ "آہنگ" کے احتشام حسین نمبر میں چھپی ہے اور اسے کسی ایک مصنف کی تحریرات سے متعلق اچھی ببلیوگرافیوں میں شامل کرنے میں کسی تامل کی گنجائش نہیں ہے۔ کرشن چندر پر بمبئی کے رسالے "شاعر" نے ایک خصوصی نمبر نکالا تھا اس نمبر میں کرشن چندر کی تصانیف کی ایک مکمل فہرست دی گئی ہے۔

اُردو میں معاصرانہ تحریرات کا اشاریہ تشکیل دینے کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا دائرہ ابھی تک رسائل و اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین اور تبصروں تک ہی محدود ہے۔ اس کام کی ابتدا بمبئی کے رسالے "نوائے ادب" [illegible] ۱۹۶۱ء میں کی تھی۔ بعد میں "قومی زبان" نے بھی اس کام کو اپنایا۔ ان دونوں رسائل میں ادب [illegible] شامل کرنے پر توجہ دی گئی اور مناسب عنوانات کے تحت ان کو ترتیب دیا گیا۔ ان رسائل [illegible] کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا دائرہ صرف اُردو زبان و ادب سے متعلق مضامین تک محدود [illegible]

ببلیوگرافی کی ایک اور قسم توضیحاتی ببلیوگرافی ہے جو کہ تحریرات کی اشاعت کے بارے میں ضروری معلومات کے علاوہ اُن کے نفسِ مضمون کے بارے میں بھی واقفیت بہم پہونچاتی ہے۔ "نوائے ادب" میں شائع ہونے والے "مقالہ نما" میں دوسری تفصیلات کے ساتھ ساتھ اُن مقالوں کے لُبِ لباب کو بھی شامل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عابد رضا بیدار نے "غالبیاتِ نو" میں توضیحاتی ببلیوگرافی کا اُسلوب اختیار کیا ہے۔ مجیب الغفار اللہ نے "غالب ببلیوگرافی" میں کہیں کہیں توضیحاتی اشاروں سے کام لیا ہے۔ ملک نذیر احمد نے بھی "کلیاتِ اقبال" میں بعض جگہوں پر مضامین کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔

اُردو میں اس طرح ببلیوگرافی کے کام کی ابتدا تو ہو چکی ہے لیکن ابھی اس میں معیاریت کی کمی ہے۔ ببلیوگرافی کی تیاری میں جن بنیادی نکات پر توجہ دی جانا چاہئے اُن پر بسا اوقات دھیان نہیں دیا جاتا۔ مثلاً اکثر ببلیوگرافیوں میں مجموعہ ہائے مضامین یا رسائل میں شامل تحریرات کا حوالہ دیتے ہوئے صفحات نمبر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ببلیوگرافی کے اسلوب میں یکسانیت پر بعض اوقات زور نہیں دیا جاتا۔ مثلاً بعض اندراجات کے ساتھ توضیحی اشارات درج کر دئیے جاتے ہیں جبکہ دوسرے اندراجات کے ساتھ یہ التزام نہیں رکھا جاتا۔ علاوہ ازیں مضامین کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر کے ترتیب دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ تقسیم یکسر ذاتی پسند پر منحصر ہوتی ہے اور اس کی کوئی سائنٹیفک بنیاد نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں ببلیوگرافی ایک انتشار کا نمونہ پیش کرتی ہے جبکہ ببلیوگرافی کا بنیادی اصول ترتیب و تنظیم ہونا چاہئے۔

اُردو میں ببلیوگرافی کے میدان میں اتنا کام نہیں ہو رہا ہے جتنا کہ ہونا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سمت میں کوششیں برابر جاری ہیں لیکن ان کوششوں کے ایک منظم لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ خاص ادبی نوعیت کے رسالوں میں کتابیات کی اشاعت کے لئے مستقل گنجائش رہنا چاہئے تاکہ قارئین نئے اضافوں سے باخبر رہیں۔ دوسرے یہ کہ ابھی تک اُردو ادب کے مطالعہ کے لئے ایک بھی ایسی ببلیوگرافی موجود نہیں جو مختلف مصنفین مختلف ادوار اور مختلف اصناف کے بارے میں بنیادی اہمیت کے حوالوں کی جانب رہبری کر سکے اور کم از کم وہ سہولت حاصل ہو سکے جو انگریزی ادب کے مطالعے کے سلسلے میں CONCISE CAMRIDGE BIBLIOGRAPHY OF ENGLISH LITERATURE تیسرے یہ تجویز ہے کہ ببلیوگرافی کے اس ذخیرے کو جو تحقیقی مقالوں یا رسالوں کے خاص نمبروں میں پوشیدہ پڑا ہے بازیافت کی جائے اور ببلیوگرافی کی ببلیوگرافی بھی تیار کی جاسکے۔ چوتھے یہ کہ ادب کے علاوہ علم کے دوسرے شعبوں سے متعلق تحریرات کی ببلیوگرافی بھی مرتب کی جائے۔

بڑھتی ہوئی تحقیقی ضرورتوں کے پیشِ نظر ببلیوگرافی کی تیاری کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن فہرست سازی ان ضرورتوں کا آخری حل نہیں ہے۔ اصل مقصد ان تحریرات کو حاصل کرنا اور اُن سے فائدہ اٹھانا ہے۔ چنانچہ ببلیوگرافی کی ترتیب کے ساتھ ساتھ ہمارا ماحول اس کا بھی ضرورت مند ہے کہ مختلف کتب خانوں میں موجود نایاب رسائل کی فائلوں اور نایاب کتابوں کی فہرستیں شائع کی جاتی رہیں تاکہ محقق کو اپنی ضرورت کے مطابق مواد تلاش کرنے میں سہولت ہو سکے۔ پرانے رسالوں کے اشاریے تیار کرنے اور مخطوطات کی فہرستیں مرتب کرنے کا بھی کام کیا گیا ہے۔ یہ کام بلاشبہ بڑی علمی اہمیت کا ہے اور اس کے ذریعے مستقبل میں تحقیق کے راستے میں سہولتوں کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ تحریرات کی تلاش و تفتیش اور ببلیوگرافی کی تیاری جدید اصولِ تحقیق کا ایک ضروری پہلو ہے اور اس پر مناسب توجہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ ▲▲

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال)

مصوّر سبزواری

○

نقاب اوڑھے طلسمی گھوڑوں پہ فاتحانہ جوانیوں کے
ہوں زندہ کردار جیسے ہم تم ازل سے جھوٹی کہانیوں کے

چراغ، مہتاب، صبح، سورج ہمارے نقشے میں تو نہیں تھے
خطوط ہم کو دکھا رہے ہو دروغ گو کامرانیوں کے

برستے بادل کے ساتھ آئے تھے جو مسافر انہیں نہ ڈھونڈو
نگل چکے ہیں انہیں بگولے سمندروں کی روانیوں کے

سروں سے تو بے وقوف لہرو کبھی کا پانی گزر چکا تھا
نہ جانے کس کو ڈرا رہی ہو دکھا کے یہ شہر پانیوں کے

کسی زمستاں کی شام آخر چھپے گی یہ برف پوش وادی
بدن بنیں گے تمام کتبے ہوس گزیدہ نشانیوں کے

مصوّر سبزواری

○

پکڑ کے بانہہ مری صبح تک چلے گا کون ؟
میں اندھی شب ہوں چراغِ شناخت دے گا کون؟

کھڑے ہیں دونوں مقابل میں حادثے کی طرح
یہ آج فیصلہ ہونا ہے کل رہے گا کون ؟

تم ان میں چاہو تو سارے جہاں سمو دینا
سمندروں سے گہرے ہیں یہ زخم انہیں بھرے گا کون ؟

اکیلے گھر کی ہیں دیواروں پہ کئی چہرے
یہ دیکھنا ہے مری موت پہ ہنسے گا کون ؟

بکھر رہے ہیں ابھی جسم اس سے مل مل کر
وہ رقصِ بے بدنی ہے، اسے چھوئے گا کون ؟

مصوّر اُس کا تجسس تو رائیگاں نہ گیا
سوال یہ ہے کہ میرا سراغ دے گا کون؟

نریندر لوتھر (حیدرآباد)

سالگرہ

آج چوتھی بار مسٹر اور مسز کھنّہ کو پھر اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو ہر سال ایک مرتبہ اُن کے سامنے پیدا ہوتا۔ اُن کا لڑکا رمیش پاگل خانے میں تھا۔ اُسے اُس کی سالگرہ پر کیا تحفہ دیا جائے؟ ویسے اُسے کسی بھی تحفے کی خواہش نہیں تھی۔ کھلونوں سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ کتابیں اُس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ مٹھائی اُس کی بیماری کے لئے نقصاندہ تھی۔ آخر کافی سوچ وچار کے بعد پچھلے سال کی طرح اس بار بھی انھوں نے فیصلہ کیا کہ اُسے تازہ پھلوں کی ڈالی تحفتہً دی جائے۔

رمیش اُن کا اکلوتا بچہ تھا۔ کتنی منتیں ماننے اور کتنے جتنوں کے بعد شادی کے دس سال بعد انھیں یہ اولاد نصیب ہوئی تھی۔ اب وہ دونوں ادھیڑ عمر ہو چکے ــــ مسز کھنّہ کچھ بجھی بجھی سی رہتی۔ نہ کچھ بناؤ سنگار کرتی نہ کوئی خاص کپڑے پہنتی۔ بس یوں ہی سفید ساڑی لپیٹ لیتی نہ ہونٹوں پہ سُرخی، نہ چہرے پر پاؤڈر نہ بالوں کو وِگ۔ اس لاپروائی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر کی لگتی۔ ورنہ اُس کی چھوٹی بہن مسز ڈھینگرا اس سے عمر میں کوئی چھوٹی تو نہ تھی۔ لیکن ایسی بن ٹھن کے رہتی کہ کوئی نہ کہہ سکتا کہ وہ پینتیس سال سے ایک دن بھی بڑی ہے۔

مسٹر کھنّہ کا لاہور میں اچھا خاصا کاروبار تھا لیکن آزادی جو اُن کے لئے صرف تقسیم ملک ہی ہو کر رہ گئی تھی کے بعد انھیں ہندوستان آنا پڑا۔ یہاں آکر اُن کا بزنس کچھ جما نہیں۔ ایک دو بار کوشش کی لیکن جس دھندے کو ہاتھ لگایا وہی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اُن کو جو تھوڑا بہت معاوضہ سرکار کی طرف سے ملا تھا وہ ان کیلئے کافی نہیں تھا۔ اس لئے اُن کا گذر اُن کے چھوٹے بھائی کے سہارے ہوتا جس کا دہلی اور بمبئی میں بہت اچھا بزنس تھا اور جو لاکھوں کماتا تھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی اور اپنی کمائی کا بیشتر حصّہ وہ دیا دھرم میں خرچ کر دیتا تھا۔ اس لئے سب لوگ اُسے راجہ کہتے تھے۔ راجہ نے انھیں بمبئی میں ایک چھوٹا سا فلیٹ لے دیا تھا تاکہ وہ اپنے بیٹے کے علاج کے لئے بمبئی رہ سکیں۔ اس فلیٹ میں علاج کی سہولت کے لئے ایک ٹیلیفون بھی لگا دیا تھا۔ خرچ کے لئے ایک معقول رقم بھی ہر مہینہ انھیں دیتا۔ اس کے عوض مسٹر کھنّہ بمبئی میں اُس کے بزنس کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کر دیا کرتے۔ رمیش کو ایک پرائیویٹ پاگل خانہ میں داخل کیا ہوا تھا، جسے سینی ٹوریم کہا جاتا تھا۔ ماہروں کا خیال تھا کہ ایسے نام سے وہاں کے مکینوں اور رشتہ داروں پر اچھا اثر پڑتا ہے جس سے علاج کرنے میں مدد ملتی ہے۔

آج کا دن ہی کچھ اُلٹا چڑھا تھا۔ سینی ٹوریم جاتے وقت پہلے تو برقی SUBURBAN TRAIN کا کرنٹ فیل ہو گیا جس سے مسٹر اور مسز کھنّہ دو اسٹیشنوں کے درمیان آدھ گھنٹے سے اوپر ٹنگے رہے۔ اُس کے بعد بس نے آنے میں دیریاں لگا دیں۔ جب بس آئی تو وہ کالج کے لڑکے اور لڑکیوں سے اٹی پڑی تھی۔ انھوں نے ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ بس سے اُترے تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بھیگتے بھاگتے بمشکل تمام وہ سینی ٹوریم پہنچے۔ حالانکہ ملاقات کا گھنٹہ شروع ہو چکا تھا لیکن خلاف معمول رمیش ملاقات کے کمرے میں نہیں تھا۔ کوئی چھ سات والدین اپنے اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی قسم کے بچے تھے وہاں پر۔ کسی کا سر بڑا تھا تو کسی کا کوئی انگ مارا ہوا۔ جو بظاہر صحت مند تھے وہ یا تو گم سم تھے یا کوئی بے تکی سی بات یا حرکت دہرائے جا رہے تھے۔ کچھ شدید قسم کے پاگل نیچے اور

نوجوان ساتھ ٹہلا کرتے میں مسافروں کے پیچھے رہ گئے۔ جوڑے تھے اور اُن کے چلنے والے ساتھیوں کے پیچھے سے اُن کے ساتھ باتیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب مسز کھنہ نے رمیش کے بارے میں پوچھا تو ایک ادھیڑ عمر نرس نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ رمیش نے آج پھر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے مارفیا کا ٹیکہ دے دیا۔ اب وہ سو رہا ہے اور ملاقات کے لئے نہیں آسکے گا۔ مسز کھنہ نے بے بسی سے پہلے اپنے ضعیف ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تحفہ کو دیکھا۔ پھر بیوی کی طرف اور جیسے دونوں نے ایک ہی نظر میں فیصلہ کر لیا کہ پھلوں کی ٹوکری وہیں چھوڑنے کے بجائے، واپس لے جانا ہی بہتر ہوگا۔ جب رمیش کی یہ حالت ہے تو نہ جانے اُن کا تحفہ اُس تک پہنچے یا نہیں۔ شاید نرسیں اور ہسپتال کے عملے کے دوسرے لوگ ہی اُسے ہضم کر لیں۔

تھوڑی دیر سستانے کے بعد وہ مایوس واپس ہیچنے برشک پارک کے وہ آہستہ آہستہ بس سٹاپ تک پہنچے۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ بس اسٹاپ کے پاس ایک جوہڑ میں ایک چڑیا کا چند روزہ بچہ مرا ہوا پڑا تھا۔ بس میں انھیں ایک ہی سیٹ ملی۔ مسز کھنہ کو وہاں بٹھا کر اُس کا خاوند اُس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سامنے والی سیٹ کی پشت پر کے ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ بس میں کتنے نوجوان بیٹھے تھے۔ لیکن کسی نے اُن کو سیٹ پیش نہیں کی۔ خاوند کے ہاتھ کی پشت پر اُبھری ہوئی نسوں کو دیکھ کر بیوی کا دل بھر آیا۔ سامنے ایک کونے والی سیٹ پر ایک سات آٹھ سال کی لڑکی اپنی بوڑھی ماں کے کندھوں سے لگ کر سسک سسک کر رو رہی تھی۔ مسز کھنہ کو ایسے لگا جیسے اُس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ ارے ہاں۔ اِس کی شکل سکینہ سے ملتی تھی۔ سکینہ بیچاری جس کا خاوند شادی کے دو سال بعد ہی چل بسا۔

جب وہ SUBURBAN TRAIN کی کار ریل پیل سے بچتے بچاتے اُترے تو کارپوریشن کی گرد دبتیاں شام کے پھیلے ہوئے اندھیرے کو روکنے کی ناکام کوشش میں جل اُٹھی تھیں۔

مسز کھنہ نے سوچا، راستے میں سے تھوڑی ترکاری لیتی چلوں۔ اُس نے پھلوں کی ٹوکری کو اپنے خاوند کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود پاس کی سبزیوں کی منڈی کی طرف چلی گئی۔ مسٹر کھنہ معمول کے مطابق آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل پڑے۔ بلڈنگ کی تین منزلوں کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد انھیں یکدم خیال آیا کہ گھر کی چابیاں تو بیوی کے پاس ہیں۔ جھنجھلاہٹ اور پھولی ہوئی سانس کی تاب نہ لا کر وہ زینے پر ہی بیٹھ گئے اور اپنا غصہ پی کر وہ بیوی کا انتظار کرنے لگے۔ دس منٹ کے بعد مسز کھنہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے بوجھ سے ہانپتی ہوئی اپنی جھنجھلاہٹ پر ندامت میں سر ہلاتی ہوئی کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ آئی تو مسٹر کھنہ خاموش اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازہ کھول کر وہ سیدھے سونے والے کمرے میں چلے گئے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے اپنی باچھوں کو دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کھینچ کر اپنے مصنوعی دانت اُتارے تو ساتھ ہی ایک لمبی سی رال بھی نکل آئی۔ دانت نکال کر انھوں نے پانی کے گلاس میں رکھ دیئے اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ بیوی خاوند کا موڈ تاڑ گئی اور کچن میں جا کر کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ کھانا تیار ہو گیا تو دونوں نے چپکے سے کھا لیا۔ کھا چکنے کے بعد خاوند پھر سونے والے کمرے میں چلا گیا۔ مسز کھنہ نے ایک پُرانی البم اُٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنی شروع کر دی۔ پہلی تصویر اُن کی شادی کی تھی۔ ایک زمانہ گذر گیا تھا اِس واقعہ کو۔ لیکن اُسے سب کچھ یاد تھا۔ پھر رمیش کی تصویر جب وہ صرف چند مہینوں کا تھا۔ اُس کی آنکھیں حیرانی سے بھر گئیں۔ اُس کے آیا کی تصویر جس کی شادی خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ لاہور میں اُن کے اپنے گھر کی تصویر۔ جب وہ بہت آسودہ حال تھے۔ رمیش کی ایک اور تصویر۔ پانچ سال کی عمر کی۔ وہ مفر چلا، اُداس پریشان سا کیمرے سے دور ایک کونے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ورق پلٹا تو اُسکی اپنی تصویر البم سے نکل کر نیچے آن گری۔ [illegible] ہی اُسکی تصویر جا بجا تھا۔ [illegible] فساد کے [illegible] سال کی عمر کی [illegible] کر شٹ

بنے ۳۰ سال تک البم کی تصویر تقسیم ہند سے کچھ ہی مہینے پہلے اُس کی سالگرہ کی تصویر۔ اُس کے بعد ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان سے بے یار و مددگار ایک قافلے کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ بے شمار مصیبتیں جھیل کے۔ دہلی آ کر انھوں نے کنگز وے ریفیوجی کیمپ میں ڈیرا ڈالا۔ اُسی سال سردیوں میں رمیش کو نمونیہ ہو گیا۔ کئی مہینے وہ بستر پر پڑا رہا۔ جب ٹھیک ہوا تو دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈرنے لگ گیا تھا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو پرندہ سمجھتا اور اونچی جگہوں سے چھلانگ لگا کر اُڑنے کی کوشش کرتا۔ اُس کے علاج کی بہت کوشش کی گئی لیکن کچھ فرق نہ پڑا۔

البم کی تصویر دیکھنے کے بعد مسٹر کھنہ نے اپنی عمر رفتہ کا جائزہ لیا۔ گذشتہ تیس برسوں میں اُس نے شکست پر شکست کھائی تھی۔ اُس کیلئے زندگی نام تھا محرومیوں کے بڑھتے ہوئے انبار کا۔ اُسے اور اُس کے خاندان کو درد کی لہروں کے تھپیڑے چوٹیں مارتے رہے۔ وقت بیتنے کے ساتھ اُس کے درد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اُس کے سامنے قوی ہیکل دیوتاؤں کی ہیبت ناک شکلیں گھوم گئیں جو اُسکے اکلوتے بچے کو کھنڈروں میں ڈھکیل رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ کر ٹک گئے۔ زندگی میں کتنی نزاکت، ملائمت، حلاوت اور نرمی ہو سکتی ہے۔ اُس میں سے کتنی حلاوت کڑواہٹ میں بدل جاتی ہے؟ کتنی ملائمت مسخ کر دی جاتی ہے۔ کتنی نرمی فنا ہو جاتی ہے۔ کتنا توازن کھو دیا جاتا ہے! اُس کی آنکھوں میں تقسیم ہند کے وقت کا وہ عام نظارہ گھوم گیا جب سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے بچے ریلوے پلیٹ فارموں کے کونے میں دبک کے بیٹھے ہوتے تھے۔ ڈرے سہمے ہوئے کہ اب آگے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

ایک تصویر ہاتھ میں لئے وہ خیالات کی دنیا میں گم تھی۔ ساتھ والے کمرے سے اُسے اپنے خاوند کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر اُٹھی [illegible] اُس کے کمرے میں آ گئے۔

"مجھے نیند [illegible] شکایت کے انداز میں بولے۔

"کیوں کیا بات ہے؟ آپ تو اتنے تھکے ہوئے تھے!"

"میں سوچ رہا ہوں" اس لئے نیند نہیں آ رہی" مسٹر کھنہ کراہ کر بولے

"کیا پھر پیٹ میں کچھ خرابی ہے؟ دوائی دوں؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ یہ کمبخت ڈاکٹر کیا کریں گے۔ ہمیں چاہئے کہ رمیش کو گھر واپس لے آئیں۔ سینی ٹوریم میں جانے اُس کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوتا ہے؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔ کل ہی لے آئیں گے۔" بیوی نے سعادتمندی سے جواب دیا۔ اس جواب سے مسٹر کھنہ کی کچھ تشفی ہوئی۔ پھر انھوں نے گذارش کے انداز میں کہا۔

"مجھے ذرا چائے بنا دو گی"

"کیوں نہیں!" مسز کھنہ نے کافی زور لگا کر اپنے جسم کو اوپر اٹھایا، البم پرے ہٹایا اور کچن میں چلی گئی۔

جب وہ چائے کا ٹرے لے کر واپس آئی تو مسٹر کھنہ نے کہا۔

"میں نے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ ہم رمیش کو باندو والے کمرے میں رکھیں گے۔ وہاں سے شیشے کی چیزیں اور چاقو قینچی وغیرہ نکال دیں گے تو پھر خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہفتے میں ایک دو بار ڈاکٹر بھی یہیں آ کر اُسے دیکھ سکتا ہے۔ خرچ کے لحاظ سے بھی یہ سستا رہے گا۔ اور پھر۔۔۔۔۔"

ابھی وہ جملہ ختم نہ کر پائے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ مسٹر کھنہ نے بوکھلا کے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی ہڑبڑا کے اُٹھی۔ چائے کا پیالہ تپائی پر رکھ کر اُس نے فون اُٹھایا۔ فون سے ایک عورت بولی۔ "ذرا نائیڈو صاحب سے ملا دیجئے۔"

"یہ غلط نمبر ہے" مسز کھنہ نے نہایت شائستگی سے کہا۔ فون ریسیور واپس رکھ کر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

مسٹر کھنہ نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ شروع کیا۔

"اچھا تو کل اُسے ضرور لے آئیں گے۔ صبح تم ذرا جلدی اٹھ جانا اور مجھے بھی اٹھا دینا۔"

فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ وہی جوان نسوانی آواز پھر نائیڈو صاحب کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

علی عباس اُمیدؔ

زرد زرد دِن ڈھلا
اور کرب کا سُورج ڈُوبا
پچھلی راتوں کی طرح زخم سی رات آئی ہے
پھر وہ بے نام سی اک پیکر
حریفِ غمِ تنہائی ہے!

نہ یہ حالات نئے ہیں، نہ پگھلتے لمحات
پھر بھی
کیا جانے کہ کیا چاہتے ہیں
گُل سے فسردہ جذبات!

جسم کے رُوپ میں آوارہ خیالوں کا ہجُوم
دم بخود، زخم بہ جاں، حرف بہ لب
ذہن کے دروازے پر
کانپتے ہاتھوں میں زنجیرِ معانی لے کر
چاہتا ہے کوئی دستک، کسی آواز کا پُر کیف طلسم!

سوچتی آنکھ کے گرداب میں خوابوں کی نمُو
آس کا بادباں کھولے ہوئے ساحل کے تصوّر کے طفیل
آرزوِ زیست کی کرتی ہے مگر یاس کی لہر
ڈگمگا دیتی ہے، رہ رہ کے ڈبو دیتی ہے!

اور وہ گُل سے فسردہ جذبات
زخم سی رات کے شانے پہ چھلکتی ہوئی آنکھیں رکھ کر

معمول کی برف

اُس کی بکھری ہوئی زُلفوں کو بھگو دیتے ہیں
اپنی سسکی کو خموشی میں چُبھو دیتے ہیں!

لفظ معدوم کے بکھرے ہوئے بے ربط حروف
اُونگھتے گنبدِ ماحول میں
آواز کی طرح
گونج بن جاتے ہیں
خاموشی کو بکھراتے ہیں!
بازگشت دیر تلک سمت بہ سمت
بھاگتی پھرتی ہے — آوارہ خیالوں کا ہجوم
چھوڑ کر معنی کی زنجیر حریفِ غمِ تنہائی کو
کانپتے ہاتھوں پہ لیتا ہے کہیں دور اچھالا جاتا ہے!

سوچتی آنکھ کے گرداب میں خوابوں کی نمو
مرگ اور زیست کی منزل سے گزر جاتی ہے
پیکرِ بے نام کے جاتے ہی ٹھہر جاتی ہے!!

مقالہ

مناظر عاشق ہرگانوی (ہرگانو)

عبد الحلیم شرر — شاعر کی حیثیت سے

عبدالحلیم شرر ایک کامیاب ناول نگار تھے، نثر نویس تھے اور مورخ تھے، ڈراما نگار بھی تھے لیکن ساتھ ہی وہ ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ بلکہ اُردو شاعری میں ردیف وقافیہ کے خلاف بغاوت کے اوّلین علم بردار شرر ہی تھے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے، لیکن شرر اُسے ادبی و شعری ترقی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے اور وہ مروجہ اصنافِ شعر سے دل برداشتہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی اس میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اُن کی خواہش تھی کہ ظاہری اور لفظی پابندیوں سے اُردو شاعری کی معنوی ترقی کی جو راہیں مسدود کر دی ہیں وہ کسی طرح وا ہو جائیں اور شعراء ان قیود سے آزاد ہو کر اپنے فکر و تخیل کو کھلی پرواز دے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اُنھوں نے انگریزی شاعری کی چند اصناف مثلاً نظم معریٰ (BLANK VERSE) نظم آزاد FREE VERSE اور STANZA کو رواج دینے کی کوشش کی۔ خود بھی اُن میں طبع آزمائی کی اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ لیکن یہ طبع آزمائی اُردو داں طبقہ کے لئے بالکل نئی اور غیر معروف تھی۔ یہی سبب ہے کہ اُن پر اعتراضات ہوئے اور اُن کی حوصلہ شکنی کی گئی، جس سے بددل ہو کر اُنھوں نے اس صنف کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی معاصرین کی مخالفت، گوناگوں مشکلات، طبعی نامناسبت اور صحافتی مصروفیات کے باعث وہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ پھر بھی شاعری میں "شبِ وصل" "شبِ غم" "زمانہ اور اسلام" تین نظمیں اور ایک ڈراما "اسیرِ بابل" مقفّیٰ نظم میں اور ڈراما "شہیدِ وفا" اور "مظلوم ورجینا" بلینک ورس یا نظم معریٰ میں اُن کی یادگار ہیں۔

"شبِ وصل" "شبِ غم" اور "زمانہ اور اسلام" عامیانہ درجہ کی نظمیں ہیں۔ اِن میں کوئی خاص خوبی، کوئی جدت اور کوئی امتیازی شان نہیں ہے۔ وہی پامال طرز اور وہی فرسودہ مضامین ہیں۔ البتہ بیان میں سادگی اور سلاست ہے اور لفظی تعقید اور مشکل الفاظ سے گریز ہے مثلاً "شبِ وصل" میں رات کا منظر ملاحظہ فرمائیے ؎

آئی رات ہوئی اندھیاری — چرخ پہ تاروں نے کی گلکاری
کیسی رات مبارک ساری — اچھی اچھی پیاری پیاری
اب پازیب بجاتے ہوں گے
تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے

نفسِ مضمون بھی دیکھ لیجئے ؎

آپس میں پھر وصل کی ٹھانی — چادر لیٹ کے سر سے تانی
چل گئی اپنی سحر بیانی — دل کی بات اُنھوں نے مانی
بوسے لینے لگے مل جل کے
لپٹے خوب ہی باہم کھل کے

شبِ غم میں "صبح کی آمد" کا بیان یوں ہے ؎

[illegible]

میکشو! وقتِ صبوحی آیا — بھوشو! جاؤ نہانے گنگا
برہمنو! لو دَیر کا رستا — طائرو! نکلو چھوڑو بسیرا
واعظو! رات فنا ہوتی ہے — دیکھو نماز قضا ہوتی ہے

لیکن شرر کی صحیح شاعرانہ عظمت اور اُن کے اجتہادی مرتبہ کا پتہ اُن کی مقفّٰی نظموں سے نہیں بلکہ نظمِ معرّیٰ میں لکھے ہوئے ڈراموں سے چلتا ہے۔

نظمِ معرّیٰ یا آزاد نظم کی روایات انگریزی ادبیات میں بھی نو عمر ہیں۔ اس قبیل کے تجربے کرنے کا خیال ابتدائی شکل میں ہاپکنس، ییٹس، ٹی ای ہیوم (HULME) کے کلام میں ملتا ہے اور بعد میں ازرا پاؤنڈ ٹی ایس ایلیٹ کے زیرِ اثر ایک ادبی میلان کی شکل میں ——!

اُردو میں یہ تجربہ عبدالحلیم شرر کی طرف سے ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:—

مشرقی شاعری میں ردیف و قافیہ بہت ضروری اور لازمی خیال کئے گئے ہیں۔ مگر انگریزی میں ایک جداگانہ وضع کی نظم ایجاد کی گئی ہے جسے "بلینک ورس" کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قافیہ وغیرہ کی قید میں کلام کو محدود اور جامد اور معانی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی ڈراما یا مختلف لوگوں کی گفتگو نظم میں ادا کرنی ہو تو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہر فقرہ یا ہر خیال جس طرح بنے ہر مصرع یا ہر شعر میں ختم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قید کے ساتھ کلام کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ قافیہ سلسلۂ کلام کو ہمیشہ قطع کر دیا کرتا ہے۔ اس مجبوری سے انگریزی میں خاصتاً ڈراما کے لئے یہ نظم غیر مقفّٰی ایجاد کی گئی جو یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک طرف تو کلام برابر موزوں ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف سلسلۂ کلام یوں جاری رہتا ہے کہ اگر مصرع مصرع جدا کر کے نہ لکھیں تو معلوم ہو کہ گویا بے تکلفی سے نثر میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہوگا مگر در اصل یہ سب قسم کی نظموں سے زیادہ دشوار ہوتی ہے اس لئے کہ اور سب نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی نہ کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے مگر اس میں چونکہ مکالمہ اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور نثر عادی کی حقیقی شان قائم رکھنا پڑتی ہے اس لئے اس میں ترتیبِ الفاظ میں ایک ادنیٰ تغیر بھی معیوب ہے یا یوں کہئے کہ تعقیدِ لفظی سب نظموں میں تھوڑی بہت جائز ہے مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں۔ سچ یہ ہے کہ بلینک ورس (نظمِ معرّیٰ) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے اور نظمِ معرّیٰ کے اختیار کئے بغیر اُردو میں ڈراما لکھے ہی نہیں جا سکتے۔

"فلورنڈا" کے پانچویں سین سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

عشق پُر اندوہ و پُر آلام عشق!
ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی؟ کہسار سے
بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں اور آندھیاں
خاک اڑاتی پھرتی ہیں اور آہ تو اے آسماں
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں
اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی

سہے تنہا میری مرتی امیدوں کو لیکر عجب
بیقراری اور بیتابی کے ساتھ

اسی ڈرامے کے چوتھے سین میں ہیرو بیٹی اپنی محبوبہ فلورنڈا کا تصور کرکے بڑبڑا رہا ہے " جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ اک میں ہوں کہ دل کو قرار آتا نہیں۔ الجھن ہے۔ بیتاب ہے اور ہر گھڑی اک درد ہے۔ پیاری فلورنڈا! تجھے اک نظر دیکھوں تو چین آئے۔ کہاں اپنے نصیب! میں تڑپتا ہوں یہاں۔ تو اندلس کے باغوں میں سیر کرتی، نازسے اٹھلاتی، ہنستی، بولتی، کھلکھلاتی، توڑتی پھولوں کو پھر ان کو عجب ناز سے سر پر لگاتی ہوگی۔
(کچھ آہٹ پاکے اور ایک آواز سن کے) کیا! یہ کون تھا؟" -
اب اسے تقطیع کرکے دیکھئے:

جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ اک میں ہوں کہ دل
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
کو قرار آتا نہیں الجھن ہے بیتاب ہے اور
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
ہر گھڑی اک درد ہے پیاری فلورنڈا تجھے!
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
اک نظر دیکھوں تو چین آئے کہاں ایسے نصیب
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
میں تڑپتا ہوں یہاں، تو اندلس کے باغوں میں
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
سیر کرتی ناز سے اٹھلاتی ہنستی بولتی
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
کھلکھلاتی توڑتی پھولوں کو پھر ان کو عجب
فاعلن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
ناز سے سر پہ لگاتی ہوگی
فاعلاتن فاعلاتن فاع
(کچھ آہٹ پاکے اور ایک آواز سن کے) کیا! یہ کون تھا؟ -
فاعلن

دوسرے سین میں ہیروئن فلورنڈا اور اُس کی ماموں زاد بہن مریم کا یہ سوال جواب دیکھئے!
فلورنڈا :- کس طرح جاؤں گی یہاں سے ؟
مریم :- خاک اُڑاتی، ٹھوکریں کھاتی، ننگے پاؤں جاؤ گی بہن،
اور جیسے ہی [illegible] آپ کو پھر پاؤں گی تڑپتا ہوا میں"

اِس کا وزن بھی بحر کے لحاظ سے برابر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ظفر منڈا : ۔ کس طرح جاؤ گی یاں سے

فاعلاتن فاعلاتن

مریم : ۔ خاک اڑاتی ٹھوکریں

فاعلاتن فاعلن

کھاتی ننگے پاؤں جاؤں گی بہن اور جس طرح

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

بن پڑے گا آپ کو پہونچاؤں گی تربت میں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

بظاہر وزن میں کمی بیشی کا شک گزرتا ہے لیکن ڈائلاگ کے ٹکڑوں کو ملانے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مصرع کا وزن ایک ہے۔ مختار کے یہاں بیان کی سادگی ہے۔ وہ مفہوم کو الفاظ کے ہیر پھیر میں نہیں چھپاتے اور نہ مشکل اور گراں بار الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ موضوع مناظرِ قدرت، فطری جذبات اور تاریخ ہیں۔ اگرچہ کردار نگاری میں وہ کامیاب نہیں ہیں لیکن منظر کشی اور فضا پیدا کرنے میں اُستادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ مختار کو شاعری میں اپنے جوہر دکھانے کا آزادانہ موقع نہیں ملا جس کے باعث وہ اِس میدان میں اپنے لئے کوئی ممتاز جگہ نہیں پیدا کر سکے۔ تاہم نظم معرّیٰ کے اوّلین رہنما و دہندہ کی حیثیت سے اُردو ادب میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔! (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ)

بقیہ صفحہ ۱۴۔ "اک چراغ اور بجھا"

مختار اٹاوی کی موت کا خلا ـــــ کیسے پُر ہوں گے اتنی بہت سی موتوں کے خلا؟! ایک ایک کر کے کتنے ساتھی بچھڑ گئے!۔ یہ سچ ہے تو زندگی کتنی بھری پُری تھی اور اب کتنی خالی خالی محسوس ہو رہی ہے۔!!

اٹاوہ کی سرزمین برسوں میں بھی اتنا اچھا شاعر اور ایسا مخلص انسان پیدا نہیں کر سکے گی۔ مختار اٹاوی اپنے پیچھے کوئی ایسا سہارا یا سرمایہ چھوڑ کر نہیں گئے ہیں جو اُن کے غمزدہ اہل و عیال کے کام آئے۔ اُن کی موت سے شعر و ادب کا تو جو نقصان ہوا وہ تو ہوا ہی، لیکن ہیں اور خصوصاً اہلِ اٹاوہ کو، اسلامیہ انٹر کالج کے اساتذہ کو ایسی کوشش کرنا چاہیئے جس سے اُن کی بیوہ اور بچوں کی گذر بسر ہوتی رہے۔ حکومت اُتر پردیش کی طرف سے اُن کی بیوہ کے لئے وظیفہ مقرر ہونا چاہیئے۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کے لئے اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کو مدد دینا چاہیئے اور مجموعۂ کلام کی فروخت سے اُن کے پسماندگان کی اعانت ہونی چاہیئے۔ اٹاوہ میں مرحوم کی کوئی مناسب یادگار قائم ہونا بھی ضروری ہے۔

حق مغفرت کرے اور ـــــ

آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

بدیع حسینی

کعبۂ دل کو بہشت کدہ جانے
ہم نے سمجھا تھا کیا، وہ کیا جانے

وہ، سزا کیا ہے؟ کیا جزا جانے
جو تغافل کو بھی ادا جانے

زندگانی کو مدعا جانے
اور کیا ہوگا اب خدا جانے

دل کو ویران بنا دیا جس نے
پھر بھی دل اس کو دلربا جانے

جو کبھی باعثِ مسرت تھیں،
اُن ہی باتوں کو وہ خطا جانے

نقش بن بن کے پھر بگڑتے ہیں،
اور کیا ہوگا اب خدا جانے

محبوب راہی

الگ تھلگ کھوگے کب تک دنیا سے خود کو لوگو
ذہنوں کی تاریک گپھاؤں سے اب تو باہر نکلو

مجھے پڑا رہنے دو یونہی گمنامی کے غاروں میں
شہرت کی چوٹی پر چڑھ کر اب مجھ کو آواز نہ دو

خاموشی کا زہر پیو گے یوں کب تک تنہا تنہا
مجھ سے مت بولو! اِن دیواروں ہی سے کچھ بات کرو

بھاگ چلو حالات کے اِن پُرہول حقائق زاروں سے
سپنوں کے رنگین چمن زاروں میں تھوڑا سستا لو

ڈھونڈ رہی ہیں آوارہ روحیں جسموں کے مسکن کو
اپنے اپنے تابوتوں میں آنکھیں موندے لیٹ رہو

جکڑے ہوئے ہیں سبھی مسائل کی زنجیروں میں راہی
کون تمہیں اب دادِ سخن دے، اتنی مہلت کس کو

اشہر ہاشمی

ہمارے پیشِ نظر منظر رواں ٹھہرا
ہوا کی زد میں بگولوں کا آسماں ٹھہرا

سُلگ رہی تھی کوئی چیز تہہ میں دریا کی
جو موج موج اُبھرتا ہوا دھواں ٹھہرا

تھا میرے شانوں پہ اک بوجھ سر قلم جو ہوا
مرا وجود ہی عنوانِ داستاں ٹھہرا

بچھڑے جسموں کا [illegible] تھا ڈھلانوں پہ
دہکتے دشت میں سورج ہی سائباں ٹھہرا

وہی ہوا جو ہونا تھا پھر کبھی اشہر
لبِ فرات قتیلوں کا کارواں ٹھہرا

تبتی کہانی

منوہر شرما ساغر پالمپوری (ہماچل)

شمعِ اُلفت کی جلتی رہے رات بھر

اپنی چپٹی ناک پر لوہے کے زنگ آلود فریم کا چشمہ چڑھائے، سُرخ چُغے میں ملبوس وہ بوڑھا لامہ نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے نتیجے کے طور پر اُن خلک پوس برفانی گھاٹیوں میں گویا قیامت آگئی تھی۔ والانگ کی بستی چینیوں کے قبضہ میں آچکی تھی اور اُس طرف سے بھاگ آنے والے تبتیوں کا وہ آخری قافلہ پُل پر سے گزرا تھا۔ اُس برفانی ندی کے اِس پار برگد کے پیڑ کے تنے کے سہارے بیٹھا وہ تبتی لامہ وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں ندی کے اُس پار سے آنے والے دُشوار گزار راستے پر جمی ہوئی تھیں، حالانکہ دشمن کی توپوں کی گرج وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ شاید زیادہ تھک جانے کے باعث وہ بوڑھا لامہ اب اور زیادہ پیدل چلنے سے معذور تھا۔

میں پُل کے اُس پار والے علاقے میں دشمن کی فوجوں کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے لئے اپنے مورچے سے کافی آگے نکل آیا تھا اور اپنا کام ختم کر کے اب اپنے کیمپ کو لوٹ رہا تھا۔ لیکن وہ لامہ اب بھی اُسی برگد کے پیڑ کے تنے کے ساتھ اپنی عینک کے دُھندلے شیشوں میں سے اُس پہاڑی ندی کے تُند و تیز دھارے میں اپنی تھکی تھکی نظروں سے نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے اُس معصوم لامہ پر رحم آ رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو لامہ؟" میں نے اُس سے پُوچھ ہی لیا۔

"والانگ سے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اُس کی مسکراہٹ میں بلا کے درد کی جھلک تھی۔

"یہاں بیٹھا میں اپنے پالتو جانوروں کے انتظار میں ہوں۔" اُس نے مزید کہا۔

"کون سے پالتو جانور؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ اُس کی بات میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا۔

"ہاں! میرے پیارے پالتو جانور۔" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں اپنے پیارے پالتو جانوروں کی فکر میں گھُلا جا رہا تھا۔۔۔ سوچ رہا ہوں۔ شاید کوئی مہربان ہمسایہ انھیں ساتھ لیتا آئے۔ اُس موت کی وادی سے!"

"کون کون سے پالتو جانور تھے تمہارے؟" میرا اشتیاق بڑھا۔

"وہ میری تنہائیوں میں میرے ساتھی تھے۔ آہ! میں بھی کتنا بزدل ہوں؟ اپنی جان بچانے کے لئے انھیں بے سہارا چھوڑ آیا۔ اُف! انسان بھی کتنا خود غرض ہے!" اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔

اپنے پالتو جانوروں کے لئے اُس کی بے پناہ محبت دیکھ کر مجھے جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ ایک وہ ظالم سفاک چینیوں نے والانگ کے بدھ مٹھوں کو لوٹ کر اُن کے دیوتا ہی نہیں بلکہ دھرم کے چیلوں کو اِس بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا کہ اُن کی دہشت سے وہ سارا پہاڑی علاقہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ ماں نے بچے کی، بھائی نے بہن کی اور خاوند نے بیوی کی پرواہ نہ کی تھی اور جو کچھ بھی سامان جس کے ہاتھ لگا تھا لے کر تمام لوگ تیز قدموں سے جان بچا کر بھاگ آئے تھے۔ لیکن موت کے منہ سے بچ نکلنے پر بھی وہ ضعیف و نزار لامہ اپنے پیارے پالتو جانوروں کے انتظار میں وہیں بیٹھا دوبارہ موت کے مُنہ میں جانے کی تیاریوں میں تھا۔

"کیا کیا جانور تھے تمہارے؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"آہ! ایک تھی بلی۔۔۔ ہائے! وہ بلی کیا تھی! اُس کے بدن کا رنگ نکھرا بسنتی تھا اور اُس کی آنکھیں نکھری ہوئی جھیل کی سی نیلی اور گول گول تھیں۔ میں جب سیام کے دارالحکومت بنکاک میں تھا ایک

بُدھ دھرم کی تعلیم [illegible] گُرو لامہ نے وہ بلّی مجھے وہاں سے لوٹتے وقت تحفے کے طور پر دی تھی۔ یہ بہت پُرانی بات ہے۔" اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اپنے درد کو پی جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ پھر کہنے لگا۔

"میں نے آٹھ بُلبل بھی پال رکھے تھے جو والانگ مٹھ میں واقع میرے کمرے کی شمالی دیوار والی کھڑکی میں تانبے کے تاروں سے بنے ایک خوبصورت پنجرے میں لٹکے رہتے تھے۔ صبح کا تارا نکلتے ہی اُن کے سُریلے گیت میری پیاسی آتما کو فرحت بخشتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔"

باوجود کوشش کے بھی ایک درد بھری سسکی اُس کے گلے سے نکل پڑی۔

"اور تم اُنھیں چھوڑ کر بھاگ نکلے؟" میں نے کہا۔

"میں تو اُنھیں ساتھ ہی لایا ہوتا، لیکن میں اُس وقت مٹھ سے دُور ندی کنارے گیا ہوا تھا۔ خدا غارت کرے اُس چینی کپتان کو جس نے اچانک گولہ باری کر کے سارے مٹھ کو گھیرے میں لے لیا۔"

"اور تمہارے کُنبے کے دیگر افراد کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا

"تمہیں بتا چکا ہوں کہ ماسوا اُن بھولے پالتو جانوروں کے میرا اِس سنسار میں اور کوئی نہیں۔ بلّی تو قدرے چالاک ہوتی ہے کسی نہ کسی طرح بچ نکلے گی، لیکن اُن معصوم بُلبلوں کا کیا ہوا ہوگا؟"

یہ کہتے ہوئے اُس کے چوڑے ماتھے پر فکر کی گہری لکیریں اُبھر آئیں۔

"تشنو لامہ! یہ تو بتاؤ کہ تمہارے سیاسی رجحانات کیا ہیں؟" یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا سوال شاید ہی اس کی سمجھ میں آسکے، میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔

"میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا کہ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟ پھر بھی اگر تمہارا یہ مطلب ہے کہ میرا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ میرا آدرش کیا ہے؟ تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرا اعتقاد اہنسا میں ہے یا انسانیت میں ہے۔ کسی کو دکھ نہ دو۔ سبھی جیوں سے پیار کرو۔ محبت دو۔ محبت لو۔ یہی میرا دھرم مجھے سکھاتا ہے۔"

اُس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگیا

"یہ جگہ بہت خطرناک ہے لامہ! اُٹھو میرے ساتھ چلو۔ ایک دو میل چلنے پر فوجی ملازمین والے موڑ پر تمہیں اپنے فوجی ٹرک میں بٹھا کر لے چلوں گا۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے تو ابھی انتظار کرنا ہے اپنے پیارے پالتو جانوروں کا۔ پھر سوچوں گا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ یہ ٹرک تو کہیں دور کہیں انجانی دھرتی تک لے جاتے ہوں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"تیزپور تک لے جاتے ہیں۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آؤ چلیں؟" میں نے کہا۔

"اُس طرف میرا اپنا کون ہے؟ تمہاری ہمدردی کے لئے شکریہ! اچھا یہ تو بتاؤ کہ میرے پیارے بُلبل تو بچ نکلیں گے نا؟" اُس نے مجھ سے یقین دہانی سی چاہتے ہوئے پوچھا۔ میں کچھ کہوں اِس سے پہلے ہی وہ پھر کہہ اُٹھا۔

"بُلبل ضرور اُڑ گئے ہوں گے۔ اور بلّی بھی بچ نکلی ہوگی۔ چالاک ہوتی ہے نا!"

میں اُس کی معصومیت سے بہت متاثر ہوا اور اُسے ڈھارس دینے کی غرض سے بولا۔

"ضرور بچ نکلیں گے تمہارے پالتو جانور۔ کوئی پڑوسی اُنھیں خود ساتھ لے آئے گا۔ تم میرے ساتھ چلو! تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کا بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شکریہ!" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پناہ گزینوں کے قافلے کا اب آخری گھوڑا پُل پار کر رہا تھا۔

"لیکن اُن بےچارے بےزبان پالتوؤں کا کیا ہوگا؟"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر دھم سے وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا وہ اب مجھ سے مخاطب نہیں تھا۔

گولیوں کی آواز نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ شام کے سائے دھرتی پر اُتر رہے تھے اور اپنے ساتھ موت کا پیغام لا رہے تھے۔ اپنے پیارے پالتوؤں کے بے سود انتظار کے علاوہ اس بدنصیب لامہ کی قسمت میں صرف موت تھی جس کی تاریکی کو وہ اپنے گُرو سے جذبۂ ایثار سے اُجالے میں بدلنے والا تھا تاکہ ——

شمعِ اُلفت کی جلتی رہے عمر بھر"۔

▲▲

نادر زیدی

خون

خون فطرت کا تقاضہ ہے . مشیت کا چلن
سرخیٔ دردِ الم
درد احساس کا ہے نام ، الم ہے ادراک
غور کر طبعِ رسا ! فکر و نظر تیرا کام
ایک قطرہ بھی بہت ہنگا ہے !

کبھی آنسو
کبھی آہوں کا دھواں
مدہ و فریاد کبھی
اور فقط یاد کبھی
گہر مچلتے ہوئے ارمانوں میں سیماب صفت
کبھی بچھڑے ہوئے محبوب کی تسکین بن کر
شرم گیں کرتا ہے مجلا میں عروس نو کو
اور سہاگن کو بھی دیتا ہے پیغام حیا !

کبھی ماتھے پہ کسی بیوہ کے ٹیکے کا نشاں
اُس کے اُجڑے ہوئے ارمانوں کا سیندور ہے یہ
کبھی اُمید کبھی حسرت و یاس
میری کبھی تصویرِ سیاس

آبرو ریز ہے یہ
فتنہ انگیز ہے یہ
گھنگروؤں میں کبھی پائل کے جھنا جھن کرتا
ساری محفل کو جگا دیتا ہے .
ایک ہلچل سی مچا دیتا ہے
وزمیں ساز میں ، آواز میں ، ہر سانس میں ہے
... کا راز ہے یہ
حیدر ... تنے کو بلانے والا ،
خون سب کچھ ہے مگر خون میں اب رنگ نہیں

عزیز اندوری

۳ نظمیں

(۱)
روشنی کا خلوص پاک سہی
دل کی تاریکیاں سلامت ہیں
صبح فکر و شعور کے دم سے
جبر کا ہر نشیب شاید بھی
سرفرازی پہ اپنی نازاں ہے .
ہر عمل جب خلاف فطرت ہے
کیوں نہ پھر جیل کے اندھیروں میں
ہم بھی کچھ دیر کو بھٹک جائیں ؟ ؟

(۲)
جب بھی فکر و شعور کا سورج
عزم و احساس کی بلندی سے
مسکرا کر نگاہ ڈالے گا .
دل پہ چھائی ہیبت تاریکی
خودکشی کے کسی بہانے کی
لمحہ لمحہ پہ منتظر ہوگی .

(۳)
محویت سے ہر ایک لمحہ کو
تازہ دم سا بنائے رکھتا ہوں
جانے کب میری زندگانی کے
بھاگتے دوڑتے سے تیز ترین ہنگامے
مجھ کو ٹھوکر سی اک لگا جائیں .
اپنا جادو اگر جگا جائیں .
اور میں چونک کر ترے تصور سے
دور اس قدر دور ہو جاؤں
پھر سے تو ، — تو ، ہی کہلائے
پھر سے میں ، — میں ، ہی کہلاؤں
وہ تسلسل جو تیری مری سانسوں کو .
اپنے سایوں میں لے کے چلتا ہے
سخت نازک ہے .
جانے کس ہولناک ، منزل میں .
ٹوٹ جائے — !!

مقالہ

پروفیسر عبدالرؤف (کلکتہ)

اعزاز افضل

وحشتؒ نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا۔

فروغِ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت — ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لئے

وحشت کے ریاضِ سخن نے شاعروں کے ایک ایسے گروہ کو جنم دیا جو فن کی بلندیوں کو چھو لینے کے لئے سرگرداں رہا۔ اعزاز افضل صاحب اگرچہ وحشت سے براہِ راست اکتسابِ فیض نہیں کر سکے۔ لیکن انھیں ان شعرا کا زمانہ ضرور میسّر آیا جو وحشت کے پیام کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے اپنی انفرادیت کی تعمیر میں مصروف تھے۔ گذشتہ نصف صدی میں شعر و سخن کی فضا قائم کرنے اور اُسے دیرپا تاثر بخشنے میں رضا علی وحشت۔ آنند لکھنوی اور ناطق لکھنوی جیسے اکابرِ فن کی خدمات کلکتہ کی ادبی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ اُن کے زمانے سے متصل حضرت پرویز شاہدی کا عہد ہے جو اپنی مخصوص ذہنی ساخت، سیاسی رُجحان اور شعری عقائد کی رُو سے ان تینوں اساتذہ سے الگ تھلگ تھے۔ پرویز شاہدی اگرچہ شاعری میں استادی اور شاگردی کی دیرینہ رسم کو آؤٹ آف ڈیٹ سمجھتے تھے اور یک قلم اس رسم کو منسوخ کر دینے کے حق میں تھے، لیکن بعض دوستوں اور شاگردوں کے باب میں اپنی رائے میں تھوڑی سی ترمیم گوارا کر لینا دوستی اور شاگرد پروری کا تقاضا سمجھتے تھے۔

افضل صاحب پرویز صاحب کے ان گنے چُنے شاگردوں میں سے ہیں جن کی اصلاح و تربیت کی طرف وہ خصوصی طور پر متوجہ تھے۔ افضل صاحب ذہنی اعتبار سے پرویز صاحب سے قریب تر ہو گئے تھے اور شعوری طور پر اُن کے رنگ میں ڈھلتے گئے۔ افضل صاحب کی عمر کوئی ۳۶، ۳۷ ہوگی اور اُن کی شاعری کی عمر ۲۲، ۲۳ سال، پرویز صاحب سے قریب ہونے سے پہلے یعنی ابتدا میں اُن کے اشعار کے مضامین رسمی ہوتے تھے یا تجریدی۔ لیکن پرویز کی نظروں نے انھیں بتایا کہ مضمون اور بیان دونوں میں ندرت اور جدت پیدا کرنے کا نام فن ہے اور یہ کہ مضمون کو مجرد ABSTRACT نہیں بلکہ اضافی RELATIVE ہونا چاہئے، کیونکہ دیگر افراد کی طرح فنکار بھی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اور از روئے بشریت سماج سے متعلق اور جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی بدلتی ہوئی فکر اور ذہنی ارتقا کے احساس سے افضل صاحب بیگانہ نہیں ہیں، بڑے سلیقے ہی سے انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔

سمتِ منزل کا تعیّن نہیں دو گام کی بات — کتنے موڑ آئے ہیں جب طرزِ سفر بدلا ہے

شعر کو تازہ اور جدید ہونا چاہئے اور اس انداز سے کہ اُس میں شاعر کی انفرادیت جھلکنے لگے اور اگر ایسا نہ ہو تو

گداگرانہ روش پر اٹل رہے ہیں ہم — پرائی فکر کے ٹکڑوں پہ پل رہے ہیں ہم

افضل صاحب فکر و نظر کی خواہ کسی منزل میں ہوں وہ اس رشتے کو نظر انداز نہیں کرتے جو شاعر اور سماج کے درمیان ہوتا ہے جس کا وہ ایک زندہ عضو ہوتا ہے۔ اسی رشتے کا پاس رکھتے ہوئے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے افراد کو انھوں نے مشورہ دیا۔

دیا ہے وقت گھنڈ چادرِ روشنی بنتے — چراغ بن کے سرِ راہ جل رہے ہیں ہم

۱۔ خان بہادر رضا علی خاں وحشت کلکتوی۔ (سالِ وفات - ۱۹۵۶)

شاعری

افتخار احمد خان افتخار نے مینائے لطافت میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ غزل محض عشق کے مضامین کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں خمریہ، زہدیہ، تصوف اور حسن و جمال کے علاوہ دیگر مضامین نہیں سما سکتے اور اس سے آگے انحراف کیا جائے تو اس صورت میں غزل غزل نہیں رہ جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری غزلوں کا بیشتر حصہ مضامین محبت و عشق سے ہے اور شعرائے متقدمین کا کلام اسی محور کے اردگرد گھومتا رہا۔ غالب نے "وسعتِ بیان" کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور تنگنائے غزل کو نئے مضامین سے آشنا کرانا چاہا جو انسانی نفسیات اور حقائقِ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی کی شہرت کا دوسرا سبب ان کے اسلوب بیان کی جدت اور مضامین کے انوکھے پن میں مضمر ہے۔ چنانچہ غالب نے اسلوب اور فکر کی نئی راہیں نکالیں جو آنے والے شعراء کے لئے مشعلِ راہ بن گئیں۔

مومن نے کیا خوب لفظوں میں بتایا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی کا نام ہے۔

یہی معنی آفرینی ہے جو ہر حساس شاعر کے ذہن کو مہمیز لگاتی رہی ہے۔ اشفاق صاحب کا تعلق شعراء کے اس گروہ سے ہے جو صرف دوسروں کے تجربات پر قانع نہیں ہوتا، دوسروں کے مضامین کو چند لفظوں کی ترمیم کے ساتھ اپنا لینا فن اور اپنی تخلیقیت کی توہین سمجھتا ہے۔ انھوں نے جدتِ اسلوب اور ندرتِ مضامین کے لئے کیا کیا کاوشیں کی ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

دیکھا تو مہرِ جبیں پہ لکھا تھا خوش آمدید — آواز دی تو بند ہر اک دل کا در ملا
صداقتوں کی رہ گزر طویل ہے نہ مختصر — یہ قرب بُعد اپنے اپنے حوصلے کا نام ہے
زمیں میں جو گڑا ہوا [illegible] — بے خانماں یہ سمجھے کہ سینے کو گھر ملا

ان تینوں اشعار میں بیان کی جدت نے مضمون کی تازگی کو نکھار دیا ہے۔

غزل کی شاعری علامتوں اور استعاروں کی شاعری ہوتی ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کے برعکس غزل کے شاعر کو اپنی تمام تر شدتِ احساس اور فکر و تجربات کی داستانوں کو الفاظ کا پیکر دے کر صرف دو مصرعوں میں سمونا پڑتا ہے اور وہ بھی ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ۔ اس پر طرہ یہ کہ غزل کی شاعری اپنی نزاکتِ مزاج کے باعث سوائے اس مخصوص ذخیرۂ الفاظ (VOCABULARY) کے [illegible] کی متحمل نہیں ہوتی ہے۔ اس صورت میں شاعر کی دشواریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شاعر کو علامتوں، استعاروں اور کنایوں کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے جن کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا۔ شاعری میں یہ [illegible] مقصود بالذات نہیں بلکہ ان کا مقصد مضمون کو فن کا صحیح روپ دینا ہوتا ہے۔

اگر شاعر صرف مضمون کے استعمال ہی کو کمالِ شاعری سمجھے تو وہ شاعری نہیں لفاظی کہی جائے گی۔ اشفاق صاحب نے غزل کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے علامتوں اور استعاروں کے برمحل استعمال سے شعروں کو تصویر بنا دیا ہے جو [illegible] کھینچتے ہیں۔

دیکھا تو مہرِ جبیں پہ لکھا تھا خوش آمدید — آواز دی تو بند ہر اک دل کا در ملا

کتنی خوبصورتی سے مضمون کو ایک مرئی پیکر بخشا گیا ہے جس کا مشاہدہ ہم معمول کی زندگی میں کر سکتے ہیں۔

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

زمیں کے ملاپ ہی کو ترستے تو دیکھتے تم بھی — وہ [illegible]

ملہ دو دائیات سوائے ذکر شاہد [illegible]
غزل [illegible]
[illegible]

ان شعروں میں بہ حیثیت مجموعی تحقیق کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے عصر یعنی انسان سے قریب ہو کر شاعری کی ہے۔ شعر میں اپنے ہم عصروں کی بہ نسبت فکر دی ہے۔ اسی لحاظ سے یہ شعر ایک پیام بھی ہے۔ اگر شعر کے معنی خدا کی پیکر کو جو اشعار کیا جائے تو معنی پیام الفاظ بنیاد (GEOLOGY) کا علم ہوگا۔ لیکن استعاروں کے بارے بہ غور کر دیکھئے تو ایک حسین شعر تخلیق ہوگا جو معنی و مطالب کا ایک تراشیدہ پیکر ہے۔

اختر صاحب کی کاوشِ فکر ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ تکمیلِ فن کے بارے میں وہ ایک واضح تصور رکھتے ہیں۔

اپنے شعروں کو نظاروں کی کسوٹی پر پرکھو   حسن کو معیارِ فکر و فن سے بالاتر سمجھ

اختر صاحب کی جوان سالی میں ان کی ذات سے اردو شاعری بہت کچھ توقع رکھ سکتی ہے۔

چند منتخب اشعار ——

فکر پروردۂ آغوشِ زمیں ہے لیکن   میرے الفاظ میں ڈھل جائے تو الہام لگے

آج اک عمر پہ یوں دل نے تجھے یاد کیا   دفعتاً نیند سے جیسے کوئی پیاسا جاگے

کتنا ہے مجلسِ شوریٰ کا وہ تو کیا حاصل   جانے پاؤں میں زنجیر سے لپٹا کیا ہے

نیند کچی ہی سہی بستر گل سے اٹھ جاؤ   اس سے پہلے کہ چمن میں کوئی نغمہ جاگے

جب کبھی چاہا ہم کہہ نہ سکے کیا اب نیا کہہ پائیں گے   اسلئے کہ ہم ٹھہر نہ سکے تو پھر بیٹھ اٹھیں گے

[illegible] (۱۰) -

لوگ دشتوں سے متعلق ہیں۔

"چاچا —— آج تم بہت اُداس ہو، کیوں —؟"

...... ایک گہری گھٹی خاموشی۔

"بولو چاچا یہ کیسی اُداسی ہے —؟"

"بیٹا —— جیسے یہاں مجھ کو ایک قیمتی احساس ہے، ٹھیک دل سے ایک نہ نکلنے والی پاپوں کی منزل ہے۔ کتنے بوجھ، کتنے دکھ اور کتنی زراشائیں بندی ہوتی ہیں اس ایک احساس کے ساتھ۔ اور آج جب میرے پاس بیٹے نے جب میری [illegible] آدھا جاگ لے کر دو لمبے ہاتھ سے پاؤں کی ایک بچی ہوئی چپل والا فرش پکڑ۔ مجھے دھتکار دیا ہے۔ تو یہ لگتا ہے جیسے میرے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر میرے سینے [illegible] کہہ گیا ہے — کمبخت بیٹے کو [illegible] مارنے کی دعا نہ رکو شے۔"

لاؤ چاچا' وہ چوہے مارنے کی دعا مجھے دیدو، ٹرالی میں کچھ جگہ خالی ہے۔ چاچا منہ پھاڑے میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ چوہے مارنے کی دعا میرے ہاتھوں میں دے کر اپنے ہونٹوں پر ایک لازوال مسکراہٹ بکھیر لیتا ہے۔ میں خوش ہو کر اُسے ٹرالی میں پھینک دیتا ہوں۔ وہ زہر کی دعا دیکھ کر ٹرالی میں بیٹھا تھکے ہوئے پروں والا کبوتر سہم جاتا ہے۔ میں ایک بے جان سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر جیپ اسٹارٹ کر دیتا ہوں۔

جیپ کی رفتار کچھ کم ہو گئی ہے۔ بوجھ بھی تو بڑھ گیا ہے۔

اب میں دھرم شالہ روڈ کراس کرتا ہوا اسٹیشن تک چلا جاؤں گا۔ دھرم شالہ —— سرائے —— لوگ آتے ہیں ٹھہرتے ہیں۔ ہنسنے اور بولنے کا عمل ہوتا ہے۔ کچھ نئے لوگوں سے بھی شناسائی ہوتی ہے۔ اور پھر —— وہاں سے چلے جانے کا ایک عجیب سا کرب جلوہ گر ہوتا ہے

منظور ہاشمی

○

کوئی حریفِ ناز و ادا بھی نہیں رہا
ہم کیا اُٹھے کہ ذوقِ وفا بھی نہیں رہا

ویسے بھی کب عزیز تھی یہ زندگی ہمیں
اور اب تو اس میں کوئی مزا بھی نہیں رہا

ایسی ہوا چلی ہے نئے موسموں کے ساتھ
فرقِ سموم و بادِ صبا بھی نہیں رہا!!

گھٹتی چلی گئی مرے سورج کی روشنی
اتنی کہ گھر میں ایک دیا بھی نہیں رہا

کیا چاہتی ہے اور گھنے جنگلوں کی آگ؟
اب تو کوئی درخت ہرا بھی نہیں رہا

اُس شہرِ آرزو کی بڑی جستجو میں ہیں
اب جس کا یاد ہم کو پتا بھی نہیں رہا

مختار شمیم

○

بازگشت اپنی آواز کی ذات کے گنبدوں میں یہاں کب تک گونجتی ہے
روشنی کے دریچوں سے آ کر ہمیں لے اُڑو دوش پر اے ہواؤ کہیں

مرحلے زندگی کے بہت سخت ہیں، وقت کی دھوپ میں ہر قدم پر لگا
ٹوٹ کر راہ میں گر نہ جاؤ کہیں، ذات کے دشت میں کھو نہ جاؤ کہیں

ریگزارِ غمِ زندگی میں مجھے یونہی تنہا مرے حال پر چھوڑ دو
راہ میں کب تلک ساتھ دو گے مرا، دردکے قافلو تھک نہ جاؤ کہیں

اپنی ضد سے ہر اک شے کی توقیر ہے۔ صبح کی شب کے سایوں میں تنویر ہے
آگ میں پھول کھلتے رہیں دوستو! سنگریزوں میں شبنم اُگاؤ کہیں

سادہ کاغذ پہ وہ دیر تک بے سبب آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا
مسکراتے ہوئے زیرِ لب پھر کہا۔ میری تقدیر کیا اب بناؤ کہیں

یہ سب ساحری دراصل [illegible] الفاظ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شاعر کو علامتوں، استعاروں اور کنایوں کا سہارا لینا ناگزیر ہے جس کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا۔ شاعری میں [illegible] ہیں وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ اُن کا مقصد مضمون کو [illegible] روپ دینا ہوتا ہے۔

اگر شاعر صرف منطق کے استعمال پر [illegible] شاعری ہو گئی تو وہ شاعری نہیں لفاظی بن جائے گی۔ [illegible] نے غزل کے [illegible] کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اُنھوں نے علامتوں اور استعاروں کے برمحل استعمال سے شعروں کو تصویر بنا دیا ہے۔ [illegible] کی طرح کھینچتے ہیں

دیکھا تو ہر جبین پہ لکھا تھا خوش آمدید   آنکھوں میں تو بند پڑا ہے ایک دل کا در جہاں

کتنی خوبصورتی سے مضمون کو ایک مرئی پیکر بخشا گیا ہے جس کا مشاہدہ ہم روزمرہ کی زندگی میں کرتے ہیں۔

ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے۔

زمین کے ملبے میں [illegible] دیکھتے ہی   وہ اضطراب جو تمہید زلزلوں کی ہے

ے [illegible] سوائے ذکرِ شاہد و شراب و شکوۂ ظلم و مفارقت و بیان حسن و خوشہ و عشرت [illegible]

غزل [illegible] و [illegible]   دیباچۂ [illegible] (۲۴۱-۲۴۲)

بحوالہ اُردو غزل کے پچاس سال۔ [illegible]

شفیع جمال (مظفر پور)

دُکھوں میں دبی ٹرالی

اکثر جب میں چاچا جانے والی اُس دُکان کا نام جیسے ہی کبھی کہ نام سے منسوب کرتا ہوں

"ماں" بہت ہی خوبصورت اور پُر تقدیس لفظ ہے۔ مجھے بھی اپنی ماں سے بہت پیار ہے۔ میرے لئے وہ ایک محترم ہستی بھی ہے مگر جب کبھی ـــــ خالی جھولی خالی کنستر اور کچھ کپڑوں کے ٹکڑے ٹرالی کے سامنے پھینک کر، گھر میں کچھ نہیں ہے: کہتی ہے تو بڑی غیر مانوس اور عجیب سی لگتی ہے۔ لیکن پھر اُس کا پُر وقار اور بارعب چہرہ دیکھ کر اُس کا حکم آمیز لہجہ سُن کر اُس کی غیر معمولی شخصیت کو دیکھ کر خاموشی سے جیپ اسٹارٹ کر دیتا ہوں۔ جانتا ہوں ـــ ماں کے پاؤں تلے جنت ہے: یہ خدا نے کہا ہے، مگر خدا کہاں ہے اور جنت ـ؟

جیپ پٹرول سے چل رہی ہے۔ راستے میں دھوبی کا گھر ہے اُس گھر میں ایک چھوٹی سی لونڈیا بھی ہے: گنوڑ چاچا ـ چاچا۔ ہم نے بغیر کسی خود غرضی، بغیر کسی قانونی پابندیوں کے اپنا ایک رشتہ بنا لیا ہے رشتہ ـ بڑی ہی چھوٹی سی بات لیکن کتنی اہم ـ! ہم سبھی لوگ رشتوں سے منسلک ہیں۔

"چاچا ـــــ آج تم بہت اُداس ہو، کیوں ـــ؟"

...... ایک گھُٹی گھُٹی خاموشی۔

"بولو، چاچا یہ کیسی اُداسی ہے ـــ؟"

"بیٹا ـــــ جیون بھگوان کا ایک قیمتی احسان ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک نہ بکنے کے پاپوں کی سزا بھی ہے۔ کتنے بوجھ، کتنے دکھ اور کتنی نراشائیں بندھی ہوتی ہیں اس ایک جیون کے ساتھ۔ اور آج جب میرے ہی بیٹے نے، جب میری ہی آتما کا آدھا بھاگ لے کر دو بیلے پتھر اور بڑے پاؤں اور ایک چوڑی چھاتی والا شریر پا کر ـ مجھے دھتکار دیا ہے۔ تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جیون ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر میرے مستقبل کے گرد کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے ـــ کمبخت بیٹھنے بھی نہیں دیتا۔ ہاں ـــ کبھی دل چاہے مارنے کی دعا کی زیادہ مقدار کارگر ہوگی۔ بھگوان کے چرنوں میں آرام مل جائے گا۔"

گنوڑ چاچا میری موجودگی نظر انداز کر کے بکتا چلا جاتا ہے۔ میری اُداسی دُور ہو جاتی ہے، جانتا ہوں، جذباتی لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ کچھا پینے پر سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔

"چاچا ـــ جیون صرف زندگی بھر کی بات ہے۔ موت کے بعد کچھ نہیں بچتا۔ عالم بالا کا تصور ایک بہلاوا ہے۔ بھگوان کا وجود ایک وہم ہے۔ کیوں ـــ؟ جانتے ہو چاچا ـــ زندگی کے تجربات نے کچھ اُصول بنائے ہیں۔ انہی اصولوں پر عمل کرنا بھگوان کا حکم ہے۔ ہم اس نام کے اتنے پابند ہو چکے ہیں کہ جیون کے بعد پھر زندگی کی آس کو دیوالی کی طرح ذہن میں سجائے اپنے گھروں میں لٹکائے چلے آ رہے ہیں۔ حشر کے جیون کی اُمید پر ہم چپ چاپ مر جاتے ہیں۔ جانتے ہو چاچا، کیوں بالطرف، صرف اس لئے کہ وجود کے مکمل فنا ہو جانے کا خوف سارے سنسار کو شکار نہ کر ڈالے۔

"لاؤ چاچا، وہ موت سے مارنے کی دعا مجھے دے دو۔ ٹرالی میں کچھ جگہ خالی ہے۔"

چاچا منہ پھاڑے میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ موت سے مارنے کی دعا میرے ہاتھوں میں دے کر اپنے ہونٹوں پر ایک لازوال مسکراہٹ بکھیر لیتا ہے۔ میں خوش ہو کر اُسے ٹرالی میں پھینک دیتا ہوں۔ وہ نہ ملی دعا دیکھ کر ٹرالی میں بیٹھا تھکے ہوئے پروں والا کبوتر سہم جاتا ہے۔ میں ایک بے جان سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر جیپ اسٹارٹ کر دیتا ہوں۔ جیپ کی رفتار کچھ کم ہو گئی ہے۔ بوجھ بھی تو بڑھ گیا ہے۔

اب میں دھرم شالہ روڈ کراس کر کے سیدھا اسٹیشن تک چلا جاؤں گا۔

دھرم شالہ ـــ سرائے ـــ لوگ آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں۔ ہنسنے اور بولنے کا عمل ہوتا ہے۔ کچھ نئے لوگوں سے بھی شناسائی ہوتی ہے اور پھر ـــ وہاں سے چلے جانے کا ایک عجیب سا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

کیا اِس جہان کی حقیقت بھی اس معروم شالہ سے مختلف ہے؟ ہم یہاں ہے ۔۔۔! اِس سرائے سے جا کر وہ زندہ رہتے ہیں، ایک پل، دو پل، یا ایک صدی۔ لیکن اِس دنیا سے جا کر ۔۔۔؟ مٹی، خاک، راکھ یا شعلہ خلا ۔۔۔ تلاش ۔۔۔ اور کیا؟ کچھ تو نہیں۔

اسٹیشن موڑ ۔۔۔ اسٹیشن ۔۔۔! ٹھہر کر سوچنے، راستہ بدلنے یا منزل کی تلاش کا ایک وسیلہ ۔۔۔ اور پھر سفر، صدیوں کی مسافت، جس کا اختتام خود کسی نے نہیں دیکھا۔ اننت دشائیں۔ صدیوں کا سفر، مستقل یاترا، زندگی پانے کی سزا۔ راستے الگ الگ ۔۔ اسٹیشن، ملنے اور بچھڑنے کی ایک جگہ، ایک لمحہ، دو پل، سرائے سے زیادہ اور سنسار سے کچھ کم عارضی۔

ملنا اور بچھڑنا زندگی ہے۔ اپنے اپنوں سے بچھڑ جائیں، دُکھ سے جائیں، پرانا دکھ بچھڑنے کے غم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کے فنا ہو جانے کا خوف، کسی عزیز کی جدائی پر ایک بھاری سا پردہ تان دیتا ہے۔ اور پھر وہی سفر ۔ رختِ سفر۔

موڑ ۔۔۔ ہسپتال کی جانب مڑ گیا ہے۔ منزل کو پاس دیکھ کر جیپ کے پاؤں سست رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں، ایک عجیب سی بےبسی، تھکن کا احساس جاگتا ہے اور منزل آ جاتی ہے۔

ہسپتال ۔۔۔ ڈیٹال، ایتھر اور اسپرٹ کی بُو، پلاسٹر کے ٹکڑے دواؤں کے خالی ڈبے، انجکشن کی شیشیاں، ڈسٹلڈ واٹر کی بک لگی بوتلیں اور اُس کے بیچ میں بیٹھی ہوئی خون کی بُو ہیں ۔۔۔ کسی کی پیلی موت کا اعلان کرتی ہیں۔ [illegible] خوش کپڑوں میں ملبوس اپنے پرائے، خادم، اُداس یا مسکراتے چہرے اور ہسپتال کا آخری حصّہ

ہسپتال کا آخری حصّہ ۔۔۔ پیئنگ وارڈ ۔ چار روپے معائنہ اور دوا الگ بازار سے۔ "سرکاری ہسپتال ۔ دوائیں اور دیگر خدمات بالکل مفت:" یہ صرف بورڈ پر لکھا ہے۔ لاپروا ڈاکٹر آرام طلب نرسیں، بد دماغ کمپاؤنڈر، لالچی اور کمینے سیکیورٹی کے عمدار خادم۔ یہ روم نمبر چھ کا بیڈ نمبر آٹھ ہے اور میرے باپ کی صحت مند صورت میرے سامنے ہے۔ اب تک میں نے (صرف) [illegible] روپے خرچ کر ڈالے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا آپریشن اور اتنا لمبا خرچ ۔۔۔!! "سرکاری ہسپتال ۔۔۔ دوائیں اور دیگر خدمات مفت:" ایک بورڈ اندر بھی لگایا گیا ہے۔ بورڈ بہت خوبصورت اور بڑا ہے۔ بےشک اُس کو بنانے میں پانچ سو روپے خرچ آئے ہوں گے۔

بیڈ نمبر سات پر ایک نیم پاگل آدمی ہے۔ کافی لمبا چوڑا اور صحت مند دکھائی دیتا ہے۔ پہلوانوں جیسا جسم ہے۔ کسی کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ "بیر سوئی" کا [illegible] ہے۔ یوں تو نیم پاگل سا ہے مگر باتیں بڑے ہوش کی کرتا ہے۔ مجھے پاس بلا کر پوچھتا ہے، میرے اور میرے باپ کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ پھر [illegible] میرے باپ کی طرف دیکھ کر اپنی پیشانی کو اپنی انگلی سے ٹھونک کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا ہے۔

"بھاگیہ ۔۔۔! کتنا بھاگوان آدمی ہے۔ بھینٹ کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے، دو جاتے ہیں، چار آتے ہیں ۔ ۔ ۔ سب بھاگیہ کا بات ہے بیٹا۔ تو نہیں جانتا بابو ۔۔۔ میرا ایک بیٹا ہے، دو پوتے ہیں اور پھر بھگوان کی کرپا سے ایک سُندر بہو ہے، پھر ۔۔۔" وہ جنت اپنے بستر پر ایک خیالی لکیر کھینچ کر بڑبڑانا شروع کرتا ہے۔

"اُسی جیون رکھتا ہے۔ جب شکر ہو تو سب کے سب اِس پار اور جب حکم ہو تو سارے کا سارا اُس پار ۔۔۔" دو پل ٹھہر کر وہ اپنے پاگل پن سے مجبور ہو کر تکیہ کو غور سے دیکھتے دیکھتے اچانک اُلٹ کر رکھ دیتا ہے اور مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ میں مُنہ پھیر کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد میں پھر اُس کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اُس کی دردناک حالت کا احساس ہوتا ہے کہ اُس کی آنکھیں، جو کھڑکی سے باہر جسم نقطے پر جمی ہیں، اُن آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ [illegible] کر چپک گئی ہیں اور لگتا ہے اچانک ہی [illegible] سے خون کا ایک ساگر اُبل پڑے گا اور ہماری دنیا کو [illegible] کر دے گا۔

پھر سے اب [illegible] نہیں جاتا ہے [illegible] آنکھوں میں [illegible] کر چپاں میرے [illegible] پڑھتا ہوں۔

گئے میرے باپ کا تصور ہی کتنا بھیانک ہے۔ جس نے خوشی خوشی ہسپتال کے اسٹاف کو آنکھیں، گردے، دل، جگر وغیرہ کا عطیہ دے دیا ہے۔ جو لوگ دھیرے دھیرے میرے باپ کی خدمت کرتے رہے تھے۔ میں انہیں لے کر باہر نکل آیا ہوں۔ ایک عظیم قربانی کی مکمل ماحولیاتی خوشیوں کا ایک پُرجوش حلقہ بن گیا ہے۔ میں تقاضائے محبت سے سرشار آنسوؤں کے ساتھ لوٹ کر گھر آیا ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے باپ کے قدموں کی چاپ میرے ساتھ نہیں ہے۔ میں گھبرا کر جب کمرے میں آیا ہوں تو میرا دل دھک دھک کرتا ہے۔ اُن کے کئی ٹکڑے بیڈ پر ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ میں آیا ہوں۔ بکھرے پڑے ہیں۔ اُن کے جسم کا بیشتر حصہ بیڈ پر ایک بے حرکت ہوئے سے لگا ہے۔ دوسرے کو دل کی بیماری ہے وہ مرحومیت کے ساتھ پہلی بار سانس لینے لگا ہے۔ نہ جانے کس کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک کے پیٹ کا آپریشن ہوتا ہے۔ میرے باپ کی ماں اس چاک کئے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر کہے گی کہ وہ دونوں کو اُن کی بیوقوفی سے بے پروا حسرت بھری آنکھوں سے باہر نکالیں جانے کو کہتی ہے کہ ممکن ہے کوئی ڈاکٹر، یا کم از کم کوئی نرس ہی آ جائے۔ لیکن ـــــ !!

اور ـــــ اور یہ ـــــ یہ کیا کا سفر ـــــ

کل تک دھرتی سے سو فٹ اوپر جا کر اندھیرے کے ٹکڑوں کو روشنی تقسیم کر رہا تھا، اور آج ـــــ یہ خاموش کیوں ہے۔ یہ کیوں نہیں لطیفے سنا کر اپنے ساتھیوں کو ہنساتا ـــ؟ اس کے ہاتھ بجلی کے تاروں سے کیوں نہیں کھیلتے ـــ؟ یہ سکوت کیسا ہے یہ جمود کیوں ہے ؟؟ میں چیخ کر کہتا ہوں، حرکت، حرکت، پلیز مُو و ـــ !!
میری آواز، میری ساری خواہشات، کوئی نہیں سُنتا، بس آہیں، کراہیں اور جمود ـــــ !

یہ آدمی آج جمود کا شکار ہے۔ میرے باپ کا یہ ٹکڑا کل تک متحرک تھا۔ زمین سے سو فٹ اوپر رہا کرتا تھا۔ آنے والا کل اسے زمین میں، پانچ فٹ اندر لے جائے گا یعنی ایک سو پانچ، اتنی اور پھر سو فٹ نیچے۔ کیا ترقی یہی ہے اور کیا یہی زندگی کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ کبھی دھرتی کے سو فٹ اوپر اور کبھی زمین میں سو فٹ نیچے ـــــ جو کیمیکل یہ کیمیکل بنا سکتا ہے گا، میرے باپ کے ٹکڑے فنا ہو جائیں گے۔ اس کے احساسات ختم ہو سکتے ہیں ـــ؟؟

میں ڈر گیا ہوں۔ خوف سے میرے سارے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ خوف زدہ ہو کر فرار کی راہ تلاش کرتا ہوں۔ میرے چاروں طرف ملبے کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ آہیں، کراہیں، سسکیاں اور جمود ـــ ! میں ایک جھٹکے سے سارے ٹکڑے ٹرالی میں پھینک دیتا ہوں۔ جیب اسٹارٹ کرتا ہوں۔ جیپ کسی زخمی ہو تڑپتے جانور کی طرح فرار ہو جاتی ہے۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں، ایک بڑا دو چار تین ....، مگر انجن جاگ نہیں پاتا۔ پیڑوں کی شاخیں چرچراتی جا رہی ہیں۔ پیڑ کی سوکھی شاخیں میرے ساتھ دوڑ میں لگ رہی ہیں ـــ میں گھبرا کر لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوں۔ جی چاہتا ہے ٹرالی کو جھٹکا دے کر جیپ کے پہیوں کے نیچے رکھ دوں، یا جیپ ہی کو ٹرالی میں ڈال دوں ـــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں سر جھٹک کر ٹرالی میں دیکھتا ہوں۔ ٹرالی لبالب بھری ہے، خالی بوتلیں، چھتریاں، بکھرے ہوئے ہارنے کی دوا، شیشہ محل کی بنفشی کرچیاں، آہیں اور سسکیاں اور وہ کسے میں سمٹا سمٹا، جو کچھ نظر نہیں آتا ـــ اُس کا حق میں تو جیسے مارنے کا وہ ٹھیک چکا ہے جس کے سینے میں شیشے کی کرچیاں چبھ چکی ہیں، آنسو آ رہے ہیں اور کراہوں نے گھیر لیا ہے اور ـــــ اور اُسے جمود نے دبوچ لیا ہے۔

جمود کو دیکھ کر میں پھر سہم گیا ہوں، اُس کی سرد نعش، گھڑی کی ٹک ٹک اور ساکت نگاہوں کو دیکھ کر میں بے اختیار چلا پڑا ہوں۔ حرکت، حرکت، مُو و، پلیز ـــــ مُو و، ـ اپنی جگہوں کا پورا گُھٹ ہے، بہت ہی تیز رفتاری سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنی دور شاخوں کی آمد۔ مگر ٹرالی میرا تعاقب کرتی، لڑھکتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ میں بھاگ رہا ہوں۔ اور وہ مجھ سے منسلک ہے ٹرالی میں سے ایک پاگل طوفان سر اٹھا کر چیخ رہا ہے، جمود، جمود، ـــــ جمود ـــــ !!

حفیظ فضا

قاتل سے نہیں ہم کو مسیحا سے گلا ہے
وہ زہر رگ و پے میں جواب دوڑ رہا ہے

حالات کی دہلیز پہ آئینے کی مانند
اک شخص بڑی دیر سے خاموش کھڑا ہے

چُپ ہوں تو سخن سے مجھے بیگانہ نہ سمجھو
اظہار کا یہ طرز یہ اسلوب نیا ہے

تم رات کے جنگل میں جسے ڈھونڈ رہے ہو
وہ صبح کے بے نور دھندلکے میں چھپا ہے

تقسیم کروں دولتِ مفہوم کہاں تک
ہر لفظ لئے ہاتھوں میں کشکول کھڑا ہے

اِس کارگہِ جبر میں اب زندگی کرنا!
اے دوست مجھے دستِ تہِ سنگ لگا ہے

بلراج حیرت

تذکرہ جس کا عقیدت سے سرِ منبر تھا
موم کے جسم میں پوشیدہ کوئی پتھر تھا

مدتوں بعد ہم آج اپنی گلی سے گذرے
وہی کہرام مچا تھا جو ترے در پر تھا

شورشِ ذات بھی کچھ کم نہیں دلچسپ مگر
اِس سے ہنگامۂ کردار بہت بہتر تھا

لوگ حیران و سراسیمہ کھڑے تکتے تھے
آنکھ میں آگ پگھلنے کا عجب منظر تھا

زندگی تیری پریشانیاں حل کر دیتا
زہر کھا لیتا، مگر مجھکو بقا کا ڈر تھا

آپ بھی حیرتؔ آوارہ سے واقف ہونگے
سنگ زاروں میں رہا کرتا تھا شیشہ گر تھا

شاہد میر

جب تلک میری نگاہوں سے کوئی رشتہ نہ تھا
اپنا چہرہ اس قدر اُس کو بھلا لگتا نہ تھا

زندگی سے بھاگ کر ملتی نہیں غم سے نجات
رازِ یہ صحرا نوردوں نے مگر سمجھا نہ تھا

ایک پل کو بھول جاتا اپنی ساری کشمکش
اُس کے ہونٹوں کا تبسم معتبر اتنا نہ تھا

زندگی کو کیوں سمجھتا تھا فریبِ مستقل؟
اُس نے کیا معصوم بچے کو کبھی دیکھا نہ تھا

آج تو شاہد مرے احساس کی [illegible]
ملتفت وہ مجھ پہ تھا [illegible]

افسانہ

[illegible] جمیل (بمبئی)

اَن کہے

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لیٹا تو بس تھوڑی ہی دیر سو سکا۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی۔ بچے اسکول چلے گئے تھے، بیوی کی صبح چونکہ بہرحال چھ بجے سے شروع ہو جاتی ہے اور یہی وقت تھوڑے سے آرام کا ہوتا ہے اسی لئے وہ گہری نیند کا لطف لے رہی تھی۔

اُس نے لیٹے لیٹے سوچا، ایسی مکمل خاموشی، ایسی بھرپور شانتی قسمت ہی سے ملتی ہے اور یہی وقت ہے جب سویا ہوا فنکار جاگتا ہے۔ کئی دنوں سے دو تین کہانیوں کے خاکے اُس کے ذہن میں تھے، لیکن جب بھی اُنھیں قلم کی وساطت سے کاغذ پر پھیلانا چاہا، کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوئی کہ وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس نے سوچا، سستی کو بالائے طاق رکھ کر فوراً اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر وہی قیام، وہی شام کے ہنگامے جو رات گئے تک ختم نہ ہوں گے۔ بس ایک بار شروع کرنے کی دیر ہے پھر قلم خود بخود چلنے لگتا ہے اور کہانی تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ ایسی کتنی ہی تنہائی کی گھڑیاں وہ تخلیق کے کرب میں گزار چکا تھا۔ شوقِ تکمیل کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی اسقاط کا شکار ہوتا رہا تھا۔ اُس نے موسیقی کے سہارے اپنے جذبوں کا نکاس ڈھونڈا، پینٹنگ کر کے رنگوں میں اپنی شخصیت کا اظہار کرنا چاہا، گیت لکھے، شعر کہے لیکن اُس کے اندر چھپے ہوئے فنکار کی کسی طرح تسکین نہیں ہو رہی تھی لیکن اب اُس نے فیصلہ کر لیا تھا [illegible] عقیدوں کا اظہار کر کے اپنے تخلیقی جذبوں کی [illegible]

اور اس [illegible] دوستوں کے خط یاد [illegible] تحریک ملی تھی۔ [illegible]

اپنے خاص خاص اور قریبی دوستوں کو سناتا ہوں۔ اپنی بیوی کو سناتا ہوں۔ تمہارے خط کی سطر سطر تمہاری جادو بیانی کی تصدیق ہے۔ کبھی دفتر اور لوگوں کا خاکہ اس انداز سے کھینچتے ہو کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور بے ساختہ قہقہے اُبل پڑتے ہیں۔ کبھی کسی کی گمبھیر زندگی کا اس انداز سے ذکر کرتے ہو کہ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، دل بھر آتا ہے۔ تمہارے خط کیا ہیں شہ پارے ہیں...: راشد نے لکھا تھا: میں نے تمہارے سارے خط ایک فائل میں جمع کر رکھے ہیں اور جب بھی اُداس ہوتا ہوں انہیں پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ تمہارے طنز و مزاح سے بھرپور اندازِ تحریر ایک نئی تازگی بخشتا ہے۔ بس تم ایسے ہی خط لکھتے رہا کرو۔ تمہیں کیونکر بتاؤں کس قدر متاثر ہے تمہاری تحریریں..."

ان خطوط کے متعلق سوچتے ہوئے اُس کے بدن میں ایک عجیب نشاط آمیز سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جیسے برقی رَو سارے جسم میں دوڑ رہی ہو۔ وہ اس کیفیت کو خوب سمجھتا تھا۔ برسوں سے کینواس پر جھکنے سے پہلے، کسی خوبصورت راگ کے ذہن میں آنے پر اور کبھی کسی حسین خیال کے شعر بننے پر ایسی ہی حالت سے وہ بارہا گزرا تھا۔

اُس نے سوچا بس اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پانچ سے پہلے بچے نہیں لوٹیں گے، بیوی کا جو گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے جب تک شام کی چائے کے لئے جگایا نہ جائے، وہ کیا اُٹھے گی۔ یہ دو گھنٹے بلا کسی خلل اندازی کے، کہانی لکھنے میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ بس اب اُٹھیں، تپائی سے پیڈ اور میز کی دراز سے قلم نکال کر شروع ہو جانا چاہیے۔ پھر شام ہی اطمینان کے ساتھ تازہ تخلیق کی پارٹی بھی [illegible] خوب [illegible] کے لئے سوٹ بھی پریس کرتا ہے۔ بیوی [illegible] سوٹ پریس کر [illegible] شام کے [illegible]

کر بڑا ترس آتا تھا۔ بے چاری کو ذرا چین نہیں، رسوئی، بچے، شاپنگ ۔۔۔ "نہیں، تم رہنے دو۔ میری بھی تو چھٹی ہے آج میں ہی کروں گا ۔۔ تم آرام کرلو۔" اب بڑا افسوس ہو رہا تھا کہ فیاضی نہ دکھاتے تو یہ وقت بھی بچایا جاسکتا تھا ۔۔ خیر پانچ دس منٹ سے کیا ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت تو اپنا ہے، بچوں کے آنے سے پہلے پہلے......

ایک پہلو پر لیٹے لیٹے بدن کچھ اکڑ سا گیا تھا، کروٹ لے کر اُس نے سوچا کیوں نہ ہو کہانی آج کھو ڈالوں، وہ جو نس بندی سے متعلق سوچ رکھی ہے۔ Sterilization آج کل کا پسندیدہ موضوع۔ تین کردار۔ ایک بے حد عیاش، شراب اور لڑکیوں کا رسیا، دوسرا بے حد دولت مند انٹلیکچول جس کی بیوی دماغ مفارقت دے کر گُلے دیو داس بنا گئی ہے اور تیسرا جو مرد ہوتے ہوئے بھی مرد نہیں ہے لیکن شادی شدہ ہے۔ شادی اس لئے کی کہ جہیز میں آئی ہوئی بے پناہ دولت ہتھیا لے۔ (سماج کے منہ پر طمانچہ۔ جہیز کی لعنت)، اور اس کی خوبصورت بیوی جو بدکردار ہو نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے جسم کے تقاضوں سے مجبور ہے۔ پھر عیاش دوست کا چلن، لڑکی کو گرد ہٹی دیو داس سے ملاتا ہے دوستی ساری حدیں توڑ کر آگے بڑھتی ہے، لڑکی بچے کی ماں بننے والی ہے، کلائمکس۔ پھر ایک خون۔ (کس کا؟) عدالت ۔ ساری شہادتیں گرد ہٹی دیو داس کے خلاف، اور وہ کہتا ہے: "یہ بچہ میرا نہیں ہے ۔" پھر گرج کر "اگر یہ بچہ میرا ہے تو آپ کا سارا نظام غلط ہے آپ کی MEDICAL SCIENCE غلط ہے اس لئے کہ میں نس بندی کرا چکا ہوں اور لیبر کے سارے ٹیسٹ بھی۔ سناٹا . . . . .

لیکن کہانی میں خون، عدالت اور سیکس آجانے سے کچھ دوسرے درجہ کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ یہی سب لکھنا تھا تو بہت پہلے لکھ چکے ہوتے۔ افسانہ ہو تو ایسا کہ لوگ پکار اٹھیں کہ اسے کہتے ہیں معیاری تخلیق جو بیک وقت زمینی بھی ہے اور آفاقی بھی وغیرہ وغیرہ ۔۔

کیوں نہ کوئی نظم لکھی جائے؟ نظم کا خیال آتے ہی دہلی کے اُس ماہانہ میگزین کے ایڈیٹر کا خط یاد آگیا جس نے اُس کی نظم لوٹا دی تھی۔ خط چھپا ہوا تھا لیکن انکار بڑا خوبصورت تھا: "ہم چند مجبوریوں (؟) کی بنا پر نظم شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی آئندہ نگارشات پر غور کرنے سے ہمیں مسرت ہوگی۔ آپ کے قارئین کے منتظر . . . .

بالکل ایسے ہی جیسے رشتہ منظور نہ ہو تو لڑکی والے صاف کہنے کے بجائے کہتے ہیں "ابھی ابھی ہمیں شادی نہیں کرنی ہے۔ ابھی تو لڑکی اور پڑھے گی ۔۔" میں سب سمجھتا ہوں اِن لوگوں کی باتیں۔ اِن کے رسالوں میں جو مضامین، جو آرٹیکل، جو شعری تخلیقات ہوتی ہیں، سبھی اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتیں۔ پورے میگزین میں ایک آدھ چیز ہو تو ہو، ورنہ باقی وہی بندھے ٹکے نام ہوتے ہیں جن کی نگارشات میں کوئی دم نہیں ہوتا۔ پر کیا کیجئے ادب بھی تو بیوپار بن گیا ہے اور بیوپار میں بڑے بڑے چکر چلانے پڑتے ہیں۔ کسی کی سفارش، جان پہچان، خوشامد ۔۔ یوں براہ راست بھیج دینے سے تھوڑے ہی شائع ہو جاتے ہیں۔ پھر گروپ بندیاں ۔۔ آپ ترقی پسند ہیں یا جدت پسند اور جو اِن دونوں کے بیچ میں ہیں ---- سب بدمعاشیاں ہیں، دن دہاڑے لوٹ ہے، بے ایمانی ہے۔ لیکن یہ سب تو ہوتا ہی ہے، آخر غالب کو بھی تو زندگی میں ٹھکرایا گیا تھا۔ تم کس کھیت کی مولی ہو؟ اِن باتوں سے بد دل نہیں ہونا چاہئے۔ لکھتے رہو لکھتے رہو، لکھتے رہو کبھی تو تمہارا جائز مقام تمہیں ملے گا ہی۔

آج کل دوپہر میں اتنی سخت گرمی ہونے لگی ہے۔ نیند تو کم بخت پوری طرح ہوتی نہیں، طبیعت سُست ہو جاتی ہے۔ نشہ کیا ہو جیسے ۔۔ ارے ہاں وہ تختے سے متعلق کون سی کہانی تھی؟ . . . . کبھی ایسا نہیں چلے گا۔ اِس طرح تو سارا وقت ضائع ہو جائے گا۔ بس قلم لے کر بیٹھ جانے میں اور جو بھی خاکہ ذہن میں آتا جائے اُسے کاغذ پر منتقل کرتے جائیں (کاغذ بھی کتنا مہنگا ہو گیا ہے آج کل!) الیس کتنی ہی کہانیوں کے خاکے دماغ سے باہر نکل نہیں آنے پائے اور پھر جوں جوں وقت گذرتا گیا دھندلے ہوتے گئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے۔ اپنا خیال قلم کی سیاہی میں بھگو لو اس سے پہلے کہ وہ بھاپ بن کر اُڑ جائے۔ (کہاوتیں بھی کبھی ترجمے کے بعد کیسی مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں!) ۔۔ تو پھر اٹھنا ہی چاہئے۔ کر کس کے ۔ یہ کیا؟ ۔۔ گھڑی تو ٹھیک ساڑھے چار!!! لیٹے لیٹے ہی گذار دیا گیا ہے۔ پھر بھی۔ دیر سے ہی سہی بالکل نہ ہو [illegible] انگریزی کہاوتیں تو ترجمہ ہونے کے بعد فضا ہی نہیں [illegible] کرا ٹھتے ہوئے اُس نے [illegible] واقعی بڑی [illegible] اپنا انداز تخیلؔ [illegible]

جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے اُس نے سوچا کہ چائے سے بڑی تازگی آ جاتی۔ اب بیوی کو جگائیں تو چائے مل جائے گی لیکن اس طرح جو خلل واقع ہوگا وہ مہنگا پڑے گا۔ کچھ دیر اور یہی شانتی برقرار ہے تو بس۔ اُس نے سگریٹ جلا کر کش لئے تو پھر وہی برقی رَو سارے بدن میں دوڑ گئی۔ تیزی سے تپائی کی طرف لپکا تو پیڈ ندارد۔ طبیعت بڑی مکدّر ہوئی۔ ٹیبل کی دراز میں بھی پیڈ نہیں تھا۔ گیا کہاں ؟ بیوی کو جگا کر پوچھیں ؟ نہیں جانے دو۔ اتنے میں ریک پر کچھ کاغذات کلپ بورڈ میں لگے ہوئے نظر آئے۔ چلو اسی سے کام چلا لیتے ہیں۔ اب پین ۔ پین نہیں مل رہا ہے۔ یہ کم بخت بچے کسی چیز کو ٹھکانے پر نہیں رہنے دیتے۔ سارے موڈ کا ستیاناس ہوا جاتا ہے۔ پُرانی کتابوں کے بیچ ایک پین پڑا مل گیا جو شاید بچّوں نے ناکارہ سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا۔ اُس میں روشنائی نہیں تھی۔ بڑی تلاش کے بعد روشنائی کی بوتل ملی تو خالی۔ اب باقاعدہ جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ کیا کریں ؟

... بیوی سے پوچھتے ہیں .... وقت گزرا جا رہا ہے ....

کچھ ندامت، کچھ جھنجھلاہٹ کے ساتھ جگایا تو بیوی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"اچھا کیا آپ نے جگا دیا۔ بچے آتے ہی ناشتہ مانگیں گے۔ کیا وقت ہو رہا ہے ؟"

"میں نے اس لئے جگایا تھا کہ میرا پین نہیں مل رہا ہے۔ تم نے کہیں دیکھا ہے ؟"

"اپنی چیزیں ٹھکانے سے تو کبھی رکھتے نہیں۔ میز کی دراز میں دیکھئے۔"

"وہاں نہیں ہے۔"

"کتابوں کے ریک پر ؟"

"وہاں بھی دیکھ لیا۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔ وہ انجو لے گئی ہے اُس کا پین خراب ہو گیا ہے نا۔"

ضبط، حدوں سے گزر چکا تھا۔ پھر بھی اُس نے کہا: "سنو۔ ایک پُرانا قلم مل گیا ہے لیکن دوات نہیں ملتی۔"

"وہ سامنے تو رکھی ہے ؟"

"اُس میں ایک [illegible]"

مٹھی بھرے میں ڈھونڈ [illegible] بتا دوں ؟

"نہیں پہلے روشنائی" یہ کہہ کر آرام صوفے پر بیٹھ گیا۔ دل و دماغ پر عجیب سی تھکاوٹ طاری ہونے لگی تھی اور شام بے کیف ہو چلی تھی۔

بیوی تھوڑی دیر بعد دوات لئے آئی۔

"بچوں نے ذرا اُنگ ٹیبل کے نیچے رکھ چھوڑی تھی۔"

تیزی سے دوات لے کر پین میں روشنائی ڈالی۔ آدمی تو نیچے چلی گئی لا جلدی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے خیالی میں کرنے سے ہاتھ پونچھ لئے اور جانے کیسے چہرے پر بھی روشنائی پہنچ گئی۔ کاغذ پر حسبِ عادت اُس نے بسم اللہ کے ہندسے لکھنے چاہے ۷۸۶۔ لیکن سات کے ہندسے پر نب کی ایسی آواز آئی جیسے بے تیل کے پہیوں والی گاڑی سے آتی ہے۔ ذرا زور دیا تو آٹھ کے ہندسے کی جگہ شگاف بن گیا پھر دو تین جھٹکے ۔ ایک بڑا سا دھبّہ میز پوش پر ۔ اور پھر ۔ لکھنے کی کوشش میں کاغذ کا سر قلم ہوتا رہا۔ کوشش، کوشش، کوشش، ۔ اور پھر گھنٹی بجی۔ بیوی نے لپک کر دروازہ کھولا تو ملازمہ بچّوں کے بستے لئے نمودار ہوئی اور پیچھے پیچھے شور مچاتے ہوئے بچے ۔

اُس نے تخلیق کے ورق کو تہہ کرتے ہوئے سوچا "شوہر پر ایک مضمون کیسا رہے گا ؟"

▲▲

بقیہ کہانی صفحہ ۳۰ ہاتھیوں کی قطار

اپنے آپ کو اُس کرسی پر پاکر حیرت ہوئی۔ اُنھیں یاد آیا کہ گزشتہ رات اُنھوں نے کتنے کرب و اضطراب میں کاٹی۔

" اوسارا تر سے پرنا تھی آ دکا نے تم نے ترنج inform کر دالو ہتوا ہن تھیا بچی اوں تم نے جوائنی شکوں۔"

(ترجمہ: میں رات پونا سے لوٹتے ہی فوراً تمہیں مطلع کرنا چاہتا تھا لیکن زبردست طوفان کی وجہ سے تمہیں دیکھ نہیں پایا۔)

یہ کہتے کہتے بیرام جی نے اپنے دوست کی جانب دیکھا، اُن کا منہ کچھ کہنے کو کھلا، لیکن وہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ کسی نے اُن کی زبان کو انگلی میں لپیٹ کر باہر کھینچ لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھے کرسی پر گر پڑے۔

پھر اُنھیں محسوس ہوا کہ اُن کی کرسی کے سامنے کھڑے ہوئے اسٹیل اور اسمنٹ کے [illegible] نے اپنی مسہری پہ آہستہ آہستہ منڈرانی میں اور اپنے [illegible]

[illegible]

▲▲

عامر سوری

ملے گی دادِ یقیں اعتبار اگر ہے بھی
ضرور آئیں گے وہ انتظار اگر ہے بھی

خزاں کے جور و ستم لوگ بھول جائیں گے
جو چند روز شکوۂ بہار اگر ہے بھی

ملیں گے زخم ہی تجھ کو عوض میں رحمت کے
تری متاعِ دلِ داغدار اگر ہے بھی

پکار اٹھے گی اک روز الاماں دنیا
مزاجِ گردشِ لیل و نہار اگر ہے بھی

نکل ہی آئے گا میداں میں سر پھرا کوئی
صلائے عامِ غمِ روزگار اگر ہے بھی!

یقیں ہے پائیں گے منزل تو آپ بھی آخر
تلاش و کوششِ دیوانہ وار اگر ہے بھی

سید شمیم گوہر

زباں خموش ہی رکھنے میں فائدہ ہے بہت
یہ کیسے کہہ دوں ہر اک شخص کو گلہ ہے بہت

یہ کیسی ترکِ تعلق کی پڑ گئی بنیاد!
تمہاری یاد جب آئی تو دل دکھا ہے بہت

در و دیوارِ خانہ ہر اک سمت کائی سی ہے جمی
اگرچہ کہنے کو باہر سے گھر سجا ہے بہت

ہمارا نام کسی کو بھی اب نہ یاد رہا
ہمارے نام کا سکہ بھی چل چکا ہے بہت

مظاہرہ نہ کرو اتنا پارسائی کا
تمہارے بارے میں ہر شخص جانتا ہے بہت

بوقتِ ترکِ وطن تو کسی نے رخ نہ کیا!
ہمارے نام کو کیوں شہر رو رہا ہے بہت

رونق گیاوی

اک یہ بھی فاصلہ ہے مرے اس کے درمیاں
سر پر الگ ہے یہی ایک آسماں

خوشبو سے میری درد کے مہکے گا رات بھر
پوشیدگی کی خاک میں لپٹا ہوا امکان

دہرائی جا رہی ہیں وہ خونی روایتیں
جلتا ہے جن کے خوف سے احساس کا مکان

احساس کے تمام وہ سوتے بھی خشک ہیں
جس پر لکھی ہوئی تھی سرابوں کی داستان

ہم تو انا کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئے
رونق غرض کی چھاؤں میں وہ ہے لہولہان

ایک ضروری خط

شفا عزیز۔ ٹونک

۱۰ اپریل ۱۹۸۴ء محترمی، السلام مسنون

پرچہ [illegible] کا تازہ شمارہ [illegible] کا مقالہ ہر چند کہ [illegible] شائع ہوا ہے۔ اس میں پروفیسر محمود شیرانی [illegible] کا جائزہ لیا گیا ہے [illegible] مقالہ نگار نے پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کو پاکستانی اسکالر لکھا ہے۔ پروفیسر صاحب کو پاکستانی اسکالر کہنا بہت بڑی ناانصافی ہے اور حقائق و واقعات کے خلاف ہے۔ وہ نہ پاکستانی تھے نہ پاکستانی اسکالر۔ وہ تو خالص ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی ہی کیا بلکہ راجستھانی اور اس سے بڑھ کر خاص ٹونکی۔ راجستھان کی خاک سے پیدا ہوئے [illegible] اور اسی کی خاک میں دفن ہوئے۔ لاہور میں ان کی سکونت بسلسلۂ ملازمت تھی اور جب ملازمت ختم ہوئی وہ عزت و احترام کے ساتھ پنشن پاکر ریٹائر ہوئے تو انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام [illegible] ٹونک میں آرام و سکون سے بسر کیے اور یہاں ہی اپنی جان [illegible] کے سپرد کی۔ اس وقت نہ تو ہندوستان آزاد ہوا تھا اور نہ پاکستان عالم وجود میں آیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو ہوا تھا ——

ڈاکٹر [illegible] صاحب جیسے فاضل محقق [illegible] سے یہ اہم تاریخی فروگذاشت نہ صرف [illegible] پروفیسر محمود شیرانی اور ان کے لائق فرزند شاعر و ادیب حضرت اختر شیرانی سے آپ خود مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس موقع پر ان کے مختصر حالات درج کروں کیونکہ [illegible] کے باعث نئی نسل کی نگاہوں سے ان کے حالات اور علمی و تحقیقی کارنامے اوجھل ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پروفیسر محمود شیرانی اپنے علمی و تحقیقی کمالات، ادبی [illegible] و تنقیدی خدمات کے باعث ہمارے علم و تحقیق [illegible] کا [illegible] تسلیم کیا گیا ہے [illegible] نظر [illegible]

تحقیق کو پختہ ثابت کر کے رکھ دیا ہے۔

انھیں تاریخ و تنقید ادب سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی دقتِ نظر، تحقیق و تفحص سے جو تحقیقات پیش کی ہیں ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ ان کا سب سے پہلا تاریخی اور تنقیدی سلسلہ کا مضمون علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف شعر العجم کی تنقید ہے۔ یہ مضمون رسالہ اردو میں ۱۹۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا تھا اور کئی سال تک برابر نکلتا رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی اشاعت نے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

"تنقید شعر العجم" کے علاوہ ان کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب "پنجاب میں اردو" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر پنجاب یونیورسٹی سے پانچ ہزار روپے کا گرانقدر انعام بھی عطا ہوا تھا۔ ان کی ایک مفید خدمت "[illegible] قدرت اللہ قاسم" کے تذکرے شعرائے اردو "مجموعۂ نغز" کی تصحیح و اشاعت ہے جس کو مرحوم نے بڑی محنت و جانفشانی سے ایڈٹ کیا تھا اور پہلی مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے چھپا تھا۔ وہ مورخ، نقاد اور محقق ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ "شیر دکن" ان کی بڑی مشہور نظم ہے۔ جو سلطان ٹیپو کا پُر درد مرثیہ بھی ہے۔ اور وطن کے بارے میں درد مند جذبات کا ترجمان بھی!

ان کے بزرگ "کھانو" ضلع ناگور کے رہنے والے تھے، ان کے والد محمد اسماعیل خاں نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کے عہد میں ٹونک آئے تھے اور یہاں توطن اختیار کر لیا تھا۔

محمود شیرانی مرحوم نواب ابراہیم علی خاں کے عہدِ سرپرستی میں ۱۸۸۰ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ یہاں پلے بڑھے۔ دستور قدیم کے مطابق تعلیم کا ابتدائی مرحلہ گھر ہی پر طے کیں، گھر کا ماحول مذہبی اور دینی تھا۔ سب سے پہلے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی اور اردو فارسی کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور چلے گئے۔ وہاں اس وقت ٹونک کے نامور عالم مولانا مفتی عبداللہ مرحوم اورینٹل کالج میں تھے۔ ان کے توسط سے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوگئے اور منشی فاضل کا امتحان اعلیٰ درجہ میں پاس کیا۔



مگر اس تعلیم سے سیری نہیں ہوئی، انتہائی مدارج تعلیم حاصل کرنے کی دھن سوار تھی۔ شوق اور ولولے کے جذبات میں رفتہ رفتہ ایک ایسی ہلچل پیدا ہوئی کہ ہندوستان سے باہر جانے اور تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ خوش حال گھرانے کے ہونہار فرد تھے۔ والد کا سایۂ عاطفت سر پر تھا ان کی بھی خواہش تھی کہ بیٹا اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ محبتِ پدری اگرچہ مانع آئی لیکن ہونہار فرزند کے ذوقِ علم اور شوقِ ترقی کو دیکھ کر اور پیشانیٔ محمود میں ستارۂ بلندی کی چمک کا مشاہدہ کرکے کلیجہ پر صبر کی سِل رکھی اور اللہ کا نام لیکر سات سمندر پار اپنے ۲۲ سالہ لختِ جگر کو انگلستان روانہ کر دیا۔

انگلستان میں پروفیسر صاحب نے اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی انہماک اور سرگرمی سے کام کیا۔ حسنِ اتفاق سے وہاں علامہ اقبال، سر عبداللہ اور مسٹر آصف علی جیسے مشاہیر کی رفاقت میسر آئی۔

پروفیسر صاحب نے تقریباً آٹھ سال اپنے وطن سے دور گزارے ۱۹۱۴ء سے کچھ پہلے وہ چند مجبوریوں اور ضرورتوں کے باعث ہندوستان رہے اور جنگِ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے پھر نہ جا سکے۔

۱۹۲۱ء تک پروفیسر صاحب ٹونک میں رہے، اور اس کے بعد یہ اہل وعیال کو ساتھ لے کر لاہور چلے گئے، اور وہاں جا کر اسلامیہ کالج اور اورنٹیل کالج میں یکے بعد دیگرے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں انھوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ پنجاب میں اپنا لوہا منوا لیا۔

۱۹۴۰ء تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے اس کے بعد وہ اپنی زندگی کا آخری حصہ راحت و آرام اور سکون و اطمینان سے گذارنے کے لئے اپنے مولد و وطن اصلی ٹونک آ گئے۔

اور فروری ۱۹۴۶ء تک مطالعہ کتب، و تحقیق و تنقید کے مشاغل سے دلچسپی لیتے رہے۔

۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک کی اس قابلِ فخر، ادب پرور اور فاضل ہستی نے انتقال کیا، انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کو ان کے لگائے ہوئے باغ میں جو شہر سے ۲ میل دور بیناس ندی کے کنارے پر واقع تھا، سپرد خاک کر دیا گیا۔ چنانچہ آج وہ اسی باغ میں آسودۂ خواب ہیں۔

سید منظور الحسن برکاتی۔

سُویم پرکاش

ترجمہ: سیّد محمود نقوی (دہلی)

چین پور کے راستے پر

گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے، پولیس کی وردی پہنے،
سر پر سفید ٹوپی لگائے ایک موٹی توند والا آدمی بنچ کے درمیان
اپنی لاٹھی پر ہتھیلیاں اور ٹھوڑی ٹکائے اونگھ رہا ہے، بڑی
بڑی مونچھیں، پیروں میں ناگرے کی چپلیں، بغل میں ایک کیمرہ
اور ایک تھیلا، ٹوپی ناک کے نیچے تک ڈھلک آئی ہے اس لئے
ٹوپی اور مونچھوں کے علاوہ چہرے پر کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔
اس کے علاوہ سارے پنچ پر اندھیرا ہے۔ ایک عام آدمی آتا ہے۔

عام آدمی: (پولیس کو دیکھ کر، نرمی سے) بھائی صاحب! (پولیس والا
نہیں سنتا، اُس کا ہاتھ ہلا کر) بھائی صاحب! (پولیس والا
نہیں سنتا، اِدھر اُدھر دیکھ کر پولیس والے کا ہاتھ زور
سے ہلا کر) بھائی صاحب! (پولیس والا نہیں سنتا،
عام آدمی اُس کی ٹوپی ہٹاتا ہے، سفید ٹوپی کے نیچے
کالی ٹوپی نکلتی ہے، آدمی سفید ٹوپی سے پسینہ
پونچھتا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کالی ٹوپی ہٹاتا ہے،
زرد ٹوپی نکلتی ہے، زرد ٹوپی ہٹاتا ہے تو بالکل
چکنی کھوپڑی نکلتی ہے، زور سے کندھا ہلا کر
بھائی صاحب!

(پولیس والا چونکتا ہے، لاٹھی چھوٹ کر عام آدمی پر گرتی
ہے، وہ چھٹ سہلاتا ہوا بیٹھ جاتا ہے)

پولیس والا: (ڈانٹتے ہوئے) کون ہے؟ کیا بات ہے؟
اے مسٹر! کون ہو تم؟ یہاں کیا کرتا ہے؟ سالا،
مار مار کے گھٹا نکال دینگا۔ سرکاری آدمی کی نیند
ڈسٹرب کرتا ہے [illegible] بھر کے
[illegible]

ہماری کھڑی لیکر بھاگتا ہے، کھڑی لیکر بھاگنے کا نتیجہ
معلوم ہے؟ اے؟ نام بول! (چیخ کر) نام بول۔
اُلّو چند!

عام آدمی: آ... آ...

پولیس والا: (قریب جاکر) نام بول، تیرا نام کیا ہے؟

عام آدمی: رام بھروسے

پولیس والا: باپ کا نام؟

عام آدمی: بھگوان بھروسے۔

پولیس والا: باپ کے باپ کا نام؟

عام آدمی: گھنشیام بھروسے

پولیس والا: رہنے والا

عام آدمی: نظام بھروسے

پولیس والا: (ڈنڈا صاف کرکے، دوسری طرف ناک چھنک کر
نیکر سے پونچھتے ہوئے) سالا سب بھروسے ہی بھروسے
(گھور کر) اِدھر کیا کرتا تھا؟

عام آدمی: (کھڑے ہو کر ڈرتے ہوئے) آپ سے ایک بات
پوچھنی تھی۔

پولیس والا: ہم سے؟

عام آدمی: جی آپ سے۔

پولیس والا: کیا بات پوچھنی تھی؟

عام آدمی: یہاں کہیں پانی ملے گا، پینے کا پانی؟

پولیس والا: (زرد ٹوپی پہن کر) یہاں سب کو کسی نہ کسی چیز کی
تلاش ہے۔ لیکن یہاں کچھ نہیں ملے گا، اِدھر کچھ نہیں ہے
سمجھے؟ اوپر والے کے پاس جاؤ۔

عام آدمی: (رقت سے کیسے) مجھ کو شوکو رہا ہے، بڑی زور کی پیاس لگی ہے۔

پولیس والا: (کان والی ٹوپی پہن کر، لہجہ بدل کر) کس قسم کی پیاس؟ ہندو یا مسلم پیاس؟ اس سلسلے میں ہماری فوج تمہارے نسلی کردار، خاندان خون اور خاص کر تمہارے مذہب پر منحصر ہے، (دھمکاتے ہوئے) ورنہ ہم کٹ مریں گے، ختم ہو جائے ساری کائنات.... زمین اور آسمان۔

عام آدمی: بھائی صاحب! پلیز... (غصے آنے کو ہوتی ہے، بیٹھ جاتا ہے)

پولیس والا: (گھور کر) کیا ہو گیا؟ سالا!

عام آدمی: پ۔ پ۔ پ۔ پانی۔

پولیس والا: (سفید ٹوپی پہن کر، پیار سے) کیا ہو گیا رام بھروسے ناراض ہو؟

عام آدمی: پانی۔

پولیس والا: ضرور ملے گا پانی، بس۔ ابھی۔ تھوڑا صبر کرو۔ ابھی ملے گا پانی۔ بہت کنوئیں کھد رہے ہیں، جگہ جگہ ٹیوب ویل لگوائے جا رہے ہیں، کئی جگہ نہریں بنوائی جا رہی ہیں۔ غیر ملکوں سے بھی پانی درآمد کرنے کے منصوبے پر غور کیا جا رہا ہے، تم صبر رکھو، ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگلے پنج سالہ منصوبے کے آخر تک تمہیں پانی ضرور مل جائے گا۔

عام آدمی: آہ...

پولیس والا: (اوپر دیکھ کر) وہ تو اس سال وقت پر بارش نہیں ہو رہی ہے ورنہ تمہیں ہم برسات میں کھڑا کر دیتے۔ کھڑا کیا کر دیتے۔ پانی تمہارے گھر میں گھس آتا۔ ویسے بھی تمہارے گھر پر پکی چھت تو ہوگی نہیں۔

عام آدمی: (ہچکی لیکر) میں.... مر... رہا۔ ہوں۔

پولیس والا: (چونک کر، گھبرا کر) مر رہا ہوں؟ تم سالا مر رہا ہے، تو پہلے کیوں نہیں بولا اُلو چند؟ کیمرہ نکال کر فوٹو کھینچتا ہے۔ خوش ہو کر) ہاں! شاباش! مرتے ہوئے آدمی کے فوٹو ہم کو بہت اچھے لگتے ہیں۔

عام آدمی: پانی... رحم کیجئے۔

پولیس والا: (جیب سے موٹی فریم کا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھاتا ہے اور جیب سے ڈائری، پنسل نکالتا ہے) ہاں بھائی... دیکھئے آپ سے دو چار سوال پوچھوں گا، آپ جواب دیجئے گا۔ میرا پہلا سوال ہے.... (سوچ کر) موجودہ حالات میں ہماری عظیم تہذیبی روایات... مغرب کی اندھی تقلید کے درمیان ایک طرح کا کینا چاہئے کہ کوئی ٹکراؤ چل رہا ہے، تو آخر کیوں؟ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے... آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

عام آدمی: آ.....ہ!

پولیس والا: (جلدی سے ڈائری میں "آہ" نوٹ کر کے نیچے جھکتا ہے) اچھا یہ بتائیے....

عام آدمی: (ہاتھ اٹھا کر پولیس والے کی گردن میں جھول جاتا ہے۔ پولیس والے کی ڈائری، پنسل، چشمہ، ٹوپی گر جاتی ہے)

پولیس والا: (عام آدمی کو جھٹک کر کھڑے ہوتے ہوئے) ابے سالا! تم لوگ مٹی کے مادھو ہو۔ تم لوگ جیسوں کو جیل میں کھڑا کر کے ایل ایم جی کا فائر کھول دینا چاہئے سالا! (ڈائری اٹھانے جاتا ہے۔ ایک پھٹے حال آدمی آتا ہے عام آدمی نمبر ۲)

نمبر ۲: سنتری جی!

پولیس والا: کون ہے؟

نمبر ۲: ایک چار پانچ سو تھانے والا تا بابو جی، بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔

پولیس والا: بھوک لگ رہی ہے؟ سالا! بھوک لگ رہی ہے تو [illegible] ؟

[illegible] شرم نہیں آتی!

[illegible]

پولیس والا: بھر؟

نمبر ۲ : بھر بھی جاتی ہے کیا کریں صاحب! بھوک تو روٹی مانگتی ہے۔ شرم سے پیٹ تھوڑی بھرتا ہے!

پولیس والا: چوپ! بھکھاری ایدر شیں۔ ایدر غنڈہ گردی کیا تو حوالات میں بند کر دے گا۔

(ایک آدمی داخل ہوتا ہے۔ پھٹے حال۔ بیمار۔ ٹھٹھرتا ہوا عام آدمی نمبر ۳)

نمبر ۳ : اے بھائی ـــ او بابو جی (بھوک سے) بہت سردی لگ رہی ہے، بخار ہے، کھانسی ہے، چلا نہیں جا رہا، چائے پینی ہے۔ بابو جی! چار آنے دیدو بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔

نمبر ۲ : میں تو خود بھوکا ہوں۔ اس سے مانگ۔

نمبر ۳ : (پولیس والے سے) بابو جی دیا کرو۔

پولیس والا: (چڑھ کر) ابے تم لوگ آدمی ہو کر جانور؟ سالے میرے سے پیسے مانگتے ہو؟ میرے پاس کہاں ہیں پیسے؟ (ایک اندھا داخل ہوتا ہے۔ اسکی لاٹھی پکڑے آگے آگے ایک لڑکا چل رہا ہے)

اندھا : رام جی ... رام جی ـــ (بچے سے) کوئی ہے؟

لڑکا : ہے۔

اندھا : (زور سے) رام جی ـــ بھگوان آپ کا بھلا کریگا کوئی چین پور کا راستہ بتاؤ۔ رام جی۔

پولیس والا: ابے او سالے! سب لوگ ایدر کاہے کو جمع ہوا ہے؟ ابھی بڑا صاحب آئے گا تو ہم کو گالی نکالے گا۔ تم جانتا نہیں یہ سرکاری زمین ہے۔ چلو ـــ راستہ چھوڑو، خالی کرو جگہ۔ نہیں تو ہم لاٹھی چارج کرے گا۔ سالا،

لڑکا : لاٹھی چارج کیسے کرے گا تیرے باپ کا راج ہے؟

پولیس والا: ابے او چھوکرے! تیری زبان بہت کھل رہی ہے سالا! جان پیاری نہیں ہے کیا؟

لڑکا : جان ہے سالا ... کیا کریں؟ راستہ نہیں پوچھیں راستہ پوچھنا کوئی گناہ ہے؟

نمبر ۳ : بابو جی! ایک چائے کے پیسے ....

پولیس والا: (لڑکے سے) گناہ ہے۔ ایک آدمی بھوک سے تڑپ رہا ہے اور تمہیں راستے کی پڑی ہے؟ اسے سنبھالوں کہ تمہاری ہائے ہائے سنوں؟ سالا!

نمبر ۲ : بابو جی بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے ـــ بابو جی چائے کے ....

پولیس والا: ابے ٹھہر جا چائے کی ماں۔ ایک آدمی بھوک کے مارے اپنا دم نکال رہا ہے اور تجھے چائے کی پڑی ہے۔ سالا چھوٹے جائے۔ چائے پینا بڑی بات ہے۔

نمبر ۱ : آہ۔

نمبر ۲ : بابو جی ـــ بھوک کے مارے ....

پولیس والا: کیسا کیسا بھکھڑ آدمی اکٹھا ہو گیا ہے۔ وہ آدمی پانی کے بغیر مرنے کو ہے۔ ادھر تم بھوک بھوک کرتا ہے بھکڑ، نیدہ، منگتا، کبھی دیکھا نہیں کھانا؟

(پولیس والا نمبر ۱ کے پاس جا کر جھکتا ہے)

نمبر ۲ : (پولیس والے کا ہاتھ پکڑ کر) بابو جی ـــ بھوکا۔

پولیس والا: (چیخ کر) ہاتھ لگاتا ہے؟ سرکاری آدمی کو ہاتھ لگاتا ہے؟ سالا! (ایک ڈنڈا جماتا ہے نمبر ۲ کاہن کاہن کرتا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ نمبر ۳ اس سے اظہار ہمدردی کرتا ہے)

پولیس والا: رام بھروسے نرائن ـــ گھبراؤ مت، ہم پانی کے مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ نہیں 'غور' تو ہم پہلے ہی کر رہے تھے اب تو ہم سنجیدگی سے 'غور کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے؟

اندھا : اے بابا کوئی چین پور کا راستہ بتاؤ۔

پولیس والا: (ڈانٹ کر) چپ بے۔ الّو چند۔

لڑکا : (للکار کر) کاہے کو چپ؟ بولے گا۔

پولیس والا: (گھبرا کر) کیا بولے گا؟

لڑکا : راستہ پوچھے گا، تیرے کو بتانا پڑے گا۔

پولیس والا: سالا! چھوٹی سی جان اور اتنی لمبی زبان، یہ کڑکی دیکھی؟

لڑکا : (اپنی لکڑی ہوا میں گھما کر) تو نے یہ لکڑی دیکھی ہے؟

پولیس والا: سالا! تو خشنہ گیری کرے گا؟

لڑکا : خشنہ گیری نہیں، راستہ پوچھے گا۔

پولیس والا: راستہ ہم نہیں بتائے گا۔

لڑکا : بتانا پڑے گا۔ ہم پچیس سال سے راستہ پوچھ رہے ہیں

نمبر۳ : ہم پچیس سال سے دوائی مانگ رہے ہیں۔

نمبر۲ : اے بابا ہم کو پچیس سال سے کھانا نہیں ملا۔

پولیس والا: چپ رہو، خاموش۔ تم لوگ صرف پچیس سال میں گھبرا گیا۔ شرم آنی چاہیئے۔ ذرا اِس کو دیکھو (نمبر۱ کو دکھا کر) اِس کو پچیس سال سے پانی نہیں ملا ہے۔ یہ شور مچاتا ہے؟

لڑکا : کیوں نہیں ملا؟

پولیس والا: ہم کو کیوں پوچھتا ہے سالا؟

لڑکا : تو پھر کس سے پوچھیں؟

نمبر۲ : ہاں۔

نمبر۳ : کس سے پوچھیں؟

پولیس والا: (سوچ کر) تم کو انگریزی آتی ہے؟

(سب نفی میں گردن ہلاتے ہیں)

پولیس والا: (تعجب، افسوس اور حقارت سے) انگریزی نہیں آتی؟ ابے سالا تم لوگ اتنا بڑا ہو گیا تم کو انگریزی نہیں آتی؟

لڑکا : ہندی تو آتی ہے۔

پولیس والا: ابے سالا انگریزی آنا چاہیئے۔ تو، اپنا باپ ہندی ہندی نہیں سمجھتا۔ سالا ہم کو پچیس سال سے بھر پیٹ دارو نہیں ملا، مگر ہم کو انگریزی نہیں آتی، اس لئے کچھ بول نہیں سکتا۔

(پس منظر میں ڈنکوں کی آواز۔ سب چونک کر دیکھتے ہیں)

ایک آواز: باادب با ملاحظہ، ہوشیار ۔۔

پولیس والا: (ایک دم اچھل کر، جیسے کرنٹ لگ گیا ہے) اپنا بتا اپنا بتا آتا ہے، تم لوگ لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔ لے۔ کوئی پوچھے تو بولنا ۔ پولیس بابا بہت اچھا آدمی ہے۔ کیا اے اندھا بھائی۔ اے بھوکا بھائی آ۔ پیاسے بھوکا بھائی ۔ اے سالا رام بھروسے سب بولنا ہم بہت اچھا آدمی ہے۔ کیا بولے گے؟ دیکھو ہم تم سے اتنی دیر تک کتنا میٹھا میٹھا بات کیا نہیں کیا؟ تم لوگ کو سب ملے گا، پر ہم کو اچھا آدمی بولنا۔ کیا؟

لڑکا : ہم نہیں بولے گا۔ ہم تم کو اچھا آدمی کبھی نہیں بولے گا۔

پولیس والا: ابے سالا ہم تم کو جان سے مار ڈالے گا۔ ابھی سیدھا کھڑا ہو جاؤ سب۔ (پولیس اٹینشن میں کھڑا ہو کر بائیں طرف دیکھنے لگتا ہے۔ سب دیکھنے لگتے ہیں۔ پولیس والا جھک کر جھانکنے لگتا ہے۔ سب جھانکنے لگتے ہیں۔ پولیس والا آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ لگاتا ہے۔ اچانک پولیس والا راحت کی سانس لیتا ہے اور پیچھے مڑ کر ہنسنے لگتا ہے۔ سب تعجب سے اُسے دیکھنے لگتے ہیں)

پولیس والا: ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ سالا ۔ اپنا بتا جی نہیں آیا۔ پانچ سال بعد آئے گا۔ پانچ سال بعد بھی نہیں آئے گا۔ اب بولو! (لڑکے کے پاس جا کر) ہم کو خراب آدمی بولے گا؟ لے (ایک لاٹھی مارتا ہے۔ لڑکا گر پڑتا ہے) اندھا سالا۔ تیرے کو راستہ چاہیئے؟ (اندھا چلپٹا کر گر جاتا ہے۔ بھوکے سے) تیرے کو کھانا چاہیئے؟ لے! (لاٹھی مارتا ہے، بھوکا گر جاتا۔ اور کیوں بے تیرے کو دوائی چاہیئے؟ چاہیئے سیئے گا؟ لے دوائی، لے چاہیئے۔ (وہ لاٹھی مارتا ہے اور وہ بھی گر پڑتا ہے) اور تو مجھے گندا! تو تو مرا ہوا ہے ہا... ہا... ہا... پھر منحلال کر ہنستے ہوئے سب کو کھینچتا ہے پھر نمبر۱ کی مینڈھ پر کھڑا ہو کر ناچنے لگتا ہے اور جیب سے ایک بوتل نکال کر پیتا ہے [illegible] لگاتا ہے) تمام لوگ [illegible] کا ہاتھ پکڑ کر [illegible] رہے ہیں)

لطیف افسانہ سالگرہ صفحہ ۳۴۴

"دیکھئے یہ غلط نمبر ہے۔ اس بار مسٹر گھنہ قدرے درشتگی سے بولا۔
"آپ ڈائریکٹری سے پتہ کرکے صحیح نمبر ملایئے۔"
ریسیور نیچے رکھ کر وہ شکایتاً بولا۔ "مسز ناگیندو نے بہت
تنگ کیا ہے۔" مسز گھنہ نے بے توجہی سے سر ہلا دیا۔
چینی کی ٹالی کھانے کی میز کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گھنہ
ترا شے دے کر چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ وقتاً فوقتاً
اپنے پیالے کو ہلاتے جاتے تھے تاکہ چینی اچھی طرح گھل جائے۔
یہ اُن کی پرانی عادت تھی۔ اُن کے ماتھے کی نس نمایاں طور پر اُبھری
ہوئی تھی۔ اگرچہ صبح بینی ٹو پر جانے سے پہلے انھوں نے شیو کی تھی لیکن
داڑھی پھر بھی کافی بڑھ آئی تھی۔ مسز گھنہ نے دوسرے دور کے لئے
چائے بنانی شروع کی تو گھنہ صاحب نے عینک لگا کر سامنے کے
شیلف پر رکھی ہوئی کتابوں کے مصنفوں کے نام پڑھنا شروع کر دیئے۔
حالی۔ حکیم۔ غالب۔ نہرو۔ ٹالسٹائے ۔ ۔ ۔
ابھی وہ لینن تک ہی پہنچے تھے کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔
اس بار وقفہ کافی کم ہو گیا تھا۔

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تجزیے

از ــــــــــ ڈاکٹر گیان چند

یہ ڈاکٹر گیان چند کے ۱۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو سال گزشتہ شائع ہوا تھا۔ اس سے ان کی تحقیقی، ادبی، تنقیدی اور علمی و فنی کاوشوں کے مجموعی مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک محقق کی حیثیت سے ابھرے تھے، لیکن چند ہی سال میں انھوں نے مختلف علمی، ادبی اور فنی موضوعات پر متنوع مضامین لکھ کر اپنے ذہن و فکر کی وسعتوں سے علمی و ادبی حلقوں کو معترف بنا لیا۔ اُردو ادیبوں میں ان کی حیثیت کافی نمایاں ہے۔ وہ بیک وقت محقق، نقاد اور عروضی ہیں۔ ایک تجربہ کار اور اچھے استاد کی حیثیت سے تدریسی مسائل پر اُن کی نظر گہری ہے۔

گزشتہ چار سال میں ڈاکٹر گیان چند نے غالب پر بڑی تعداد میں مضامین لکھے ہیں اور ان کا نام غالب شناسوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے غالب کے مشکل اور کچھ اہل علم کے نزدیک، بعض مہمل اشعار کی شرح لکھی ہے۔ اس طرح غالب کے محقق اور نقاد کے علاوہ اس کے شارحین میں بھی اُن کا شمار ہوتا ہے۔ بڑی موشگافیاں کی ہیں انھوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح میں۔ بعض عروضی اور علمی و فنی مسائل پر اُن کے خیالات چونکا دینے والے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا ایک مضمون "یائے اضافت اور ہمزہ" رسالہ "ہندوستانی زبان" بمبئی میں نظر سے گزرا۔ اُن کے مضامین کے اس مجموعہ میں بھی اس نوع کے بعض مضامین ہیں۔ "عظمت اللہ خاں کے عروضی اجتہادات" اور "اُردو عروض کی تشکیل جدید" پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اُن کے نظریات و خیالات غیر تقلیدی ہیں اور وہ بعض علمی و فنی عروض میں اجتہاد چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ جذبہ قابل قدر ہے اور لائق فخر بھی۔ اُردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اسے دنیا کی بڑی زبانوں کے قریب لانے کے لئے املا، قواعد، عروض اور دیگر فنی امور میں تجدید کی سخت ضرورت ہے۔

"تجزیے" میں ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ سات تحقیق کے تحت ہیں اور بارہ ادبی و تنقیدی۔ تحقیق کے مسائل، اُردو اساتذہ کے مسائل، ہندوستان میں اُردو تحقیق کی رفتار اور کلاسیکی متون کی ترتیب انجمن اساتذۂ اُردو کی مختلف کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ نقل کی کرپال کتھا اور عروض پر دو مضامین جن کا ذکر سطور بالا میں آیا ہے، کچھ تحقیقی اور فنی انداز کے ہیں۔ "عظمت اللہ کے عروضی اجتہادات" اس کتاب کا سب سے مبسوط اور نہایت دلچسپ مضمون ہے۔ بعض وہ مضامین جو ریڈیو کے لئے لکھے گئے، سرسری ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ بعض دوسرے محققین کی طرح اُن کی تحریروں میں یبوست نہیں ہوتی۔ اہل علم کو ان مضامین میں کہیں کہیں اختلافی پہلو مل سکتے ہیں اور علمی، فنی، ادبی مباحث میں مسلمات سے قطع نظر اختلاف کی گنجائش ہوتی ہی ہے۔ یہ اپنے اپنے ذہن و فکر کی بات ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں، اہم پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہیں اور ایک طرح کی کشادہ دلی و بے باکی سے کام لیتے ہیں۔ تحقیق تو اُن کا اصل میدان اور میلان ہے ہی، اور اس میں اُن کی حیثیت رہنمایانہ ہے۔ تحقیقی مضامین سے ہٹ کر علمی و ادبی مضامین میں ایک طرح کی ذہنی کشادگی پائی جاتی ہے۔

۲۷۲ صفحات۔ بڑی تقطیع۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت گیارہ روپئے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

لالہ زار

از ــــــــــ [illegible]

[illegible] سال میں انھوں نے [illegible] کرتی ہے کہ [illegible] اُن کا [illegible] شائع [illegible] ہے یہ

کتاب میں گفتگو یہ تھا وہ جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے ایک ایسی تنظیم و ترتیب کے ساتھ صنفِ طنز و مزاح میں کام کیا ہے جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ ہمارے مزاح نگاروں نے صرف مضامین لکھے ہیں۔ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے لطیفوں اور لطیفہ گوئی کو شرافت و طہارت بخشی اور طنز و مزاح میں انھیں ایک ایسا مقام دلانے کی مستحسن سعی کی جو اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی۔ "قہقہہ زار" لطائف و ظرائف پر مشتمل تھی اور اس کے بعد "شگوفہ زار" صنفِ مزاح پر اُن کی نہایت قابلِ قدر علمی و تحقیقی کاوش تھی جس کی داد انھیں ہر طرف سے ملی اور یہ اعتراف کیا گیا کہ طنز و مزاح پر اُردو میں اب تک ایسا تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔

"لالہ زار" خواجہ عبدالغفور کے ۲۲ مضامین کا مجموعہ ہے ان میں سے کچھ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، کچھ ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ [illegible] نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"جب آپ یہ مضامین پڑھیں گے تو ان کے ظاہری مزاحیہ لباس کے اندر سے ایک نہایت سنجیدہ شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آئے گی، لیکن جب آپ اس کو آداب عرض خواجہ صاحب کہہ کر مخاطب کرنا چاہیں گے تو وہ پھر مزاح کے پردوں میں جا چھپے گی اور آپ کا شوقِ ملاقات اور بڑھ جائے گا۔"

دراصل غفور صاحب اُن مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کا قلم مزاح کی سطح پر نہیں چلتا اور جو محض الفاظ اور فقروں سے مسکراہٹ کا سامان بہم نہیں پہنچاتے۔ اُن کے طنز و مزاح کی تہیں گہری ہوتی ہیں اور اس گہرائی کو پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے وسیع علم و مطالعہ اور تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ خیالات میں گیرائی اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ارادی طور پر کسی کو ہنسانا نہیں چاہتے۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا نہیں چاہتے۔ صرف شگفتہ نثر میں لطیفانہ طور پر ایسی باتیں پیش کر دیتے ہیں جو قاری کو متبسم کر دیں لیکن خیالات اور ان باتوں کا کچھ حاصل ہو۔ [illegible] انھیں پسند نہیں۔

کتاب [illegible] ہے۔ ۱۸۲ صفحات۔ قیمت پانچ روپیے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ [illegible] پوسٹ بکس ۱۴۳۱ بمبئی ۸ اور مکتبہ جامعہ [illegible] دہلی ۶

جہاں آرا

از ——— رفعت سروش

رفعت سروش اُردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ اُن کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ اُردو شاعری میں اُن کا اپنا ایک انداز اور اپنا رنگ ہے۔ سالہا سال سے رفعت سروش آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں اور ریڈیو کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے مختلف موضوعات پر جو مضامین، فیچرز، طویل نظمیں اور منظوم ڈرامے لکھے ہیں اُن میں سے بیشتر معیار کے اعتبار سے قابلِ ستائش ہیں۔

"جہاں آرا" تین ایکٹ کا طویل "اوپیرا" ہے۔ یہ رفعت سروش کی منظوم تحریروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ شاہجہاں کی چہیتی بیٹی شہزادی جہاں آرا ہندوستانی تاریخ میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ اُس کے حسن و سیرت، علم دوستی، تدبّر و تعقل، نیکی و شرافت اور ایثار و قربانی سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں۔ ہندوستانی مورخین کے علاوہ چند بیرونی مورخین نے بھی جہاں آرا کی دانشمندی، روشن دماغی، اعلیٰ ظرفی، نفاست و نزاکت، سخاوت اور علمی موضوعوں کی بڑی تعریف کی ہے وہ نہایت عاقلہ و فاضلہ تھی۔ اُسے اُمورِ سلطنت میں بھی دخل تھا۔ شاہجہاں کے بیٹوں دارا شکوہ اورنگ زیب اور مُراد کی رسّہ کشی، رقابت نیز شاہجہاں کی اسیری کے دوران جہاں آرا کا کردار بے مثال اور مغلیہ تاریخ کا نمایاں باب ہے۔

جہاں آرا کی زندگی کی کہانی بڑی طویل اور المناک ہے۔ سب کچھ ہوتے بھی اُسے بہت درد و غم سہنے پڑے تھے۔ اور بالآخر اُس نے اپنی روح کے سکون کے لئے تصوّف کا سہارا لیا تھا۔ عبادت اور اپنے پیر و مُرشد مُلّا شاہ قادری سے دل لگا لیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانوں سے لَو لگا لی تھی۔

رفعت سروش نے شہزادی جہاں آرا کی زندگی کے کچھ اہم واقعات کو کہانی کی طرح ایک لڑی میں پرو کر "اوپیرا" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ منظوم ڈرامے کی روایت تو بہت پرانی ہے لیکن منظوم ڈرامے صرف کرداروں کی بات کو سیدھے سادے انداز میں ڈھال دینے کی حد تک ہوتے تھے۔ ردیف اور قافیوں سے جُڑے ہوئے یہ منظوم مکالمے بڑی حد تک تاثیر سے خالی نظر آتے ہیں۔ "اوپیرا" منظوم کا تشکیلہ

شاعری کی مقبول صنف ہے۔ اس میں شعر و نغمہ کا امتزاج ہوتا ہے۔ منظوما کاری کی اس فضا کو نغمہ ریز الفاظ سے اُبھارا جاتا ہے۔

"جہاں آرا" کا طویل مقدمہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ اس میں جہاں آرا کی شخصیت، اُس کی تاریخی حیثیت اور مؤرخین کے خیالات کے ساتھ ساتھ "اوپیرا" سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے رفعت سروش کی اس کاوش کا نہایت تفصیل سے علمی و فنی جائزہ لیا ہے۔ اس کی خوبیوں کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ اُن کی فاضلانہ تحریر کا ایک چھوٹا سا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

> ہر زبان میں شاعری کی بنیاد کسی نہ کسی طرح کی نغمگی، آہنگ یا موسیقیت پر ملے گی، لیکن مغربی زبانوں میں شعر کی موسیقیت کا ڈھانچہ اتنا کسا ہوا نہیں، جتنا مشرقی زبانوں میں ہے۔ اُردو شاعری میں نغمگی کا احساس کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ اجتماعی جھنکار نہ سہی، شعر کی اپنی موسیقیت اور اندرونی نغمگی سنگیت کیساتھ مل کر وہ جادو جگا سکتی ہے کہ باید و شاید۔
>
> رفعت سروش کا زیر نظر "اوپیرا" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں جگہ جگہ شعر کی اپنی نغمگی کو اُبھر کر سامنے آنے کا موقع دیا گیا ہے اور شعر کی موسیقیت کے امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔
>
> شاعر کے ذہن نے کہیں پر پہلے سے یہ طے نہیں کیا کہ فلاں موقع پر فلاں بحر یا فلاں فارم اختیار کیا جائے۔ بلکہ وہ پورے "اوپیرا" کا تصور ایک مجموعی اور تاثری کل کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس میں سے نغمگی کی جو زیر و بم ہر ہر موقع و مقام کی رعایت سے خود بخود نکلتی ہیں، انھیں سامنے آنے دیتا ہے۔"

یہی رفعت سروش کے "اوپیرا" جہاں آرا کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ بحروں کے تنوع سے اس اوپیرا میں بڑی نغمگی پیدا کر دی ہے۔ واقعات کی نوعیت کے اعتبار سے انھوں نے ایسے لفظوں کا استعمال کیا ہے، جن سے مصرعے ذیادہ سے موسیقی آمیز معلوم ہوتے ہیں۔ ہر مکالمہ کے لئے بحر الگ ہے اور مکالمہ کے دوران بحر کو بدلا نہیں ہے، ہاں امکان بحر کی کمی بیشی سے مکالمہ میں حسن و اثر پیدا کیا ہے۔

شہزادی، شہنشاہ کی ملاقات سے واپس آ رہی تھی کہ اس کا آنچل راستے میں روشنی کے لئے رکھے ہوئے چراغ کی زد میں آ گیا۔ شہزادی کا لباس جو نہایت باریک ململ کا تھا اور جس میں جہانگیری عطریات اور خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں، آن کی آن میں بھڑک اٹھا۔ خادماؤں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر آگ بجھانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ شہزادی حرم کو بھاگتے ہوئے اپنی چیخوں کو روکے رہی کہ مبادا کوئی مرد آگ بجھانے کے لئے آ جائے اور نامحرم کا ہاتھ اسکے بدن پر پڑے۔ اس واقعہ کی "اوپیرا" میں اس طرح منظر کشی کی گئی

مہ لقا:۔	قیامت قیامت! غضب ہو گیا
روشن آرا:۔	ہوا کیا؟
	بتاؤ تو کچھ مہ لقا
مہ لقا:۔	جیسے پہنچیں شمع کے نزدیک بیگم صاحبہ اُس کی لَو نے صورتِ پروانہ بڑھ کر۔۔۔
روشن آرا:۔	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا کیا؟
مہ لقا:۔	عطر میں بھیگے ہوئے آنچل کو اک بوسہ دیا
سب کنیزیں:۔	یا خدا۔!
مہ لقا:۔	آگ ذوق و شوق میں ہر چہار سو بڑھتی گئی پہلے آنچل پھر لباسِ ناز کی جانب بڑھی

"جہاں آرا" دہلی ٹیلی ویژن کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور چند دیگر مقامات پر کئی ہفتے کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے کتابی شکل میں بھی یہ پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے لائق ہے کتابت طباعت نفیس۔ بڑی تقطیع ۱۲۷ صفحات۔ قیمت [illegible]

[illegible] ۲۶

محفلِ اپنی

یہ عام شمارہ

"قومی یکجہتی نمبر" کے بجائے قارئینِ "شاعر" یہ عام شمارہ پاکر سخت متعجب ہونگے۔ لیکن پچھلے ماہ حالات جس طرح منقلب ہوئے اور اُن کا جو ناگوار اثر "شاعر" کے کاموں پر پڑا اُس کے تعلق سے قارئینِ "شاعر" کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔

اپریل ۱۹۷۴ء کا "شاعر" اپریل ہی میں تیار ہوگیا تھا اور جب ۲۰ اپریل کو اُسے پوسٹ کرنے کی اجازت لی گئی تو پوسٹ آفس نے لینے سے انکار کردیا۔ سوائے سادہ خطوں کے، نہ پیکٹ لئے جارہے تھے نہ پارسل، نہ منی آرڈر اور نہ وی پی۔ پھر ریلوے ہڑتال شروع ہوئی اور اُس نے ایسا طول کھینچا کہ خدا کی پناہ۔ بمبئی میں قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ بمبئی کی پوری زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ فیکٹریوں اور کاروباری اداروں میں حاضریاں نہ ہونے کے برابر۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا ناممکن۔ سیکڑوں کھچا کھچ بھری ٹرکوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لوگ بھرے ہوئے اِدھر سے اُدھر بمشکل آجارہے تھے۔ ڈاک بند، ضروریاتِ زندگی نایاب اور اِتنی گراں کہ خریدنے کی ہمت نہ ہو۔

خدا خدا کرکے ۱۷ اپریل کو اپریل کے شمارہ کے سادہ پیکٹ پوسٹ آفس نے قبول کئے اور پھر ۹ دن کے بعد ایجنٹوں کے پیکٹ، وی پی اور پارسل لئے گئے۔ اِس طرح پورا مہینہ کاروباری تعطّل میں گذر گیا۔ کتابت و طباعت کا کام بھی بند رہا۔ اخباری کاغذ کی ڈلیوری نہ مل سکی۔ اور وہ تمام کام جو ڈاک کے ذریعہ ہونے تھے، نہ ہوسکے۔ بے اندازہ ڈاک غائب ہوئی۔ غرض اِن نقصانات کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا جو ۲۶ اپریل سے آخر مئی تک ہوئے اور ۱۱ جون تک جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں حالات پوری طرح معمول پر نہیں آئے ہیں۔

مئی اور جون ۱۹۷۴ء کے اِس مشترک شمارہ کو بہتر نثر و نظم مواد سے مزیّن کیا گیا ہے۔ "شاعر" کے مواد و معیار کی جو خصوصیات ہیں وہ پوری طرح اِس شمارہ میں نظر آئیں گی۔ مقالات کے علاوہ اِس شمارہ کی کہانیاں اور پیش کردہ ڈراما خاصے کی چیز ہیں۔ اپریل کے شمارہ کے تعلق سے چونکہ خطوط نہیں آئے اِس لئے پچھلے "مکتوبات" کا باب شائع نہیں ہو رہا ہے۔

قومی یکجہتی نمبر اگست میں

اب "قومی یکجہتی نمبر" اگست ۱۹۷۴ء میں شائع ہوسکے گا۔ ہمیں اِس کا احساس ہے کہ اِس اہم ترین قومی دستاویز کا اہلِ ملک کو کئی مہینے سے شدید انتظار ہے۔ لیکن اشارۃً اِس وقت اتنا ہی عرض کردینا کافی ہوگا کہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا، اِس کے لئے ڈیڑھ سال سے مسلسل کام ہو رہے ہیں۔ اُردو رسائل کی تاریخ میں کسی خاص نمبر کے لئے اتنا بڑا منصوبہ کبھی نہ بنتے دیکھا اور سُنا، جتنا بڑا منصوبہ قومی یکجہتی نمبر کا تھا۔ اُردو دنیا کو اِس کا صحیح اندازہ نمبر کو دیکھنے کے بعد ہی ہوسکے گا۔

زرِ سالانہ اور قومی یکجہتی نمبر کی رعایتی قیمت

اپریل کے "شاعر" میں ایک علیحدہ خط کے ذریعہ تمام مستقل خریداروں کو متوجہ کیا گیا تھا کہ جن کا زرِ سالانہ ختم ہوچکا ہے، وہ اپنا زرِ سالانہ مع رعایتی قیمت "قومی یکجہتی نمبر" بھیجدیں۔ اور جن کا سالِ خریداری ختم نہیں ہوا ہے، وہ صرف نمبر کی رعایتی قیمت روانہ کردیں۔ ابھی کئی سو مستقل خریداروں نے توجہ نہیں کی ہے۔ اُمید کہ اب فوری توجہ دی جائے گی۔

محصولِ ڈاک کی شرحوں میں بھیانک اضافہ

ہندوستان کی محصولِ ڈاک کی شرحیں دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہیں اور حالیہ اضافوں نے تو عوام کی کمر اور بھی توڑ کر رکھ دی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ رسائل و اخبارات کی مشکلات اور اُن کے اخراجات میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجا جائے۔

○ چندہ ختم ہونے کی اطلاع

آپ کا سالِ خریداری مئی — جون، کے اس شمارہ کیساتھ ختم ہو رہا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ سال کے لئے -/۱۲ روپئے منی آرڈر کے ذریعہ جلد از جلد بھیج کر ممنون کیجئے۔ امید کہ آپ تجدیدِ خریداری منظور کریں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجدینے کی ہدایت کیجئے۔ تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو ایک خط کے ذریعہ اطلاع دیجئے۔ زرِ سالانہ وصول نہ ہوا تو "شاعر" حاضر نہ ہوسکے گا۔ شکریہ

رفتار

(علمی، ادبی، اور تہذیبی خبریں)

حضرت امیر خسرو کی ۷۰۰ سالہ تقاریب

۱۹۷۵ء کے دوران حضرت امیر خسرو کی ۷۰۰ سالہ تقاریب عظیم الشان پیمانے پر منانا طے پایا ہے۔ اس مقصد کیلئے ایک کل ہند قومی کمیٹی عالی جناب فخرالدین علی احمد کی صدارت میں تشکیل پائی ہے۔

اس سلسلے میں قومی اور بین الاقوامی مذاکرات۔ مشاعرے اور موسیقی کے جلسے منعقد ہوں گے۔ نیز امیر خسرو کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے تحقیقی اور یادگاری کتب مختلف زبانوں میں شائع کی جائیں گی۔ سرکاری اور نیم سرکاری امیر خسرو نمبر نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فلم ڈویژن امیر خسرو پر ایک ڈاکومینٹری فلم بھی تیار کرے گی۔ حکومت اور علمی اداروں کے تعاون سے دیگر تجاویز بھی زیر غور ہیں۔

اس کے علاوہ کمیٹی نے یادگاری کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں نہ صرف امیر خسرو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے گی، بلکہ امیر خسرو سے متعلق اسوقت تک سامنے آئے ہوئے اہم مواد کو بھی شائع کیا جائے گا تاکہ بعد میں طلبہ اور محققین کو سہولت ہو۔

اس ضمن میں اہل قلم حضرات سے تعاون کی گذارش ہے اور اس بکھرے ہوئے سرمائے کی نشاندہی اور انھیں یکجا کرنے میں بھی ہمیں آپ کے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ خط و کتابت کیلئے:

جناب حسن الدین احمد	جناب ظ۔ انصاری
جنرل سکریٹری امیر خسرو تقریبات کمیٹی	جنرل سکریٹری امیر خسرو تقریبات کمیٹی
سی۔ ۳۰۷۔ کرزن روڈ اپارٹمنٹ	۲۲۔ شیریں کولابہ روڈ بمبئی ۵
نئی دہلی نمبر ۱	

اُردو مصنفین ڈائرکٹری کے لئے عطیہ

لکھنؤ:۔ ہماچل پردیش کے وزیر جنگلات جناب لائق رام پرارتھی نے کلچرل اکاڈمی کی طرف سے اُردو مصنفین ڈائرکٹری کی تیاری کیلئے اُردو پراموشن فورم کو پانچ ہزار روپیہ دینے کا اعلان فورم کی ایک نشست میں کیا ہے جس کی صدارت پنجاب اسمبلی کے اسپیکر جناب [illegible] کرشن نے کی تھی۔

مرکزی انجمن ترقی اُردو کے دفاتر دہلی منتقل

حیدرآباد:۔ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند کے بموجب انجمن کے تمام شعبے علی گڑھ سے دہلی منتقل ہو گئے ہیں تمام خط و کتابت جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۶۶۲ کلاں محل دہلی ۶ ۱۱۰۰۰ سے کی جائے۔

مظفر حنفی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

ادبی حلقوں میں یہ خبر خوشی کے ساتھ سنی جائے گی کہ اُردو کے جانے پہچانے شاعر ادیب اور نقاد مظفر حنفی کو اُن کے مقالہ "شاد عارفی: شاعر عارفی فن اور شخصیت" کے عنوان سے لکھے گئے تحقیقی مقالے پر بھوپال یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنا یہ مقالہ پروفیسر [illegible] صدر شعبۂ اُردو سیفیہ کالج بھوپال کی رہنمائی میں تحریر کیا ہے۔

ادبی سنگم کی طرف سے نظموں کے معیاری گیت پر ایوارڈ

ادبی سنگم۔ لچھیا پارک۔ ملاڈ ایسٹ کا جو عظیم الشان سالانہ مشاعرہ جو اس سال مئی کے اواخر میں منعقد ہونے والا تھا کل ہند ریلوے ہڑتال اور مانسون کی بے وقت آمد کی وجہ سے اب اکتوبر کے وسط میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ انعقاد پذیر ہوگا۔

یہ خبر بھی یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ ادبی سنگم کی مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق ہر سال سالانہ مشاعرہ میں نظموں کے بہترین (معیاری) گیت پر اس کے لائق مصنف کو انجمن کی طرف سے ایوارڈ بھی پیش کیا جائے گا۔

شکریۂ تعزیت

مہندر ناتھ کی مرگ ناگہاں پر جن احباب نے تاروں اور خطوں کے ذریعہ تعزیت فرمائی اور ہمارے غم کو اپنا اور ادبی دنیا کا غم سمجھ کر اظہار ہمدردی کیا۔ ہم ان سب کے ممنون ہیں

— کرشن چندر

سلمیٰ صدیقی

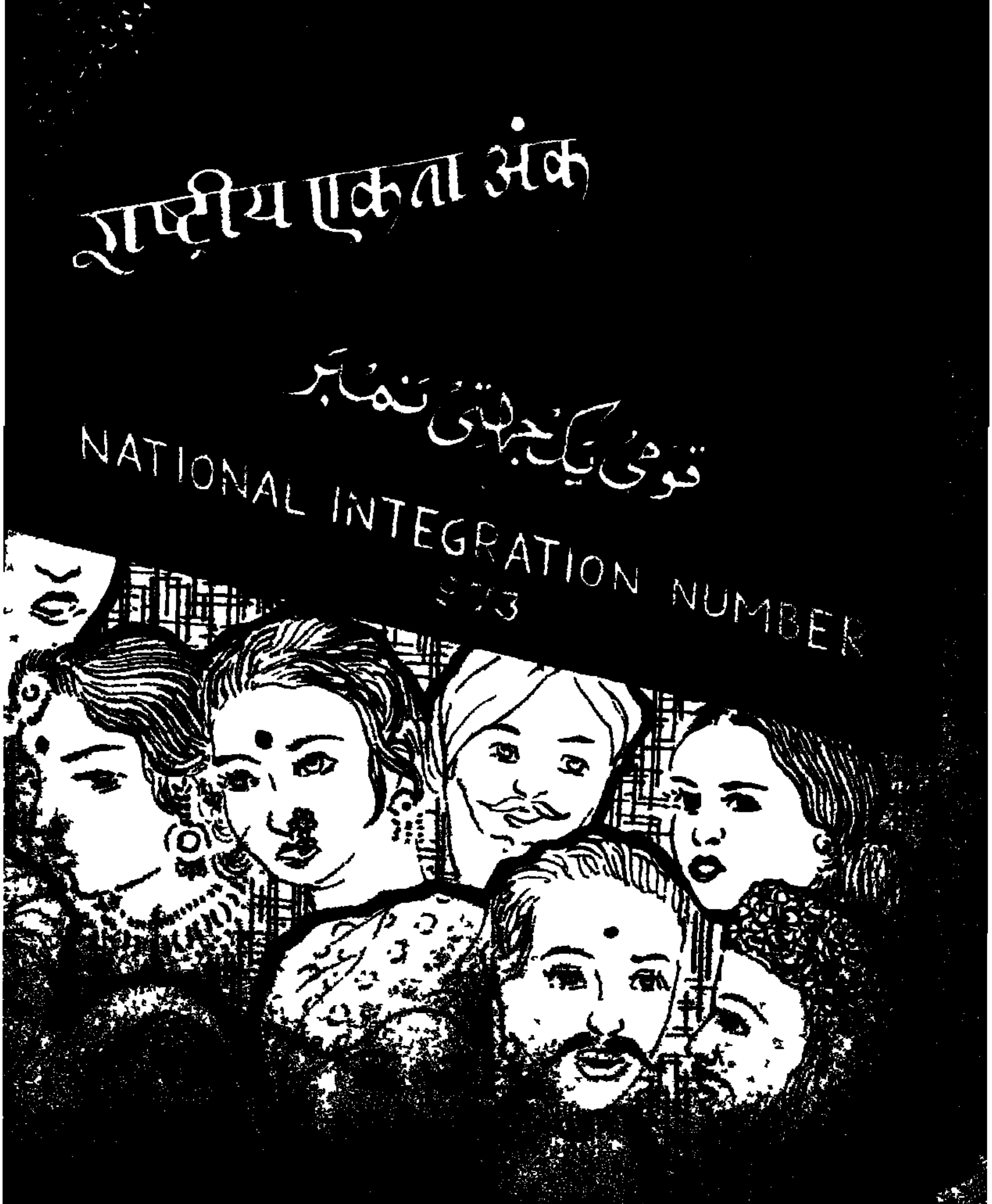
[illegible] مسرور پریس [illegible] کردیں ہے

राष्ट्रीय एकता अंक

قومی یکجہتی نمبر

NATIONAL INTEGRATION NUMBER

1973



جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی۔ علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا پینتالیس ۴۵ سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

ماہنامہ بمبئی

شاعر

جلد ——— ۴۵

شمارہ ——— ۱۰-۱۱

سنہ ۱۹۷۴ء

مدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:

کرشن چندر

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

یونس اگاسکر

مہتمم:

ناظر نعمان صدیقی

اِس شمارے میں

فون نمبر ——— ۳۵۹۹۰۴

فی پرچہ: ایک روپیہ پچھتر پیسے

زرِ سالانہ ——— ۱۵ روپے

معاونین سے ——— ۵۰ روپے

تا عمر خریداری ——— ۲۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے ——— ۳۰ شلنگ

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاعر" قصرالادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصرالادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

میرا تجربہ

والد کی قبل از وقت موت کی وجہ سے میں مجبور ہوگیا کہ کالج کی تعلیم جو میں نے ایف۔ وائی۔ بی۔ اے۔ تک پوری کرلی تھی، ترک کرکے اپنے خاندان کی ذمہ داری سنبھالوں۔ میرے خیال میں ملازمت کی تلاش بے سود تھی، لہٰذا میں نے سوچا کہ پولٹری کا کاروبار شروع کردوں۔ میں نے امداد کیلئے محکمہ صنعت سے رجوع کیا۔ محکمہ نے میرا منصوبہ منظور کرلیا اور میں اپنے بنک سے قرض حاصل کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس طرح اب میں اپنے کاروبار کے ذریعہ ۳۰۰ تا [illegible] روپے ماہانہ کما لیتا ہوں۔

پرتھوی راج گنیش راج پردیسی، [illegible]
پولٹری فارم، [illegible] ضلع [illegible]



ڈائرکٹوریٹ [illegible] گورنمنٹ [illegible] مہاراشٹر، بمبئی، مئی [illegible]

ترتیب

تصویر سرورق: فکر تونسوی

گوشۂ فکر تونسوی

مزاحیہ ڈرامہ

نظمیں

مقالات

کہانیاں

غزلیں

شمارہ: ۱۰-۱۱ سنہ ۱۹۷۴ء

جرعات

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی

کے قیام کی ضرورت

اُردو کو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک زبان مان لیا گیا ہے۔ ہندستان اور پاکستان اس زبان کے سب سے بڑے اور خصوصی مراکز ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے ممالک میں بھی اُردو کم و بیش لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ اعداد و شمار کے اعتبار سے ہندستان میں اُردو والوں کی تعداد کسی طرح پانچ چھ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ گذشتہ دس سال میں اُردو حلقے کافی وسیع ہوئے ہیں۔ تعلیم بڑھی ہے، معیار بلند ہوا ہے۔ رسائل و اخبارات کی تعداد میں اضافے ہوئے ہیں۔ تنقیدی، ادبی، علمی، مذہبی، تاریخی، تحقیقی اور شعری کتابیں بھی پہلے سے زیادہ طبع ہوئی ہیں۔ ہر صوبے میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہندستان کے بے شمار کالجوں میں اُردو بی۔ اے تک پڑھائی جاتی ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں اُردو ایم۔ اے تک کی تعلیم کا خاص انتظام ہے۔ علیٰ قدرِ مذاق تحقیقی کام بھی ہو رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُردو آفسٹ طباعت عام ہو گئی ہے۔ شہروں شہروں آفسٹ پریس لگ چکے ہیں۔ بہت سے اخبارات و رسائل نہایت دیدہ زیب چھپ رہے ہیں۔ کتابیں بھی آفسٹ پر طبع ہونے لگی ہیں۔

چونکہ اُردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے، اس لئے حکومتِ ہند نے مرکز میں ایک ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے، جس کی سرگرمیاں کافی بڑھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی صوبائی حکومتوں نے اُردو اکاڈمیاں قائم کی ہیں اور اُن کے لئے ہر سال ایک بڑی رقم اپنے بجٹ میں رکھتی ہیں۔ سب سے بڑی اکاڈمی اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ہے۔ پھر جموں و کشمیر اکاڈمی۔ صوبۂ بہار اور پنجاب میں بھی اکاڈمیاں قائم ہو چکی ہیں۔ مدھیہ پردیش، راجستھان، کرناٹک، آندھرا پردیش اور بنگال میں بھی اکاڈمیوں کے قیام کے منصوبے بن رہے ہیں۔ ریاستی سطح پر اُردو کے کاموں کو منظم کرنے اور بڑھانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

صوبۂ مہاراشٹر اُردو زبان کے سلسلے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صوبے کی تمام زبانوں میں اعداد و شمار کے اعتبار سے مراٹھی کے بعد اُردو کا دوسرا درجہ ہے۔ پرائمری کی تعلیم سے لے کر ہائر سیکنڈری تک، اور پھر کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اُردو تعلیم کے معقول انتظامات ہیں۔ اس عظیم ریاست سے اُردو کے روزنامے، ہفتہ وار اخبارات اور ماہانہ و دوماہی رسالے بھی اچھی خاصی تعداد میں نکلتے ہیں۔ گذشتہ چند ماہ سے ریڈیو بمبئی سے بیس منٹ کا اُردو پروگرام "بزمِ اُردو" کے نام سے روزانہ ہونے لگا ہے۔ ٹیلی ویژن پر بھی "محفلِ یاراں" اور "بچوں کے لئے گلشن گلشن" دو اُردو پروگرام ہوتے ہیں۔ حکومتِ مہاراشٹر کی طرف سے اُردو میں پندرہ روزہ "قومی راج" نہایت اہتمام سے نکلتا ہے۔ فلم کا سب سے بڑا مرکز بمبئی ہی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کی بڑی تعداد اس صوبے (خصوصاً بمبئی) میں ہے۔ ان میں وہ چوٹی کے ادیب و شاعر بھی ہیں، جو اُردو شعر و ادب کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ صوبۂ مہاراشٹر کے اُردو ادیب، شاعر اور مصنفین اُن تمام اعانتوں سے محروم ہیں جو مرکزی حکومت کی طرف سے دی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے اُن کے صوبوں کے اُردو قلم کاروں کو ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹر میں تصنیف و تالیف اور نظم و نثر کتابوں کی رفتارِ طباعت بہت سست ہے۔ اُردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے اقتصادی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ہمارے اس بڑے صوبے میں اُردو لائبریریوں کی بہت کمی ہے۔ ان حالات میں بڑی ضرورت ہے کہ

بمبئی میں "مہاراشٹر اُردو اکاڈمی" قائم ہو

ہم جناب نواب علی یاور جنگ، گورنر مہاراشٹر، جناب وی۔ پی۔ نائک، منسٹر اعلیٰ مہاراشٹر، جناب ڈاکٹر رفیق زکریا، منسٹر شہری ترقیات، نیز ٹاؤن شپ اور اوقاف، جناب ایس۔ جی۔ پولد، منسٹر تعلیمات، جناب رجنی پٹیل، صدر پردیش کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد "مہاراشٹر اُردو اکاڈمی" کے قیام پر توجہ فرمائیں۔

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، مولانا شہاب مالیر کوٹلوی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، خواجہ عبدالغفور، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، سلمیٰ صدیقی، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، باقر مہدی، یوسف ناظم، فضیل جعفری، حسن کمال، بمبئی اور صوبے کے دوسرے شہروں کے ادیبوں، شاعروں، نیز انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مہاتما گاندھی اُردو ریسرچ سینٹر، انجمن خیر الاسلام کے علاوہ تمام اُردو روزناموں، ہفتہ وار اخبارات اور رسالوں کے مدیروں سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ "مہاراشٹر اُردو اکاڈمی" کے قیام کے سوال کو متحدہ طور پر اٹھائیں۔

سردار جعفری

○

سرد ہیں دل، آتشِ روئے نگاراں چاہیئے
شعلۂ حسنِ بہارِ گل عذاراں چاہیئے

منزلِ عشق و جنوں کے فاصلے ہیں سربکف
ان کٹھن راہوں میں لطفِ دستِ یاراں چاہیئے

کٹ رہی ہے اور کٹ چکتی نہیں فصلِ خزاں
تیز تر اک اور تیغِ نوبہاراں چاہیئے

آج میخانے میں سحرِ چشمِ ساقی کے لئے
التفاتِ چشمِ مستِ میگساراں چاہیئے

اس دلِ وحشی کی آزادی کا کیا کیجے علاج
اک کمندِ گیسوئے یزداں شکاراں چاہیئے

نغمہ بن جاتا ہے نالہ اُن کی بزمِ ناز میں
دل کے خوش رکھنے کو شورِ سوگواراں چاہیئے

آسمانوں سے برستے ہیں زمیں پر ریگ زار
آج پھر سردار رقصِ برق و باراں چاہیئے

سردار جعفری

○

خِرد والو، جنوں والوں کے ویرانوں میں آجاؤ
دِلوں کے باغ، زخموں کے گلستانوں میں آجاؤ

یہ دامان و گریباں اب سلامت رہ نہیں سکتے
ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے دیوانوں میں آجاؤ

ستم کی تیغ خود دستِ ستم کو کاٹ دیتی ہے
ستم والو، تم اب اپنے عزاخانوں میں آجاؤ

یہ کب تک سرد لاشیں بے حسی کے برف خانوں میں
چراغِ درد سے روشن شبستانوں میں آجاؤ

یہ کب تک سیم و زر کے جنگلوں میں مشقِ خونخواری
یہ انسانوں کی بستی ہے اب انسانوں میں آجاؤ

کبھی شبنم کا قطرہ بن کے ٹپکو لالہ و گل پر
کبھی دریاؤں کی صورت بیابانوں میں آجاؤ

ہوا ہے سخت، اب اشکوں کے پرچم اُڑ نہیں سکتے
لہو کے پرچموں کو لے کے میدانوں میں آجاؤ

جراحت خانۂ دِل میں تلاشِ رنگ و نکہت ہے
کہاں ہو اے گلستانو، گریبانوں میں آجاؤ

زمانہ کر رہا ہے اہتمامِ جشنِ بیداری
گریباں چاک کر کے شعلہ دامانوں میں آجاؤ

مقالہ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

شعرِ اقبال میں احتجاجی آہنگ

شاعری میں کہیں نہ کہیں فلسفیانہ خیالات کا نظم ہو جانا کوئی خاص بات نہیں مگر فلسفیانہ فکر و نظر کو اپنی شاعری کی اساس بنانا معمولی بات نہیں ہے۔ اگر کسی کے کلام میں فکر و نظر کی ایک مربوط تنظیم ملتی ہے تو وہ اقبال ہی ہے۔ ظاہر ہے اگر صرف فلسفہ ہی نظم کیا جائے گا تو کلام یکسر سپاٹ ہی رہے گا بغیر شعر و سخن میں فلسفیانہ نکات و نظریات کے جذباتی معادلات EMOTIONAL EQUIVALENTS پیش کرکے ہی خوبی و مزہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور یہی اقبال نے کیا بھی ہے۔ شعرِ اقبال کے حسن و خوبی میں اُس کے احتجاجی آہنگ و انداز نے بڑا نکیلا پن اور بانکپن پیدا کیا ہے۔

اقبال کے سامنے ہمیشہ تعمیرِ اقدار کا مسئلہ رہا۔ یورپ سے واپس آنے پر اس مسئلہ پر غور و خوض کی شدت میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ اُس نے اپنی قوم و ملت کو نہایت گہری پسماندگی اور خوفناک مایوسی کا شکار پایا۔ ایک طرف تو لوگ غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ دوسری طرف اُن کے ذہنی احساس سے یہ توانائی بھی مفقود ہوئی جا رہی تھی کہ اُن کی اپنی بھی اخلاقی تنظیم ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ توجہ اور قابلِ عمل ہے۔ یہی پریشانہ ذہنیت شاعر کو سخت ناگوار تھی اور جس کی طرف واضح اشارات مندرجہ ذیل اشعار سے ملتے ہیں:

چوں شود اندیشۂ قومی خراب — ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم — در نگاہِ اُو کج آید مستقیم

لہٰذا پہلے تطہیرِ فکر کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک دل و دماغ صاف نہ ہوں تعمیرِ فکر کیونکر ممکن ہو سکتی ہے ؎

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

تطہیرِ فکر بعد تعمیرِ فکر کے لئے ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتے استوار کرنے کی ضرورت شاعر کو محسوس ہوئی۔ زبوں حالی نے مسلمانوں کی ذہنیت کو ہزیمت خوردہ بنا دیا تھا۔ غلامی کے پس منظر میں وہ اپنے ماضی کو بھول گئے تھے اور مستقبل کی طرف ثابت قدمی سے گامزن ہونے کے لئے نہ اُن کے پاس دل باقی رہا تھا نہ دماغ۔ اس حالت کی عکاسی شاعر نے یوں کی ہے ؎

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

نئے انداز میں پرانے موضوعات پر اپنی قوتِ شعر گوئی کو مرکوز کرنے سے شاعر کا دلی منشا یہی تھا کہ وہ مسلم قوم کو بے عملی اور افسردگی سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر حقائق کی طرف اُس کی توانائیوں کو بیدار کرے۔ ایک جانب تو اقبال نے آباؤ و اجداد کی عظمت کی تصاویر پیش کیں اور دوسری جانب مستقبل کے عظیم ترین امکانات کے نقشے کھینچے۔ زوالِ قوم و صدمہ کی جلا وطنی کو اقبال کی قوتِ شعر کلسنے اعلیٰ تر امکانات کی طرف متوجہ کیا اور یہ دعوت دی کہ انسان

خلاصۂ بحث

کائناتِ ظاہری پر حملہ کر کے اُس کے تمام تر مادّی وسائل کو اپنے تصرف میں لے آئے:

دشنہ زن در پیکرِ ایں کائنات — در شکم دارد گہر چوں سومنات
جانِ ما را لذتِ احساس نیست — خاکِ رہ جز ریزۂ الماس نیست

جس کو سب لوگ زوال و جلاوطنیٔ آدم تصور کرتے تھے وہ اقبال کی نظر میں انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ شاندار واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مستقبل کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس واقعہ کو دلکشی سے بھرپور شاعرانہ انداز میں 'میلادِ آدم' کے عنوان کے تحت پیامِ مشرق میں پیش کیا گیا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر — تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

ایسے آدم کا جنت سے نکالا جانا شاعر کی نظر میں بے مقصد بات نہ تھی۔ یہ بات ایک نئے مستقبل کی پیش خیمہ تھی اور اسی لئے فرشتوں نے بوقتِ سفر اُسے مبارک باد دی اور اُس کے لئے زیادہ متنوع، زیادہ بھرپور اور زیادہ مسرت انگیز زندگی کی پیشگوئی کی۔

جاوید نامہ میں فرشتوں سے یہ کہلوایا گیا ہے:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے — زمیں از کوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے
خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد — ز گردابِ سپہرِ نیلگوں افزوں شود روزے

اور ایک آسمانی آواز اُس کو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور زمین کو رُوحانی اور مادّی خزانوں سے آگاہ کرتی ہے:

اے امینے از امانت بے خبر — غم مخور اندر ضمیرِ خود نگر
روزہا روشن ز غوغائے حیات — نے از آں نورے کہ بینی در جہات
شستہ از روئے جہاں نقشِ امید — نورِ جان از خاکِ تو آید پدید
عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند — عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند
چشمِ او روشن شود از کائنات — تا بہ بیند ذات را اندر صفات

الغرض انسان کو بے بال و پر کر کے جنت بدر نہیں کیا گیا بلکہ اُس کو کائنات میں نئی رُوح پھونکنے کی ذمہ داری عطا کی گئی تھی۔ آدم محدود ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اُس کو ایک لامحدود دائرۂ عمل ودیعت کیا گیا تھا۔ بس ضرورت تھی تو یہ کہ وہ عمل پیرا ہو، اپنی مرئی اور غیر مرئی توانائیوں کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالے:

در شکن آں را کہ ناید سازگار — از ضمیرِ خود دگر عالم بیار
بندۂ آزاد را آید گراں — زیستن اندر جہانِ دیگراں
جانِ بیدارے چو زاید در بدن — لرزہ ہا افتد دریں دیرِ کہن

اقبال کے یہاں بصیرت، عمل اور اپنی توانائی پر نظر رکھنا ہی تقدیرِ انسانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اقبال نے جبریت کے تصور کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ مسلمانوں کے علم و ادب پر، افکار و اعمال پر جو مسئلۂ تقدیر سے متعلق دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اُن کو چاک چاک کر ڈالنا ضروری تھا۔ لہٰذا اقبال نے کہا

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ — نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مردِ مومن با خدا دارد نیاز — با تو ما سازیم تو با ما بساز
عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است — روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است

پیامِ مشرق میں بھی یہی تلقین کی گئی ہے:

اور یہ دیکھئے۔

عجم بحری است ناپیدا کناری — کہ در وی گوہرِ الماس رنگ است
ولیکن من نہ رانم کشتیِ خویش — بدریائی کہ موجش بے نہنگ است
میارا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

انسان صحیح معنوں میں قدرتِ الٰہی کا تکملہ ہے، محض ماحول و وقت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ یہ دراصل انسان ہی کے دم قدم سے ہوا کہ انتشار نے ترتیب کو وجود دیا۔ اسی نے گھنے خوفناک جنگلوں کو صاف کیا، بنجر زمینوں کو کاشت کی زیبائی سے روشناس کیا اور اس طرح زندگی کو خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں رکھا اور وہ خدا سے یہ کہہ سکا:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور کیسی لاجواب بات پیش کی گئی ہے اس شعر میں:

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو — گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

"چناں می بایست" کا تصور ہی ایک ایسی توانائی ہے جو خلاقِ مقدرات ہے۔ انسان کی منزلِ مقصود کے بارے میں اقبال کے تصور کا ثبوت بہ باب خدا کے جواب میں ملتا ہے۔

بودۂ اندر جہانِ چار سو — ہر کہ گنجد اندرو میرد درو
زندگی خواہی خودی را پیش کن — چار سو را جذب اندر خویش کن

اقبال کے یہاں ابلیس یا شیطان کا تصور روایتی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ شعرِ اقبال میں ابلیس مزاحمت کی روحِ رواں ہے، جو انسانی توانائیوں کو چیلنج دیتی ہیں۔ انسان اثباتِ خودی کا پیکر ہے اور وہ اس چیلنج کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ اپنے خلقی خصائص کو بروئے کار لاتا ہے۔ انسان محض وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ نئے مقاصد کی تلاش میں رہتا ہے۔ سوز و ساز سے بھرپور انسانی اجتہاد میں دل کا رول نہایت اہم ہوتا ہے یعنی وجدان کا مقام اقبال کے یہاں عقل سے بالاتر ہے، گوکہ اُن کے یہاں یہ تلقین کہیں نہیں ملتی کہ انسان عقل سے بالکل ہاتھ دھو لے۔ عقل کی حیثیت ایک پاسبان کی ہے اور بس:

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

دوسرے الفاظ میں عقل وسیلہ تو ضرور ہے مگر اُسے منتہا سمجھ بیٹھنا نادرست ہی ہے۔

اقبال کے یہاں فنِ شاعری کا تصور بھی احتجاجی پہلو رکھتا ہے۔ سچا فنکار وہی ہے جو مقصدِ زندگی کے حصول میں مدد و معاون ہو، معاشرے کو تقویت پہنچائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ ظفریابی کے قابل بنا سکے۔ اقبال نے اُن کی مذمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جو معاشرے کو اپنے منفی نغمات سے بُری طرح مجروح کرتے ہوں۔ دورِ انحطاط کے فنکاروں کی مذمت اقبال نے جہاں بھی کی ہے اپنے مخصوص انداز میں کی ہے:

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام — حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب
عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا — اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

جس شاعر و فلسفی کو زندگی میں جمود و انحطاط سے نفرت ہو وہ اپنی ملت کے شعراء کا غیر متحرک تخیل و تصور کا فنکار ہونا کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔

یہی کو احتجاج کہئے یا حملہ جو کچھ بھی کہا ہے اس میں شاعرانہ جذباتی کیفیات کی بھرپور گرمی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی اقبال نے تمام فرسودہ علامات و سعایات جیسے گل و بلبل، زلف و رخسار، جام و ساقی، عشق و محبت، کفر و ایمان کے مفہوم کو بدل ڈالا ہے:

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے — طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیل — ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم — شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

الغرض علم و فن اور زندگی میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ اقبال ہی سے سنئے:

علم و فن از پیش خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ زادانِ حیات

نغمہ می باید جنوں پروردۂ — آتشے در خونِ دل حل کردۂ

عشق اگر سوزے نہ دارد حکمت است — شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے — اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کی تمام دلچسپیاں آزادی اور بغاوت کے جذبے کی مرہونِ منت ہوتی ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی جس نے اقبال کی توجہ کو ملٹن کے شیطان اور گوئٹے کے Mephistopheles کی جانب کھینچا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہیں ہے کہ ملٹن کی تصنیف PARAISE LOST (فردوسِ گم گشتہ) سے ملتی جلتی تصنیف پیش کرنا بہت پہلے سے اقبال کا جزو خیال ہو گیا تھا جس کا واضح ذکر انور بیگ نے اپنی تصنیف Iqbal the Poet of the East میں کیا ہے۔ مزید برآں اپنی ڈائری stray Reflections میں خود اقبال نے کئی جگہ گوئٹے کے فاوسٹ اور ملٹن کے Pradise Lost کے متعلق اپنی پسندیدگی اظہار کی ہے۔ آزادی خیال آزادیٔ رائے اور جوش و قوتِ عمل کے کردار میں شیطان کو محض فتنہ و شر کا پیکر سمجھنا اقبال کے نزدیک غلط اقدام ہے اور اقبال نے جس انداز سے شیطان کو پیش کیا ہے اس اعتبار سے وہ ایک ہیرو معلوم ہوتا ہے، جو تمام حرکت اور تمام تغیر کی تخلیق کا ذمہ ہے۔ اقبال نے بے شیطان کے جہان کو کور ذوقی بتایا ہے:

مزی اندر جہانِ کور ذوقے — کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

اقبال کا یہ احتجاج کس قدر بلند مقام تھا کہ اس نے شیطان کو انسانی معاشرے "لا" یعنی تمام خداؤں سے انکار کی علامت تصور کیا۔ اقبال کے نزدیک "لا" اور "الا" ایک دوسرے کا تتمہ ہیں۔ ہر نفی سے اس کی نقیض کا اثبات نکلتا ہے اور نقیضین (دونوں متناقض باتیں) غلط نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا تمام خداؤں کا انکار دراصل ایک خدا کا اقرار و اثبات ہے۔ یہاں تک کہ شیطان کی نافرمانی بھی اقرار کی ایک صورت ہے۔ جاوید نامہ میں شیطان سے کہلوایا گیا ہے:

از وجودِ حق مرا منکر مگیر — دیدہ بر باطن کشا، ظاہر مگیر

من بلے در پردۂ لا گفتہ ام — گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام

شیطان کے متعلق اقبال خدا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھتا ہے:

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

شاعر بشو

شیطان کا جبریل کو یہ جواب کس درجہ کشش کا حامل ہے:

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو!

اقبال کے نزدیک خیر و شر دونوں انسانی زندگی کی ناقابلِ انکار حقیقتیں ہیں۔ دنیا نہ تو مطلق خیر ہے اور نہ کلیتاً شر۔ ابلیس کلامِ اقبال میں ایک ایسی قوت کا مظہر ہے جو قوتِ عمل کو دعوت دیتا ہے۔ وہ مجسم تلاش ہے، مجسم اضطراب ہے۔ اقبال نے صرف دو مقامات پر شیطان کی تخلیق اور بدی کے مقصدِ وجود کی وضاحت کی ہے۔ خیر و شر کی تخلیق کے متعلق جواب میں اقبال نے جاوید نامہ میں سید علی ہمدانی سے یہ کہلوایا ہے کہ شیطان سے تعلق کا نتیجہ انسان کا زوال ہے، لیکن شیطان سے جہاد کرنے کا نتیجہ انسان کا عروج و کمال، انسان کی شخصیت ایک شمشیر ہے جس کے لئے شر سنگِ فساں کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر شخصیت کامل نشوونما حاصل نہیں کر سکتی۔

بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال

خویش را بر اہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگِ فسن ؟
تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

دوسری جگہ "تسخیرِ فطرت" میں آدم خدا کے روبرو حاضر ہو کر شیطان کے ذریعے اپنے بہکانے پر معذرت پیش کرتا ہے، مگر اپنے عمل کی تصویب میں کہتا ہے کہ اپنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے اور فطرت کی تسخیر کے لئے یہ ناگزیر تھا:

رام نہ گردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بہ کمندِ نیاز ناز نہ گردد اسیر
تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز
بستنِ زنارِ او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

فطرت کی تسخیر کے لئے بھرپور جد و جہد کی ضرورت ہے جہاں ہماری تمام تر توانائیاں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ فکر، وجدان اور عشق سب ایک وحدت کے تحت آ جاتے ہیں اور ہم لامحدود امکانات کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ انسانی تغیر و ترقی کا راز اسی سلسلہ ہائے عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس قبیل کے افکار کو نظم کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل کام نہیں ہے مگر اقبال نے بحسن و خوبی جذباتی حالات پیش کر کے فلسفیانہ نکات کو شعری ملبوسات دئے ہیں۔

یہ احتجاجی مزاج شاعر کو خدا سے شکوہ کرنے کے لئے لے گیا۔ مگر کیا "شکوہ" کیا "جوابِ شکوہ" دونوں میں شاعر کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کو اپنے ماضی کی یاد دلائے اور مستقبل کے منتظر عظیم ترین امکانات کی جانب اس کو رجوع کرے اور وہ اپنے حال کو قعرِ مذلت سے باہر نکالے۔ پہلے شکوہ سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

شکوہ تقدیر کا نہیں ہے بلکہ اس کا ہے کہ پہلے سے مسلمان اب کیوں نہیں رہے:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

شاعرِ مشرق

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر — کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر — مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مُسلم نے کیا کام ترا؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے میدانوں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہمیں چھاؤں میں تلواروں کی

پھر یہ گلہ بھی تھا کہ:

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے — ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اُونٹوں کے حُدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

اس نظم میں جتنے بھی ٹیپ کے اشعار ہیں کم و بیش سبھی میں شکوہ ہے۔ اور ہر جگہ شکوہ کی نوعیت یہی ہے کہ ملت کی کسی خامی کو یا کسی عظمتِ پارینہ کو نفسِ مضمون بنایا گیا ہے۔ جوابِ شکوہ کو عام طور پر اس حیثیت کی نظم نہیں سمجھا جاتا جو 'شکوہ' کو ہم جذباتی طور پر دیتے آئے ہیں۔ مگر احتجاج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جوابِ شکوہ میں بھی شاعر کا یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کو نئے صالح اور توانا محرکات و ترغیبات دے۔ دیکھئے یہ بند!

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری — مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری — تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

غرضکہ اقبال کی شاعری میں احتجاج اُسی اہمیت کا حامل ہے جو شاعر کے فکر و نظر کو بھی حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ارشاداتِ اقبال خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں سب میں معنی و مقصد ایک ہی ہے۔ اقبال کا پیغام ایک مسلسل، مربوط اور مدلّل نظامِ فکر پر مبنی ہے اور خیالات و تخیلات میں اخلاص، پختہ یقینی، جوش و سوز کے تحت ایک متعین رجحان اور یکسانیت پیدا کرتا ہے جس میں احتجاج کو ایک جزوِ لازم بنا دیا گیا ہے۔ یہ احتجاج تعمیری و فلاحی بھی ہے اور دلکش بھی۔

محسن زیدی

سفر کی راہ میں اک رہگزار ایسا تھا
نظر نہ آتا تھا کچھ بھی، غبار ایسا تھا

ہمارے قتل میں ہو جیسے ہاتھ اُس کا بھی
ہماری موت پہ وہ سوگوار ایسا تھا

محیطِ دائرۂ کائنات ہی رہی ذات
کسی طرح بھی نہ ٹوٹا حصار ایسا تھا

اسے نہ یاد ملے تھے جو زخم پچھلے برس
کچھ اب کے سال بھی رنگِ بہار ایسا تھا

ہمیں جو چھاؤں کہیں ملتی تپتے صحرا میں
کہاں کوئی شجرِ سایہ دار ایسا تھا

ہر ایک شخص تھا اک دوسرے کا درپۂ جاں
وہ اک معرکۂ کارزار ایسا تھا

اِس آتی جاتی بہار و خزاں پہ تہمت کیا
کہ دل کا نخل ہی بے برگ و بار ایسا تھا

تمام عمر سبک سر نہ ہو سکا محسنؔ
اُتر سکا نہ مرے سر سے بار ایسا تھا

ماہر القادری

کراچی ۱۰ر نومبر ۱۹۷۲ء

عزیزِ گرامی قدر، سلام و رحمت

آپ کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ شعر و ادب کی متاعِ گرانمایہ ہیں۔ صاحبزادے سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی کا جو دعوت نامہ آپ نے ارسال فرمایا تھا۔ اُس کا جواب دے دیا گیا تھا۔ وہ آپ کو تاخیر سے ملے گا۔ یہ آپ کی محبت ہے، جو مجھے یاد رکھتے ہیں۔

"فاران" اللہ تعالیٰ کے فضل سے بدستور نکل رہا ہے۔ بھارت کا کارڈ یہاں بیرنگ ہو جاتا ہے۔ جس پر ایک روپیہ پانچ پیسے محصول لیا جاتا ہے۔ لفافہ پر ایک روپیہ پچیس پیسے "فاران" پر بھی اتنا ہی محصول لگے گا۔

چشمِ ساقی کے تصور سے جو یارانہ ہے
اب مرے سامنے شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے
عشق خود اپنی جگہ عشق ہے اور کچھ بھی نہیں
عشق کے پاس حقیقت ہے نہ افسانہ ہے
کیا خبر جلوہ و نظارہ کا انجام ہو کیا؟
نگہِ شوق کا انداز حریفانہ ہے
شمع بجھتی ہے، سحر ہونے کو ہے، کیا کیجے
اور ابھی کشمکشِ نزع میں پروانہ ہے
دل ہے اک جنّت آباد، یقیں کے دم سے
بے یقینی ہو تو یہ باغ بھی ویرانہ ہے
توبہ و شکر بھی ہو، شغلِ مے و جام کے بعد
ایک مسجد بھی قریبِ درِ میخانہ ہے

کہانی

قرۃ العین حیدر

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حدِ نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گزرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک فربہ عورت جو شاید اُس کی بیٹی تھی اور اُس کی طرف سے بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص چالیس سال کے لگ بھگ عمر، متبسم پُرسکون چہرہ، ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر سامنے والے پُرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی اوق اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارویجین۔ یا ہنگیرین۔ یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں، پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن تماللڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے، اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے بات کرتے سنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا۔ لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورنٹو میں چند ایرانی طلباء سے مل چکی تھی۔

چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ یہ فیبولس گائے FABULOUS GUY پرشیئن ہے۔ (اس نے انگریزی میں سوچا، میں آپ کو اردو میں بتا رہی ہوں کیونکہ افسانہ بزبان اردو ہے۔)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا، آہستہ سے کہا "دنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے۔"

یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا: "ڈیڈ۔ اب آرام کرو۔"

اُس نے جواب دیا: "ایڈنا۔ میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اُس کی بیٹی نے رسان سے کہا: "اچھا۔ اس کے بعد ذرا سا سو جاؤ۔"

اُس کے بعد وہ آ کر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ گو انگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

"میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں تمارا فیلڈنگ ہوں۔ ٹورونٹو۔ کینیڈا۔"

"کیمبرج۔ انگلینڈ۔ ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے۔"

"کچھ بیمار ہیں؟"

"سرطان۔ اور انہیں بتا دیا گیا ہے۔" ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"اوہ۔ آئی ایم سو سوری۔" تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم میں دفعتاً داخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

"اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے۔" ایڈنا ہنٹ نے آہستہ آہستہ کہا: کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لئے

پھوٹتی ہے تو جانے ــــــ کیسا لگتا ہوگا۔"

"اِس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہیئے۔" تمارا نے کہا اور خفت سے ہنسی۔

"حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" ایڈنا ہنٹ نے جواب دیا۔

"جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔" ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس لیے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔

"میں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں ــــ میری والدہ کے دو ماموں ایک خالہ اُن کے بچے ــــ سب کے سب ــــ میری ممّی آج بھی کسی فیکٹری سے چمنی سے دُھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو مُنہ پھیر لیتی ہیں۔"

"اوہ"

"حالانکہ وہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔"

"اوہ ــــ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم رُوسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے۔"

"میرے نانا رُوسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جا کر تعصّب سے بچنے کے لیے بدل کر فیلڈنگ کر لیا۔ لیکن میں ــــ" اس نے ذرا جوش سے کہا۔ "میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں تمارا گرین برگ فیلڈنگ۔"

"واقعی ــــ؟ برطانوی خاتون نے کہا۔ "کتنی دلچسپ بات ہے۔"

"اولادِ آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔" تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اُونچی آواز میں کہا۔ "کیونکہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیّر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اُس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو۔ میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود بھی مُسکرائی۔ اب طالبانیہ اس اجنبی پہ عاشق ہوتی جا رہی ہو را۔

برطانوی خاتون نے بھی غالباً یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجئے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کر لیں گے۔ کیونکہ اولادِ آدم کی باہم کشش کا عجیب کھیل ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"میرے نانا ــــ جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لیکر بھاگے تھے۔" تمارا نے آہستہ سے کہا۔

"کوران ــــ؟" ایڈنا نے تعجب سے دوہرایا۔

"ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی ممّی کو بتاتی تھیں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو ــــ اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہو سکتی تھی۔" سگریٹ سلگانے کے لئے تمارا نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کے اپنا لائیٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے مناظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ "یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں ــــ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انہیں جانے کیسا لگتا ہوگا ــــ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔"

ایرانی نما نوجوان دردمندی سے مسکرایا۔ "جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے مُنہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔"

"واقعی ــــ؟"

ہمسفر نے اپنا نام بتایا دکتور شریعتیان۔ تبریز یونیورسٹی۔ شعبۂ تاریخ۔ کارڈ دیا۔ اس پہ نام کے بہت سے تیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے فطری تجسّس سے دریافت کیا۔ "این۔ آئی۔ کیو۔ یعنی ــ؟"

"نصرت الدّین امام قلی۔"

لڑکی نے اپنا نام بتلانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ نصرت الدین امام قلی سے اُس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبہ کے اسٹیشن پر ٹرین رُکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اُسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت اور پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ اکا دکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر بیرطا توی اور کینیڈین خواتین کو پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی باہوں پر سر رکھ کر اُونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کینیڈین لڑکی سے کہا "تمارا خانم۔ کہاں تک میرے ساتھ رہو گی ؟"

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی۔ اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی ـــــ کہاں نامعقول ٹم ! ـــــ اور کہاں تمارا خانم ۔ جیسے سرود بج رہا ہو ۔ یا عمر خیام کا مصرع ـــــ تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرالڈ تک محدود تھی۔

اُس نے اُسی کیفیت میں کہا۔ "جہاں تک ممکن ہو"

بہرحال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔

"تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے ؟"

"پڑھنے ۔ بائیو کیمسٹری۔ مجھے ایک اسکالرشپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے۔"

"صرف چند روز کے لئے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔"

ٹرین قرونِ وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے۔ دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پُل پر سے گذر رہے تھے۔

"بڑا خوبصورت شہر ہے" تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

دکتور نصرت الدین بے حد پُر مذاق اور خوشدل شخص تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے یہ بتلانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا "خانم جوُن"

"ہُوں ـــ ؟ جوُن کا مطلب ؟"

"زندگی ـــ !"

"ونڈرفل۔ یعنی میں تمہاری زندگی ہوں !"

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "ہاہا ـــ میری زندگی !۔ سُنو ۔ خانم جوُن ۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو"

"بہت خوب ۔ آپ سے زیادہ بااخلاق شخص دنیا میں نہ ہو گا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں۔"

"واللہ ۔ کسی روز تمہیں اُن کی تصویر دکھلاؤں گا۔"

دوسری شام وہ اُس کے ہوسٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کر کے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

"کیسی بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھدار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔ !" ۔ اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔

"لوگ یہاں مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی آتے کیمپس کی سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔"

"چھانٹ لی ! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں۔ !"

تمارا نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتّے سرسرائے۔

وہ بھی عجیب عیّاش بزدل ظالم قوم ہے —" تمارا نے مزید اظہارِ خیال کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قدِ آدم آئینے میں اس کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انہیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں۔" نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

"کاکروچ کھاتے ہیں؟" تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔ "وحشی۔ بدو۔ مشرقی۔ معاف کرنا — میرا مطلب ہے — تم تو اُن سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں۔"

"درست۔ متشکرم۔ متشکرم۔ ا"

"ترجمہ کرو۔"

"جی — ! تھینکس۔" اُس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ "تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔"

"واقعی — ؟ بہت جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھو گی۔"

"کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟"

"بہت — کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا۔ اور فرہاد۔"

"فرہاد کون؟"

"تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ۔" اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ اُن کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو اس راستے کا نقشہ کھینچا جدھر سے آرمینیہ کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کو ہ بیستوں کا جغرافیہ اس کینیڈین دانشور کو ذہن نشین کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دُور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدّین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اُتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دُہرایا ہوا نقشہ دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصّہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اُس نے جھک کر کہا۔ "تمارا خانم۔ اب، وقت آ گیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں۔"

وہ سُرخ ہو گئی۔ "معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

"معلوم ہے۔" اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی اس خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدّت سے محسوس کیا۔ نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق الٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاورمیانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

"دادی امّاں — اور یہ — ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔"

تمارا نے دیکھا دادی میں اس کی بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اُس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پہ رکھ لیئے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس کے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ اتنے نازک چھوٹے چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو۔"

"ہوں تو سہی شاید۔"

"کون سا۔؟ ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا یا دادا اِس وقت سوئیٹزرلینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزین ہیں۔"

"میرے والد ٹورانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔" تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گذر گیا۔" لیکن میرے نانا غالباً خوانین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔"

"اوہو ــــ خوانین کریمیا! ـــ حاجی سلیم گرائی۔ قزادولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی ـــ محمود گرائی ــ کون سے گرائی؟"

"نصرت ـــ مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو ـــ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اِس وقت تم سے سنے ہیں۔"

"اور موصوف تمہارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔"

"ہاں۔ وہی پرانی کہانی ـــ پیرس آئے اور ایک ریستوراں میں نوکر ہو گئے اور ریستوراں کے مالک کی خوبصورت لڑکی روزلین سے شادی کر لی۔ اور روزلین کے ابّا بہت خفا ہوئے۔ کیونکہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کئے تھے ـــ" وہ دفعتاً چپ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گذرا جسے نصرت الدین امام قلی نے دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔" روزلین کے ابّا واقعی بہت خفا تھے۔ جب روزلین اُن سے فخریہ کہتیں کہ انہوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے آجکل ہر چپڑقنات کوچوان سائیس جاکروب جو روس سے بھاگ کر یہاں آ رہا ہے اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا۔ تمہارا نانا ری خاندیشی کریمیا کے کسی خان کا چوبدار رہا ہوگا۔ نانا بیچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انہیں کھا گیا۔ اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گذرا جسے حسبِ معمول تمارا نے نہیں دیکھا۔

"میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کر لی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کر کے امریکہ آ گئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف ـــ سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں"

نصرت الدین نے آہستہ سے کہا۔ پھر پوچھا۔" فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے۔؟"

"کینیڈین ـــ"

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا۔ "تمہارے نانا اور میری دادی کے نام ـــ" انہوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرے ہفتے کا ذکر ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی سمت جاتے ہوئے بازار میں سے گذر رہے اچانک وہ کھلونوں کی ایک دوکان کے سامنے ٹھٹھک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

"تمہارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین؟" تمارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا۔" میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد اُن کی ماں میری محبوب بیوی ہے۔" میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اگر اس کا منگیتر ـــ میرے بڑے بھائی کا لڑکا ـــ وہ ـــ دراصل ہماری ایرفورس میں ٹسٹ پائلٹ ہے ـــ اس لئے ـــ کچھ پتہ نہیں ـــ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔" وہ ایکدم خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا ـــ اس نے آہستہ سے خود دار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے" کہا۔" تم نے کبھی بتایا نہیں"

"تم نے کبھی پوچھا نہیں"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنگی انسان تھا کوہ بیستون کے پتھروں سے تراشا ہوا مجسمہ۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ تمارا اس سے اُسی طرح ملاکی۔ وہ اُسے مغرب کی PERMISSIVE سوسائٹی کی ایک آوارہ گرد عام لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی۔ اُس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین نے تمارا سے کہا "ہلو خواند خاتون "

"کون — ؟"

"علاؤ الدین کیقباد دوئم کی ملکہ —"

"کبھی وہ اُسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم۔ کبھی اُسے شہزادی ساقی بیگ کہتا۔" کیونکہ — تمہارے اندر کم از کم پندرہ فیصدی تاتاری خون تو ہے ہی — اور سنو۔ فرض کرو —" ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا۔ "اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے۔ وہیں کسی خان زادی سے شادی کرلی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہوسکتی تھیں۔"

دفعتہً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نسل۔ خون — نسل۔ کس کا کیا قصور ہے؟ وہ بہت بیرحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا "چلو۔ بی بی جون — گھر چلیں۔"

"گھر — ؟" اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "میرا گھر کہاں ہے ؟"

"تمہارا گھر تو ٹورنٹو میں ہے۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے —" نصرت نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی۔ لیکن اچانک دل میں اُمید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ مرد اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پُرسکون نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے "میرا گھر کہاں ہے ؟"

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے عاشقی کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں — تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا "آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہوجائیں تب ملیں۔"

"ہاں۔ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لئے مونٹریال آؤ یا یو۔ این میں ایرانی سفیر ہو کر نیو یارک پہنچو۔"

"اور تم کسی امریکن کروڑپتی کی فربہ بیوہ ہو۔"

"ہاں۔ اور اتفاق میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو — اور تم سوچو۔ میں نے اِس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں ؟"

"پیرِ زن —"

"اور عربی میں — ؟"

"مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں۔"

"سُنو۔ نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے۔"

"کیا۔ ؟"

"جب میں اس امریکن کروڑپتی سے شادی کروں گی —"

"جو بوجہ ULCERS تمہیں جلد بیوہ کر جائیگا۔"

"ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار — صرف ایک بار — تم جہاں کہیں بھی ہوگے — تبریز۔ اصفہان۔ شیراز — میں وہاں پہنچ کر اس اپنے نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور بالضرور —"

نصرت نے شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "بعض مرتبہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی — وہ بھی تمہاری طرح — تمہاری طرح اپنے ابن عم کو اسی شدت سے چاہتی ہے۔" وہ پھر ملول نظر آیا۔

"آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنتِ عم سمجھو۔"

"تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔"

"کیونکہ ہم سب اولادِ آدم ہیں — ہے نا — ؟"

"اولادِ آدم — اولادِ ابراہیمؑ۔ آلِ یافث۔ آلِ اسحٰق۔

آلِ اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجرۂ نسب کے اِس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔"

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی۔

"میں نے آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔"

"آغا۔ تم میں نرگسیت بھی ہے۔"

"ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹنی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔ اے ربِ عظیم۔ میری حفاظت کرنا

میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے

—— اُس نے دل میں دہرایا۔

اے ربِ عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا

اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر ——

"آغا۔ ایک بات بتاؤ۔"

"ہوں۔ ہوں۔"

"تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمہارے ملک کے بہت سے دانشور جو اور دانشور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے برلن میں کل بڑا جلوس نکالا۔"

"پڑھا۔"

"تم تو جلا وطن ایرانی نہیں ہو۔؟"

نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم۔ لڑکے پڑھاتا ہوں۔"

"اچھا۔ شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔"

"اچھا۔"

اس رات وہ حسبِ معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا۔ "جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے مجھے کتنی باتیں یاد آئیں گی۔ کتنی ہزاروں باتیں۔ تم کو تو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آ کر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا؟"

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

"تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لئے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ائیرز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔" اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔"

اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی۔ T کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی۔ "وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔"

"میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔

نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پرزے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

•

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے سر ذرا سا اٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند باغ کے صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلی فون پلنگ کے سرہانے کتابوں کے ایک ریک پر رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا سرک کر ریسیور اٹھایا اور "الو" کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بلایا۔

وہ لپک کر آیا اور ریسیور ہاتھ میں لیکر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔

گفتگو ختم کرنے کے بعد نصرت نے جھک کر اس سے کہا۔

"خانم جونی۔ اب اٹھو۔"

اس نے سستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ کھسکتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانہ میں گیا۔ قہوے کی کشتی لاکر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی۔ اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جارہا تھا۔ اور باغ کو دیکھ رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بیحد غضب ڈھایا۔ تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے اتری اور اس کے قریب جاکر بڑے لاڈ سے کہا۔ "آج اتنی جلدی کیا ہے؟ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔"

"ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹمنٹ ہے۔" اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ "جھٹ پٹ تیار ہو کر ناشتہ کرلو۔ تمہیں راستے میں اتارتا جاؤں گا۔"

ٹھیک پونے نو پر وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے — صنوبروں کے جھنڈ میں سے گذرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔ "یہ تمہارے ہوسٹل کی طرف سے نہیں جاتی۔ تم دوسری میں چلی جانا۔ میں اسے پکڑتا ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا۔ "خدا حافظ۔" اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آکر تمارا نے حسب معمول اسے فون کیا۔ گھنٹی بجا کی۔ وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی دیر میں سوکر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جاچکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن اٹھائے۔ سب سے اوپر والے اخبار کی شاہ سرخی تھی وہ حوزناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ دکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانشگاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبہ کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ایر پورٹ میں طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ "نصرت الدین" نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پہ پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں۔ سمندر۔ بے تکی شکلیں۔ آگ۔ اور آوازیں۔ شاید وہ CLAREAU DIENCE کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آیا کیں جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔ اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ۔ میں نے تمہاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے وہ سخت دل ہو جاتا ہے — یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا — تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے — ونڈرفل۔

میں تمہاری زندگی ہوں۔ ! - ہاہا — میری زندگی ! ———
جانِ من — چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے — قرلوتی — وقت ضائع نہ کرو — میری لڑکی کا منگیتر — بہت خطرناک زندگی ہے اس بے چارے کی — مجھے عربی نہیں آتی — ہو تو کان خاتون — میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا — ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں — تم میری بنت عم ہو تو سہی — آلِ اسحٰق — آلِ اسمٰعیل — میں بنی آدم کے شجرے کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔

ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے ۔ اپنا خیال رکھو ۔ اچھا رکھوں گا ۔ شہزادی ساقی بیگ ۔

اندھیرا پڑتے پالا اُس کی روم میٹ کمرے میں آئی ۔ نائٹی جالا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی ۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی ۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی ۔ اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا ۔ آدھا چہرہ ۔ آدھا دستی بم سے اڑ چکا تھا ۔ صرف پروفائل باقی تھا ۔ دماغ بھی اڑ چکا تھا ۔ ایرپورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجہ بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں ۔ سیاہ جما ہوا خون ۔ کٹا ہوا ہاتھ ۔ کار توس کی پیٹی ۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ ۔ تم بہت اچھی اداکارہ ہو ۔ کم از کم ٹی وی اسٹار تو بن سکتی ہو ۔ واقعی ؟ ۔ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھو لوگی ۔

کیمرہ پیچھے ہٹا ۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا ۔ برابر میں نصرت الدین کا کٹا ہوا ہاتھ ۔ لالہ کے پھول اُس کے خون میں لت پت ۔ پھر اُس کا آدھا چہرہ ۔ جرمن نیوز کاسٹر نے اس کا اصل نام اناؤنس کیا ۔ پھر آدھا چہرہ ۔ پھر گوشت کا ملغوبہ ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو اُبکائی سی آئی ۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسل خانے کی طرف بھاگنا چاہا ۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سُن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی ۔

تمارا نے دیکھا کہ پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا ۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکی ۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا ۔ جیسے نرسیں آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہیں ۔

یا اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لیجایا جا رہا تھا اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے ۔ ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جاتا تھا ۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی ۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد ۔ کمرے کے اندر کمرے ۔ گیلریاں سب نیلے ۔ ایک کمرے میں سفید آتش دان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی ۔ شکل سے سنٹرل یورپین معلوم ہوتی تھی ۔ پورا سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نکلا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب !

ایک اور ہال ۔ اُس کے وسط میں قالین بافی کا کرگھا کرگھے پر آدھا بُنا ہوا قالین ۔ اُس پر شجر حیات کا ادھورا نمونہ ۔

" یہ شجر حیات کیا چیز ہے نصرت الدین ؟ "

" مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون ۔ "

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں ۔ پھر بہت سے پردے ۔ جیسے محلات میں ہوتے ہیں ۔ اطلسی آبشار ۔ پردوں سے نکل کر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا ۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی ۔ وہ نیچے اتری ۔ جیسے بنک کے تہہ خانے ہوتے ہیں ۔ چکیلی سنگلاخ دیواریں ۔ چکیلا فرش ۔ یا جیل خانے کے کوریڈور ۔ سناٹا ۔ اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی ۔ اچانک اسے چند کیچڑ سے لتھڑے آدمی نظر آئے ۔ وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ۔ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لئے کھڑے تھے ۔ کیچڑ سے لتھڑے چہرے ۔ کیچڑ کی وردیاں ۔ اُسے دیکھ کر استہزاء سے ہنسے ۔ وہ باہر نکلی ۔ عین سامنے چوڑا دروازہ تھا ۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار ۔ بارش ہو رہی تھی ۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گذر رہی تھیں ۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی ۔ اس نے قریب جا کر اس عورت کو چھوا ۔ وہ عورت مردہ تھی ۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا ۔ آگے بڑھی ۔ سڑک پر مُردوں کا ہجوم تھا ۔ بسیں اور ٹرامیں مُردے چلا رہے تھے ۔ دکانوں میں خرید و فروخت مُردے کر رہے تھے ۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا ۔ اسٹیج پر سوان لیک میں مُردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے ۔

" یہ زومبی ہیں نا ؟ " اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا ۔

" قطعی قطعی ۔ " اُس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب

دیا۔ "زندہ نہیں مادموزیل۔ خالص۔ اصلی مُردہ ہے۔"

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس مفلر سے سر چھپائے مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سرخ ہو جاتیں کبھی سبز۔ اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔

تمارا۔ نرمی سے کہا۔ "ایکسکیوز می" اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت موجود ہو۔ یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہو گئی۔ بغیر ڈرائیور بغیر مسافروں کے فرّاٹے بھرتی ایک پُل سے گزر کر قبرستان کے پھاٹک پہ رک گئی۔

یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا۔ اب اُسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چیزوں کو اُن کے اصل بنیادی رُوپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جا کر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک SP LIT LEVEL قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پہ سنٹرل یورپین نیلے چہرے والی عورت لِلی مارلین گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہو گئیں۔ وہ خبریں سُننا نہ چاہتی تھی۔ اِس لئے بھاگی۔

راستے میں دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے اُلٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔

قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں۔ جگہ نہیں ملی۔ اس لئے اپنے آپ کو بتایا۔ اور شہر واپس آ گئی۔ یہاں حسبِ معمول ہر جگہ مُردے ہی مُردے تھے۔ دفتروں میں۔ کارخانوں میں۔ ہر جگہ۔ بعض مُردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لبادہ بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے نکلا۔ (تابوت گاڑی کو بانددی امرکے کھینچ رہے تھے)

سلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھا اور جا کر منیجر کی کرسی پہ گم سُم بیٹھ گیا۔ اور مٹی کے رنگ کی کھچڑی کھچڑی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مُردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے منجمد چہرے مٹی کے تھے۔

"یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جنرل لام بندی"۔ ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا۔ وقت دھا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صومعہ فوراً اس کے سامنے آ گیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر ربانی نماز عشاء پڑھا رہا تھا۔ باہر دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں مُنہ چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا آپ حضرت ایوبؑ ہیں؟" اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں بلبلا بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔" آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"آپ ابلیس ہیں۔؟"

"یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار۔" اُس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پہ ڈالی۔

"آپ نے ایل۔ ایس۔ ڈی بہت نوش جان کی ہوگی۔ آپ کی رُوح کو کیا تکلیف ہے؟"

"رُوح۔ ؟ رُوح گئی چولہے بھاڑ میں۔ کیسی رُوح؟" اس نے جواب دیا اور بال نوچے۔

میں چیزوں کو ان کے بنیادی رُوپ میں دیکھ رہی ہوں۔ اس نے دل میں دُہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی۔ کبھی ایکدم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتار میں ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور تیونس

اور سوڈان۔

اور ——

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آگئی اور بغیر پٹریوں کے۔ ریت پر چلنے لگی اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پتھر کے سُرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹائیر

اور صیدون

اور نینوا ——

اُفق پر سُنسان خیموں کے پردے بادِ سموم میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دُور دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نیر بڑی کربناک آواز میں پکارا —— العطش —— العطش ——

اس کے کیا معنی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اُسے کوئی زبان نہ آتی تھی سوا اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں میں وہاں ہو آئی ہوں۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ پرچھائیوں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔ العطش ——

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ العطش ——

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔

" آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے۔ "

جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اُس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لئے اسی کیفے ٹیریا میں گئی دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اُن کے سامنے موازہ اخبار رکھا تھا جس میں نصرت الدین اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ اور اُن کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں (جیسے وہ فارسی اشعار اُسے سُنایا کرتا تھا)

آلس لینڈ کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں کتنے جذبات۔ تصوّرات۔ نظریے۔ خواب۔ کرب۔ اندوہ۔ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جان جانے کے باوجود —— منتظرِ لا اَدب ہے —— کانٹا چمچے اور پلیٹ اُٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیئے

قبا چلیئے

اُس کو خونِ عرب سے ——

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اُٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

▲

بشر نواز

○

فرضی سمندروں کی شناور بنی رہی
دنیا کس احتیاط سے بے ڈر بنی رہی

طے ہو سکا نہ خود سے تعارف کا مرحلہ
چھوٹی سی ایک موج سمندر بنی رہی

بنتے رہے بکھرتے رہے بت خلاؤں میں
سوچ اپنی عمر بھر کوئی آذر بنی رہی

وہ ایک پل کے واسطے سورج کے روبرو
پرچھائیں اپنی، اپنے سے برتر بنی رہی

دیکھا سبھی نے، سمجھا کسی نے نہیں مگر
ہستی بھی جیسے گنبدِ بے در بنی رہی

لمحہ یہ لمحہ کشتی رہی زندگی کی ڈور
سانس اپنی اپنے واسطے خنجر بنی رہی

جھنکار اک دھنک سے تراشیدہ جسم کی
تا دیر اپنی راہ کا پتھر بنی رہی

اک ناتمام گیت سناتی ہوئی نگاہ
ساون کی رت میں دور کا منظر بنی رہی

ظفر غوری

ریشمی جالا

ایک ریشم کا نیا کیڑا ہو تم -!
اپنی پیاسی خواہشوں کے خول میں
ٹوٹی ہستی کو چھپائے .
کس طرح جیتے رہو گے ؟
ہر سمے ڈرتے رہو گے .
کوئی بھاری پیر سر پر پڑ نہ جائے !

بھاگتے لمحوں کی سانسیں تیز ہیں -
پیڑ کیا کہسار تک ہلنے لگے -
ڈولتی دھرتی ہے ہر دشواش کی
ہر یقیں کا آسماں کانپا ہوا
کون اس طوفان میں قائم رہا ؟

اب تو جینے کے لئے
وقت کے پھیلے ہوئے پنکھوں پہ
اڑتے بازوؤں میں
ایک مکڑی کی طرح کچھ ریشمی جالا بنو
اڑتے لمحے قید کر لو
مکھی، مچھر کی طرح !!

مقالہ

کرامت علی کرامت

لشکر میں اکیلا

بانی کا ایک شعر ہے :-

اُڑتی تصویروں میں اک نقش لیکن کچھ ہٹا سا
ایک حرفِ معتبر لفظوں کے لشکر میں اکیلا

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک حرفِ معتبر لفظوں کے لشکر میں کس طرح اکیلا ہے؟ کیا یہ لفظوں کے لشکر سے الگ ہو گیا ہے یا لفظوں کے لشکر میں شامل ہو کر خود کو اکیلا محسوس کر رہا ہے؟ اِن سوالوں کا تشفّی بخش جواب پانے کے لئے ہمیں سب سے پہلے مصرعِ اُولیٰ کے ایک چھوٹے سے لفظ "کچھ" پر غور کرنا پڑے گا جس کا استعمال نہایت معنی خیز طور پر ہوا ہے۔ یہ حرفِ معتبر "اُڑتی تصویروں" کے ہجوم میں ایک ایسے نقش کی طرح ہے جو عام رَوِش سے "کچھ" ہٹا سا ہے، یعنی نہ یہ لشکر سے پورے طور پر الگ تھلگ ہے اور نہ اِس ہجوم میں گم ہو کر اپنی انفرادی شخصیت کھو بیٹھا ہے۔ جہاں تک "حرفِ معتبر" کا خود کو اکیلا محسوس کرنے کا سوال ہے، اِس کی وضاحت بانی کے ایک اور شعر سے ہو جاتی ہے۔

کوئی کھڑا ہے مری طرح بھیڑ میں تنہا
نظر بچا کے مری سمت دیکھتا ہے بہت

میں سمجھتا ہوں کہ یہ "کوئی" کوئی دوسرا شخص نہیں ہے، بلکہ خود شاعر کی "ذاتِ دیگر" ہے جو شاعری میں "حرفِ معتبر" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے غرض کہ بانی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اِس امر کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ جدیدیوں کی بھیڑ سے الگ بھی نہیں ہیں اور اِس بھیڑ میں اس طرح شامل بھی نہیں ہیں کہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں۔ تو پھر بانی کن معنوں میں جدید شعراء کی بھیڑ میں شامل ہیں اور کن معنوں میں اس بھیڑ سے الگ ہیں؟ بانی نے دراصل آزادی سے قبل شعر گوئی کا آغاز کیا اور ساقی، ادبِ لطیف، نئی دنیا وغیرہ رسائل میں پابندی سے چھپتے رہے) اِس طرح اُنھیں حرمت الاکرام، خفقا ابنِ فیضی نارش پرتاب گڈھی، مظہر امام وغیرہم کا ہم عصر کہنا چاہئے۔ لیکن بانی کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل جیسی صنفِ سخن کو اُن رُومانی فضاؤں سے مکمل طور پر آزاد کیا جو زمانۂ قدیم سے مجاز اور فیض تک مختلف رنگوں میں آسمانِ غزل پر مسلّط تھیں۔ مزید برآں اُنھوں نے اس صنفِ سخن کی اساس خالص جدید حسّیت پر اِس منفرد انداز سے رکھی کہ وہ ناصر کاظمی، منیر نیازی اور (کسی حد تک) ظفر اقبال سے الگ نظر آنے لگتے ہیں۔ آپ بانی کی غزلیں یکے بعد دیگرے پڑھتے جائیے۔ آپ کو حُسن و عشق کی روایتی داستان کا سُراغ دُور دُور تک نہیں ملے گا حتیٰ کہ وارداتِ قلبی کا براہِ راست اظہار بھی کہیں نہیں، جسے عموماً ہمارے کلاسیکل ادب میں تشبیہات و استعارات کا نعم البدل تصوّر کیا جاتا ہے۔ بانی نے جو راہ اپنائی ہے اُس کی حیثیت پُل صراط سے کچھ کم نہیں۔ ایک طرف اگر اُنھوں نے رُومانیت سے مُنہ موڑ کر ہمارے ادب کی ایک عظیم روایت سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے (جس کی بیساکھی کا سہارا لے کر ہمارے بہت سے پختہ اور نیم پختہ جدید شاعر ابھی تک آگے بڑھ رہے ہیں) تو دوسری طرف اُنھوں نے جدید حسّیت کی بعض دعاوی اور مثبت قدروں سے صرفِ نظر کر کے اپنی دنیا آپ محدود کر لی ہے۔ لیکن اپنے اِس محدود دائرے کے اندر رہ کر بھی بعض اوقات اُنھوں نے جدید انسان کی نفسیات کے تاریک گوشوں کو اس انداز سے اُجاگر کیا ہے کہ ہماری عقل متحیّر رہ جاتی ہے۔ بانی کا موضوعِ سخن اِس دَور کے دوسرے جدید شعراء کے موضوع سے

بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ باقی کے کلام میں بھی جدید انسان کے تہذیبی سفر کی وہی لاسمتیت[1]، بٹتے ہوئے رشتوں[2] کا وہی غم، ہجوم کے درمیان تنہائی[3] کا وہی جان لیوا احساس اور اپنی ذات کے اندر ایک ذاتِ دیگر[4] کی وہی والہانہ تلاش کارفرما ہے جیسے تقریباً تمام دوسرے جدید شاعر طرح طرح کے پیرائے سے اپنی شاعری کے کینوس میں سموتے آئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں کہوں گا کہ اسلوب کی تازگی کی وجہ سے باقی کے شعروں میں وہ "کاٹ" پیدا ہوتی ہے جو بہت کم کسی دوسرے جدید شاعر کو نصیب ہے۔ سادگی میں پُرکاری کا فن انھوں نے غالباً میر سے سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدھے سادے الفاظ میں وہ دل میں چبھنے والی بات کہہ جاتے ہیں۔ باقی میر سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے بعض اشعار زرق تا بقدم میر کے رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

آنکھیں، چہرے، پاؤں سبھی کچھ بکھرے بکھرے ہیں رستے میں
پیش رَوؤں پر کیا کچھ بیتی، جا کے تماشہ دیکھو تم

رات دعا مانگی تھی باقی ہم نے سب کے سکھنے پر
ہاتھ ابھی تک شل ہیں اپنے، قہرِ خدا کا دیکھو تم

یہ دشتِ دل ہے کوئی آ بھی جائے
برابر ایک سناٹا رہے گا

وہ ایک عکس کہ پل بھر نظر میں ٹھہرا تھا
تمام عمر کا اب سلسلہ ہے میرے لئے

حتیٰ کہ غالب نے اپنی شاعری کے آخری دور میں میر کے رنگ میں جس نوعیت کے شعر کہے ہیں، باقی نے بھی تقریباً اسی نوعیت کے شعر کہنے کی کوشش کی ہے

بھرے شہر میں اک بیاباں بھی تھا
اشارہ تھا اپنے ہی گھر کی طرف

اس شعر کو پڑھ کر غالب کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے :۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے؟
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے غالب کو گھر کی ویرانی یاد آتی ہے اور بھرے شہر میں جو بیاباں کی سی کیفیت ہے (یعنی بھیڑ میں رہ کر شاعر کو تنہائی کا جو احساس ہے) اس کے پیشِ نظر باقی کو گھر کی تنہائی یاد آتی ہے۔ بات تقریباً ایک جیسی ہے، اسلوب میں بھی یکسانیت ہے لیکن حیثیت میں فرق ہے۔

باقی کو تنہائی کا جو شدید احساس ہے، اس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں بھی کیا ہے۔

دن کو دفتر میں اکیلا، شب بھرے گھر میں اکیلا
میں کہ عکسِ منتشر، ایک ایک منظر میں اکیلا

جاؤ موجو، میری منزل کا پتہ کیا پوچھتی ہو[5]
اک جزیرہ دور افتادہ سمندر میں اکیلا

دوستوفسکی نے جس وقت کہا تھا کہ "میں دو حصّوں میں بٹ گیا ہوں ..... جیسے کسی شخص کی ذاتِ دیگر اس کے قریب استادہ ہو" یا پھر

---

[1] نہ منزلیں تھیں نہ کچھ دل میں تھا نہ سر میں تھا / عجب نظارۂ لاسمتیت نظر میں تھا

[2] کہیں نہ آخری جھونکا ہو بٹتے رشتوں کا / یہ درمیاں سے نکلتا ہوا سا کچھ تو ہے

[3] اس کو تنہا کر گئی کروٹ کوئی پچھلے پہر کی / پھر اُٹھا بھاگا وہ سارا دن، نگر بھر میں اکیلا

[4] سفر ہے مرا اپنے ڈر کی طرف / مری ایک ذاتِ دگر کی طرف

[5] "Do you know, I feel as though I were split in two? .... It's just as though one's second self were standing beside one; One is sensible and rational oneself; But the other self is impelled to do some thing perfectly senseless." (DOSTOIE VISKI)

شاذ تمکنت

ڈی۔ ایچ۔ لارنس[1] نے جس وقت کہا تھا کہ اُن کے ناولوں کے کرداروں کی ایک اور "انا" ہوتی ہے جس کے طریقِ عمل کے مطابق "فرد" کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی، تو اس وقت ان ادیبوں کا اشارہ فرائڈین لاشعور کی طرف تھا۔ ہمارے ادب میں فرائڈین لاشعور کے پوشیدہ خزانوں کی باقاعدہ دریافت کا سلسلہ میراجی، ن۔م۔ راشد اور مجید امجد کے زمانے سے شروع ہوا۔ لیکن جدید تر شاعروں کے یہاں ذات کی تقسیم کا تصور اپنے پیش رَووں سے ذرا مختلف ہے۔ "ذاتِ دیگر" دراصل شاعر کی شخصیت "کا ایک ایسا حصہ ہے جو "ذاتِ اوّل" سے بعض اوقات برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ بعض اوقات آسے لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر[2] دکھا کر اُس سے فرار کرنے لگتا ہے، بعض اوقات یہ دونوں اشیاء پہلو بہ پہلو چل کر حق ہم سفری ادا کرتی ہیں۔ لہٰذا جدید شاعروں کا "ذاتِ اوّل اور ذاتِ دیگر" کا تصور فرائڈ کے مفروضات کی بہ نسبت یُنگ کے نظریات سے زیادہ قریب ہے۔ باقیؔ کی ایک غزلِ مسلسل "۔۔ کون تھا" کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔ جن سے میرے اس قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

مجھ سے اک اک قدم پر بچھڑتا ہوا کون تھا ۔۔۔ ساتھ میرے، مجھے کیا خبر، دوسرا کون تھا
پہلے کس کی نظر میں خزانے تھے اُس پار کے ۔۔۔ مشل میرے، حدوں سے اُدھر دیکھتا کون تھا
کس کی بھیگی صدا جھانکتی تھی مری خاک سے ۔۔۔ میں تھا اپنا کھنڈر، اس میں میرے سوا کون تھا

آشوبِ وقت کے اثر سے شکست و ریخت کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہوا ہے اُس سے جدید انسان کا نہ ظاہر محفوظ رہ سکتا ہے، نہ باطن۔ اسی خیال کو باقیؔ نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

وہ جسے اب تک سمجھتا تھا میں پتھر سامنے تھا ۔۔۔ اک پگھلتی موم کا سیال پیکر سامنے تھا
ایک اک شخص ہے ٹوٹا ہوا اندر سے یہاں ۔۔۔ کیا چھپائے گا کوئی حال عیاں ہے سب کا؟

اس آخری شعر کے خیال کو محمود سعیدی نے بڑے خوبصورت اور اچھوتے پیرائے میں اس طرح ادا کیا ہے:

سنگ پیکر لوگ بھی اندر سے تھے ٹوٹے ہوئے ۔۔۔ عکسِ احساسِ شکست آئینۂ نخوت میں تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ باقیؔ اور محمود سعیدی دونوں کے پہلے مصرعے خیال کے اعتبار سے تقریباً ایک ہیں لیکن محمود نے دوسرے مصرعے میں جو شعری پیکر استعمال کیا ہے وہ اس شعر کے رتبہ کو باقیؔ کے مذکورہ شعر کے مقابلے میں کہاں سے کہاں بلند کر دیتا ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ باقیؔ نے جو اُسلوب اپنایا ہے، وہ "عکسِ احساسِ شکست" اور "آئینۂ نخوت" جیسی فارسی آمیز ترکیب کی اجازت نہیں دیتا۔ ظاہر ہے، جو شاعر اپنی شاعری میں فارسی ترکیبوں کے استعمال کو روا رکھتا ہے، وہ ترکیبِ اضافت کی وجہ سے پیکر تراشی کے عمل میں ___ ADVANTAGEOUS مقام پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود سعیدی کے شعر میں جو بات پیدا ہو گئی، وہ باقیؔ کے مذکورہ شعر میں پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن آپ ذرا باقیؔ کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے پر غور فرمائیے:۔

اک پگھلتی موم کا سیال پیکر سامنے تھا

یہاں فارسی کی ترکیبِ اضافت سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود باقیؔ نے جو شعری پیکر پیش کیا ہے، وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔

"You mustn't look in my novel for the old stable ego of the character. There is another ego according to whose action the individual is unrecognizable." (D. H. LAWRENCE)

[2] دکھا کے لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر ۔۔۔ یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے

بانی کے شعری پیکر کس طرح عام فہم الفاظ سے مرکب ہو کر معنوی وسعت اور جذباتی گہرائی کے حامل بن جاتے ہیں، اس کی چند اور مثالیں مندرجہ ذیل کر دیا اصل ہ۔

کبھی ہوں تیری خموشی کے کٹنے ساحل پر   کبھی میں لوٹتی آواز کے بھنور میں تھا

ہماری آنکھ میں آکر بنا اک اشک وہ رنگ   جو برگِ سبز کے اندر نہ شاخِ تر میں تھا

تو کوئی غم ہے تو دل میں جگہ بنا اپنی   تو اک صدا ہے تو احساس کی کماں سے نکل

یہ آسماں میں سیاہی بکھیر دی کس نے   ہمیں تھا شوق بہت اس میں رنگ بھرنے کا

اس طرح شب گئے ٹوٹی ہے امید   کوئی دیوار گری ہو جیسے

میں نے چاہا آنے والے وقت کا اک عکس دیکھوں   بیکراں ہوتے ہوئے لمحے کا منظر سامنے تھا

ذیل کے اشعار میں شعری پیکر شاعر کے تخلیقی جذبات میں جذب ہو کر علامتی معنویت کے حامل بن گئے ہیں :۔

کہیں سے آ گیا اک ابرِ درمیاں، ورنہ   مرے بدن میں یہ سورج اترنے والا تھا

شب کون تھا یہاں جو سمندر کو پی گیا   اب کوئی موجِ آب نہ موجِ سراب ہے

البتہ اس نوعیت کے علامتی اشعار بانی کے یہاں خال خال ملتے ہیں۔ لہٰذا علامت پسندی اُن کی شاعری کا غالب رنگ نہیں ہے۔

بانی کو جدید انسان کے ذہنی سفر کے ہر پیچ و خم سے دلچسپی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ تخلیقی سطح پر اُن کے یہاں اس ذہنی سفر کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ اس ذہنی سفر کا اُس روحانی سفر سے کوئی تعلق نہیں جو کبیر سے کرشنگور اور اقبال تک موت اور حیات کے تسلسل کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

بانی کی نظر میں زماں اور مکاں کا وجود بکھر رہا ہے۔ اس لئے شاعر طویل سفر سے ڈرتے ہوئے ڈھیر ہو گیا ہے[۱]۔ باوجود اس کا اندیشہ ہے کہ قدم آگے نہیں اُٹھا پاتے[۲]۔ شاعر کے پیشِ نظر عجب نظارۂ لامتناہیت ہے۔ یہ ایک ایسا سفر ہے کہ راستے میں تمام ہم سفر کٹتے گئے ہیں اور کچھ ہی دیر میں شاعر کو وحدت سے دو چار ہونا ہے[۳]۔ شاعر کی خود فراموشی اور گم شدگی کا یہ عالم ہے کہ جب تک وہ کسی کے لوٹنے کی آواز نہیں سنتا تب تک اُس پر واضح نہیں ہوتا کہ اس وادیٔ تنہائی میں کوئی اور بھی اُس کا ہم سفر تھا[۴]۔ اس سفر میں جہاں شام ہو گی وہیں شاعر رُک جائے گا۔ لیکن اس وقت گھر کی یاد اُسے بہت ستائے گی[۵]۔

شاعر راستے میں کچھ ایسی کثیف گردِ سفر چھوڑ آیا ہے کہ ماضی کا تصور بالکل دھندلا کے رہ گیا ہے۔ اس لئے شاعر ماضی کی سمت لوٹنا چاہتا ہے تو اُسے راہ نہیں ملتی[۶]۔ یہ درست ہے کہ شاعر ٹھٹھر اکر سایۂ شجر میں کچھ دیر کے لئے رُک گیا ہے، لیکن راستے میں ٹھہرنا جیسے اُس کی

---

۱ زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے   میں ڈھیر ہو گیا طویل سفر سے ڈرتے ہوئے

۲ جیسے میرے سائے دشمن میرے مقابل ہوں اک ساتھ   پاؤں نہیں آگے اُٹھ پاتے، زور بھرا اسکا دیکھو تم

۳ عجب سفر تھا کہ ہم راستوں سے کٹتے گئے   پھر اس کے بعد ہمیں لاپتہ بھی ہونا تھا
میں ترے بعد پھر اے گم شدگی   خیمۂ گردِ سفر سے نکلا

۴ کسی کے لوٹنے کی جب صدا سنی تو کھلا   کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا

۵ ڈھلے گی شام جہاں کچھ نظر نہ آئے گا   پھر اس کے بعد بہت یاد گھر کی آئے گی

۶ میں اپنے پیچھے عجب گرد چھوڑ آیا ہوں   مجھے بھی راہ نہ ملے گی جو لوٹنا چاہوں

ملاحظہ ہو بشیر بدر کا یہ شعر :

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں   وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہو گی

سرشت میں داخل نہیں[1]۔ شاعر کو اپنے ہم سفروں سے بچھڑنے کا غم ضرور ہے، لیکن سفر کا تقاضہ اس سے کچھ اور کہتا ہے[2]۔ اس لئے تمام دشواریوں کے باوجود شاعر تن تنہا یہ سفر انجام دینا چاہتا ہے۔ دشتِ تنہائی کا یہ سفر شاعر کو اس قدر عزیز ہے کہ وہ اپنے احباب کا ہم سفر کا مرہونِ منت ہونا نہیں چاہتا۔[3]

غرض بانیؔ کو جدید حسیت کے اظہار پر مکمل عبور حاصل ہے۔ جدید حسیت کا فنکارانہ اظہار اُن کی مختصر نظموں "ہر جادۂ شہر" "کہیں کوئی"، "ابدیت" وغیرہ میں بھی بڑے خوبصورت انداز سے ہوا ہے۔ خصوصاً نظم "ابدیت" سب سے مختصر لیکن سب سے زیادہ مؤثر ہے۔ آپ بھی سنئے اور لطف اُٹھائیے:۔

"......مگر مری زندگی کے آنگن میں
سیکڑوں بے سحر شبیں
ایک ڈھیر بن کر سلگ رہی ہیں
اگرچہ سو بار پو پھٹی ہے
اگرچہ سو بار دن ہوا ہے"

اسی خیال کو غالبؔ نے اپنے ایک فارسی شعر میں یوں ادا کیا تھا:۔

نومیدی ما گردش ایام نہ دارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

جدید حسیت سے مملو بانیؔ کے چند اور خوبصورت شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

مجھے سنبھال لیا تیری ایک آہٹ نے — سکوتِ شب کی طرح میں بکھرنے والا تھا
عجیب لمحۂ کمزور سے میں گزرا ہوں — تمام سلسلۂ پل میں بکھرنے والا تھا

بعض اوقات بانیؔ کے اشعار نہایت سپاٹ، بے کیف اور بے رس ہوتے ہیں اور کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کا حق ادا نہیں کرتے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

مجھے پتہ تھا کہ یہ حادثہ بھی ہونا تھا — میں اُس سے مل کے نہ تھا خوش، جدا بھی ہونا تھا
ذرا تو دیکھو کہ کس حال میں ہیں میرے رقیب — کہ اب نگاہ نہ ڈالو گے تم اُدھر بھی کیا
ذرا چھوا تھا کہ بس پیڑ آ گرا مجھ پر — کہاں خبر تھی کہ اندر سے کھوکھلا ہے بہت

لیکن اس نوعیت کے اشعار کی تعداد اُن کے یہاں نسبتاً کم ہے۔

بانیؔ کی شاعری سے متعلق میری مختصر رائے یہ ہے کہ اُن کے یہاں موضوعات اور اسالیب کی وہ بوقلمونی نہیں ملتی جو مثال کے طور پر حرمت الاکرام یا محمود سعیدی کے یہاں پائی جاتی ہے، اُن کے یہاں وہ مفکرانہ گہرائی اور فلسفیانہ عمق بھی نہیں ہے جس کا سلسلہ اقبالؔ اور جمیلؔ مظہری سے جوڑا جا سکے۔ اُن کے یہاں پیکر تراشی کا عمل گنجینۂ معنی کا وہ طلسم نہیں رکھتا جو، مثال کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کے کلام میں رکھتا ہے، ان کے یہاں وہ علامت پسندی بھی نہیں ہوتی جو بشیر بدرؔ، عادلؔ منصوری اور وہابؔ دانش جیسے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود جدید حسیت کے پُرخلوص اظہار کے لئے اُنھوں نے میرؔ کا تتبع کرتے ہوئے جس طرح "سادگی میں پُرکاری" کی روایت کو اپنایا ہے، دُرشت اور کھُردُرے

---

[1] میں رُک کے ذرا سا گیا سایۂ شجر میں ضرور — میں راستے میں مگر کب ٹھہرنے والا تھا

[2] مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو — مگر سفر کا تقاضا جدا ہے میرے لئے

[3] مجھ کو اس دلچسپ سفر کی راہ نہیں کھوٹی کرنی — میں عجلت میں نہیں ہوں یارو اپنا رستہ دیکھو تم

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر دیکھئے)

امجد نجمی کی آخری غزل

حضرت امجد نجمی گذشتہ دو سال سے ضیق النفس کے شکار تھے۔ انھیں بے حد جسمانی تکلیف تھی۔ اس کے باوجود اس اثنا میں اُن کی تخلیقی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی گویا چراغ بجھنے سے پہلے زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ جنوری کے آخری ہفتے میں سردی لگ جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کی حالت بگڑتی گئی یا آخر پہلی فروری کو یہ بلبلِ رنگیں تو ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا۔ انھوں نے انتقال سے چند روز قبل بیماری کے عالم جو غزل کہی تھی اسے اشاعت کیلئے ارسالِ خدمت کر رہا ہوں ظاہر ہے کہ اس غزل کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔ لہٰذا اسے شاعر میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔ — کرامت علی کرامت

چاند اُگتا ہے تو اُگنے دیجے اُسے، ہر طرف چاندنی اپنی پھیلائے گا
اُجلی راتوں کی یہ دلکشی دیکھ کر، کوئی تو آئے گا، کوئی تو آئے گا

زندگی کیا ہے بازی ہے شطرنج کی جس کے مہروں کی رفتار میں ہیں سبھی
چُوک اس میں اگر تجھ سے کچھ ہو گئی، مات کھا جائے گا، مات کھا جائے گا

ساقیٔ دلربا میری سُن لے ذرا، چاہتا ہے وہ جتنی تو اُس کو پلا،
رِند بدمست ہو کر کرے گا بھی کیا، تیرے گُن گائے گا، تیرے گُن گائے گا

کہہ دو اربابِ دار و رسن سے یہی، طاقتِ ضبط باقی ہے مجھ میں ابھی —!
ورنہ میں بھی اُٹھاؤں جو بانگِ اَنا، شور مچ جائے گا، شور مچ جائے گا

دشت میں اس کی ہو یا چمن میں بسر، اس کا شیرازہ جائے گا اک دن بکھر
لاکھ شبنم رکھے اس کو تازہ و تر، پھول مرجھائے گا پھول مرجھائے گا

یہ خلوص ایسا گُل ہے جو کھلتا نہیں، آج کل یہ کسی میں بھی ملتا نہیں
اک حقیقت ہے یہ، اِس حقیقت کو تُو کیسے جھٹلائے گا، کیسے جھٹلائے گا

کیا کہا؟ آج وہ میرے گھر آئیں گے: بخت خفتہ مرے اب سنور جائینگے
چُپکے چُپکے کہو، ہولے ہولے کہو، کوئی سُن پائے گا، کوئی سُن پائے گا

حُسن والوں کا اتنا نہ پیچھا کریں، خواہشِ دید اتنی نہ موسیٰ کریں
برق گر جائے گی ہوش اُڑ جائیں گے، طُور جل جائے گا طُور جل جائے گا

سو برس بھی یہاں تو جیے گا اگر، ایک دن باندھنا ہوگا رختِ سفر
اپنی اس زندگانیٔ فانی پہ تُو، کتنا اِترائے گا کتنا اِترائے گا

جھونکے بادِ صبا کے یہ خوشبو میں تر، کالے کالے یہ بادل کے پیغامبر
نجمی تیرے لئے مژدۂ جانفزا، کوئی تو لائے گا، کوئی تو لائے گا

کہانی

شیام سندر پرویز

رات کی رادھا

سُوامی۔ آج آپ نے مجھے بچا لیا' اور شیلا ایک بار پھر بیقرار ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ آنسو تھے کہ اُس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ جیسے اُمڈتی ہوئی موجیں ایک دوسری کا تعاقب کرتی چلی آئیں۔ جیسے اُس کے سینہ میں کوئی طوفان اُٹھ رہا ہو اور آنکھوں تک آتے آتے وہ کف بار موجیں پانی کی لہر بن کر رہ جائیں۔

'اب بھول بھی جاؤ اُن باتوں کو' میں نے پیار سے اُسے لپٹاتے ہوئے کہا۔' اب تو تم میرے پاس ہو'۔

'وہ تو ہوں'۔ اُس نے اپنی شرابور آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا' اور پرماتما مجھے ہمیشہ آپ کے چرنوں میں رکھے۔ لیکن میں سوچتی ہوں۔ کہ اگر آپ مجھے وہاں سے کھینچ کر نہ لے آتے۔ تو جانے کیا ہو جاتا!' اور پھر وہ اِس طرح بچوں کی مانند بلک بلک کر رونے لگی کہ مجھے بے اختیار اُس کے ہونٹوں پر اپنے لب رکھ کر اُسے خاموش کرنا پڑا۔

چند دن سے شہر میں بال کنواریوں کی دھوم مچ رہی تھی۔ جانے کیا کشش تھی کہ لوگ جوق در جوق کھنچے چلے جا رہے تھے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع رہتے تھیں لوگ ناتھ جی کہتے تھے۔ جب شام کو راس لیلا کرتے اور بانسری بجاتے تھے تو لڑکیاں بے قرار ہو کر ناچنے لگتی تھیں۔ اُن کی بانسری میں ایسا جادو تھا کہ سننے والیاں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتی تھیں۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ جو ایک دفعہ اُن کے چرنوں کو چھو لیتی تھی وہ اُن ہی کی ہو رہتی تھی۔ پھر اُسے بھائی بہن، گھر بار کسی چیز سے پیار نہ رہتا تھا۔ شہر کے بڑے رئیس گوردھن داس نے اپنی کوٹھی اُن کے لئے خالی کر دی تھی۔ وہیں ہر روز شام کو راس لیلا ہوتی تھی۔ پہلے بھجن کیرتن ہوتا تھا۔ پھر پرشاد بانٹا جاتا تھا۔ اتنے میں ناتھ جی اپنی وشرام گاہ سے باہر آتے تھے۔ مخمور آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتے تھے اور پھر لبوں تک بانسری لے جا کر اُس میں وہ سحر پھونکتے تھے کہ لڑکیاں بے قرار ہو کر ناچنے لگتی تھیں۔

کئی روز سے ہم بھی یہ قصے سُن رہے تھے۔ لیکن جو بات عقل کے ترازو پر پوری نہ اُترے' اُسے ماننے کو کبھی ہمارا جی نہیں چاہا۔ اِس لئے ہم اُسے ہمیشہ 'سب پاکھنڈ ہے' کہہ کر ٹال دیتے تھے۔

آج جب میں دفتر سے گھر آیا۔ تو شیلا نے کہا۔ چلئے ہم بھی چل کر دیکھیں آخر اِتنی مانتا کس بات کی ہے'۔

'چھوڑو بھی شیلا' میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اِن باتوں میں کیا دھرا ہے۔ ہاں برلا مندر چلنا چاہو تو میں حاضر ہوں'۔

'نہیں سوامی' شیلا نے ضد کی۔ آخر دیکھنے میں کیا حرج ہے'۔

حرج کیا ہوگا۔ سوائے اِس کے کہ وقت کا خون ہوگا۔

'چلئے میری خاطر آج تھوڑا وقت کا خون بھی کر ڈالئے'۔

'دیکھو شیلا۔ بعد میں خون کا الزام میرے سر نہ آنا چاہئے'۔

'چلئے وہ وہ بھی ہم نے اپنے سر لیا' اور شیلا کچھ اِس پیار سے مسکرا دی کہ مجھے ساتھ چلتے ہی بنا۔ شیلا کی حسین مسکراہٹ میں کچھ ایسی سحر کاری ہے کہ مجھے ہمیشہ ہتھیار ڈالتے ہی پڑتے ہیں۔

جب ہم بال کنواری آشرم پہنچے تو خاصی بھیڑ تھی۔ کیرتن ہو رہا تھا۔ اور سب عقیدت بھری آواز میں رادھے شیام۔ سیتا رام' الاپ رہے تھے۔ ایک طرف مرد تھے۔ اور دوسری طرف عورتیں۔ سیوادار ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ اور اشاروں سے مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ جگہ پر بٹھاتے جا رہے تھے۔ ایسی عقیدت اور اتنی مانتا بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ماحول روحانیت سے معمور تھا۔ سب لوگ اس طرح سرشار ہو کر بھگوان کا نام الاپ رہے تھے' جیسے ان کی زندگی کا یہی مقصد

جیسے وہ سب کٹھ پتلیاں ہوں اور ڈور کھینچنے والا کوئی اور ہو۔

کافی دیر کیرتن جاری رہا۔ لوگ جھوم جھوم کر رام نام الا پتے رہے۔ پھر شانتی پاٹھ ہوا۔ کیرتن سماپت ہو گیا اور پرشاد بانٹا جانا شروع ہوا۔ پرشاد ابھی بانٹا ہی جا رہا تھا کہ ایک طرف سے ہلکی سی مُرلی کی دُھن سُنائی دی۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ سٹیج کے دائیں طرف کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں ایک پچیس تیس سالہ خوبصورت نوجوان کھڑا تھا۔ اُس نے ہلکے بادامی رنگ کی دھوتی اور لمبا کُرتا پہنا ہوا تھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار اور تُمبر ڈالا ہوا تھا۔ اُس کے بال شانوں تک لمبے تھے اور اس طرح سنوارے گئے تھے کہ چہرہ اور بھی نکھر آیا تھا۔ چہرے پر مکمل سکون اور ایسی مُسکراہٹ تھی کہ خود بخود عقیدت سے سر جُھکا دینے کو جی چاہتا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ لوگ کس بات کا اتنا طوفان اُٹھا رہے ہیں۔ یہاں تو سکون ہے۔ شانتی ہے۔ عقیدت ہے، بھگتی ہے۔ نوجوان نے جسے یہاں ناتھ جی کہتے تھے۔ ایک بار چاروں طرف دیکھا اور پھر بانسری لبوں سے لگالی۔

میں نے ایسا ملکوتی نغمہ کبھی نہیں سُنا تھا۔ بانسری کی پہلی ہی دُھن کے ساتھ کوئی پندرہ سولہ لڑکیاں اُٹھیں اور اسٹیج پر آکر ناچنے لگیں۔ سب نوجوان تھیں، سب خوبصورت تھیں۔ حسن اور نغمہ کا ایسا شیریں امتزاج میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جیسے مست چاندنی میں کوئی نُور سما رہا ہو۔ جیسے سرسراتے جھرنوں میں کوئی رنگ بھر دے۔ یا جیسے زہر ترح میں کوئی زندگی پھونک دے۔

لیکن میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ اُن ہی لڑکیوں میں شیلا بھی ناچ رہی ہے، مدہوش ہرنی کی طرح۔ ایک بار جی میرا بڑا ہی چاہا کہ اُسے روک دوں۔ پھر میں نے سوچا۔ شاید شیلا اس جگہ کا تجربہ کرنا چاہتی ہے۔ شاید وہ خود دیکھنا چاہتی ہے کہ اس تمام اہتمام میں روحانیت کہاں تک ہے۔ اور فراڈ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں خاموشی سے بیٹھا اُسے دوسری لڑکیوں کے ساتھ ناچتا دیکھتا رہا۔

پھر ایکا ایکی وہ ملکوتی نغمہ رُک گیا۔ جیسے وقت کا پہیہ رُک جائے جیسے کائنات سانس لینا بند کر دے۔ جیسے چلتے چلتے کوئی رنگین فلم کٹ جائے، یا جیسے کوئی جادوگر اپنے سحر سے ایک حسین منظر کو منجمد کر دے۔

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد پھر اُس دلکش منظر میں حرکت ہوئی۔ اور میں نے دیکھا کہ ناتھ جی نے اپنی بانسری شیلا کے کندھے پر رکھ دی ہے۔ سب لڑکیوں نے شیلا کو مبارکباد دینا شروع کی۔ پھر ایک ایک لڑکی اسٹیج پر ایک جانب رکھے ہوئے پھولوں کے ٹوکرے سے ایک ہار اُٹھاتی تھی اور شیلا کو پہنا کر سنگت میں جہاں دوسری عورتیں بیٹھی تھی آکر بیٹھ جاتی۔ میں گُم سُم بیٹھا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا

اِس ہار پہنانے کا مطلب کیا ہے؟

اُس آدمی نے مجھے بتایا: یہ لڑکی بہت بھاگوان ہے۔ اِسے آج کی رادھا چُنا گیا ہے۔ اِسے آج ناتھ جی کے ساتھ وشرام کرنے کا سوبھاگیہ پراپت ہوگا۔

'نہیں' — میں زور سے چیخا۔ جیسے کسی نے میرے سینے میں آگ لگا دی ہو۔ میں تیر کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھا اور بے تحاشہ بھاگتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ ایک ہاتھ سے شیلا کا بازو پکڑتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے سب ہار نوچ کر پھینک دیئے اور چلاتے ہوئے کہا۔

'چلو گھر'

'کیا کہہ رہے ہیں آپ'۔ شیلا نے مدہوش آواز میں کہا۔ آپ دیکھتے نہیں۔ میں آج کی رادھا ہوں۔ رادھا۔ مجھے ناتھ جی کے ساتھ رہنا ہے'۔

'بکواس' اور زندگی میں پہلی بار میں نے ایک بھرپور طمانچہ شیلا کے مُنہ پر مارا۔ اور پھر اُسے گھسیٹتا ہوا اسٹیج سے نیچے لے آیا۔ اتنے ہی میں کئی ایک سیوادار میرے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ اور شیلا کو مجھ سے علیحدہ کرنے لگے۔

'ہٹ جاؤ میرے راستہ سے'۔ میں نے پاکٹ سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ 'ورنہ ایک ایک کو بھون ڈالوں گا'۔ اُس وقت میری یہ حالت تھی جیسے میرے سر پر خون سوار ہو۔ میں جان پر کھیل کر بھی شیلا کو وہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

'جانے دو' اسٹیج سے ناتھ جی کی آواز آئی۔ سب راستہ سے ہٹ گئے لیکن میں نے سُنا مجھ پر چاروں طرف سے پھٹکار پڑ رہی ہے۔ کوئی مجھے لعنتی کہہ رہا ہے۔ کوئی دوزخی۔ کوئی پاپی۔ کوئی ناستک۔ لیکن میں سب کی سُنی ان سُنی کرتا ہوا۔ شیلا کو گھسیٹتا ہوا باہر کار تک لے آیا۔ پھر کار کی

کھول کر اُسے اندر ڈھکیلتے ہوئے میں نے جلدی سے کار اسٹارٹ کردی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے گاڑی کس اسپیڈ سے چلائی۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ چند ہی لمحوں میں مَیں گھر کے دروازہ پر تھا۔ کار کو پورچ کے نیچے کھڑا کرتے ہوئے میں نے شیلا کو نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ لیکن جب وہ اُسی طرح بُت بنی بیٹھی رہی تو میں نے غصّہ سے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ قریب قریب بے سُدھ پڑی ہے اور اُس کی نیم وا آنکھیں خُمار سے سُرخ ہو رہی ہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ ایکا ایکی شیلا کو ہو کیا گیا ہے۔ میں نے آہستہ سے شیلا کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور بیڈ روم میں لا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر نوکر کو کافی لانے کے لئے کہا۔

کافی شیلا نے میرے ہاتھوں میں لیٹے لیٹے ہی پی اور پھر پیتے ہی مدہوش ہو کر سو گئی۔ میں نے اُسی وقت ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ مجھے اُس کی بے ہوشی کا بظاہر کوئی سبب نظر نہ آتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شیلا کو میرے ہاتھوں سے چھین رہا ہے۔

ڈاکٹر نے کافی دیر معائنہ کے بعد کہا۔

"انھوں نے کوئی نشہ آور دوا کھائی ہے۔"

لیکن انھیں تو نشہ کی کوئی عادت نہیں' میں نے ڈاکٹر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ شیلا کو تو چائے پینا بھی میں نے سکھایا ہے۔ وہ نشہ کو کر ہی نہیں سکتی

'پھر انھیں کوئی دوا کھلائی گئی ہے' ڈاکٹر نے پُورے یقین کے ساتھ کہا۔ اور جہاں تک علامتوں کا تعلق ہے۔ غالباً انھیں ایل۔ ایس۔ ڈی کھلائی گئی ہے۔ میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ کوئی دو گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔

'ڈاکٹر ـــــ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پُوچھا۔ کوئی خطرہ تو نہیں'

'اوہ نہیں' ـــــ ڈاکٹر نے مجھے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔' دوا کی مقدار کچھ زیادہ نہ تھی اِس لئے کسی نقصان کا احتمال نہیں'۔

پھر اُس نے ٹیکہ لگایا۔ فیس لی۔ اور چلا گیا۔ اور میں حیران ہو کر سوچنے لگا۔ یہ ایل۔ ایس۔ ڈی شیلا نے کیسے کھائی۔؟ یہ کس نے کھلادی۔ پھر اُس کا مست ہرنی کی طرح ناچنا۔ اور مدہوش انداز میں کہنا کہ میں رادھا ہوں ـ رادھا۔ سب کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد شیلا نے آنکھ کھولی۔ میں قریب ہی کرسی پر بیٹھا اُس کے ہوش میں آنے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی شیلا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ پھر لیٹے لیٹے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور میرے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"سوامی میں یہاں کیسے آگئی۔ میں تو آپ کے ساتھ بال گنوار کی آشرم گئی تھی۔

' ہاں اور وہاں تم مُرلی کی تان پر ناچنے لگیں۔ اور پھر ناتھ جی نے تمہیں رادھا چُن لیا!

' ایسا کیا سچ مچ ہوا تھا' شیلا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا' مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ کیرتن کے بعد میں نے پرشاد کھایا۔ اور پھر جیسے میں ہوا میں تیرنے لگی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔

' ہاں اُسے اب خواب ہی رہنے دو۔ ورنہ اگر میں تمہیں زبردستی وہاں سے کھینچ کر نہ لاتا تو تم اس وقت ناتھ جی کے ساتھ وشرام آشرم میں ہوتیں اور پھر میں نے شام کا تمام اُسے واقعہ من وعن سُنا ڈالا۔

شیلا تڑپ کر میرے بازوؤں سے علیٰحدہ ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپتے ہوئے بولی۔

"سوامی۔ آپ نے مجھے گولی کیوں نہیں مار دی۔ میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا۔ میں اب کیسے زندہ رہوں گی۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

'اِس میں تمہارا کیا قصور تھا' میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تم تو نشہ میں تھیں!

'لیکن نشہ کی حالت میں بھی میں ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ مجھے مرجانا چاہئے میں اب آپ کے لائق بالکل نہیں'

پاگل مت ہو شیلا' میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ تم تو میری زندگی ہو۔ تمہارے بغیر میری زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ میں تمہیں وہاں سے بچا لایا'۔

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش میری جانب دیکھتی رہی، پھر مجھ سے اسطرح لپٹ گئی۔ جیسے وہ برسوں کی جدائی کے بعد مجھے ملی ہو اور اُسے خوف ہو کہ کوئی مجھے پھر اُس سے چھین لے گا۔

ثامحے انصاری

○

ویرانۂ ہستی کو پھولوں سے بسا آئے
جس راہ سے ہم گزرے اک شمع جلا آئے

مرجھائی ہوئی کلیاں سنولائی ہوئی شاخیں
ویران بہاروں میں کیا بادِ صبا آئے

اظہارِ تمنا سے باز آئے نہ دیوانے
جس شہر میں جا نکلے طوفان اٹھا آئے

میں نے تو زمانے کو آئینہ دکھایا ہے
اب تیغِ جفا چمکے یا برقِ بلا آئے

جب راہ نہ مل پائی انکارِ حقیقت کی،
کچھ لوگ حقیقت کو افسانہ بنا آئے

کچھ اور بھی بڑھ جائے امکانِ غزل ثاقی
شاعر کے تخیل میں گر تازہ ہوا آئے

حامدی کاشمیری

○

نور کے دائروں میں پھیلو گے جل کر دیکھو
دشتِ ظلمت ہے بدن، روپ بدل کر دیکھو

ہر قدم اٹھے گا پُر نور جزیروں کی طرف
سوچتے کیا ہو، سیہ موجوں پہ چل کر دیکھو

گرتے پیڑوں کا تماشا بھی عجب نشہ ہے
اس سیہ آندھی میں چٹانوں میں ڈھل کر دیکھو

اب نہیں کوئی نشاں ان کا کمیں گاہوں میں،
تنگ و تاریک مکانوں سے نکل کر دیکھو

بام و درِ ظلمتِ سیّال میں بہہ جاتے ہیں
دھوپ میں نکلو، سرِ راہ پگھل کر دیکھو

وحشتِ دل میں، یہ ممکن ہے، کبھی ہو جائے
اپنی پرچھائیں [illegible] سے کچل کر دیکھو

مناظر عاشق ہرگانوی

مظہر امام کی غزل گوئی

مظہر امام کی غزلوں میں جذباتی واردات کا اظہار ہے اور شہروں کی صنعتی زندگی کے بوجھ سے دم گھٹ جانے کا تجربہ بھی ہے۔ روایات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اور انھیں کچھ وسعت دے کر نئی راہیں بھی تراشی گئی ہیں اور ان میں معانی و مطالب کی نئی صورتیں بھی ملتی ہیں۔ ساتھ ہی غزل کو زندگی کی بوقلموں حقیقتوں کا آئینہ دار بنانے کی سعی نمایاں ہے۔ رنگ و آہنگ میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی تکمیل کا انداز موجود ہے اور جذبے اور تجربے کی تشکیل میں توازن اور اعتدال کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اُن کے ہاں صوت کا شعور اور ترنم کے مزاج کا احساس نسبتاً تیز ہے۔ وہ نئے عہد اور نئے زمانے کے مسائل سے برسرِ پیکار ہیں لیکن اُن کا شعور پہلے درِ گوش پر دستک دیتا ہے پھر دل میں اُترتا ہے۔ حافظہ اور شعور سے متعلق شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے کہ فن کار کا حافظہ، اُس کا شعور، اُس کا لاشعور اس طرح رشتوں میں مربوط ہوتے ہیں کہ ہر نیا خیال ہر نیا تجربہ ارتقا پذیر نظام فضائے یاد کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔

یہ نظام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ زمان و مکان کی حدود کے اندر اجسام کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ نظام اجرامِ فلکی کے نظام اور ایٹم کے اندر کے نظام سے مماثل ہے۔ ہیولے۔ سرگرداں ہیولے، جسم بنتے چلے جاتے ہیں۔ نظام کا حصہ بن کر اپنے محور پر قائم ہو کر، اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں، اُن کی سرگردانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اُن کی منزلیں، اُن کے سفر کی حدود مقرر ہو جاتی ہیں اس نظام کا انسان کے خارجی ماحول سے بظاہر بے نظام مگر منظم رشتہ ہے۔ ہر لحظہ بکھرتے ہوئے: اپنے مرکز سے کٹ کر، زماں میں سرگرداں بھٹکتے ہوئے مناظر، گُل کے سُراغ میں پھرتی ہوئی خوشبو، مختلف رفتاروں میں رواں رنگ، آفاق سے اُبھرتے آفاق میں گم ہوتے ہوئے رنگ رنگ کے بکھیرو، دن اور رات کے ملاپ سے پیدا ہونے والے دمکتے ہیجان سے اُبھرتے ہوئے نغمے سے بکھرتی ہوئی قوسیں، اُن میں جذب ہوتے ہوئے انسانی جسموں کے خطوط، ان سب کو فن کار اور شاعر کا حافظہ، اُس کا شعور، اُس کا لاشعور اپنے حیطۂ کشش میں کھینچتا رہتا ہے اور کبھی لمحوں میں کبھی سالوں میں، ان ہیولوں کو اپنے نظام کا حصہ بنا لیتا ہے۔ یہ ہیولہ شعور میں چھپا ہوا ہے، ہر شئے، ہر خیال، ہر تصوّر، ہر جذبے ہر آرزو کا "زوج" ایک دوسرے سے ناآشنا، ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ فن کار یا شاعر ایسے ہی زوجیت کے ابدی رشتے میں باندھ دیتا ہے کہ زوجین زماں کے زینۂ پیچاں پر درجہ بہ درجہ، طبق بہ طبق، عالم بہ عالم، ارتقا کرتے چلے جائیں۔

فطرت کی آغوش میں جو کچھ بھی محوِ خواب ہے، اُس وقت تک محوِ خواب رہتا ہے جب تک فن کار یا شاعر کی فضائے یاد اُس کو اپنے حیطۂ نظام میں کھینچ نہ لے اور پھر دھیان کی صد راہوں پر نہ چھوڑ دے کہ اُن راہوں پر وہ اپنے زوج کے مدِّ مقابل آ جائے۔ اُن کو راہ دکھانے کی خاطر نظام فضائے یاد اپنی حرکت سے پیدا ہونے والی کسی قوت کو اُن کا راہ نما مقرر کر دیتا ہے۔ اور یہ راہ نما مرئی لیکن شفاف لسانی جسم ہے۔ جس کا ایک عضو غزل ہے۔ یعنی فن کار یا شاعر اپنے نظام فضائے یاد کے ارتقائی عوامل سے وجود میں آنے والی قوتوں کو اپنے اندر سے خارج کرنے کے لئے ایسا جسم تلاش کرنے جس میں یہ قوتیں اس طرح جذب ہو جائیں کہ وہ جسم متحرک ہو جائے یا نشو و نما کا اہل ہو جائے اور اُس کی حرکات کے مجموعی تاثر سے ہر اُس انسان کے شعور و حافظہ میں جس کو اُس کا قرب نصیب ہو فن کار کی فضائے یاد کے نظام کا مشابہ ترکیب پا جائے۔ یہی مشابہی ترکیب "غزل" ہو سکتی ہے جو ایک غیر منقسم اور بہت ہی مربوط وحدت ہے جس کا تعلق عمارت میں اینٹ

بجلی جیسا نہیں بلکہ اُڑتی ہوئی چنگاریاں جیسا ہے۔ اینٹوں کی طرح اُس کے اجزا کی حدود نہیں ہوتیں بلکہ یہ شعلوں کی مانند چمکتی، تھرکتی اور ایک موہوم سی لکیر بناتی ہوئی ہوتی ہے جیسے رنگ، ڈھب اور انفرادیت بخشنے والے شاعروں میں مظہر امام بھی ہیں۔ اُن کے یہاں گہرے جذبات کا خلوص ہے، فکر کی روشنی ہے، حسن اور تاثر ہے، نظر کی بیباکی ہے، خیالات کی پختگی ہے فنی ریاض ہے، احساس میں شدت اور خیالات میں اُستواری ہے۔ اُن کا شعورِ کائنات اُن کے ذاتی تجربات کی راہوں سے گزر کر مرتب ہوا ہے۔ اُن کے شاعرانہ لہجے میں انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور دوسروں کے جذبات و محسوسات میں گہری شرکت کا احساس ملتا ہے۔ اسی رویّہ کی بنا پر اُن کی اپنی کاوشیں اُن کے اپنے عہد کے تغیر پسند مزاج کا جزو بن کر اور اُن قوتوں کا اخلاقی سہارا بن کر اُبھرتی ہیں جو موجودہ اور آنے والے نئے عہد اور ترقی پذیر نسل و سماج کی تشکیل اور تہذیب کے ملے جلے جدوجہد کر رہی ہیں۔ اُن کے یہاں صفات کے اندر حسیاتی اور جذباتی معنویت ملتی ہے اور جگہ بہ جگہ فکری معنویت نظر آتی ہے۔ ؎

تھا تصوّر کے چراغِ کُشتہ کا وہ بھی دُھواں
جس کو اپنی سادگی سے آسماں سمجھا تھا میں

سائے میں زلفِ غم کے آرام کر رہا ہوں!
تو کس کو ڈھونڈتی ہے اے گردشِ زمانہ

مانگنے والے! ذرا اپنی لکیریں بھی تو دیکھ
ساری تاثیرِ دعا، دستِ دعا لے جائے گا

ذرا تاریکیوں کو بھی پکارو
کہ اتنی روشنی اچھی نہیں ہے

ہمیں خبر ہے کہ شیشہ گری کا فن کیا ہے
کہ ہم نے ٹوٹ کے ذرّات کو بھی دیکھا ہے

دیواریں ہل رہی ہیں زمان و مکان کی
گرتا ہوا یہ گھر کوئی آکر سنبھال دے

غور سے دیکھو تو سائے بھی نظر آئیں گے
میری اُمید کے تپتے ہوئے میدانوں میں

یہ معنویت اور فنی لطافت ذہنِ انسانی کو دعوتِ فکر دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مظہر امام زندگی اور کائنات کے رموز کو سمجھنے سمجھانے کے لئے بعض مبینہ اقدار اور معتقدات کا سہارا لیتے ہیں۔ ؎

اپنی دیوارِ انا کا بھی سہارا نہ ہوئے
ہم پجاری کے پجاری رہے، دیوتا نہ ہوئے

کسی ویران جزیرے سے پکارو مجھ کو
میں کراہوں کے سمندر سے نکل آیا ہوں

شاید کہیں سورج کی کرن شام کو پھوٹے
ہم شمع جلائے ہوئے بیٹھے ہیں سحر سے

مظہر امام نے غزل کے پرانے اسالیب میں ہمہ گیر بنیادی تجربوں کو نئے زاویۂ بیان، نئے لب و لہجہ اور نئے آہنگ کے ساتھ سمو کر انفرادیت بخشی ہے۔ یہ انفرادیت محبت کی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہے جس میں اُن کی رُوح کا سوز و گداز، کیف و سرور، افسردگی اور تشنگی، اضطراب و انبساط، پژمردگی اور معصومیت اور شعور و آگہی بدرجۂ اتم موجود ہیں ؎

تیری آنکھوں میں گذرتے موسموں کا عکس ہے
سیلِ صبح اک روز اس کو بھی بہا لے جائیگا

اُس کی دہلیز کے سورج کو اُٹھا لے آتے
اپنی دیوار کا سایہ جو گھنیرا ہوتا

تجھ سے اک شخص کو پرکھا تو ملمع نکلا
اُس کو میں کیسا سمجھتا تھا وہ کیسا نکلا

اپنے ٹوٹے ہوئے خواب کی کرچیاں
تیری آسودہ آنکھوں میں بھر جاؤں گا

کوئی شب زینتِ آغوش ہو جب چاند کھِلے
سانس کا قلزمِ بے تاب جزیرہ مانگے

احساسِ ذات میں جو بے تکلفی اور برجستگی ہے اور معصوم اور پاکیزہ اندازِ بیان میں جو سادگی اور صداقت ہے اُس میں قدرتی پن صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنے احساسات اور طبیعت اور وارداتِ قلبی کے بیان میں اپنی پُرکاری سے جس طرح نئے نئے پہلو مظہر امام نے نکالے ہیں وہ اُن کی جذباتی بصیرت اور فنی پختگی کی دلیل ہیں ؎

فردا کی نگاہیں ترے جلوے سے ہیں سیراب — اے کاش! یہ بادل مرے خوابوں پہ بھی برسے
اور کیا رکھا ہے میرے پاس لے جانے کو اب — میرا قاتل آئے گا، میری دعا لے جائے گا
اب تو یہ غم ہے، ملاقات ہوئی کیوں تجھ سے — تو نہ ہوتا تو مرے ساتھ زمانہ ہوتا
نگاہیں تیری کیا کچھ پوچھتی تھیں — بڑی مشکل سے حالِ دل چھپایا
تم ہی یہ وقت پڑا ہو تو بتاؤ یارو — دل کے اندر بھی نہیں ہے کوئی باہر بھی نہیں

اس نفسیاتی اور جذباتی تسلسل میں ایک متانت آمیز شوخی بھی ہے جو اُردو شاعری میں کم نظر آتی ہے۔ مظہر امام جن قدروں کو پیش کرتے ہیں اُن میں حلاوت گرمی اور دلرفیت ہے۔ ایک نوع کا اعتدال، ٹھہراؤ اور سکون بھی ہے جن میں فنی خوبیوں کا التزام ہے ؎

کور چشموں کے لئے کیا روشنی، کیا تیرگی — گر چہ غم ہے سہی، میں دیدۂ بینا میں ہوں
ایسا بھی کیا کہ کوئی خریدار ہی نہ ہو — جب بیچنے چلیں گے تو قیمت بھی آئے گی
دشت پاؤں پر نیند پڑی تھی — سورج سر پر آن کھڑا تھا
شب کی اُبھری خشک رگوں میں اب تو لہو بھی سوکھ چکا ہے — لاؤ بلاؤ آج کہاں ہیں صبح کی مئے چھلکانے والے

زرخیز تخیل کی ان جیتی جاگتی تصویروں میں ایک نیا انداز ہے۔ پیش پا اُفتادہ حقیقتوں اور ان بظاہر معمولی اور کم مایہ چیزوں کو جن سے ہم واقف ہیں اور جن کا مشاہدہ روزانہ کرتے رہتے ہیں لیکن جو عادت یا ذہنی بے حسی کی وجہ سے ہمارے تخیل کو نہیں اُکساتیں۔ مظہر امام نے نہایت پُرکیف طریقہ سے بیان کیا ہے اور اُن کے غیر معمولی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں نزاکت، چابکدستی اور معنی آفرینی سے کام لیا ہے۔ اُن کی شاعری میں اُن کے سرشار تجربوں کا نکھار ہے۔ جو مادی زندگی اور اُس کے لوازمات کو بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے قبول کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا لہجہ دوسروں سے مختلف ہے اور وہ آواز متقدمین یا معاصرین کی بازگشت نہیں ہیں بلکہ اُن کے یہاں ذاتی انکشاف کی تازگی اور روشنی موجود ہے۔ یہ تازگی اور روشنی مواد کے اعتبار سے اور اس مواد کے لئے ایک خارجی وسیلہ وضع کرنے کے معاملہ میں بھی ہے ؎

ایک نویلی دلہن بن کر اک دن اندر آیا تھا — جانے کب کا بھولا بھٹکا لمحہ آدھی رات گئے
لمحوں کی طرح گذری ہیں صدیاں تو بارہا — اک پل بنا ہے کیسے زمانہ کہا نہ جائے
ہر آئینے سے آنکھ چراتے ہیں آج ہم — یہ تیری جستجو ہے کہ ہے اپنی جستجو،
روشنی کے لئے اک عمر سلگتے گذری — اور اب شمع ملی ہے تو اندھیرا ہی نہیں

جذبے کی گرمی کو قائم رکھتے ہوئے فکر کی روشنی کی آمیزش کا لازمی عنصر مظہر امام کے یہاں قدم قدم پر ملتا ہے۔ وہ احساسات کو نئی زندگی، ذہن کو نئی معلومات اور روح کو نئی غذا فراہم کرتے ہیں۔ اُن کے سوچنے کے انداز میں ایک نوع کی طرفگی اور پہلوداری ہے ؎

مری تخئیل کے افسردہ لب پر — وہ اپنے ہونٹ رکھ کر سو گئی ہے
لبِ گستاخ کو ہم کوئی سزا دے لیتے — تم نے ہونٹوں کا تقدس تو بچایا ہوتا
جس سے وابستہ تھیں شام درد کی تنہائیاں — صبح کی صورت وہ سادہ پیرہن آیا تو ہے
چھپتی موج کی باہوں میں رہی تشنہ لبی — چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

مظہر امام جب EGO SATISFACTION کے لئے اساسی طور پر مثبت جہد کی طرف سفر کرتے ہیں تو انھیں زندگی اور زندگی کے سارے غم ہی پیارے لگنے لگتے ہیں۔ اُس وقت وہ درد و غم میں بھی انھیں خوبی کے پہلو نظر آتے ہیں اور زندگی کی تھکا تھکی میں نشاط کے نغمے اُبلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ؎

شاعر۔ بمبئی

شکر کر اے زندگی! اک رند کو بزمِ شوق — لے کے اپنی آرزوؤں کی تھکن آیا تو ہے

زندگی صہبا بھی ہے زہرِ لب بھی — زندگی کو ظرفِ صہبا کیجئے

لہجے کا یہ تیکھا پن ایک الگ کیفیت (MOOD) کا پتہ دیتا ہے۔ کائنات کے شعوری ادراک میں اُن کے نزدیک زندگی کی ہما ہمی، کشاکش اور تگ و دو میں شرکت کا حوصلہ نہ رکھنا اور محض بیاطِ فرصتِ ہستی کو ادراکِ زندگی کا وسیلہ بنالینا روایت کے ایسے جبر کو اختیار کرنا ہے جو فنکار کی چشمِ بینا کو لڑکوں کا کھیل بنا دیتا ہے۔ زندگی اُن کے یہاں جبر اور بوجھ کا نام نہیں ہے جس میں آدمی جبر اور مجبوریوں کے آلۂ کار کی حیثیت رکھتا ہو بلکہ وہ اُن سے سلئے کائنات کے ظہور و امکان میں سے ایک بڑی اکائی ہے جس کی حرکت اور اختیار سے انسان کا اپنے وجود ذہن اور شعور کو ہم آہنگ کرنا لازمی ہے۔ ؎

زندگی تاریخ کا نقشِ کفِ پا ہی نہیں — زندگی ہے رہ نمائے گردشِ ایّام بھی

زندگی کو پرکھنے اور برتنے کے بارے میں مظہر امام کا بنیادی رویّہ ایک ایسے انسان کا ہے جو زندگی کو اُس کی تمام موجودہ کلفتوں اور صعوبتوں کے ساتھ قبول کرتا ہے ؎

زندگی خواب نہیں، ایک حقیقت ہی سہی — لیکن اکثر یہ حقیقت بھی گراں گذری ہے

اشک بھی پیتے ہیں ہم اور بادۂ گلفام بھی — زندگی اپنی بدل لیتی ہے اکثر جام بھی

اور پھر اسی کلفت بھری زندگی سے اس کی رعنائیوں، حسن، آرام اور سہولتوں کو نئے سرے سے دریافت کرتا ہے ؎

مامور کیا ہے خدمت پہ تاریخ نے اپنے شانے کو — اے زُلفِ حیات! آزردہ نہ ہو آیا ہوں تجھے سلجھانے کو

میں نے مانا ترے کوچے میں قدم اُٹھ نہ سکے — زیست کی دوڑ میں لیکن کبھی ہارا تو نہیں

ہزار موت کی ظلمت حریفِ نور رہے — نہ رُک سکے گا کبھی مہرِ زندگی کا خرام

عام جذبات سے بلند ہو کر ہم جب کائنات کی وسعت اور فطرتِ انسانی پر نظر ڈالتے ہیں تو حقیقت کی تلاش کے لئے خواب و خیال وہی اہمیت رکھتے ہیں جو خالص، مادّی حقائق رکھتے ہیں۔ جس طرح زندگی کی تخلیق و تشکیل میں مختلف عناصر کی ضرورت ہے اسی طرح شاعری کے لئے جذباتی وجدان و بصیرت اہم ہیں۔ شاعر فلسفی و مورخ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ وہ زندگی کے متعلق VISION کا علمبردار ہے۔ مظہر امام کے یہاں یہ VISION نئے انداز اور نئے لب و لہجہ میں نئی جہت کا پتہ دیتے ہیں۔

سچا شاعر ہمیشہ اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے اور زیادہ حسّاس ہوتا ہے۔ مظہر امام کے قیمتی اور اچھوتے تجربے میں حسین، دیدہ زیب اور دلفریب رنگوں کی آمیزش کے ساتھ اُن کی اپنی تنقید بھی پنہاں ہوتی ہے ؎

کچھ حسینوں نے شاخِ گیسو پر — کیا حسیں گھونسلے بنائے ہیں!

میری ہی طرح کرتے ہیں اِک اِک کی شکایت — جو اپنے ہی خوابوں کے پرستار رہے ہیں

خود غرض ہیں انجمن آرائیاں تنہائیاں — آدمی کا آدمی سے اب کوئی رشتہ نہیں

مظہر امام کی اس تنقید میں ایک آفاقیت ہے جو معاشرے کے ہر پہلو کو اپنے احاطہ میں لیتی ہے۔ آج کے شاعروں پر یہ تنقید دیکھئے ؎

چند مہمل سے شعر بھی سنئے — شاعری کے نئے تقاضے ہیں!

اِن کی صورت تو دیکھئے مظہر! — شاعری کا یہ ذوق رکھتے ہیں

مظہر امام نے زبان کے نام لیواؤں کی بھی بخیہ گری کی ہے ؎

بسترِ مرگ پر ہے اُردو زبان — لوگ عربی قرآن پڑھتے ہیں!

بلکہ اُنھوں نے خود اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا ہے اور اپنے اندر ڈوب کر اپنی لامحدود سمتوں کو پار کر کے اپنی ہر کو کو کیوں بیان کیا ہے ؎

بددعا کس لمحۂ حاضر کی ہے مجھ پر امام؟ — ہوں صدائے عصر لیکن گنبدِ فردا میں ہوں

طرزِ بیان کی یہ بے باکی اور لہجے کا یہ تیکھا پن تجربہ اور مشاہدہ کے بعد ہی آتا ہے۔

بدیع حسینی

کون سی منزل میں ہیں؟

بے کراں ہے زندگی کی واردات
بے کراں ہیں حادثات۔
زندگی خود حادثہ ہے۔
موت بھی اک حادثہ۔

بے کراں سیلِ حوادث میں بہے جاتے ہیں ہم
کون جانے، کن فرازوں سے نشیبوں میں گرے ہیں
یا چلے ہیں وادیوں سے کوہساروں کے لئے
یا فضاؤں میں ہوا بن کر اُڑے جاتے ہیں ہم۔
کون جانے کوئی منزل ہے ہمارے واسطے
یا سفر ہے بے کراں، بے انتہا ہیں منزلیں
کون جانے کون سی منزل میں ہیں؟
تازہ دم ہیں یا کسی دیوار کے سائے میں ہیں
یا ابھی تک دشت پیما
یا خود اپنی آپ منزل، آپ اپنی واردات؟

نصر قریشی

مُداوا

تارِ رگِ جاں تیز ابی شورش میں لرزاں
ضربِ الم سے زخمی، ٹوٹا
شہرِ تمنا پر نوحہ خواں
آوازوں کا ٹھنڈا قطرہ
خاموشی کے سوکھے لب پر گرنے دیں
عہدِ رفتہ کی بچھڑی آوازوں کو،
عہدِ حاضر کی سانسوں میں گھلنے دیں
پتھر، ہیرا، کانچ اور لوہا
برگِ صدا سے کٹ جائیگا
دل کا درد بیاں کرنے سے بٹ جائے گا

مومن خان شوق

نئے آدرش

اُسے کیوں روکتے ہو
کوئی چپ چاپ گھر کو جا رہا ہے
تمنا کی چتا کو آگ دے کر
اُدھر دیکھو۔ خرابے میں
وہاں کچھ پھول شاید جل رہے ہیں۔
اُجالا، کپکپاتا، کانپتا، مدھم اُجالا،
یقینِ صبح کی روشن علامت ہے۔

کہانی

انجو سُودیش

پلاسٹک کا آدمی

ڈبل بیڈ پر اُس کے ساتھ لیٹی اُس کی بیوی نیند کی یلغار کو روک کر اُسے بڑبڑاتے ہوئے سننے لگی پھر اس نے اپنی خمار کے بوجھ سے بند آنکھوں کو نیم وا کیا اور گردن کو تھوڑا گھما کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جب وہ چوتھی بار کراہنے کے بعد بڑبڑایا " یہ ہو کیسے گیا۔ آخر میں نے یہ کیوں کیا۔ اتنی بے بسی۔" تو خوفزدہ ہونے کی بجائے وہ مسکرانے لگی۔ اس نے سوچا ضرور کسی نوزائیدہ کہانی کا کردار اُس کے تحت الشعور میں بیٹھا اُسے پریشان کر رہا ہے اور اُسی کا ذہنی کرب اس کے لبوں پر جملوں کی صورت میں آ رہا ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اس کے قریب سرک گئی۔

" نہیں "۔ بیوی کے جوان اور سجے جسم کے مہکتے گداز سے لاتعلق ہوتا ہوا وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے بیزاری کے عالم میں رات کی معطر اور کیف آگیں آغوش سے نکل بھاگا۔ چند قدم پر کھڑے بیتے ہوئے لمحات کو اپنا راستہ روکے کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اُس کرب انگیز حقیقت کے حوالے کر کے خود کو لوٹنے اور بکھرنے کا المناک منظر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس دن کافی رات گئے گھر لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لفافہ تھا۔ بیوی نے جالی دار دروازے کو کھولتے کھولتے اپنے چہرے پر انتظار کرنے کی وجہ سے چھائی جھلاہٹ دور کر لی اور لفافہ اُس کے ہاتھ سے چھین لیا " قمیص کا کپڑا ہے نا "۔ لفافے میں سے کپڑے کا ٹکڑا نکالتے ہی وہ حیران ہونے لگی " لال رنگ۔۔! تم نے کیسے خرید لیا! اِس رنگ کی قمیص میں آدمی ریلوے کے قلی جیسا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی شخصیت کا وقار مر جاتا ہے۔ مجھے آج تک لال رنگ کی ساڑھی پہننے دی نہ چوڑیاں۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے بھی دوسرے رنگوں کے ہیں۔ پھولدان میں گلاب کا پھول تک برداشت نہیں کیا کبھی۔ آج اپنے لئے۔۔۔" اتنا کچھ ایک ہی سانس میں کہتی ہوئی بیوی کی جانب ساکن نظروں سے دیکھتا ہوا وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ " دراصل۔۔۔" وہ کچھ کہنے لگا تھا۔

" دراصل کیا۔ اُس دن ونڈو شاپنگ کرتے وقت تم نے نیلے رنگ کا پیس پسند کیا تھا پھر یہ۔۔۔" " دراصل بات یوں ہے۔ میں دکان کے اندر داخل ہوا تو وہاں دائیں کونے میں کھڑے پلاسٹر کے آدمی کو پہنائی گئی قمیص کا رنگ مجھے یکدم پسند آ گیا۔ وہ اس میں بہت جچ رہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح میں نے اپنی پسند کو نظر انداز کر کے یہ ٹکڑا خرید لیا۔ مگر اس میں۔۔۔" وہ گھبرانے لگا۔

اُس کی بیوی اُس کی بات کو ان سُنا کر کے کچن میں چلی گئی اور وہ اپنے آپ سے لڑنے لگا۔ کیا ہوا جو آج کل ہر کوئی لال رنگ میں ملبوس دکھائی دیتا ہے۔ میں نے پالیٹکس میں ایم۔ اے کرتے وقت بھی اس رنگ میں کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ ماسکو کے ریڈ اسکوائر نے مجھے آج تک متاثر نہیں کیا۔ پھر یہ سب۔۔۔" اس کے جی میں آیا کپڑے کی دھجیاں اڑا دے۔ رسوئی میں جل رہی گیس کے شعلے کے حوالے کر دے۔ کم از کم فرش پر ڈال کر پاؤں ہی تلے کچل دے۔ " پلاسٹر کا آدمی " اس نے غصے میں اپنا نچلا ہونٹ چبا ڈالا۔ " پلاسٹر کا آدمی مجھے لیڈ کرے گا؟ میری پسند کا قاتل۔۔۔ میری انفرادیت پر اتنا بڑا ڈاکہ۔ میں کہاں ہوں؟" تبھی کئی اشتہار اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور ریڈیو پر رات دن ہونے والی ایڈورٹیزمنٹ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترنے لگی۔

" کھانا کھانے کے بعد چائے پیو گے یا کافی۔ آئس کریم بھی جمی پڑی ہے۔" بیوی نے چیزیں اُس کے سامنے پڑی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کھانا ابھی نہیں کھاؤں گا" وہ جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولا۔ گلاس میز پر رکھتے ہوئے اُسے یہ دیکھ کر راحت ہوئی کہ بیوی نے اُسے کھانا کھلانے پر اصرار نہیں کیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ گرم دودھ سے بھرا گلاس لے کر آئی تو اُس کی رگوں میں بہنے والا خون اُس کے دماغ میں اکٹھا ہو کر لاوے کی طرح اُبلنے لگا۔ بیوی کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر اُس نے میز پر رکھ دیا۔ "تم اب سو جاؤ۔ مجھے یہ ناول آج ہی ختم کرنا ہے" بُک شیلف میں سے کتاب اٹھانے کے لئے اُس نے اپنا بازو پھیلایا۔

حالیہ بیتے ہوئے لمحات کو اپنا تمسخر اڑاتے دیکھ کر وہ خود شکستگی کی کئی سیڑھیاں ایک ہی چھلانگ میں اُتر گیا۔ آخری سیڑھی پر کھڑی ایک گئی اور پرانی شام کو اپنا بازو پکڑتے دیکھ کر اس کی رُوح قبض ہونے لگی۔ مگر قصائی کی مانند بے رحم شام اُسے گھسیٹتی ہوئی اُس کے شاعر دوست کیفی کے گھر لے ہی گئی۔ وہاں ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ سگریٹ اور چائے پیتے ہوئے چند دوستوں کے درمیان ہو رہی بات چیت میں حصّہ لینے لگا۔

"قادر نے 'رباب' میں جو مضمون کسی دوسرے کے نام سے چھپوایا ہے اُسے پڑھ کر لگتا ہے وہ پاگل ہو گیا ہے" کیفی بجھی ہوئی بیڑی کو پھر سے سلگانے لگا۔

"اس نے ناصر کاظمی کو First Establishment کا بانی کہہ کر اپنی برائی کا اچھا جواز پیدا کر لیا ہے"

شاد سگرٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑنے کے لئے آگے کی جانب جھکا۔

"پہلا ناصر کاظمی کو Establishment ماننے میں ہی کیا تک ہے۔ اِس پوزیشن کو پہنچنا معمولی بات نہیں۔ مجھے اس کا ایک بھی شعر ایسا دکھائی نہیں دیتا جسے ہم عظیم شاعری کے زمرے میں لا سکیں" راز نے صوفے کی پیٹھ سے ٹیک لگائی۔ "ویسے قادر بُرا شاعر نہیں ہے۔ لیکن اپنی شہرت کے لئے دوسرے ادیبوں کی آڑ اور اشتہاری شکل میں چھپوانا اچھا نہیں لگتا۔ لوگ اتنے بیوقوف نہیں ہیں۔ وہ سب سمجھتے ہیں" کیفی اپنے گھٹنا زدہ گھٹنے پر مُکّے مارنے لگا۔

"فراق نے بھی کئی بار کچھ ایسا ہی کیا ہے" راز نے لقمہ دیا۔ "ویسے ایک مبتدی بھی اُس کے اشعار سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے"

"یہ کیا کہتے ہو۔ فراق کو سبھی عظیم شاعر تسلیم کرتے ہیں" گاندھی نے سموسے کو تلی ہوئی شے ہونے کی وجہ سے قدرے حقارت سے دیکھتے ہوئے بھی کھانا شروع کر دیا۔

"ناصر کاظمی کی شاعری میں فراق کی شاعری کا آہنگ صاف سنائی دیتا ہے" اُس نے کہا۔ "اسی لئے ہم اُسے 'گریٹ پوئٹ' نہیں کہہ سکتے۔ وہ میر کا چربہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اُس کا لب و لہجہ مستعار لیا ہوا ہے جس کے پاس اپنا کچھ نہیں اُسے Establishment ماننا انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل ہے" کیفی اپنی ٹانگ کو اکٹھا کرتے ہوئے کراہنے لگا۔ "میرے خیال میں 'شب خون' والوں کو خط لکھ کر اُن کی رائے لی جائے"

"اُس بازیگر کی رائے کو پوچھتا کون ہے۔ کرتب دکھانے والے کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی" راز نے جھنجھلاتے ہوئے صوفے کی پشت کو ٹھکرا دیا۔

"میرے خیال میں آدمی ذہین ہے۔ بد نیت ہو تو بات دوسری ہے" کیفی مسکرایا۔

"سب بکواس ہے۔ 'شب خون' میں جو کچھ چھپتا ہے اسے پڑھ کر لگتا ہے عریاں نسل کشی پر تُلا ہوا ہے" گاندھی نے چائے کے پیالے کو لبوں سے لگائے بغیر میز پر رکھ دیا۔

"اپنی ذہانت کا سکّہ جمانے کے لئے مغربی اور امریکی ادیبوں اور نقادوں کی باتوں کو دہرانے سے بات نہیں بنتی۔ اوٹ پٹانگ باتیں لکھ کر جاہل اور خام دماغ لوگوں پر ہی رعب ڈالا جا سکتا ہے۔ نظم اور غزل کے خالص ڈھانچے مہیا کر کے وہ نئے لکھنے والوں کی انفرادیت اور ادبی اور فنی حِس کو ذبح کر رہا ہے۔" راز تلملانے لگا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی" کیفی نے راز اور گاندھی کی جانب حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ "چھپنے کا شوق ہر شاعر اور ادیب کو کسی نہ کسی پرچے کے ایڈیٹر کے زیرِ ہدایت ہو کر لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ 'شب خون' بھی اپنے معیار کا مقاصد رکھتا ہے۔ ادیب قطار در قطار اندھے غار میں اگر رہے ہیں تو اسے ادب و آرٹ کی خدمت کرنا نہیں کہتے" گاندھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"میرے خیال میں یہ بحث چھوڑ کر تم سب اپنی نئی نظمیں سناؤ۔" اُس نے

تنگ آگیا۔ ایسا پروپیگنڈہ مجھے قطعی پسند نہیں۔ ان باتوں میں جدت ہے نہ انفرادیت۔"

غزلیں سُن کر اُس نے زور کا قہقہہ لگایا تو باقی چاروں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ معاً ہیئت اور زبان کے لحاظ سے یکساں غزلیں سُن کر قہقہہ لگانے کی بجائے اُسے رونا چاہیئے تھا۔ اُن چاروں کے مُنہ پر طمانچے مار کر انہیں سمجھانا چاہیئے تھا کہ پچھلے دنوں اُس نے اپنے بیٹے راجو کو اس لئے بُری طرح پیٹا تھا کیوں کہ وہ ساتھ والے مکان میں آئے ڈائننگ ٹیبل کو دیکھ کر مچل پڑا تھا۔ اُسے یہ بات سخت ناگوار گزری تھی کہ اس کا بیٹا نقل کرے۔ ساتھ والے مکان میں اُس ٹیبل کے آنے سے پہلے وہ اُسے لانے کی ضد کرتا تو وہ اُسے شاباش دیتا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر الوداع کہے وہاں سے چل پڑا۔ "غلام، کم ظرف، پست ذہن نقال ۔۔۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔ اس دن نہ سہی چند روز بعد اسے ڈائننگ ٹیبل خریدنی ہی پڑی۔ اپنی انا کی لاش کو برہنہ حالت میں میز پہ پڑا دیکھ کر وہ بدحواسی کے عالم میں برسوں تک پھیلی ہوئی سنسان سڑک پہ بھاگتا ہوا جب شاردا بائی کے کوٹھے پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا دم پھول گیا ہے۔ یہاں آکر بھی اُسے محسوس ہوا کہ اس سے کوئی غیر ارادی فعل سرزد ہو گیا ہے۔ ایک بڑا سانحہ اس کے گلے میں رسّی باندھ کر اُسے یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ ماضی کا آسیب تادمِ حیات پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیفی کے پاس جانے سے ڈرنے والا بھلا شاردا بائی کے کوٹھے پر چڑھنے کی جسارت کر سکتا ہے؟ مگر آ ہی گیا ہے تو ۔۔۔

کالج سے نکلا تو دل و دماغ پہ ہلکے گرم ترنم نشے کی کیف آور دھند چھائی ہوئی رہنے لگی۔ یار دوستوں کے ساتھ جوان جسموں، لمبے گھنیرے بالوں، دہکتے ارمانوں اور بہکتے خیالوں کی باتیں کرتے کرتے نہ جانے اُسے کیا ہو گیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کا خواب دیکھنے لگا جو کوٹھے پر دھندا کرتے ہوئے بھی کسی ایسے نوجوان کی منتظر ہو جسے وہ اپنا ایک اچھوتا ارمان نذر کر سکے۔ جو اُس کے جسم کا خریدار نہ ہو کر اس کی روح کا مالک بن کر اس پر اپنا پورا حق جتائے۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں لمبی بے پناہ اُداسی کا خیال کر کے وہ عجیب و غریب احساس میں ڈوبا رہنے لگا۔

اسے سب کچھ پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا اور تمام کائنات اُداس شگفتگی میں نہائی نظر آنے لگی۔

ایک رات وہ اکیلا ہی شاردا بائی کے کوٹھے پر چلا گیا۔ وقت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہال میں کوئی نہیں تھا۔ سازندے بھی چائے پینے یا پان کھانے کے لئے نیچے بازار میں اُتر گئے تھے۔ شاردا بائی آرام کمرے میں پلنگ پر لیٹی اپنے قریب بیٹھی بڑی بائی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ سُن کر بڑی بائی نے پوچھا، کون ہے۔

اپنے خیال میں مست، بنا جواب دیئے کمرے میں داخل ہو کر وہ چپ چاپ وہاں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"آپ باہر تشریف رکھتے تو ۔۔۔" بڑی بائی کے فقرہ پورا کرنے سے پہلے ہی اُس نے نوٹ اس کی جانب بڑھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑکی صرف گانا سناتی ہے۔ دوسرا دھندہ ۔۔۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

بڑی بائی اس جانب مسکراتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور وہ شاردا بائی کے تازہ پھول کی طرح کھلے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"آپ پریشان دکھائی دیتے ہیں؟" کمرے کی فضا نغمہ بار ہو اٹھی۔

"نہیں تو۔" وہ سنبھل گیا۔

"پھر یہ خاموشی کیوں۔ نگاہوں میں کریدتا تجسس کیا؟"

"میں تمہارے خوبصورت جسم میں سمائی روح میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" شاردا کی غزالی آنکھیں سنجیدہ ہو کر اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"کیا تمہیں اُداس ہونا آتا ہے؟" اس نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔

"اُداس ہونے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے کیا؟" وہ حیران ہونے لگی۔

"میرا مطلب ہے، ان دلفریب آنکھوں کا اداسی سے کوئی سروکار ہے یا نہیں۔"

اس کی بات سُن کر شاردا بائی اس کی طرف دیکھتی ہوئی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی: "ایک ویشیا سے زیادہ اُداس انسان دنیا میں دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی کے المیے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اوپر سے چاہے کیسی بھی لگے، اس کے اندر کا سناٹا اُسے سوائے غم اور اُداسی کے کچھ نہیں دیتا۔ ہر شئے اپنے مرکز سے بندھا

رہنے ہی میں اپنی نجات سمجھتی ہے۔ مگر ولیشیا جیسی نکھری ہوئی عورت لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھتے ہیں" شاردا کی آنکھوں میں یاسیت اور اپنی من چاہی اُداسی کو دیکھ کر وہ بے قابو ہونے لگا۔

"کیا میں تمہاری آنکھوں کو چوم سکتا ہوں؟"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ کو غیر معمولی احساسات سے دوچار ہونے کا عشق ہے تو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیوں۔"

"میں ہر کسی کے لئے اُداس نہیں ہو سکتی۔ آپ کی چھوٹی سی لغزش یہ بھرم توڑ دے گی۔ میں آپ کے تئیں کاروباری انداز اپنانے کے لئے مجبور ہو جاؤں گی۔ آؤ ہم دونوں اُداسی کے سمندر کی گہرائی میں اُتر جائیں۔ تہہ پر پہنچ کر سب کچھ آپ کا ہو جائے گا۔" شاردا کو خواب آلود آواز میں بولتے سُن کر وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ اُسے لگا دنیا کی ہر شے ساکت ہو کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی حالت کا اندازہ کر کے شاردا نے کہا۔ "اب آپ جائیں۔ کبھی ٹھیک سمجھیں اور ہمت کر سکیں تو آ کر مجھے لے جائیں۔ میں آپ کی راہ دیکھوں گی۔ سمندر کی تہہ کو چھوئے بغیر میرے پاس آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جس منزل و دھن کی آپ کو تلاش تھی میں نے آپ کو دے دیا ہے۔ اسے اپنی مکتی کا سادھن بنانا آپ کا کام ہے" شاردا خاموش ہو گئی اور وہ بے خودی کے عالم میں لوٹ آیا۔

جس بات کی اُسے قطعاً اُمید نہیں تھی وہ اس طرح اور اتنی آسانی سے ہو جائے گی، اُسے یقین نہیں آیا۔ مگر حقیقت کو خواب ماننا ممکن نہیں تھا ولیشیا کی عظمت نے اُسے انسانی وجود کی جس لطافت سے روشناس کرایا اُس کے طفیل اُسے ہر طرف نور ہی نور بکھرا ہوا نظر آنے لگا۔ اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنائے رکھنے کے لئے وہ بے چین رہنے لگا۔ مگر شاردا بائی کو بیوی بنا کر گھر لانا اُس کے لئے کڑا مسئلہ تھا۔ وہ دن رات اپنے آپ کو سمجھانے اور ماں باپ سے بغاوت کرنے کی ہمت باندھنے لگا ہر قسم کی کتابوں کی ورق گردانی کرنے اور کسی سے اس مسئلے پر رائے لینے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ انسان کبھی من مانی نہیں کر سکتا۔ ہر جگہ بندھن ہی بندھن ہیں۔ اخلاقیات، سماجیات، دینیات کی آہنی زنجیریں اسے جکڑے ہوئے ہیں۔ کتابیں راستوں کا تعین کرتی ہیں، کوئی بھی شخص اندھا ہو کر اپنی راہ نہیں چن سکتا۔ آزادی ایک واہمہ ہے۔ لاابالی پن، بے لچی، بے تکا پن اپنی قیمت مانگتے ہیں۔ جسے ادا کرنے کی طاقت کسی میں نہیں ہوتی۔ انفرادیت سے مہنگی کوئی شے نہیں ہے۔ کبھی خون، کبھی ماحول، کبھی ماضی، کبھی مستقبل ہیں روکتا ٹوکتا، توڑتا، مروڑتا رہتا ہے۔

شاردا بائی نے اُداسی کے جس سمندر کے کنارے اُسے لا کھڑا کیا ہے، اُس کی گہرائی کی انتہا نہیں ہے وہ اس کی تہہ تک تبھی پہونچ سکتا ہے، جب ساری رسّیاں کاٹ کر اپنے گلے میں خود مختاری کا بھاری پتھر باندھ لے۔ جہاں تہاں گھومتا ہوا لمبے عرصے تک وہ رسّیاں کاٹنے اور پتھر باندھنے کے لئے حوصلہ اور ہمت بٹورتا رہا۔ مگر ہر طرف سے ہر طرح مایوس ہو کر اُس نے اُداسی کے بیکراں سمندر کی جانب پیٹھ پھیر لی۔

شاردا بائی کی منتظر آنکھوں میں بسی بے پناہ اُداسی کو یاد کر کے وہ لوٹنے لگا تو پژمردہ اور مضمحل سا تھا۔ اسے محسوس ہوا اس کا سانس رُکنے لگا ہے۔ اپنے آپ کو اپنے اندر پھیلتی گھٹن سے آزاد کرانے کے لئے وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا مگر کمرے میں پھیلا اندھیرا اسٹک کے ہر موڑ پہ اور ہر چوک میں لگی ہوئی ٹیوب لائٹس کی مانند آنکھیں جھپکانے لگا تو اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ تبھی اس کی بیوی نے اپنا نیند آلود ہاتھ اس کی پیٹھ پہ رکھتے ہوئے خمار آلود آواز میں کہا۔ "لگتا ہے کسی کہانی کا خاکہ مکمل ہو گیا ہے۔ اب سو جاؤ۔ صبح اُس میں رنگ بھر لینا" اور وہ بدحواس سا اُس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

(بقیہ افسانہ "بیوی" صفحہ ۱۲)

تصویریں آویزاں تھیں۔

"واقعی۔"

"مسٹر داس گپتا ہنسے۔ یہ سُن کر آپ حیران ہوں گے۔ کہ ہر سال پوجا۔ نیا سال اور مسٹر سرکار کی سالگرہ کے موقع پر انجلی انہیں خط لکھ کر سلام اور نیک خواہشات ارسال کرتی ہیں۔"

○

گوشۂ فکر تونسوی

فکر تونسوی

فکر بیتی

میرے جنم پر دیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے کیونکہ وہ جشنہ کے راج محل پر پھول برسانے میں مصروف تھے۔ وہاں ایک شہزادے نے جنم لیا تھا ——— یعنی جنم سے ہی میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے ——— اب تک کشیدہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہزادے اور ادیب کو ایک ہی تاریخ اور ایک ہی نکشتر میں پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ سے آپ قانونِ فطرت کا نقص بھی کہہ سکتے ہیں لیکن دیوتاؤں کا رول بھی غیر شریفانہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ انھیں پھولوں کے استعمال کا مناسب ڈھنگ آنا چاہئے تھا۔ اور اگر نہیں آتا۔ تو خدا کو کچھ انٹیلیجنٹ دیوتا پیدا کرنے چاہئیں۔

میں تونسہ میں پیدا ہوا۔ اگر تونسہ میں پیدا نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں پیدا ہو جاتا۔ ٹمبکٹو بھی کوئی بُری جگہ نہیں تھی لیکن ہر جگہ مجھے فکر ہی کہا جاتا اور ہر جگہ میرا باپ چودھری سرائن سنگھ کا میر منشی دعنیت رائے ہی ہوتا جس کے گھر خلاف توقع ایک ادیب جنم لیتا۔ اور دیوتا پھول نہ برساتے۔ صرف اس ٹیکنیکل وجہ سے کہ میر منشی کی چھت کے نیچے ڈیڑھ سو کمرے نہیں ہیں۔ صرف ڈیڑھ کمرہ ہے۔

بیس برس بعد میرے باپ نے مجھ پر انکشاف کیا۔ "تمہارے پیدائش کی خبر مجھے جیتو ساربان نے سنائی تھی۔ تو میرے مُنہ سے صرف اتنا نکلا تھا" یہ ساتواں بچہ ہے اور شاید بھائیوں کی طرح بھوکوں مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔"

لیعنی میرے والد (محترم) کے لئے میری پیدائش کی اہمیت صرف ہندسوں تک محدود تھی۔ پانچواں' چھٹا' ساتواں ——— نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے ——— آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔

ہندسوں کو تو انسان کا مقدر نہیں بننا چاہئے۔

مگر جیتو ساربان مجھے ہندسہ نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ایک بچہ سمجھتا تھا' جس میں معصومیت ہوتی ہے۔ وہ گاؤں میں واحد شخص تھا جس نے مجھے پیار سے دیکھا' محلے میں گڑ کی ٹانگری بانٹی' اور اتنا سوچنا بھی بے معنی سمجھا کہ وہ ایک سستی اور گھٹیا چیز بانٹ رہا ہے۔ وہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ خوشی بانٹنی چاہئے۔ چاہے وہ سستی اور گھٹیا ہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر ایک دن مجھے یوں لگا۔ جیسے جیتو ساربان کی بیٹی بھاتو جوان ہو گئی ہے اور بھاتو کو دیکھتے ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور جوان ہو گیا اس چھلانگ پر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی ہوئی۔ اور یہ مسرت نیچرل تھی۔ نیچر نے ہم دونوں کے ہونٹوں پر گلاب کھلائے اور میرے باپ اور جیتو ساربان کی داڑھی میں سفید بال اُگ آئے اور میں نے بھاتو کے گھڑے پر ایک ہلکا سا "ٹن!" کنکر پھینکا۔ جسے اٹھائے ہوئے وہ کنوئیں سے آرہی تھی اس "ٹن" سے اس کے سر اور چھاتی میں ایک دلکش تناؤ آگیا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی" بھاتو نے تن تناتی چھاتی کو پلّو سے ڈھانپ کر کہا۔

"آتی ہے" میں مُسکرایا۔

وہ منہ پھیر کر شرما گئی۔ تاکہ شرمانے کی اوٹ میں مُسکرا سکے۔

اور پھر کئی دن تک ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کی بھاشا سمجھتے رہے اور پھر دل ہی دل میں اعلان کیا کہ یہ پیار کی بھاشا ہے اور اس پیار میں جیتو ساربان

کو ذہنی معصومیت نظر آئی جو ایک بچے میں ہوتی ہے اور اُس نے میرے باپ سے کہا۔ "میر منشی! تمہارا بیٹا میری بھاتو کے گھڑے پر کنکر پھینکتا ہے۔"

"اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہمارا خاندان شریف ہے۔" میرے باپ کا خیال تھا کہ جن بچوں کو باسی سُوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھلائے جائیں وہ بھی شریف خاندان کے بچے کہلا سکتے ہیں شرافت باسی ٹکڑوں کی زرخرید غلام نہیں ہوتی۔

میرا باپ ایلوژن میں خوش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ مگر اس خوشی کو نمبردار کے لڑکے داؤد خاں نے ایک دن زبردست جھٹکا دیا۔ جب بھاتو شباب کا سر غرور بلند کئے کنوئیں سے آ رہی تھی۔ اور میرے کنکر کا انتظار کر رہی تھی تو داؤد خان نے اپنی ریشمیں قمیص کے بازو بھاتو کے راستے میں پھیلا دئیے۔ وہ بازو کنکر نہیں تھے۔ بلکہ داؤد انھیں آغوشِ محبت سمجھ رہا تھا۔ اُس نے بھاتو کو چیلنج دیا: "مجھ سے عشق کرو۔ ورنہ....."

"ورنہ.....؟" بھاتو نے ورنہ "ہُنہ!" کے لہجے میں کہی۔ ایسی "ہُنہ" وہ گاؤں میں سوائے میرے ہر ایک سے کہہ سکتی تھی مگر جیتو سارباں کے پاس صرف دو اونٹ تھے۔ اور نمبردار کے پاس تین گھوڑیاں، پانچ بیل اور چھ شکاری کُتے تھے۔ ان سبھوں نے مل کر بھاتو کو سوتے میں اٹھایا اور ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے۔ اور پھر پہاڑی کھوہ سے کچھ چیخیں سُنائی دیں۔ اور اُلّوؤں نے منحوس آوازیں نکالیں اور پہاڑی کوّے کُرلاتے ہوئے کھوہ سے بھاگ گئے اور میری چھت پر آ گئے ——— یہ عشق کی اور معصومیت کی اور اس رُوح کی توہین تھی جسے آگے چل کر شاعر اور ادیب کے قالب ڈھلنا تھا۔

"ایسا کیوں؟ آخر کیوں —؟" میں نے باپ سے پُوچھا، جیتو سارباں سے پُوچھا۔ دونوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا: "ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا! یہ جگ کی ریت ہے، جس میں نمبردار اور تھانیدار ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مُرغی کھاتے ہیں۔ اور جن کے بچے باسی ٹکڑے کھاتے ہیں مُرغی اُن کی فریاد نہیں سُنتی۔"

اور پھر میں راتوں رات گاؤں سے بھاگ گیا۔ اور گاؤں میں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں ایسے جگ کو بدل دوں گا اور مُرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹا دوں گا۔ بھاتو کو بھی نہیں بتایا ——— کیسے بتاتا؟ اُس نے تو کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ باسی ٹکڑے نے اپنی توہین کے بدلے خودکشی کر لی تھی۔

چنانچہ خودکشی سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ ایسی بھاتو سے بھی بگڑ گئے جو خودکشی کر کے سمجھی ہے کہ اس سے تھانیدار اور نمبردار کے دسترخوان سے مُرغی بھاگ جائے گی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا۔ کہ میری ننھی معصوم بچّی راج رانی، جس کے پاس نہ راج تھا نہ وہ رانی تھی۔ صرف ایک گلاسڑا کیلا اور کتابیں تھیں۔ جسے وہ بستے میں باندھے اسکول جا رہی تھی کہ یکایک خطرے کا ہارن بجا، آسمان پر ہوائی جہاز منڈلانے لگے۔ ان ہوائی جہازوں میں کوئی بستہ، کیلا اور کتاب نہیں تھی بلکہ بم تھے۔ اور اُنھوں نے کہا کہ یہ جنگ ہے۔ اور اگر تم اسکول جاؤ گی تو ہم پھینک کر ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ کیونکہ ہم نے کتابیں پڑھ کر ہی یہ بم بنائے ہیں ——— اور معصومیت پر یہ بم مجھے یوں لگا جیسے نمبردار کا لڑکا داؤد خاں، بھاتو کے گھڑے پر اپنے گھوڑے کا سُم مار کر کہہ رہا ہو۔ "مجھ سے عشق کرو ورنہ....."

اور مجھے غصّہ آ گیا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ غصّہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر میں نے لاؤڈ اسپیکر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور گاؤں گاؤں گھومنے لگا: "ہم امن چاہتے ہیں۔ امن ——— کس کے لئے؟ ننھی راج رانی کے لئے، اُس کے بستے کے لئے، بڑا لڑکی کے قاعدے کے لئے معصوم آنکھوں میں گنگنا تے شیگو ر اور کالی داس کے لئے.....؟"

اور گاؤں کے اُوبڑ کھابڑ راستوں پر مجھے کانٹے چبھے، جھاڑیوں نے اُلجھایا، کیچڑ نے لت پت کیا، سُوکھی سڑی چائے، اُبلتی بُھوک اور ہونٹوں کی پپڑیوں نے مجھے جھانسے دئیے کہ یہ مقدّس کاز ہے، ہسٹری پلٹا کھائے گی اور مُرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹ جائے گا اور کسی بھاتو کا گھڑا خودکشی نہیں کرے گا۔ اور پھر ہوائی جہاز کا بم شرم سے پگھل جائے گا اور معصوم راج رانی کا گلاسڑا کیلا ایک سیب میں بدل جائے گا۔

اور اُس سیب پر ٹیگور کی گیتانجلی لکھی جائے گی۔

لیکن جب میں امن کا لاؤڈ اسپیکر کاندھے پر رکھے چل رہا تھا تو ایک ٹیلے پر مجھے بابا گوردھن سنگھ ملا جو پندرہ برس تک کیلے کو سیب میں بدلنے کی خاطر جیل میں رہا تھا۔ اُس کی معصوم بھانو کو بھی کسی نے بم سے ہلاک کر دیا تھا اور وہ غصّے میں آ کر غدری بابا بن گیا تھا اور امریکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں سے دخانی جہاز میں بندوقیں بھروا یا تھا مگر جہاز کو بابا اور بندوق سمیت انڈمان جیل کی دلدل میں پھینک دیا گیا تھا ایسا تھا بابا گوردھن سنگھ ـــــ اُس نے میرے کندھے پر امن کی فاختہ کو بیٹھے دیکھ کر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تم بیوقوف ہو ینگ مین!"

کیا امن کی صدا لگانا بے وقوفی ہے بابا؟"

"کیسا امن؟ کس کے ساتھ امن؟ وہ نتھنے پھڑ کا کر بولا۔" جو لوگ شکاری کتّے چھوڑ کر ٹیگور کی گیتوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ اُن کے ساتھ ہم امن سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ مرغی کو تم نے پالا ہے۔ مگر اُسے نمبردار کا بیٹا تھانیدار کے ساتھ بیٹھ کر کھا جاتا ہے۔ کیا ہم اس کے ساتھ امن سے رہیں! تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

"چوہدری نرائن سنگھ کا میر منشی تھا"

"بس وہی! اُس نے امن کا لاؤڈ اسپیکر زور سے گرا دیا۔" تمہارے چہرے پر جوانی میں جو جھرّیاں ہیں۔ وہ اسی نرائن سنگھ نے ڈالی ہیں۔ یہ جھرّیاں جب مٹ سکتی ہیں جب ہم نرائن سنگھ سے جنگ کریں گے۔ امن نہیں۔"

کیا بابا گوردھن سنگھ میرے باپ کی طرح اپوزشن میں خوش رہنا جانتا تھا؟ چند ماہ بعد سُنا کہ بابا گوردھن کے تعاقب میں پولیس نے اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر گولی چلا دی۔ الزام یہ تھا کہ اُس نے کسی چوہدری نرائن سنگھ کی جاگیر میں آتشیں اسلحہ دبا رکھا تھا تاکہ اس کی فصل بھک سے اُڑ جائے ـــــ اُس وقت سے امن سے بھی میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اب تک کشیدہ چلے آ رہے ہیں۔

کیا میں تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے ہی اِس دنیا میں آیا تھا۔؟

نہایت احترام سے یہ سوال میں نے جمنی داس رنگ ساز سے کیا۔ جو مجھ سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیتا تھا اور دو آنے روزانہ دیتا تھا۔ میں اُس کی بھارت رنگ ساز کمپنی میں حسیناؤں کے دو پٹّے اور معززین کی پگڑیاں ـــ نارنجی' گلابی' سُرمئی رنگتا تھا کیونکہ مجھے بھوک لگتی تھی اور کمپنی کو اس بھوک کا علم تھا۔ دو آنے میں دال روٹی تو ملتی تھی۔ لیکن آلو گوبھی کی سپیشل سبزی نہیں ملتی تھی۔ ڈھابے کے مالک سری چند کو میں نے لاکھ سمجھایا کہ سپیشل سبزی کے لئے میرا مَن بے حد للچاتا ہے۔ لیکن وہ کہتا۔ لالچ بُری بلا ہے' شاستروں میں اِسے پاپ کہا گیا ہے

میں نے سوچا' شاستر شاید دو آنے روزانہ پانے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے۔

مُسلسل لالچ سے بور ہو کر ایک دن میں نے جمنی داس سے کہہ دیا۔" ماسٹر جی! کبھی کبھی یُوں لگتا ہے' جیسے میرے اور آپ کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔"

وہ بولا۔" کوئی ہرج نہیں۔ میرے تعلقات تو اُس سپاہی سے بھی کشیدہ ہو گئے ہیں جو مجھ سے پانچ روپیہ ماہانہ رشوت لیتا ہے۔ تم کیا ہو تم کو تو اتنا شعور نہیں کہ نارنجی اور نیلا رنگ ملنے سے کون سا رنگ جنم لیتا ہے' قرمزی یا بادامی۔"

میں نے کہا۔" میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تھانیدار کا رنگ جب کرسی نشین کے رنگ میں ملتا ہے تو مچھلی کا رنگ جنم لیتا۔ جیسے آپ ہر شام سامن مچھلی فروش سے خرید کر کھاتے ہیں۔"

یہ سُن کر جمنی داس نے مجھے فحش گالی دی۔ اور ملازمت سے الگ کر دیا۔ اور کہا۔ تم دو پٹّے رنگنے کا فن کبھی نہیں جان سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم بگڑی اور دوپٹّے کی توس قزح پر ایک نظم لکھ سکتے ہو۔

بلندا ہمکو! اور بھیوں!

میں نے تھانیدار سے رپورٹ کی۔ اُس نے کہا "اگرچہ پی العمال جمنی داس سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ لیکن رنگوں کے متعلق اُس کا نقطۂ نگاہ صحیح ہے۔ وہ رنگوں کی بھانت زیادہ سمجھتا ہے جبھی تو مچھلی کھاتا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں تھانیدار پر اپنی مخفیہ اُنڈیلی۔ اور بھاگ گیا' بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا حتیٰ کہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔

دراصل بھاگتے بھاگتے میں تیل جنبیلی سپیشل کی فرم کے قریب سے گذر رہا تھا جس کے مالک دھومی مل نے مجھے لپساندگی سے ہونکتے دیکھ کر میرے ہاتھ میں برش اور سیاہی کا ڈبہ پکڑا دیا کہ ہمارے تیل کا اشتہار شہر بھر کی دیواروں پر لکھ آؤ۔ تم بہت ترقی کر جاؤ گے۔ جس آدمی کو دو لقمے مل جائیں اُسے ترقی کہتے ہیں۔

مگر میں نے سوچا کہ دو لقمے بانٹنے کا سہرا اُنھیں ملتا ہے جو تیل کی ساخت میں گاہکوں سے فسراڈ کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے دھومی مل نواڑ سے کہا۔ مجھے چار آنے عنایت کر دیجئے کیونکہ آج خطرہ ہے کہ اشتہار لکھتے لکھتے مجھے بھوک لگ جائے گی۔"

وہ بولا: "میرے بزنس کا اصول ہے کہ مزدور کو جب پسینہ آ جائے اُسے اُجرت دے دو۔ لہٰذا جاؤ' پہلے پسینہ پیدا کرو۔"

میں نے کہا۔ "بڑا زریں اصول ہے۔ بہذا یہی سہی!"

"بڑا ہی ہے" اُس نے میری تائید کی۔

اور پھر دن بھر مٹی چھینے کی انگارے اُگلتی دھوپ میں دیواریں لکھتے لکھتے مجھ پر ہندوستان بھر کا افلاس گذر گیا۔ مجھے پسینہ آیا' پڑیاں جمیں' آنکھوں میں چنگاریاں تڑتڑائیں۔ جسم میں پے در پے تھرتھریاں آئیں۔ ہر مسام سے بھوک کے پھول اُگے' نروس سسٹم کو سیکڑوں جھٹکے آئے' اور میں دھومی مل کی فرم سے دس بارہ گز کے فاصلے پر غش کھا کر گر پڑا۔ میرا پسینہ دھومی مل نے دیکھا یا نہیں۔ لیکن جب چھتیس گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں ایک فلیٹ میں لیٹا تھا اور ہماچل دیش کی ایک حسینہ مجھے پنکھا جھل رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم جیتو سارباں کی بیٹی بھاتو ہو؟"

وہ پہاڑی جھیل سے اپنی ٹھرتی چھاتیاں چھپاتے ہوئے بولی: "پہلے تم بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے۔ مجھے تم پر پیار آ رہا ہے۔ مجھے دلہن بنا کر گھر لے چلو!"

میں نے کہا۔ "اس دنیا میں جنم لیتے ہی میرا گھر کھو گیا۔ جب تک میں اُسے تلاش نہ کر لوں اُس وقت تک تم میری دلہن بننا ملتوی کر دو۔"

لیکن اُس نے بتایا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ دو چار منٹ میں کسی کی دلہن بننا چاہتی ہے۔ ورنہ وہ حرامی نوسرباز آ جائے گا۔ جو مجھے بہکا کر لایا ہے کہ میں تمہیں شہر کی راجکماری بنا دوں گا۔ لیکن یہاں لا کر اُس نے میرے کنوارپن کا ریٹ مقرر کر دیا۔ اس لئے آؤ... آؤ' ریٹ کی اس دنیا سے بھاگ چلیں اور کسی پہاڑی کھوہ میں بیٹھ کر دُلہا دلہن کا ازلی گیت گائیں۔

اور میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کل جب وہ نوسرباز نشے میں میرے رخسار کو گنڈیری سمجھ کر چوس رہا تھا تو کہہ رہا تھا۔ میں انسانیت پرست ہوں۔ اس بے ہوش چھوکرے کو سڑک سے اُٹھا لیا کیونکہ اس کی ناک بڑی معصوم ہے' مجھے دھوکا نہیں دے گی۔ میں دھوکے والی ناکوں کی خوب پہچان رکھتا ہوں' میں اسے اپنا شاگرد بناؤں گا۔

مگر پھر دُلہا دلہن کے بھاگنے سے پہلے چھاپہ مار پولیس آ گئی اور نوسرباز کے شاگرد کو گرفتار کر کے لے گئی اور پھر نوسرباز کو زندگی بھر نہ پکڑا گیا' پولیس کو اُس کی اور میری ناک کی پہچان نہیں تھی۔ جبھی ناک اور پولیس سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے — آج تک کشیدہ چلے آ رہے ہیں۔

اور پھر مجھے یاد نہیں۔ میں کب مر گیا اور جیسے مجھ پر صدیاں گذر گئیں۔ ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے انسانی کارواں گذر گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کچھ گھاؤ ہیں' کچھ پڑیاں ہیں' کچھ انگارے ہیں جو میرا مسلسل تعاقب کرتے ہیں۔ اُنھوں نے گیا کے جنگل میں مجھے روک لیا' وہاں شاید ایک

(باقی صفحہ ۸۲ پر دیکھئے)

مُجتبیٰ حسین

فکر تونسوی ۔ بھیڑ کا آدمی

گذشتہ دس برسوں میں ملک نے کتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے؟ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج سے دس برس پہلے میں؛ فکر تونسوی کا ایک ادنیٰ سا مدّاح اور پرستار تھا ۔ اور آج دس برس بعد میں اُن کی کتاب کیلئے اُن کا "تعارف" لکھ رہا ہوں ۔ ذرا سوچئے کہ ملک نے واقعی کتنی ترقی کی ہے ۔

دس بارہ برس پہلے میں "ملاپ" میں فکر تونسوی کا کالم "پیاز کے چھلکے" کچھ ایسی پابندی سے پڑھا کرتا تھا، جیسے کوئی پابندی سے گیتا کا پاٹھ کرتا ہے ۔ محض "پیاز کے چھلکے" کی خاطر میں "ملاپ" کی سالم کاپی خریدا کرتا تھا جیسے کسی لڑکی کے گال پر "خوشنما سیاہ تل" کو دیکھ بعض ناعاقبت اندیش نوجوان "سالم لڑکی" سے شادی کر لیتے ہیں ۔ فکر تونسوی آج بھی میرے لئے ادب کے گال پر "سیاہ تل" کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپریل ۱۹۶۲ء میں ڈرتے ڈرتے انھیں پہلا خط لکھا تھا ۔ سوچا تھا کہ فکر تونسوی اتنے بڑے ادیب ہیں مجھ جیسے آدمی کے خط کا کیا جواب دیں گے ۔ مگر تیسرے ہی دن جب مجھے فکر تونسوی کا جواب مل گیا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ واقعی بڑے ادیب نہیں ہیں ۔ بلکہ مجھے شاید کوفت بھی ہوئی کہ آخر اتنے دنوں تک میں فکر تونسوی کو اتنا بڑا ادیب سمجھتا رہا ۔ پھر اُس کے بعد اُن سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی (خط وہ لکھتے تھے اور "کتابت" میں کرتا تھا) یہ خط و کتابت بڑی حد تک عشقیہ خط و کتابت کی تعریف میں آتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ؎

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

اگست ۱۹۶۶ء میں مجھے دہلی جانے کا موقع ملا ۔ جس دن دہلی پہونچا اُسی شام کو کناٹ پلیس کے "ٹی ہاؤس" میں یوں ہی چائے پینے چلا گیا چائے پی ہی رہا تھا کہ سامنے والی میز پر مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جو ___ HUNCH BACK OF NOTRE DAM سے بڑی مشابہت رکھتا تھا ۔ میں دل ہی دل میں قدرت کی ستم ظریفی پر ہنستا رہا کہ وہ کیسی کیسی صورتیں بنا کر دنیا میں چھوڑ دیتی ہے ۔ ابھی میں اُس شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے اُس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ۔ پھر سوچا کہ ہنچ بیک آف ناترے ڈیم؛ چونکہ میں پڑھ چکا ہوں "شاید اُسی ناول میں" میں نے اسے دیکھا ہو ۔ کبھی کبھی ادب بھی تو زندگی سے قریب ہو جاتا ہے ۔ میں دماغ پر زور دے ہی رہا تھا کہ مجھے اچانک کسی رسالہ میں چھپی ہوئی فکر تونسوی کی تصویر یاد آ گئی ۔ اُس شخص کا حُلیہ فکر تونسوی کے حُلیہ سے بہت ملتا جلتا تھا (بشرطیکہ اُسے حُلیہ کہا جا سکے) فکر تونسوی کے حلیہ کی بابت یہ عرض کر دوں کہ اُن کے چہرہ پر دو آنکھیں ہیں؛ دو کان ہیں؛ ایک ناک بھی موجود ہے؛ تھوڑی بہت پیشانی بھی ہے؛ گال بھی بقدر ظرف موجود ہیں ۔ کسی زمانہ میں اُن پر گوشت پوست بھی رہا ہوگا ۔ غور سے دیکھا جائے تو ہونٹ بھی نظر آ جاتے ہیں ۔ ان ساری باتوں کے باوجود اُن کے حُلیہ کی خوبی یہ ہے کہ اُن پر آدمی ہونے کی تہمت لگائی جا سکتی ہے ۔ اُن کے حُلیہ میں اگر کوئی نمایاں شئے ہے تو وہ اُن کا قلم ہے ۔ فکر تونسوی اُس وقت تک خوبرو نظر نہیں آتے جب تک کہ اُن کے حُلیہ میں اُن کے قلم کو بھی شامل نہ کر دیا جائے (ملاوٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے) بلکہ بعض اوقات تو وہ صرف "قلم ہی قلم" نظر آتے ہیں ۔

بہرحال جب مجھے گمان ہوا کہ یہ شخص فکر تونسوی بھی ہو سکتا ہے تو میں اپنی کرسی سے اُٹھ کر اُس کے پاس گیا ۔ پھر بڑے ہی نرم لہجہ میں پوچھا ___ کیا آپ فکر تونسوی ہیں؟"

"ہاں جی"۔ اس شخص نے نہایت کرخت پنجابی لہجہ میں جواب دیا۔

بس پھر کیا تھا میں اپنا تعارف کرائے بغیر اُن سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو فکر تونسوی نے کسی قدر شرماتے ہوئے پوچھا۔ "اور آپ کی تعریف؟"

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے کہا "اوہو! معاف کیجئے۔ میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں"۔

یہ سنتے ہی فکر تونسوی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "پہلی بار تم بغلگیر ہوئے تھے۔ اب مجھے بغلگیر ہونے کا موقع دو۔ بغلگیری دو طرفہ ہونی چاہئے۔ یکطرفہ نہیں"۔

اور اُس دن کے بعد سے آج تک یہ "بغلگیری" جوں کی توں برقرار ہے۔

فکر تونسوی کئی باتوں کی وجہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔ ادیب کی حیثیت سے میں انہیں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مضامین لکھتے ہیں۔ ادب میں آج تک کسی نے اس طرح مضامین لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر ہر گواہ یہ کہتا ہے کہ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں کہوں گا" اسی طرح فکر تونسوی اپنا ہر مضمون لکھنے سے پہلے اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ "جو کچھ لکھوں گا وہ سچ لکھوں گا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہ لکھوں گا"۔

گذشتہ پندرہ برسوں میں میں نے فکر تونسوی کے لاتعداد مضامین پڑھے ہیں اور ان مضامین میں مجھے ایک ہی چیز نظر آئی اور وہ ہے "سچ"۔ اور آپ جانتے ہیں کہ سچ بڑا کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے جو لوگ فکر تونسوی کے مضامین کو پسند نہیں کرتے وہ یقیناً ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سچ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "سچائی" آدمی سے بڑی بھاری قیمت وصول کرتی ہے۔ سقراط کو بالآخر زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ فکر تونسوی پھر بھی اس معاملہ میں خوش قسمت ہیں۔ لیکن "سچائی" نے جو اُن کی حالت بنا رکھی ہے اُس کے اظہار کے لئے مجھے وہ واقعہ سُنانا پڑے گا جسے میں نے اب تک راز میں رکھا ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ فکر تونسوی کے ایک دوست کے کھوتی ماموں فکر تونسوی کے ہم محلہ تھے مگر دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن فکر تونسوی نے باتوں باتوں میں اپنے دوست سے پوچھا "یار! تم ہمیشہ اپنے ماموں کا ذکر کرتے ہو اور یہ بھی کہتے ہو کہ وہ میرے ہی محلہ میں رہتے ہیں مگر تم نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہیں اور کیسے ہیں تاکہ میں انہیں پہچان سکوں"۔ اُن کے دوست نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے ماموں کے "حدود اربعہ" اور "محل وقوع" کی صراحت کی تو فکر تونسوی نے اُن کے ماموں کو پہچانتے ہوئے کہا "اے یار! کہیں وہ صاحب تو تمہارے ماموں نہیں ہیں جو ہر روز صبح میں "ملک ڈپو" سے پانچ لیٹر دودھ لے جاتے ہیں"۔ اُس پر دوست نے اقرارِ جرم کیا۔

چند روز بعد یہ صاحب اپنے ماموں کے پاس گئے تو اُن کے ماموں نے پوچھا "تم ہمیشہ فکر تونسوی کا ذکر کرتے رہتے ہو۔ یہ بھی کہتے ہو کہ وہ ہمارے ہی محلہ میں رہتے ہیں۔ آخر یہ صاحب کون ہیں؟ کیسے ہیں؟ مجھے کچھ تو بتاؤ تاکہ میں انہیں پہچان سکوں"۔ فکر تونسوی کے دوست نے فکر تونسوی کا حلیہ بیان کرنا شروع کیا تو تھوڑی دیر بعد کھوتی ماموں نے اپنے صوفے سے اُچھل کر کہا "میاں! کہیں وہ صاحب تو فکر تونسوی نہیں ہیں جو ہر روز صبح "ملک ڈپو" سے پاؤ لیٹر دودھ لے جاتے ہیں"۔

اتفاق سے فکر تونسوی کے دوست میرے بھی دوست ہیں۔ ایک دن مجھ سے ملے تو کھوتی ماموں اور فکر تونسوی کی "پہچان" کے اس پیمانہ کا ذکر کیا۔ پھر کہا "خدا کے لئے فکر تونسوی سے ہرگز اس واقعہ کا ذکر نہ کیجئے۔ اُن کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی"۔

میں نے کہا "میں تو یہ واقعہ فکر تونسوی کو ضرور سُناؤں گا۔ وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ یوں بھی اُن کی ساری تحریروں میں "پانچ لیٹر دودھ والے آدمی کے خلاف" "پاؤ لیٹر دودھ والے آدمی" کے احتجاج کی آواز صاف سُنائی دیتی ہے۔ فکر تونسوی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایسے سماج میں رہتے ہیں جہاں آدمی کی پہچان "دودھ کے لیٹروں" سے کی جاتی ہے۔ فکر تونسوی کتنا ہی بڑا ادیب کیوں نہ ہو وہ سماج میں "پاؤ لیٹر دودھ" سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا

فکر تونسوی لیڈروں سے ناپے جانے والے اسی سماج کے خلاف لکھتے ہیں اور جی کھول کر لکھتے ہیں۔

پتہ نہیں فکر تونسوی نے کتنا لکھا ہے مگر جو کچھ بھی لکھا ہے اُس میں سماج کے کسی نہ کسی تضاد اور کشمکش کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جہاں تک اُن کے لکھنے کی رفتار کا تعلق ہے بعض احباب کا خیال ہے کہ آواز کی رفتار اور اُن کے لکھنے کی رفتار میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحے کہہ ڈالے بلکہ ایک صاحب کی رائے تو یہ بھی ہے کہ اگر فکر تونسوی لکھنے کی بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کرتے تو آج ملک میں "نیوز پرنٹ" کی اتنی قلت نہ ہوتی۔ "ملاپ" کا روزانہ کالم تو یہ لکھتے ہی ہیں، بیسیوں رسالوں کیلئے مضامین لکھتے ہیں، دوستوں کو خطوط لکھتے ہیں، گھر میں دھوبی کا حساب اور گھر کے اخراجات کا حساب لکھتے ہیں۔ غرض وہ کیا نہیں لکھتے۔ وہ اُن ادیبوں میں سے ہیں جو لکھنے پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ ایک کافی ہاؤس ہی ایسی جگہ ہے جہاں میں نے انھیں لکھتے ہوئے نہیں پایا۔ "ملاپ" کے دفتر اور اُن کے گھر پر جب بھی گیا تو انھیں حالتِ "تخلیق" میں پایا۔

چند سال پہلے جب اُن کے سیدھے ہاتھ اور سیدھے پاؤں پر فالج کے حملے کی اطلاع مجھے ملی تو مجھے بڑا صدمہ ہوا کہ اب یہ آخر کیسے لکھیں گے۔ وہ مضبوط ہاتھ جو سرمایہ داری، بے ایمانی، لوٹ کھسوٹ، فرقہ پرستی اور رجعت پرستی سے نبرد آزما تھا، اب وہ مات کھا گیا ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ فکر تونسوی بڑی قوتِ ارادی کے مالک ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہاتھ جب لکھنے کے قابل نہیں رہیں گے تو وہ ضرور پاؤں کی مدد سے لکھیں گے۔ مگر لکھیں گے ضرور۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں لکھنے سے روک نہیں سکتی۔ چند ہی دنوں بعد مجھے دہلی جانے کا موقع ملا تو مزاج پُرسی کے لئے اُن کے گھر گیا۔ سوچا تھا کہ اب کی بار فکر تونسوی کو اُن کے گھر پر لکھتے ہوئے نہیں پاؤں گا مگر جیسے ہی اُن کے دیوان خانہ میں پہونچا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن کے فالج زدہ ہاتھ میں ایک قلم ہے اور یہ قلم کاغذ پر ایک شرابی کی طرح لڑکھڑا لڑکھڑا کر کیڑے مکوڑوں کی سی شکلیں بنا رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اپنا فالج زدہ ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک بے جان لکڑی کی طرح گر گیا۔ اُس وقت وہ بات بھی بڑی مشکل سے کر سکتے تھے۔ ایک جملہ کہتے تھے تو بڑی مشکل سے دو چار الفاظ اُن کے منہ سے ادا ہو جاتے تھے۔ گویا ٹیلیگرام کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ کئی جملوں کے بعد یہ جملے میرے پلّے پڑے کہ "تم بہت اچھے وقت آئے۔ میں اصل میں تمہارے ہی بارے میں لکھ رہا تھا۔ میں نے آج ہی تو سے لکھنے کی مشق شروع کی ہے اور اتفاق دیکھو کہ تمہیں "تختۂ مشق" بنا رہا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنے لرزتے ہاتھ سے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ سچ مچ یہ ٹیڑھی میڑھی تحریر میرے ہی بارے میں تھی۔ میری خوب ساری تعریف و توصیف تھی۔ میں نے اُس کاغذ کو اُن سے لے لیا اور کہا "فکر بھائی! اب اس کاغذ کو میرے پاس ہی رہنے دیجئے۔ میں اسے اپنے پاس محفوظ رکھوں گا کیونکہ اسی تحریر سے آپ کے ہاتھ کے "نشاۃِ ثانیہ" کا آغاز ہو رہا ہے"۔ چنانچہ یہ تحریر اب تک میرے پاس محفوظ ہے اور اسے جب بھی دیکھتا ہوں مجھے اُس میں ایک سچے ادیب کی انا اور اُس کی "قوتِ ارادی" صاف جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس ادیب کا ہاتھ ظلم کے خلاف لڑنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ فالج کے ہر حملہ کو شکست دے دیتا ہے۔ آج فکر تونسوی کا ہاتھ اُتنا ہی مضبوط اور توانا ہے اور اُسی طاقت کے ساتھ حالات سے لڑ رہا ہے۔

اس سیدھے سادے اور عملی زندگی میں بڑی حد تک معصوم آدمی کو جب بھی دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر اس شخص میں اتنا STAMINA کہاں سے آگیا کہ برسوں سے لکھ رہا ہے مگر پھر بھی "خرچ" ہونے میں نہیں آتا۔ اس شخص کی ذات میں آخر طنز کے کتنے سر چشمے ہیں جو بس اُبلتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی تھم کر لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ جو ادیب روزانہ کالم نگاری کی اذیت سے دوچار ہو چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا پیشہ ہے۔ اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے مگر فکر تونسوی ہیں کہ پندرہ برسوں سے مسلسل لکھتے چلے جا رہے ہیں اور ہر بلا نئی چیز لکھ رہے ہیں۔ یوں بھی اردو ادب میں "سیاسی طنز" نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میدان میں انھوں نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ مقام شاید ہی کسی کو نصیب ہو سکے۔ بعض نقّاد فکر تونسوی کی تحریر کو "صحافتی تحریر" کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے نقّاد اصطلاحوں میں بھٹکنے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہی "صحافتی تحریر" جب پڑھی جاتی ہے تو کتنے دلوں کی دھڑکنیں اس سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ کتنے ادھ مانوں کا کلیجا

اس تحریریں چھلکنے لگتی ہیں ـــــ اور پھر کسی میں ہمت ہو تو اتنا کم کر بتائے جتنا کہ فکر تونسوی نے لکھا ہے۔ فکر تونسوی کا کمال یہ ہے کہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بنیاد بنا کر بڑے سے بڑا مضمون لکھتے ہیں۔ اور پھر مضمون بھی ایسا کہ جس میں ہر فقرہ کے بعد ایک نیا شرارہ چمک اٹھتا ہے۔ ایسا تیز مشاہدہ اور طنز کا ایسا گہرا احساس اُردو میں شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔

فکر تونسوی عام زندگی میں بیوقوفی کی حد تک معصوم نظر آتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ایسا بدھو شخص بھی اُردو کا اتنا بڑا طنز نگار ہو سکتا ہے۔ ان سے اگر آپ ملنا چاہیں تو شام کے وقت کناٹ پیلس کے "کافی ہاؤس" میں چلے جائیے۔ لوگوں کی بھیڑ میں ایک شخص اپنے سیدھے پاؤں کو زمین سے گھسیٹتا ہوا ادھر اُدھر چلتا نظر آئے گا۔ یہی شخص فکر تونسوی ہوگا۔

یہ اپنے اطراف ادیبوں کو جمع کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیشہ چند نوجوانوں اور چند "سرداروں" میں گھرے نظر آئیں گے۔ "سرداروں" کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ سردار جتنا بوڑھا ہوگا اس کا دل اتنا ہی جوان ہوگا۔ خود تو لطیفے نہیں سناتے مگر دوسروں کے لطیفوں پر بے ساختہ ہنستے ہیں بلکہ گھر جاکر بھی ہنستے ہیں۔ ایک دن میں نے انھیں ایک لطیفہ سنایا۔ خوب ہنسے۔ دوسرے دن میں پھر ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ اکیلے بیٹھے ہیں اور آپ ہی آپ ہنس رہے ہیں۔

میں نے پوچھا "کس بات پر ہنسی ہو رہی ہے ؟"

کہنے لگے "کل والے لطیفہ میں تھوڑی سی ہنسی باقی تھی۔ وہ ہنس رہا ہوں"

ہنسی کو اتنی احتیاط سے برتنے والا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

کافی ہاؤس کی بھیڑ میں جب فکر تونسوی بھیڑ کا حصّہ بننے لگتے ہیں اور ہر ایرے غیرے کی ذات میں اُترنے لگتے ہیں تو میں اکثر اوقات اپنے ذہن میں انھیں اس بھیڑ سے جدا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اتنا بڑا ادیب بھیڑ کا حصّہ کیسے بن سکتا ہے۔ اسے کہیں تو رکنا چاہئے۔

کبھی کبھی میں انھیں ٹوکتا ہوں تو وہ خالص پنجابی میں کہتے ہیں ــ" اوچھڈ یار۔ چپ رہ۔ میں تا اے بھیڑ دا حصّہ آں۔ ایسے رہنا ئے۔"

اور میں کہتا ہوں " اوے تسی اردو وچ گل کرو ناں "

اس پر وہ سنبھل کر کہتے ہیں " یار! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اس بھیڑ میں نہ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اسی بھیڑ نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ میں اسی بھیڑ سے آیا ہوں اور اسی بھیڑ میں چلا جاؤں گا۔ میں جن کے لئے لکھتا ہوں وہ لوگ اسی بھیڑ میں رہتے ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے ادیبوں کا حصّہ تو بنا دیتے ہو مگر ادیبوں سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے خول میں بند ہوتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے خول سے باہر نکل آتے ہیں اور اس کے بعد اپنی اپنی ذات کے قلعوں میں بند ہو جاتے ہیں ـــ اور اس کے بعد میں اور یہ بھیڑ دونوں ہی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ بھیڑ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔ تم لوگ بھاگ جاتے ہو۔"

اور میں بڑی حیران نظروں سے فکر تونسوی کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب شخص ہے جو بھیڑ میں اپنے آپ کو ضم کرنا چاہتا ہے مگر پھر بھی بھیڑ سے کس قدر مختلف ہے۔ کیسی انفرادیت ہے اس کی۔ ایسے لمحوں میں میں بھیڑ اور فکر تونسوی تینوں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر میں یکّہ و تنہا ہو کر فکر تونسوی کو انسانوں کی بھیڑ میں غائب ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اور بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں ـــــ

بلراج ورما

فکر تونسوی

"ترقی پسند ادب . . . . . جس میں تعمیر کی رُوح ہو، حُسن کا جوہر ہو ۔۔۔۔ جو
جھنجھوڑ کر جگا دے، سُلائے نہیں ۔۔۔ کیونکہ مزید سونا موت کی علامت ہوگا"

(مرحوم پریم چند)

ٹھہرے ہوئے تالاب میں ایک ننھا سا کنکر پھینک دیجئے بظاہر مُردہ پانی کی سطح بیدار ہو کر اٹھکیلیاں کرنے لگے گی۔ ایک لہر سے دوسری اور دوسری سے تیسری پیدا ہوگی اور گولائیوں کا اٹوٹ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

حرکت کی یہ انگڑائیاں ۔ یہ انتشار، یکایک جوان اور خوبرو رقاصہ کا متوالا ناچ بن جائے گا۔

یہ زندگی ابھی تک کہاں چھپی بیٹھی تھی؟

زندگی کے چہرے سے جالوں کے بد وضع پردے ہٹانا فکر تونسوی کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایک شوخ و شریر بچے کی طرح وہ ہر روز چند چھوٹے چھوٹے کنکر جیبوں میں بھر کر گھر سے نکلتا ہے تاکہ زندگی کے سوئے ہوئے تالاب میں حرکت پیدا کر سکے۔ لہروں کا یہ رقص اُسے بے حد پسند ہے۔

"پیاز کے چھلکے" زندگی کی ضامن لہروں کے اِس کھیل ہی کا نام ہے، وہ ہر روز پیاز کا ایک چھلکا چھیل کر اپنے چاہنے والوں میں دیوتا کے پرساد کی طرح بانٹ دیتا ہے۔

موت کے بیوپاریوں کی دنیا میں زندگی کی برقراری کے سامان لوازمات ایٹم بم کی نسبت سستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیاز کے چھلکوں کا یہ بانکا سوداگر کئی سال کی اِس تجارت کے باوجود ایک عام ہندوستانی کی طرح غریب و نادار ہے۔

میرا نام چونکہ دانشوروں اور نقادوں کی فہرست میں نہیں آتا لہٰذا یہ مضمون قلمبند کرتے ہوئے کسی قدر جھجک محسوس کرنا میرے لئے لازمی ہے۔ فکر تونسوی اور اُس کے فن پر اِس سے پہلے اور اِس وقت بھی بے شمار مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ یہ ہر ادیب کے عروج کا ایک سانحہ ہوتا ہے جب اُس کے بارے میں تعریفی اور تنقیدی مضمون لکھنا ہر کوئی اپنا حق سمجھتا ہے۔ آج کل فکر اِسی سانحہ سے گذر رہے ہیں۔ یہ حق یہ ذہنی مجبوری ہی میرے اِس مضمون کی وجہ ہے۔

فکر کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں اور میں نے اُن کی لکھی ہوئی ہر کتاب کم از کم ایک بار پڑھی ہے۔ میں انھیں اُس دور سے پڑھ رہا ہوں جب وہ راشد اور میراجی کے رنگ میں آزاد نظم میں مشق فرمایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے نظم لکھنا یکایک کیوں چھوڑ دیا یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ (اُن کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے یہ سلسلہ شروع ہی کیوں کیا تھا۔ آج تک یہی بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئی)

میرا ایمان ہے کہ تفریحی نثر کے احاطے میں جو بے پناہ کامیابی اُن کے حصے میں آئی ہے وہ اُنھیں آزاد نظم میں بھی میسر آتی۔ محض اِس خوف سے ایک اچھا خاصا میدان چھوڑ دینا کہ لوگ اُن کا مفہوم نہیں سمجھ پاتے (اگر واقعی کوئی مفہوم تھا تو) میری نظر میں ایک عظیم غلطی

ہے اور ایک ایسا اعترافِ شکست جو ایک اچھے ادیب کی شان کے شایاں نہیں۔ میں نے فکر صاحب کو اس بدچلنی کے لئے اکثر کوسا ہے گالی دی ہے۔

فکر کیا شئے ہیں۔ اُن کا مذہب کیا ہے۔ اُن کا خدا کون ہے۔ کن اثرات اور قدروں نے اُن کے ادب کی نشو و نما کی ہے۔ یہ سب بتانا میرے لئے ضروری نہیں۔ یہ باتیں کسی ادیب کی وفات کے بعد کہنے کے لئے ہوتی ہیں۔ "عمر کے ماہرین کی رائے ہے کہ پچاسّی برس سے پہلے مجھے موت نہیں آئے گی" (میرا بیالیسواں جنم دن)

ویسے ان چند صفحات میں ان نکتوں کی تشریح ممکن بھی نہیں، فکر تونسوی نام کا آدمی ہندو بھی ہو سکتا ہے اور مسلمان بھی۔ حقیقت ہے کہ یہ حضرت جتنے ہندو ہیں تقریباً اتنے ہی مسلمان بھی ہیں۔

فکر صاحب کی عمر سات اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ساٹھ سال کی ہو جائے گی یعنی سٹھیانے میں ابھی چار سال سے کچھ زیادہ ہی کا وقفہ باقی ہے۔

وہ گزشتہ ۳۴ سال یعنی ۱۹۴۰ء سے باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔ زمانہ کے بدلتے ہوئے تیوروں سے فکر صاحب نے اندازہ لگا لیا ہے کہ زندگی کے تقاضے لمبے چوڑے مضامین کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا اُنھوں نے اس قسم کے مضامین سے ہمیشہ گریز فرمایا ہے اور ہر بات کو ناپ تول کر مختصر بنانے کی سعی کی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے ناول بھی طویل مختصر کہانی سے آگے نہیں بڑھنے پائے۔

لکھنا ہی اُن کا ذریعۂ معاش ہے۔ ہر طرح کی تنگی کے باوجود اُنھوں نے روٹی کمانے کا کوئی دوسرا وسیلہ کبھی قبول نہیں کیا۔ لکھنے کے قلیل آمدنی ہی میں ہمیشہ گزر بسر کی اور بضد ہیں کہ آئندہ بھی اسی راہ پر گامزن رہیں گے۔ آج تک اُنھوں نے ہزاروں ادبی تہذیبی اور سیاسی مضامین۔ طنزیہ اور تفریحی خاکے۔ کہانیاں۔ نظمیں۔ ریڈیائی فیچر قلمبند کئے ہیں۔ ان کے علاوہ اُن کے تین طنزیہ و مزاحیہ ناول۔ پروفیسر بدھو، ماڈرن الہ دین اور چوپٹ راجہ اور ایک مجموعۂ کلام کتابی شکل میں آ چکے ہیں۔

اُن کا ایک اسٹیج ڈرامہ "دربارِ اکبری" مذہبی اجارے داری پر ایک طنز ہے اور میری شتابدی' گاندھی جی کے آدرشوں کی ناکامی کا نوحہ ہے۔ یہ ڈرامے کئی بار کئی جگہ کامیابی سے کھیلے جا چکے ہیں۔ مضامین کے مجموعوں میں وارنٹ گرفتاری' گم شدہ کی تلاش۔ میں نے الیکشن لڑا اور میرا آخری جنم خاص طور پر ہر دلعزیز ہوئے ہیں۔

اُن کی چار کتابوں کے ہندی ترجمے بھی چھپ چکے ہیں اور جلد ہی اُن کے تازہ ترین اور میری نظر میں آج تک کے بہترین طنزیہ ناول "چوپٹ راجہ" کا ہندی ترجمہ بھارتیہ گیان پیٹھ نامی سنستھا چھاپ چکی ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ عمر کے غلط دور تک پہنچنے سے پہلے وہ اتنی ہی اور کتابوں کا ہدیہ ادب کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔

تونسہ نام کے مختصر مگر نسبتاً خوشحال گاؤں میں پہلی جنگِ عظیم کے آخری مراحل میں جناب فکر روتے ہوئے اس دنیا میں نازل ہوئے، تونسہ کے حدود اربعہ کے بارے میں اُنھوں نے بتایا کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں ہندوستان اور افغانستان کی سرحد پر وطنِ عزیز کا یہ آخری گاؤں ہے۔ میرے سمجھانے پر کہ اُن کا مقصد غالباً پاکستان اور افغانستان کی حد سے ہے وہ ایکدم بھڑک اُٹھے۔

"تونسہ ہندوستان ہی کا ایک حصّہ ہے محض ایک فرضی دیوار کھڑی کر کے تم ایک مخصوص تہذیب کا بٹوارہ نہیں کر سکتے سیاست کا رسوخ اور وقار چاہے کیسا بھی ہو کسی بڑے ملک کی تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ قطعی نہیں بدل سکتی۔ تہذیب سیاست سے بڑی شئے ہے۔ روسی انقلاب سے بڑا دوسرا کوئی انقلاب پچھلی کئی صدیوں سے بنی نوع انسان نے نہیں دیکھا، مگر کیا تم کہہ سکتے ہو کہ روسی انقلاب سے جہاں اُس بڑے ملک کی سیاسیات اور معاشیات کا رنگ روپ بدلا وہاں اُس ملک کی تہذیبی اقدار بھی قطعی طور پر بدل گئیں۔ ماؤسی تنگ دورِ حاضر کا سب سے بڑا REVOLUTIONARY ہے مگر وہ بھی چینی کلچر پر CONFUSION کے اثر و رسوخ کو کم نہیں کر سکا۔ لینن نے تو ٹالسٹائی اور پشکن کی زبان کو روسی ادب و تہذیب کا بے بہا خزانہ مانا ہے اور ہم وطنوں سے

ماایہ کی سے ہے کہ وہ ٹالسٹائی کی زبان کو کبھی نہ بھولیں۔ بٹوارے نے ہماری ادبی اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی اقدار کا شیرازہ ضرور بکھیرا ہے، مگر ہمارے COMPOSITE CULTURE کے تانے بانے ابھی تک قائم ہیں۔ ہمیں ہندوستانی ہوں، بھارتیہ ہوں یا پاکستانی ہوں، ہم بھائی ہیں۔ بھائی اکثر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بھائی پھر بھائی ہیں۔ آج نہیں تو کل، ہمیں کبھی نہ کبھی ضرور گلے ملنا ہے۔ میں تونسہ کی مٹی سے پیدا ہوا تھا اور میرے جسم کی راکھ تونسہ کی دھرتی کی ہی کھاد بنے گی:

حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر EMOTIONAL آدمی 'جوکر' کا کردار اتنی کامیابی سے کیسے نبھائے جا رہا ہے۔

اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم اُنھوں نے تونسہ کی اکلوتی مسجد میں حاصل کی۔ اُس اسلامی پرائمری مدرسے کے معلم بیک وقت مولوی بھی تھے۔ اِسی قسم کی تعلیم اُن کے والد بزرگوار اور والدۂ محترمہ نے بھی پائی تھی۔ لہٰذا اردو ایک طرح سے اُنھیں ورثے میں ملی۔ مال کے دودھ کے ساتھ اُن کی ادبی تربیت میں نہ دلّی کا مزاق ہے نہ لکھنؤ کی نرم و شیریں زبان۔ اس تربیت کا پس منظر لاہور ہے۔ جہاں ادبی دنیا اور ادب لطیف جیسی فن اور آگہی کی قندیلیں جن کی روشنی میں اُنھوں نے ادبیات کے اوّلین قواعد پڑھے اور سیکھے۔

اُنھوں نے خالص علمی فکری اور فلسفیانہ مضامین کبھی نہیں لکھے مگر اُن کے مضامین میں علم و فکر اور فلسفہ کے عناصر ہمیشہ تشریف لاتے رہے۔ اُن کی کوئی تصنیف عظیم شاہکار یا سنگِ میل کا درجہ بھلے ہی نہ رکھتی ہو مگر ہر تصنیف میں اُن کا احساس دل دھڑکتا ہے۔ شعور و علم اکتسابی اشیاء ہیں، الہامی نہیں۔ اگر تم سوچنے کی جرأت کرتے ہو تو جو دیکھتے ہو اُسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ادیب کو آنے والی نسلوں کے لئے ہی نہیں اپنی نسل کے لئے بھی لکھنا ہے۔ ایک ساحر کے لئے بھی لکھنا ہے۔

ناشناس زندگی نے ہر گام پر فکر تونسوی کا تمسخر اُڑایا۔ ہر موڑ پر اُسے گالی دی۔ مارا پیٹا تک ہے۔ نفرت و ظلم کی بجائے زندگی اُن پر رحم و کرم سے مسکراتی ہوتی تو شاید وہ روایتی قسم کا ایک مزاح نگار بن کر رہ جاتا۔

مگر اس ظلم و تشدد کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا حیرت ہے کہ ہوا اُس کے بالکل برعکس اور فکر تلخ کلام ہجو نگار بننے کی بجائے بنیے وہ مسخرہ بن گیا کسی دربار کا مسخرا نہیں۔ عوام کا مسخرہ جو اپنے آپ پر ہنسنے کا کلیجہ رکھتا ہے اور زندگی کو اُس کی کج ادائی کے باوجود پیار و احترام سے دیکھتا ہے اور دن رات اُس کے چہرے کی بدوضع جھریاں بھرنے میں مصروف رہتا ہے۔

فکر کے سوچنے کے انداز میں تلخی تو آئی۔ نفرت اور تلخ کلامی نہیں آئی۔ وہ سنجیدگی سے سوچتے ہیں مگر مسکرا کر کہتے ہیں۔ اُن کی زبان بانکی، شگفتہ، رواں دواں اور پانی اور ہوا کی طرح آزاد ہے۔ اُن کی فقرے بازی کانٹوں کی طرح نوکیلی ہے اور پھولوں کی طرح دلکش: ترے

ان کے اسلوب بیان میں گرمی ہے تپش نہیں

تیزی ہے تیزابیت نہیں ۔

لطافت ہے کثافت نہیں ۔

تفریحِ طبع کا سامان بھی ہے ——

وہ عُریاں تو ہوئے ہیں بد قماش کبھی نہیں ہوئے ۔

اُن کی باتوں میں پھکڑپن کی جھلکی تو اکثر ملتی ہے مگر سفلہ پن کہیں نظر نہیں آتا۔

اُن کا طنز بے درد تنقید نہیں ہمدردانہ شکوہ ہے۔

فکر کے طنز کا نشتر جرّاح کا نشتر ہے۔ تیزاب و زہر میں بُجھا ہوا گلا کاٹنے والے ظالم کا چاقو یا تلوار نہیں، اِس نشتر سے وہ ملک اور

قوم کے پکے ہوئے پھوڑے، پھنسے سے پیپ کر گندہ مواد نکالتے ہیں، مریض کو تڑپا کر حظ نہیں اُٹھاتے۔ اپنے مقصد کی پاکیزگی اور سنجیدگی کو کبھی تلخی نہیں دیتے۔

طنز و مزاح سے ماورا ہو تو ہجو بن کے رہ جاتا ہے، رشک و رقابت اور غیروں کی تذلیل و تضحیک کے جراثیم پھیلانے والی ہجو، روایتی مزاحیہ اُردو ادب سے فکر ہمیشہ دور رہے ہیں۔ فیچ و ناہموار تعصب کی باہمی چھیڑ چھاڑ کے چکر میں پڑنے کی بجائے انہوں نے قوم کے حسد و نفرت۔ عالمی جنگ۔ غلط تعلیم و تربیت۔ طبقاتی تجزیوں۔ ماحول کی خامیوں اور ظاہری ذمہ دار افراد کی سیاکاریوں کو اپنے قلم کا شاہکار بنایا ہے۔

"جنگ بے حد خطرناک چیز ہے۔ امن بے حد ضروری چیز ہے۔ جنگ و امن کے مسائل فوجی جرنیل اور سیاست داں پر چھوڑنا عالمی صحت کے لئے مضر ہے۔ اسی طرح تعلیم۔ آدمی کی خوراک۔ عوام کی صحت اور لا اینڈ آرڈر کے مسائل مُردہ ذہن، استادوں، میونسپل کمیٹیوں کے ممبروں اور پولیس کے افسروں تک ہی محدود رہنے دئے جائیں تو عقلمندی نہیں۔ سماج کی برائیوں کے خلاف اپنی نحیف و نزار آواز اُٹھائی ہے اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کو کسی نے نہیں سنا۔ مجھے اکثر سنا اور سمجھا گیا ہے اور میری سجھائی ہوئی علامتوں پر جو دوا صلاح آپ سب کی علامتیں ہیں عمل بھی کیا گیا ہے۔"

فکر صاحب صاف گوئی کے علمبردار ہیں۔ مبالغہ سے عموماً احتراز فرماتے ہیں مگر جہاں کہیں بھی انہوں نے تفریح اور طنز میں مبالغے سے کام لیا ہے اُن کے تاثرِ بیان میں اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں آئی۔ اس کی وجہ اُن کی جدتِ فکر، کہنے کا انداز، زندگی کے تئیں ذمہ داری اور اپنے فن سے گہری عقیدت ہے۔

یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ٹریجیڈی کے دائرے کے پاس جہاں ادب کا سب سے بیش قیمت خزینہ ہے، ارسطو سے لے کر آج تک مغرب و مشرق کے ادبا، شعرا اور دانشور بدستور اضافہ فرما رہے ہیں، کامیڈی کی زمین میں اس قسم کی لاجواب تقریباً مفقود ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیڈی کے ادیب ٹریجیڈی کے شہہ زادوں کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کرتے۔ اس قسم کے مقابلہ کا شوق فکر صاحب کو قطعی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا قلم رُک رُک کر نہیں چلتا بلکہ تیز گام ہے اور بدلتے ماحول کا ہم پلہ۔ اس یکتائے فن ادیب نے ہمارے قومی ادب کو جو بلندی اور عظمت بخشی ہے اُس کی مثال نایاب ہے۔

فکر صاحب کو اردو زبان سے مجنونانہ عشق ہے، ایک بار میرے کہنے پر کہ چونکہ اُردو زبان کو سمجھنے والا طبقہ بدستور سکڑتا جا رہا ہے انہیں انگریزی یا ہندی میں لکھنے کی مشق شروع کر دینا چاہیئے تاکہ اُن کے تاثرات کا اثر و رسوخ محدود نہ رہ کر پھیل سکے، وہ چمک اُٹھے۔

"اُردو زندہ زبان ہے۔ بھلے ہی اُس کا حال بدحال ہے، مگر اس کا مستقبل اس کے ماضی ہی کی طرح تابندہ اور درخشندہ ہوگا۔ اتنے اہم ادبی اور تہذیبی خزانے کو کوئی ملک و قوم دیر تک نظر انداز نہیں کر سکتی۔"

فکر اُردو کے اُن چند گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جو زمانے کی سرد مہری کو بالائے طاق رکھ کر اپنی اس محبوب زبان کی خدمت میں جُٹے ہیں اور بضد ہیں کہ اُن کی محبوبہ آج نہیں تو کل ضرور اس طویل علالت سے شفایاب ہو گی۔

فکر اور اُن کے سخت جان ساتھی اس دَور کا معجزہ ہیں۔ جب بھی ان بیس تیس سالوں کی تواریخ لکھی جائے گی ان چند جنونی ادیبوں کا نام ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۳۲ ۔ لشکر میں اکیلا)

لب و لہجے کے مجموعہ میں جس طرح انہوں نے اپنے لئے ایک لطیف اور دلکش آواز ڈھونڈی ہے، جدید انسان کے تحت الشعور اور لاشعور میں چھپے ہوئے بعض بیانات کو جس انداز سے انہوں نے کھنگالا ہے، وہ "حرفِ معتبر" کو لفظوں کے لشکر میں محض اکیلا ثابت نہیں کرتا بلکہ اُس کی بقائے دوام کی بشارت بھی دیتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آئندہ سپاٹ اور سطحی قسم کے اشعار کو "حرفِ معتبر" کا درجہ نہ دیا جائے اور تجربات کی بوقلمونی کو شاعری میں برتنے کی کوشش کی جائے، جس کا فقدان "حرفِ معتبر" کو ایک عظیم شعری کارنامہ بننے سے روکتا ہے۔

ظہیر غازی پوری

○

یہ عہد چاہتا ہے گرد گرد ہو جاؤ
دیارِ زیست میں صحرا نورد ہو جاؤ

کسی طرف سے نہ پھوٹے گی اب کرن کوئی
بجھا کے شعلۂ خوں جسم سرد ہو جاؤ

جواں ہو شوق تو شاداب سبز کھیتی سے
گزر کے میری طرح فصلِ زرد ہو جاؤ

سمٹ سکتے نہیں خود کو جسم کے اندر
تو پھر بکھر کے کوئی دشتِ گرد ہو جاؤ

مری صدی میں وہی شخص تو ہے بالغ ذہن
جو چاہتا ہے کہ تم فرد فرد ہو جاؤ

یہ سلسلہ مجھے تاریخ ساز لگتا ہے
زمیں سے اٹھو تو بے سمت گرد ہو جاؤ

یہی ہے وقت کہ توسیعِ فکر و فن کیلئے
شکست و ریخت سے محوِ نبرد ہو جاؤ

زمیں کا کرب ہے بہتر خلا کی جنت سے
چمن میں بکھرا ہوا برگِ زرد ہو جاؤ

ظہیر خود کو تراشو بنامِ خوش نظری
دیارِ فن میں حسیں لاجورد ہو جاؤ

صلاح الدین نیّر

○

محفلِ رنداں میں شاید دیر سے تم آگئے
خالی شیشوں کی طرح احباب پھر ٹکرا گئے

ایک ہی زنبیل ہے چھوٹا بڑا کوئی نہیں
ہم سے درویشوں میں رہکر تم بھی دھوکہ کھا گئے

ہم تو کم آمیز تھے، احباب لائے کھینچ کر
اعتبار اب آگیا تو سب کے سب گھبرا گئے

زندگی بھر جو ہمیں خود راہ دکھلاتا رہا!
حد تو یہ ہے ہم اسی پتھر سے ٹھوکر کھا گئے

غور سے ہم نے سنی تو اپنی ہی آواز تھی
آپ کے لہجے کو سن کر ہم بھی دھوکہ کھا گئے

ہو گئے جب ہم نئے زخموں سے کچھ کچھ روشناس
کچھ پرانے غم بھی اک دن ہم سے ملنے آگئے

کیا بتاؤں دوستو! موسم تو کچھ ایسا نہ تھا
جو کتابوں میں تھے اب وہ پھول بھی مرجھا گئے

تھی پسِ پردہ بھی کچھ میری ہی اپنی داستاں
حادثہ میرا تھا لیکن آپ کیوں گھبرا گئے

کس کو راس آئی ہے نیّر مسکرانے کی ہوس
رفتہ رفتہ آنسوؤں کی زد میں ہم بھی آگئے

کہانی

نیہار بھٹاچاریہ

مترجمہ: ارمان نجمی

بیوی

آج عدالت کے کالم میں ایک معاملہ کی رپورٹ پڑھتے ہوئے کئی برس پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔

پارلیمان کے انتخابات کے قبل راجستھان گھومنے گیا تھا گھومتے گھومتے اجمیر پہونچا اور سرکٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن خوب سیر کی، صبح سے شام تک سیر کرتے ہوئے لونی ندی کے باندھ پر کافی دیر تک گھومتا ٹہلتا رہا۔ اس کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس آ کر نہایا، دلپورٹ ٹاسپ کی، کھانا کھایا۔ برآمدے میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے آنا ساگر کی خوبصورتی سے رات گئے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے سونے چلا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے جب نوکر کے جگانے سے آنکھ کھلی اس وقت دیکھا۔ بہت زوروں کا بخار ہے۔ تب اٹھکر برآمدے میں چائے پینے بیٹھ گیا۔ جب تھرتھراہٹ کی وجہ سے ہاتھوں سے چائے کی پیالی گر گئی۔ برآمدہ کے پاس سے ایک شریف آدمی فوراً میرے پاس آئے اور سوال کیا۔

"ایے نی تھنگ رانگ"؟

سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے میں نے کہا "نو تھنگ رانگ۔ لیکن کل رات بہت زیادہ بخار آ گیا تھا اور اس وقت بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔

مسٹر داس گپتا سے یہی میری ملاقات۔ مغربی بنگال کے صوبہ میں وہ آئی۔ پی۔ ایس تھے۔ دلی ڈیپوٹیشن میں آئے ہوئے تھے۔ ایک اکلوتی لڑکی شادی کے بعد سسرال چلی گئی تو گھر میں بسوں کا جی خراب ہو گیا۔ اسی لئے ماں اور اہلیہ کے ساتھ باہر گھومنے نکلے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ پشکر دیکھکر اجمیر میں ایک دن گذار کر چلے جائیں گے لیکن آنا ساگر کے کنارے بہت اچھا لگ رہا ہے، اسی لئے ایک ہفتہ یہاں ٹھہریں گے پھر دلی واپس جائیں گے۔

طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں بھی کئی دن اجمیر میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گیا۔ مسٹر داس گپتا کی اہلیہ اور ماں دونوں وقت پشکر جاتیں۔ برہما کے مندر میں پوجا کرنے اور آرتی دیکھنے، ہم دونوں سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھ کر گپ لڑاتے۔ قسم قسم کی گپ۔ میں پارلیمان کے کلب کی باتیں کرتا۔ وی آئی پی لوگوں کے قصے سناتا اور وہ بھی کئی مزے مزے کے واقعات اور حیرت انگیز افسانے سناتے۔

اس درمیان ایک نوبیاہتا جوڑا ایک دن کے لئے سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔

جوان جوڑے کو دیکھکر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے "آنا ساگر کی طرف سے نگاہ موڑ کر میری جانب گھومتے ہوئے مسٹر داس گپتا نے کہا۔

"کیا ہوا تھا"؟ شاید بغیر شادی کئے ہوئے وہ شوہر اور بیوی کی طرح رہتے تھے"

وہ ہنسے "یہ تو ہمیشہ ہوتا آیا ہے"

"تب۔۔؟"

مسٹر داس گپتا نے شروع کیا "میں ان دنوں مرشد آباد میں تعینات تھا۔ چند مہینوں کے اندر دیگا میں کئی قسم کے واقعات رونما ہو چکے تھے اس لئے میں خود ایک بار وہاں گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"پھر؟"

دو تین دنوں کے بعد ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔

نمسکار! ایک ضروری ذاتی کام کی وجہ سے آپ کو ناوقت تکلیف دینے حاضر ہوا ہوں"

مسٹر داس گپتا نے ایک بار نوجوان کو سر سے پیر تک اچھی طرح دیکھ

کر کہا۔" بیٹھئے "

اُس کے بیٹھنے کے بعد مسٹر داس گپتا نے دریافت کیا:-

"آپ کا نام"؟

"میرا نام ہے شمشیر سرکار"

فرمایئے! کیا کام ہے"

دو ایک منٹ تک شمشیر بابو کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی، پتھر کی طرح چپ چاپ رہے۔ اس کے بعد یکایک بول اٹھے۔

"میری بیوی کھو گئی ہیں"

دیکھا، کوئی کلکتہ، دلی، بمبئی کی طرح بڑا شہر نہیں ہے جو کوئی نووارد لڑکا یا لڑکی ادھر ادھر جاکر راستہ بھول جائے۔۔۔ گم ہو جائے۔ ہوٹل اور بنگلوں میں کھانے پینے اور آرام کرنے کے علاوہ سمندر کے کنارے سیر کرنے سبھی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جھاؤ بن کے آس پاس بھی کچھ لوگ گھومتے ٹہلتے ہیں، لیکن گم ہو جانے کی جگہ کہاں ہے؟"

شمشیر بابو کی بات سن کر مسٹر داس گپتا بہت حیران ہوئے، بولے"

یہاں کہاں گم ہو جائے گی۔ شمشیر بابو نے اداس آنکھوں سے ایک بار مسٹر داس گپتا کی طرف دیکھا "لیکن سویرے سے تو میں ان کو موجود نہیں پا رہا ہوں"

"سویرے سے کیا مطلب ہے"؟

"میں نے سویرے آٹھ بجے اُٹھنے کے بعد سے تو اُن کو نہیں دیکھا"

"کہاں ٹھہرے ہیں"

ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے بنگلہ میں"

"یہاں کب آئے ہیں"

"آج ٹھیک ایک ہفتہ ہو گیا۔

آپ کی بیوی کا نام جان سکتا ہوں۔

"انجلی سرکار"

آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے۔

ابھی تو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔

یہاں ہنی مون منانے آئے ہوئے ہیں

آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔

"آپ نے کیا اپنی پسند سے شادی کی ہے؟

"نہیں! طے شدہ شادی ہے یہ"

مسٹر داس گپتا نے کچھ دیر سوچا۔ سیاحت کے موسم میں بہت سے خراب قسم کے لوگ دکھاوے کی مقصد سے آتے ہیں، دکھاوا جتنا مقبول ہے، اتنا ہی زیادہ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ہنی مون کے لئے آئی ہوئی دلہن کا لاپتہ ہو جانا؟"

آپ کی بیوی دیکھنے میں کیسی ہیں۔

"اچھی"

شادی سے قبل کسی سے محبت تو نہ کرتی تھیں آپ کو اس کا علم ہے۔

میں تو یہ سب نہیں سوچ سکتا ہوں"

شادی کے بعد سے آپ دونوں ایک ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔

"ہاں"

آپ کی بیوی آپ کے ساتھ کس طرح پیش آتی ہیں۔

"بہت اچھی طرح سے"

اس درمیان کبھی آپ دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا۔

جی نہیں۔

کسی بات کو لے کر کوئی اختلافِ رائے تو نہیں ہے۔

شمشیر بابو نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"نہیں تو!

مسٹر داس گپتا نے کہا! ہاں ذرا یہ بھی بتایئے کہ کتنا روپیہ اور کون کون سا زیور ساتھ لے کر گئی ہیں۔

شمشیر بابو نے فوراً سر ہلا کر کہا" نہیں نہیں وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔

پھر بھی: وہ کیا کیا لے کر گئی ہیں۔

گلے میں ایک معمولی ہار اور ہاتھ کی چوڑیوں کے علاوہ باقی زیورات میری ماں کے پاس ہیں۔

تب بھی کیا گلے کا ہار اور ہاتھ کی چوڑیاں وہ پہن کر گئی ہیں"

جی نہیں، گلے کا ہار اُن کے تکیہ کے نیچے تھا"

کیوں!؟"

روز رات کو سونے کے قبل وہ اُسے کھول لیتی تھیں ۔
روپیہ پیسہ ۔
جی نہیں ۔ کچھ روپیہ پیسہ لے کر نہیں گئی ہیں ۔
کپڑے لتے وغیرہ ۔
سب کچھ پڑا ہوا ہے ۔
ایک سینئر پولیس آفیسر کے ذہن میں اور بھی کئی قسم کے سوالات سر اٹھاتے ہیں ۔
آپ کیا کام کرتے ہیں ؟
میں سول انجینیر ہوں پی ۔ ڈبلو ڈی میں ملازمت کرتا ہوں ۔
آپ کی بیگم کہاں تک پڑھی لکھی ہیں ۔
وہ بی اے پاس ہیں ۔
لین دین کے متعلق آپ کے گھر میں آپ کی بیوی کو کبھی کوئی بات سننی پڑی ہے ۔
ان لوگوں نے جو کچھ بھی مجھے دیا ہے وہ میری امید سے کہیں زیادہ ہے
"شادی سے پہلے کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے "
نہیں ۔
کسی لڑکی سے آپ کی خط و کتابت تو نہیں تھی "
"نہیں"
مسٹر داس گپتا نے ایک نیا سگار سلگاتے ہوئے نہ جانے کیا حساب کتاب لگا لیا ۔
آپ برا نہ مانیں ۔ آپ کو کوئی جسمانی کمزوری تو نہیں ہے "
بالکل نہیں "
کئی منٹ تک دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ پھر مسٹر داس گپتا بولے ۔ دیکھا میں گم ہو جانے کا کوئی موقع نہیں ہے ۔ کیا خیال ہے "؟
نہیں ! آپ کا خیال بجا ہے "
ٹھیک ہے " سوچا کر کے شمشیر بابو بولے ۔ میں سوچتا ہوں کہ کہیں ان کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آیا "
صبح سویرے ٹہلنے کے لئے باہر نکلتے وقت تو کسی حادثہ کی کوئی خبر نہیں ہے
وہ کیا روزانہ ٹہلنے کے لئے نکلتی تھیں ۔
جی ہاں
کس وقت جاتی تھیں ۔
ٹھیک وقت تو میں نہیں بتا سکتا ہوں لیکن علی الصباح جاتی تھیں ۔
آپ کیا اُس وقت سوئے رہتے تھے ۔
ہاں وہ باہر سے آکر غسل کرتیں تب مجھے جگاتیں ۔
جمیسر کے سرکٹ ہاؤس کے برآمدہ میں بیٹھے ہوئے شمشیر سرکار کی بیوی کی گمشدگی کی کہانی سن رہا ہوں ۔ مسٹر داس گپتا بولے اس طرح کے معاملوں کا پتہ چلانا کوئی مشکل نہیں ۔ مجھے یقین تھا کہ وہ معاملہ نہ تو خودکشی نہ تو قتل اور نہ تو گمشدگی کا معاملہ تھا "
تب ! ۔ میں نے سوال کیا ۔
اور کچھ ! تمام ہوٹلوں کے رجسٹروں کے اندراج دیکھ کر میں جان لیتا کہ اُس دن سویرے ہوٹل چھوڑ کر کون کون لوگ باہر گئے ہیں ، ہوٹلوں کے ملازمین پر ذرا سا دباؤ ڈالنے سے یہ پتہ چل ہی جاتا کہ وہ لوگ ابھی ابھی گئے ہیں ۔
یہ ٹھیک ہے ۔
صبح سویرے جو بس اور ٹیکسی دیگھا سے روانہ ہوئی تھی ۔ اُن میں تلاش کرنے سے بھی کچھ پتہ چلتا ۔ زیادہ سے زیادہ کچھ لوگوں کے گھر جا کر کھوج خبر لینے سے سب پتہ مل جاتا لیکن میں نے کچھ بھی نہیں کیا ۔
کیوں ؟
ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتا سکتا ہوں لیکن خیال ہوا کہ کچھ انتظار کر کے دیکھ لیا جائے کہ مسز سرکار واپس لوٹتی ہیں یا کوئی خبر بھیجتی ہیں کہ نہیں ۔
خود تھانہ کے او ۔ سی کو بلا کر سب کچھ بتا دیا ۔
اُس کے بعد "
مسٹر داس گپتا تھوڑا ہنسے ۔
تقریباً ساڑھے آٹھ ، نو بجے رات میں کسی راستے سے ایک لیں ڈرائیور تھانہ میں دو عدد خطوط دے گیا ۔
دو عدد خطوط ۔
ایک تھانہ کے او ۔ سی کے نام تھا اور دوسرا مسٹر سرکار کے نام تھا ۔
کیا خط مسز سرکار کا لکھا ہوا تھا ۔ کیا لکھا تھا انہوں نے "
کیا آپ خط پڑھنا چاہتے ہیں ۔
آپ کے پاس خط ہے کیا "

نہیں! خط نہیں ہے۔ خط مسٹر سرکار کو دے دیا تھا۔ لیکن دینے سے قبل میں نے اپنی ذاتی ڈائری میں اس کی نقل رکھ لی تھی۔"

"وہ ڈائری کیا دلی میں ہے"

"ممکن ہے کہ پاس ہی ہو" مسٹر داس گپتا ایک بار پھر تھوڑا ہنسے "باہر نکلنے پر دو چار پرانی ڈائریاں ساتھ رکھ لیتا ہوں، وقت ملنے پر پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ پرانی ڈائری پڑھنے میں لطف ملتا ہے۔"

"لطف تو ملے گا ہی"

مسٹر داس گپتا اُٹھ کر گئے اور اپنے کمرے سے ڈائری نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولے "لیجئے پڑھئے۔"

ہاتھ بڑھا کر میں نے ڈائری لے لی اور خط پڑھا۔

"میں انجلی ہوں۔ تمہاری انجو۔ تم کو اپنا مدعا سے دوچار کرنے کی کوئی خواہش یا ارادہ تو نہیں تھا۔ لیکن میں مجبور ہو گئی۔ تم مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتی ہوں، سو کر اُٹھنے کے بعد تم نے مجھے تلاش کیا ہوگا۔ تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی ہوگی لیکن صبح سویرے سیر کے وقت اتفاقاً ایک آدمی سے ملاقات ہو گئی جس کو خالی ہاتھ واپس کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا، اُس سے میری جان پہچان اُس زمانے سے ہے جب میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ میں کچھ بھی جانتی یا سمجھتی نہیں تھی کہ وہ مجھے اس قدر چاہتا ہے۔ کسی دن کچھ دعویٰ کرنا تو دور کی بات ہے۔ منہ کھول کر کبھی اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

آج صبح سویرے اچانک اُسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ سُنا کہ آج تقریباً ایک ماہ ہوا جو وہ گھر سے باہر گھوم رہا ہے۔ اُس کے جسم کی حالت بہت سست ہے۔ اس طرح پاگل جیسی حالت میں گھومتے پھرتے ہوئے وہ یقیناً زیادہ دن نہیں بچتا۔

میں نے ڈائری کا ورق اُلٹا۔

تمہارے خلاف میرا کچھ بھی الزام نہیں ہے۔ تم نے ایک شوہر کی حیثیت سے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ ایک بیوی ہونے کے ناطے میں نے بھی تمہیں نامکمل نہیں رکھا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی تمہیں دیا ہے وہ اور دوسری لڑکیاں بھی تمہیں دے سکتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ لو کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ، خوبصورت، جوان لڑکی کو بیوی کی حیثیت میں پاکر تمہارا من بھر جائے گا۔ لیکن میں جس غریب کرانی کے ہمراہ جا رہی ہوں وہ صرف مجھے ہی چاہتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی دوسری لڑکی اس کی کمی پورا نہیں کر سکے گی۔

میں جانتی ہوں کہ میں نے تمہارے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے۔ کلکتہ لوٹ کر یہی کہنا کہ میں سمندر میں ڈوب گئی۔ تمہارے ماں باپ یقیناً پھر تمہاری شادی کر دیں گے میں بھی تم سے یہی التجا کرتی ہوں کہ تم شادی کر لو۔ بغیر شادی کئے تم رہ نہ سکو گے۔ میرے گھر بھی خبر بھیج دینا۔ دو چار دنوں تک رونا دھونا ہوگا۔ لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے دوبارہ ڈائری کا ورق اُلٹا

آخر میں ایک التجا کر رہی ہوں۔ تم تو سرکاری آفیسر ہو۔ تھانہ، پولیس کرنے سے یہ یقینی ہے کہ ایک دن میں پکڑی جاؤں گی، مہربانی کر کے پولیس کو رپورٹ مت کرنا۔ معاملہ مقدمہ کی حیثیت مجھ میں نہیں۔"

ڈائری بند کرتے ہوئے مسٹر داس گپتا نے سوال کیا "آپ نے خط پڑھا؟"

"ہاں! لیکن! اس کے بعد کیا ہوا؟"

"واقعی! مسٹر سرکار نے کوئی رپورٹ نہیں کی۔ تکلیف دینے کے لئے مجھ سے معذرت کر گئے"

"پھر اس کے بعد؟"

دوسرے دن وہ کلکتہ واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد اُن کی اور کوئی خبر نہ مل سکی۔ کئی برس تک میں دارجلنگ میں تعینات تھا تو مسٹر سرکار وہاں ایگزیکیوٹو انجینیئر تھے۔"

"واقعی وہی تھے۔"

"ہاں"

"کیا اُنہوں نے دوبارہ شادی کر لی تھی۔"

"نہیں"

میں حیران رہ گیا۔ شادی نہیں کی؟

شادی کرنا تو دور کی بات ہے۔ ہر کمرہ میں انجلی کی تین چار

(باقی صفحہ ۷۰ پر دیکھئے)

محمد خالد عابدی

انارکلی کا مقدمہ

کردار

اکبر ——— ہندوستان کے شہنشاہ

سلیم ——— ولی عہد

وزیر اعظم ———

انارکلی ——— ایک گستاخ کنیز اور سلیم کی محبوبہ

بیربل ——— دربار کا ایک مسخرہ

تانسین ——— ایک محکمۂ موسیقار

جیلر ——— ایک غافل شخص

انسپکٹر ——— ایک باوفا سپاہی

نقیب ———

(دربار کا منظر)

(دربار کے دائیں بائیں بندوقوں سے لیس فوجی کھڑے ہیں۔ تخت کے ایک جانب ٹرانزسٹر اور دوسری جانب ٹیلیفون رکھا ہے۔ سامنے کی دیوار پر ایک وال کلاک آویزاں ہے۔ گھڑی صبح کے گیارہ بجنے میں دو منٹ بجا رہی ہے)

نقیب باادب، باملاحظہ ہوشیار! شہنشاہِ ہند ظلِّ سبحانی تشریف لا رہے ہیں۔

(اکبر داخل ہوتے ہیں)

(اکبر اعظم شیروانی و جینز میں ملبوس اور سر پر انگریزی ہیٹ لگائے ہوئے ہیں اور پائپ پی رہے ہیں۔ تخت پر بیٹھتے ہی ہیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اکبر ریسیور کو کان سے لگاتے ہوئے)

اکبر یس! اکبر دی گریٹ اسپیکنگ۔ (چہرہ پر غصہ کے آثار نمودار ہوتے ہیں) واٹ نانسینس، رانگ نمبر۔

وزیر اعظم ظلِّ سبحانی کس کا فون تھا؟

اکبر (غصہ سے) تھی کوئی سلیم کی محبوبہ۔ شام کو پکچر کے لئے آفر کر رہی تھی۔ (تخت سے ٹیکتے ہوئے) وزیر اعظم ہم کل رات آرام سے سو نہ سکے۔ سلیم کی نافرمانیاں اور اس کی گستاخیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم جلد از جلد اس کا مناسب حل چاہتے ہیں۔

وزیر اعظم ظلِّ سبحانی مناسب سمجھیں تو میں اس پریشانی کو حل کرنے کی کوشش کروں؟

اکبر (منہ سے پائپ ہٹاتے ہوئے) یہ سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ تم نے ذاتی معاملات میں دلچسپی لینا کب سے شروع کر دیا۔

بیربل (بات کاٹتے ہوئے) حضور آپ نے وزیر اعظم کو اتنا منہ لگالیا ہے تو وہ سر چڑھیں گے ہی۔

اکبر (بارعب آواز میں) بیربل شاید تم ہمارے جاہ و جلال سے واقف نہیں۔ یہاں ایک نمبر بجلی آ پڑی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے

بیربل حضور! میں آپ کا چمچہ جو ٹھہرا۔

وزیر اعظم (اکبر سے) ہاں تو حضور کیا اب میں ذاتی معاملات میں دلچسپی لے سکتا ہوں؟

اکبر ہاں! اب ہم بدولت اجازت دیتے ہیں۔

وزیر اعظم ہاں تو حضور وہ کیا پریشانی ہے ؟

اکبر (سنجیدہ ہو کر) وزیر اعظم اسے پریشانی نہ کہئے بلکہ اسے مقدمہ کہئے، مقدمہ ..... ؟

وزیر اعظم (حیرت سے) مقدمہ !

اکبر ہاں مقدمہ

وزیر اعظم تو حضور یہ مقدمہ فوجداری ہے یا دیوانی ؟

اکبر (غصّہ سے) آپ کی عقل دیوانی ہے۔

وزیر اعظم (حیرت سے) جی میری عقل دیوانی ہے ... !

اکبر ہاں وزیر اعظم آپ کی عقل دیوانی ہے۔ ہم نافرمان سلیم کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور آپ فوجداری و دیوانی مقدمے کی بات کر رہے ہیں۔

بیربل حضور! وزیر اعظم سے فرمائیے کہ یہ کانوں کی صفائی کروائیں۔

اکبر (بیربل سے) بیربل تم بیچ میں ٹانگ مت اُلجھاؤ۔

وزیر اعظم ظلِّ سبحانی اس بیربل کے بچے کو چھٹی دے دیجئے تو بہتر ہوگا۔

بیربل معاف کیجئے وزیر اعظم میرے بچے نہیں ہیں۔

وزیر اعظم اور وہ گھر میں جو بچوں کی فوج ہے وہ کس کی ہے ؟

بیربل (ہکلاتے ہوئے) وہ... وہ... تو محلے کے بچے ہیں۔

اکبر (بات کاٹتے ہوئے) وزیر اعظم آپ ہم سے کلام کیجئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم وہ بات بھول جائیں جو ہم آپ سے کہنا چاہتے ہیں

وزیر اعظم کیا حضور کی یادداشت کمزور ہوتی جارہی ہے ؟

اکبر ہاں وزیر اعظم کھانے پینے کی ہر چیز میں ملاوٹ، دماغ میں قوت آئے تو کہاں سے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سلیم بضد ہے کہ وہ انارکلی سے شادی کرے گا۔

وزیر اعظم تو حضور اس میں برائی کیا ہے۔ یہ آزاد ہندوستان ہے اس میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ اور پھر حضور اس ماڈرن دور کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اکبر (غصے سے ناراض ہو کر) گویا تم بھی سلیم کے حامی ہو۔ یاد رہے وزیر اعظم مع حمایتیوں کے داخل زنداں کر دیئے جاؤ گے۔ وقت ہے کہ گزرا جارہا ہے اور مقدمہ ہے کہ وہیں کا وہیں ہے۔

وزیر اعظم (سنجیدہ ہو کر) حضور وہ مقدمہ بیان فرمائیں۔ اب میں سیریل سن رہا ہوں

بیربل (بات کاٹ کر) اور حضور میں اس سیریل مقدمہ کو ٹیپ کر رہا ہوں۔

اکبر (بیربل سے) اس لئے کہ یہ ٹیپ تم سلیم اور انارکلی کو جا کر سناؤ۔ یہ چمچہ گری تم نے کب سے شروع کر دی یہاں کی بجاؤ وہاں کا ؟

بیربل حضور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ چمچہ تو صرف "اکبری دیگ" کا ہے۔ (درباری قہقہہ لگاتے ہیں)

اکبر (بلند آواز میں) خاموش... خاموش

وزیر اعظم (یاد دلاتے ہوئے) حضور وہ مقدمہ !

اکبر (اقرار میں گردن کو خم دے کر) "آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا" تو ایسی تدبیر نکالو کہ سلیم، انارکلی سے شادی نہ کر سکے۔

وزیر اعظم حضور، اگر آپ اُن کی شادی میں حائل ہوں گے تو وہ کورٹ میرج کریں گے۔

اکبر (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! بیربل تم ابھی وقت جاؤ اور سلیم کو ہمارے حضور میں پیش کرو۔

بیربل (سلوٹ مار کر) جو حکم جہاں پناہ۔

(بیربل جاتا ہے)

اکبر (وزیر اعظم سے) ہاں تو وزیر اعظم اس کیس پر کیا غور کیا؟

وزیر اعظم حضور کیس تو بہت سیریس ہے بالکل لیوی وصول کرنے کی طرح۔

اکبر (حیرت سے) اچھا !

وزیر اعظم ہاں حضور بہت ہی اُلجھا ہوا کیس ہے۔ اس کے لئے کافی اسٹڈی کی ضرورت ہے۔ پھر کہیں جا کر اطمینان بخش جواب دے سکوں گا۔

اکبر وزیر اعظم کچھ تو آئیڈیا فرمائیے کیا ہم اس مقدمے میں کامیاب ہو سکیں گے ؟

وزیرِاعظم حضور دراصل سلیم کی سوسائٹی اچھی نہیں ہے اور پھر آج کل جو فلمیں بن رہی ہیں انھوں نے تو بڑا غضب ڈھا رکھا ہے۔
حضور آج کل فلموں میں وہ فحش مکالمے، بے ہودہ گیت اور وہ گندے ڈانس ہوتے ہیں کہ اچھا خاصا نوجوان لڑکی کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں حضور آپ تو کوئی دوسرا سینسر بورڈ قائم کیجئے۔

اکبر لیکن وزیرِاعظم فلم کا سلیم کی گستاخیوں سے کیا تعلق ہے؟

وزیرِاعظم حضور ہے کیوں نہیں۔ ایسے حضور یہ فلم والے فلموں کے ذریعے سب کچھ بتا دیتے ہیں کہ کس طرح کیا کرنا چاہئے۔
ابھی کچھ روز پہلے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی نوجوان نے ایک انگریزی فلم کو دیکھ کر ایک بینک میں ڈاکہ ڈال دیا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں فلموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے

اکبر (حیرت سے) اچھا!

وزیرِاعظم جی ہاں حضور

اکبر وزیرِاعظم سینسر بورڈ کے لئے تمہاری تجویز اچھی ہے لیکن ایسا کیوں نہ کر دیا جائے کہ فلموں پر پابندی عائد کر دی جائے۔ یہ تشدد از خود ختم ہو جائے گا۔

وزیرِاعظم نہیں حضور ہماری حکومت کو فلموں سے کافی مالی فائدہ پہنچتا ہے۔ اور پھر ہندوستان کے بہت سے ایسے شہر اور ایسے صوبے ہیں جہاں نہ تو اچھے پارک ہیں اور نہ دیگر تفریحی ذرائع۔ وہاں فلم ہی تفریح کا واحد ذریعہ ہے۔

اکبر (رسٹ واچ دیکھتے ہوئے) وزیرِاعظم! بیربل ابھی تک نہیں آیا

وزیرِاعظم حضور سلیم کو گرفتار کرنا بھی ایک مہم سر کرنا ہے۔

اکبر یقیناً۔

وزیرِاعظم (ایک جانب دیکھ کر یک لخت) حضور وہ آ گیا بیربل۔

(بیربل داخل ہوتا ہے)

بیربل (سلوٹ مار کر) جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔

اکبر کہو بیربل کیا خبر لائے؟

بیربل حضور میری زبان معذور ہے۔

اکبر (غصے سے مغلوب ہو کر) زبان معذور ہے لیکن کہنا ضروری ہے

بیربل (بے ساختہ) واہ واہ حضور! کیا برجستہ مصرع کہا ہے۔

اکبر (خفگی کا اظہار کرتے ہوئے) خاموش... خاموش، یہاں کوئی مشاعرہ نہیں ہو رہا ہے۔ ما بدولت جواب طلب کرتے ہیں کہ سلیم کہاں ہے۔ اُسے ہمارے روبرو کیوں نہ پیش کر سکے؟

بیربل (خوف سے لرزتے ہوئے) حضور وہ ..... عشق فرما رہے ہیں۔

اکبر (غصہ سے) لیکن کہاں؟

بیربل حضور! وہ کناٹ پلیس کے ایک بار میں بیٹھے ہیں۔

اکبر (از خود کلام کرتے ہوئے) سلیم تف ہے تمہارے نصیب پر تمہارے ہاتھوں میں مغلیہ سلطنت کی تلوار نہ ہوتے ہوئے کیبرے ڈانسر کی ریشمیں زلفیں ہیں (وزیرِاعظم سے) وزیرِاعظم اسی وقت ایک شاہی فرمان تیار کیجئے اور اس میں تحریر کیجئے کہ ہم سلیم کو تخت و تاج سے محروم کرتے ہیں۔

وزیرِاعظم (سر کو ذرا خم کر کے) جو حکم عالم پناہ۔

اکبر (تخت سے اُتر کر دو چار قدم چلنے کے بعد) اور ہاں مَیں لنچ ٹائم کے بعد پھر دربار آؤں گا۔ اُس وقت تک سلیم ہر صورت میں یہاں آ جانا چاہئے ورنہ تمہارا اور سیبل کا انکریمنٹ روک دوں گا۔

(اکبر جاتے ہیں)

نقیب حاضرین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اب بے ادب ہو سکتے ہیں کیونکہ جہاں پناہ تشریف لے جا رہے ہیں۔

وزیرِاعظم (بیربل سے) بیربل اب خیر مناؤ انکریمنٹ تو رک ہی جائے گا بعید نہیں کہ سی۔ آر۔ اے بھی بگڑ جائے۔

بیربل ہاں وزیرِاعظم دیکھئے تو عشق تو سلیم فرما رہے ہیں اور ہماری جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم ملک بدل دیں۔

وزیرِاعظم بیربل یاد رہے دل بدلنا غداری کی علامت ہے۔

بیربل (ایک جانب دیکھ کر بلند آواز میں) ارے... ارے... ارے یہ کون اونٹ کی طرح منہ اُٹھائے چلا آ رہا ہے؟ کون ہو

بھائی کیسے تکلیف فرمائی؟

تانسین (ایک نحیف و لاغر شخص جو کہ پینٹ پر سفید لکھنوی کرتا پہنے ہے۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہے اور ہاتھ میں وائلن ہے) ارے آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں ہندوستان کا مہان گائیک اور سنگیت کار ہوں۔ تانسین۔

بیربل (بات کاٹ کر) یہ خوش فہمی آپ کو کب سے ہوئی کہ آپ ایک مہان گائیک اور سنگیت کار ہیں؟

وزیرِ اعظم (بات کاٹ کر) تم سلیم کو گرفتار کرنے کی تیاری کرو۔ میں ان سے نپٹتا ہوں۔

(بیربل جاتا ہے)

وزیرِ اعظم ہاں تو مسٹر گائیک۔ اسی میں اچھا ہے کہ آپ اس وقت یہاں سے تشریف لے جائیں۔ اکبرِ اعظم اس وقت ذہنی طور پر پریشان ہیں۔

تانسین (سنجیدہ ہو کر) ہیں! بہت پریشان ہیں، تو پھر میں انھیں ایک پوپ سانگ اور کچھ سیکسی سانگس سنا دیتا ہوں۔ اس سے وہ تمام پریشانیاں بھول جائیں گے (بلند آواز میں) کہاں ہیں میری قدر کرنے والے مہابلی، میری آنکھیں آپ کے درشن کو ترس رہی ہیں (الاپتا ہے)

کہاں چھپے ہوئے بلما انکھیاں ترسیں توے درسن کو...!

وزیرِ اعظم آ... آ... ارے... منہ کو لگام دو۔ اگر اکبرِ اعظم کے کان میں ذرا بھی دھمک پڑ گئی نا تو سمجھ لو، تمہارا یہ پوپ سانگ مرثیہ میں بدل جائے گا۔

تانسین (جھنجھلا کر) اے واہ، تم کیا جانو سنگیت۔ ودیا سنگیت تو وہ مہان کلا ہے جس سے بڑے بڑے روگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اور سنگیت میں ہی وہ شکتی ہے جس سے بڑے بڑے دریاؤں کا بہاؤ تھم جاتا ہے۔

وزیرِ اعظم مسٹر گائیک مہاراج شاید تمہیں اپنی جان پیاری نہیں۔ (وزیرِ اعظم اشارہ کر کے تانسین کو ایک گوشہ میں چھپا دیتے ہیں)

(قدموں کی آہٹ)

نقیب باادب، باملاحظہ ہوشیار، شہنشاہِ ہند دوبارہ تشریف لا رہے ہیں۔

اکبر (تخت پر بیٹھتے ہوئے) وزیرِ اعظم سلیم کو گرفتار کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟

وزیرِ اعظم حضور میں نے بیربل کو پابند کر دیا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ (سر خم کر کے) حضور جاں بخشی ہو تو کچھ عرض کروں۔

اکبر اجازت ہے۔

وزیرِ اعظم حضور ایک گائیک تشریف لائے ہیں اور وہ اپنا نام تانسین بتاتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کئی راگوں کے ماہر ہیں۔ میں نے انھیں فی الحال گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا ہے۔

اکبر وزیرِ اعظم ہم اس وقت ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ ہماری جانب سے اُنھیں یہ پیغام دیجئے کہ اس وقت تو خود ہمارے ذہن میں دیپک راگ اور شانتی بھنگ راگ چل رہے ہیں۔ اگر تمہارے پاس کوئی مرہم راگ ہو تو گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

وزیرِ اعظم اگر آپ کا اشارہ ہو تو اُنھیں ٹرخا دوں۔

اکبر یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ہمارے فاضل وزیرِ اعظم ہمارے دماغ کی کیفیت کا بھی اندازہ لگا لیتے ہیں۔

بیربل (مسرت سے سرشار ہو کر) جہاں پناہ کی جے ہو۔

اکبر (از خود) شاید کامیابی حاصل ہوئی۔ کہو بیربل کیا خبر لائے؟

بیربل حضور، میں شہزادہ سلیم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا

اکبر (فخر سے) ہم بہت خوش ہوئے۔ یقیناً تم تعریف کے قابل ہو لیکن مابدولت یہ جاننا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ گستاخ اتنی آسانی سے کیسے ہاتھ آ گیا۔ ہماری کتنی ملٹری کو حرکت میں لانا پڑا؟

بیربل حضور آپ کی تمام بٹالین، انفنٹری، ایئر فورس اور نیول فورس دھری کی دھری رہ گئی۔ حضور سیاست سے ریاست جیتی جاتی ہے۔ دراصل میں نے جس وقت سلیم کو گرفتار کیا وہ اس وقت کولڈ کافی پئے ہوئے تھے چنانچہ ٹھنڈے ٹھنڈے سے چلے آئے۔

اکبر (بہ زعم) اُس گستاخ کو پیش کیا جائے۔

بیربل (ایک جانب سے کھینچ کر سامنے لاتے ہوئے) حضور یہ رہا میری محنت و تلاش کا نتیجہ۔ (بیربل اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

(سلیم اکبر کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہے وہ ماڈرن لباس میں ملبوس ہے اور نئی تہذیب اختیار کئے ہوئے ہے)

سلیم (لہجے میں کرختگی) کیا میں ہندوستان کے شہنشاہ اکبر اعظم سے پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے پولیس کی کسٹڈی میں کیوں لایا گیا۔ اس حرکت سے میری پریسٹیج پر اثر پڑا ہے۔

اکبر (نہایت استقلال سے) سلیم یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہمارے یہ بہادر سپاہی تمہارے خیر خواہ ہیں، ہمدرد ہیں۔

سلیم (لہجہ میں کرختگی) مجھے وہ خیر خواہی و ہمدردی ہرگز پسند نہیں جو کسی گرفت کی پابند ہو؟

اکبر (طنزیہ لہجہ میں) بہت خوب سلیم آج کل تم ڈائیلاگ کی بہت پریکٹس کر رہے ہو، کیا کسی ڈرامے میں مجنوں کا رول کر رہے ہو۔

سلیم (برہمی) ہاں وہی داستانِ عشق کا ڈراما جسے آپ بلاوجہ سینسر کر رہے ہیں۔ میں اکبر اعظم سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟

اکبر ہونہوں۔ وزیرِ اعظم وہ شاہی فرمان باآوازِ بلند پڑھا جائے

وزیرِ اعظم جو حکم ظلِّ سبحانی۔ (ایک شخص فرمان لاکر دیتا ہے۔ وزیرِ اعظم پڑھتے ہیں) بنام نور الدین محمد سلیم عرف پرنس شیخو، تم پر الزام ہے کہ تم نے شاہی تخت و تاج کی توہین کی اور ہندوستان کے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی نافرمانی کی اور ایک ادنیٰ کیبرے ڈانسر کو شاہی تخت سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ سلیم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آئیں اور ہندوستان کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کے لئے شاہی تخت و تاج کی فکر کریں نہ کہ داستانِ عشق کو عام کریں۔ اکبر اعظم کی جانب سے تمہیں وارننگ دی جاتی ہے کہ اگر تم عشق و عاشقی سے باز نہیں آؤگے تو تمہیں تخت و تاج سے محروم کر دیا جائیگا

سلیم (اکڑ کر) اکبر اعظم مجھے تخت و تاج سے دستبرداری کی دھمکی نہ دیں لیکن یہ یاد رہے کہ میں الیکشن لڑ کر وہ تخت و تاج حاصل کروں گا جو اس ولی عہد کا حق ہے۔

اکبر (استقلال سے) لیکن نادان سلیم کو معلوم ہو کہ ہم اُسے ٹکٹ دیں گے ہی نہیں جو وہ ہمارے مقابلے میں الیکشن لڑ سکے۔

سلیم تو پھر اکبر اعظم کو معلوم ہو کہ میں کسی اور پارٹی سے کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور پھر سارے ہندوستان کے اسٹوڈنٹ میرے ساتھ ہیں۔

اکبر (خوشامدانہ لہجہ میں) ڈیر سلیم! خدا کے واسطے اتنے خفا نہ ہو۔ تم سیریسلی سوچو اگر تم حکومت کی باگ ڈور نہیں سنبھالوگے تو اس ہندوستان کا کیا ہوگا۔ اس وقت ہندوستان کن حالات سے گزر رہا ہے۔ انڈسٹریوں میں دھاندلی چل رہی ہے، فیکٹری والے اسٹرائک کر رہے ہیں۔ بالا لوگوں کی چاروں طرف سے آوازیں کہ ڈی اے بڑھاؤ۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ ایم۔ پی۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ سی کی ہڑتال سے ہمیں کتنا نقصان ہوا ہے۔ ریلوے نے ہڑتال کی۔ اس کا نقصان کہاں سے برداشت کیا جائے۔ ہم دوسرے ممالک سے قرض مانگ کر ویسے ہی شرمندہ ہیں۔

سلیم آئی نو ویری ویل فادر، لیکن کیا میں اکبر اعظم سے پوچھ سکتا ہوں کہ میرے اور انارکلی کے افیئرس سے حکومت کو کیا نقصان ہے جو میرے خلاف محاذ قائم کیا جا رہا ہے۔

اکبر (اطمینان دلاتے ہوئے) بائی گاڈ سلیم ہم تمہاری محبت کے دشمن نہیں۔ لیکن تمہیں انارکلی میں ایسی کیا بات نظر آئی جو تم تخت تاج چھوڑنے پر آمادہ ہو۔

سلیم اکبر اعظم یہ بات ایک بھونرے سے پوچھیں کہ وہ پھول پر کیوں منڈلاتا ہے، ایک چکور سے پوچھیں کہ وہ چاند کو کیوں چاہتا ہے۔

اکبر (غصہ سے مغلوب ہو کر) تو گویا تمہیں اُس محبوب کی گلیاں

منظور ہیں۔ یہ شاہی تخت و تاج یہ مال مریادا پسند نہیں؟ تاریخ میں ایک عاشق ہونا منظور ہے لیکن تاریخ مغلیہ میں ایک فرمانروا ایک بیاد سپاہی ہونا پسند نہیں۔ اس کنیز کے عشق میں تم مجنوں بننا پسند کر گئے۔ لیکن یہ شاہی تخت و تاج کچھ نہیں۔

سلیم (بہ زعم) یہ تخت نہیں ایک مظلوم عاشق کا تابوت ہے اکبر اعظم کو مزید معلوم ہو کہ محبت انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس حق کی خاطر میں دنیا سے بھی بغاوت کر سکتا ہوں خواہ مجھے تمرد و سرکشی ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

اکبر: (چیختے ہوئے) سلیم! (آہستہ سے) تم گلاب کے پھول کی طرح باپ کی شفقت میں کانٹے کی مانند کھٹک رہے ہو۔

سلیم (دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر) یہ ایک بے بس شہنشاہ کا مظلوم پر الزام ہے۔

اکبر (جذباتی ہو کر چیختے ہوئے) یا خدا! کیا مجھے اسی دن کے لئے زندہ رکھا تھا کہ ایک کمزور عاشق شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے آہنی اصولوں سے ٹکرانے کی جرأت کرے (وقفہ سے) سلیم ہم تمہیں ایک مدت کی مہلت دیتے ہیں۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔ اپنا فیصلہ بدل دو۔ ہم ایک بار پھر تمہاری خطائیں، تمہاری گستاخیاں معاف کر سکتے ہیں۔ پیار سے تمہاری پیشانی چوم سکتے ہیں۔

سلیم (بہ زعم) میں اور میری پاک محبت اکبر اعظم کی ہمدردی کی محتاج نہیں۔

اکبر سلیم تم نادان ہو (دیوار گھڑی میں پانچ بج رہے ہیں یکے بعد دیگرے گھنٹے بجتے ہیں) وزیر اعظم۔

وزیر اعظم جی عالم پناہ۔

اکبر (دیوار گھڑی پر نظر جماتے ہوئے) مقدمہ کی کارروائی کل تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔ اور سلیم کو سینٹرل جیل میں بند کر دیا جائے۔

(اکبر جاتے ہیں)

(دوسرے دن کا منظر)

باادب با ملاحظہ ہوشیار شہنشاہ ہند تشریف لاتے ہیں۔

(اکبر داخل ہوتے ہیں)

اکبر (تخت پر بیٹھتے ہی سر سے ہیٹ اتارتے ہیں، سر کھجاتے ہیں پھر واپس ہیٹ پہنتے ہوئے) وزیر اعظم ہم اس مقدمہ سے بہت پریشان ہو گئے ہیں۔ ہم جلد از جلد اس سے نجات چاہتے ہیں۔

وزیر اعظم حضور کا خیال نیک ہے۔

اکبر (پائپ سلگاتے ہوئے) ہاں تو وہ مقدمہ پیش کیا جائے (بدحواسی و پریشانی کے عالم میں ایک شخص دربار میں داخل ہوتا ہے)

جیلر حضور اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کروں اپنی جاں بخشی چاہوں گا۔

اکبر وزیر اعظم یہ کون شخص ہے؟

وزیر اعظم حضور یہ جیلر صاحب ہیں۔

اکبر اوہ! آئی سی، تو کیا فریاد ہے آپ کی؟

جیلر (خوف زدہ ہو کر) حضور ہزار پہرے ہونے کے باوجود آج صبح سلیم قید سے فرار ہو گئے۔ آئی جی، ڈی آئی جی، ایس او، انسپکٹر اور سپاہیوں نے اُن کا تعاقب کیا لیکن وہ ارجنٹ پاسپورٹ کی مدد سے انگلینڈ فرار ہو گئے۔

اکبر (غصہ سے تمتما اٹھتے ہیں) او نمک حرام تم کیا کر رہے تھے

جیلر حضور میں اُس وقت ایک بڑا ہی دلچسپ خواب دیکھ رہا تھا کہ میرا پرموشن ہو گیا ہے۔

اکبر بے شک بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں اور وہ بدنصیب انارکلی کہاں ہے؟

جیلر حضور وہ بھی شہزادہ سلیم کے ساتھ فرار ہو گئی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں حضور یہ تو کوئی بڑی پلان تھا حضور میں بالکل بے قصور ہوں، اس میں کوئی میری سازش کارفرما نہیں ہے (پیچھے ہٹتا جاتا ہے) حضور بائی گاڈ یہ میرا پلان نہیں تھا۔

اکبر تمہیں یہ کیسے معلوم کہ سلیم کے ساتھ انارکلی بھی فرار ہو گئی ہے۔ تم پہچانتے ہو انارکلی کو؟

جیسلر جی ہاں حضور میں اُسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اُس کے ناگن جیسے بال ہیں، اُونٹ سا قد ہے، کوئل سی آواز ہے، ہاتھی کی طرح چال ہے۔ اوہ ۔ لیکن حضور اُس کے چہرے پر کچھ چیچک کے داغ ہیں، اور شاید وہ بیل باٹم پہن کر گھومتی ہے۔

اکبر (چیخ کر) خاموش! بے وقوف تم اس کا ناک نقشہ بتا رہے ہو یا اُس پر غزل لکھ رہے ہو۔ وزیر اعظم! اِس کو سزائے موت دی جائے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو ایسا افسر نہیں چاہیئے جو لا پروا ہو۔ کیرلیس ہو۔ اِسے ابھی سزائے موت دی جائے۔

وزیر اعظم (بات کاٹ کر) حضور اِسے سزائے موت دینا بیکار ہے کیونکہ یہ تو خود پچپن سال میں ریٹائر ہو رہا ہے

اکبر (ریوالور نکال کر جیسلر کی طرف نشانہ بتاتے ہوئے) دفع ہو، دفعہ ہو جاؤ نظروں سے نمک حراموں۔ جب محکمۂ پولیس اتنا غافل ہے تو دوسرے محکموں کا کیا حال ہوگا؟

انسپکٹر (دربار میں داخل ہو کر ہیٹ اُتار کے بغل میں دبا کر)

May I Interfere Sir?

وزیر اعظم (نظریں جماتے ہوئے) Who are you?

انسپکٹر (سر کو خم کرتے ہوئے) I am Police Inspector

اکبر (از حد مسرت سے) Oh, Come in Come. کہو کیا خبر لائے؟

انسپکٹر (اکبر کے روبرو پیش کرتے ہوئے) حضور یہ رہی انارکلی۔
(اکبر انارکلی کو دیکھ کر تمتما جاتے ہیں اور تخت سے اُٹھ کر انارکلی کے روبرو کھڑے ہو کر)

اکبر ایسی کیا لالچ ہے جو تم سلیم جیسے معصوم اور شریف شہزادہ کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتی ہو۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک نائٹ کلب کی معمولی کیبرے ڈانسر ہو اور سلیم آسمان کا چاند ہے (انارکلی کی طرف پیٹھ کر کے) تم اُسے بھول جاؤ۔

انارکلی (سسکتے ہوئے) No I do not forget and I cant live without Salim

اکبر تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم سلیم سے محبت کرتی ہو۔ تم سلیم کے 47

بینک بیلنس، اُس کی برابری سے محبت کرتی ہو۔ تم سلیم کی بیوی بن کر ملکہ ہونے کا خواب دیکھ رہی ہو۔ یاد رہے یہ نازک ہاتھ جو صرف سو گز چل سکتے ہیں بندوق نہیں چلا سکتے

انارکلی (جھکا سر کو اٹھا کر چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو جھٹک کر) میں سلیم کو حاصل کر کے رہوں گی۔

اکبر (غصے سے) سلیم تو سلیم تمہیں سلیم کی تصویر تک نہیں ملے گی۔ (لہجہ میں آہستگی) ہاں اُس کے عوض ہم تمہیں مس انڈیا کا خطاب دے سکتے ہیں۔

انارکلی (حقارت سے) تھو... نہیں چاہیئے۔

اکبر ہم پدم شری کا خطاب دے سکتے ہیں

انارکلی وہی پدم شری جسے وی شانتارام نے واپس کر دیا تھا۔

اکبر چاہو تو پونا فلم انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلا سکتے ہیں۔

انارکلی وہ انسٹی ٹیوٹ آپ ہی کو مبارک ہو، مجھے تو صرف سلیم چاہیئے جسے آپ ہنس کر دیں گے۔

اکبر (غصے سے) گستاخ لڑکی ہمیں چیلنج کرتی ہے۔

انارکلی (بیگ سے کاغذات نکال کر) تو یہ رہا ہماری شادی کا سرٹیفکیٹ۔ اکبر اعظم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ شادی کا تو ہم ایک ہفتہ پہلے کر چکے ہیں۔ انگلینڈ تو ہم ہنی مون منانے جا رہے تھے۔
(اکبر کو غش آنے لگتا ہے وزیر اعظم انہیں سنبھالتے ہیں)

اکبر (کراہتے ہوئے) وزیر اعظم خدا کے واسطے کچھ تدبیر کرو۔ ہم نافرمان سلیم سے کیا اُمید رکھیں کہ وہ مستقبل میں مغلیہ سلطنت کے وقار کو قائم رکھ سکے گا۔

وزیر اعظم (تسلی دلاتے ہوئے) ہاں ظل سبحانی اولاد نہ ہو ایک غم لیکن نافرمان اور ناخلف اولاد ہزار غم۔
(ہمت کر کے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں) وزیر اعظم آپ ابھی وقت سلیم کو ٹرنک کال کیجئے کہ ہم اُس سے کمپرومائز کرنے کیلئے تیار ہیں۔ (لہجہ میں تاسف) وزیر اعظم ہم نے تو سلیم کو صرف دھمکی دی تھی وہ REAL میں ہم سے ناراض ہو گیا۔

وزیر اعظم حضور آپ گھبرائیے مت جب سلیم کے پاس پاکٹ منی ختم ہو جائیگی تو وہ تو خود واپس چلا آئے گا۔

اکبر ہائے ہائے وزیر اعظم دل کے بہلانے کو اکبر یہ خیال اچھا ہے۔
(اکبر غش کھا کر فرش پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے۔)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

گناہ کا رشتہ

از ——— مانک ٹالہ

"گناہ کا رشتہ" مانک ٹالہ کی درمیانی سائز کی ۱۸ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کہانیوں کے جو مجموعے اس وقت ادبی بازار میں چھپ کر آئے ہیں اُن میں یہ مجموعہ تازہ ترین ہے۔ جن لوگوں کی زبان پر اب تک اصلی دودھ کا مزا ہے اور جنہوں نے صنعتی کارخانوں میں کیمسٹوں کے تیار کردہ کے مطابق بنے ہوئے دودھوں کو نہیں چکھا ہے اُنھیں مانک ٹالہ کی کہانیوں میں وہی لطف آئے گا جو اصلی کہانیوں میں موجود ہوتا ہے۔ مانک ٹالہ کی کہانیاں نہ تو پُرانی ڈگر کی بندھی ٹکی کہانیاں ہیں اور نہ کہانی اور مضمون کے درمیان کی کوئی چیز۔ مانک ٹالہ نے کہانی کو اس طرح نہیں برتا ہے جس طرح کوئی ڈاکٹر مریض پر نئی نئی دوائیں آزماتا ہے اور پھر خود اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی بکثرت دی ہوئی دواؤں میں سے کس دوا سے مریض بچ گیا تھا۔ مانک ٹالہ کی کہانیاں تجرباتی افسانہ نگاری کا نمونہ نہیں بلکہ ان کے گہرے مشاہدے اور تخلیقی صلاحیتوں کا عکس ہیں۔ ان کی کہانیاں (psychic) سائیکک کہانیوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک موہوم اور انجانے جذبے کو' یا ایک بظاہر بے وقعت نفسیاتی احساس کو' خوبصورت کہانی کی شکل دے سکتے ہیں۔ قاری کے لئے یہ آسان بات ہے لیکن افسانہ نگار کے لئے مشکل فن۔ مانک ٹالہ اس میدان میں نئے نہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو 'سہل ممتنع' بنا دیتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں ایک خوشگوار استعجاب ہے۔ 'ایک دن کا سلطان' اس کی اچھی مثال ہے۔ 'کاروبار' میں گھر جانے والے فرد کی نفسیاتی شکست و ریخت کا کامیاب خاکہ ہے۔ پھر مانک ٹالہ کو الفاظ چُننے کا بڑا سلیقہ ہے۔ الفاظ چُننے کا کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہو۔ مانک ٹالہ اپنی کہانی کے موضوع اور اُس کے کرداروں کے مطابق الفاظ چن لیتے ہیں۔ نہ تو ان کا لہجہ کھُردرا ہے نہ زبان اُکھڑی اُکھڑی (پنجابی رنگ ضرور کہیں کہیں جھلکتا ہے) "آبرو باختہ" میں وہ ایک عصمت فروش عورت کے دل کے اندر جھانکتے ہیں۔ سیدھی سادی کہانی ہے لیکن کہیں پُر اسرار نہیں لیکن دل کو چھونے والی بات حسب معمول موجود ہے۔

کہانیوں کے اس مجموعے سے قبل اُن کا ایک اور مجموعہ "پیاسی بیل" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُس مجموعے میں بھی اٹھارہ ہی کہانیاں تھیں۔ لیکن کہانیوں اور مضامین کے مجموعوں میں یہی تعداد شاید رائج الوقت کی طرح پائی جاتی ہے۔

مانک ٹالہ اصل میں ایک 'مُبصّر' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سیّاح تو ہیں ہی' لیکن ایسے سیّاح نہیں جو صرف طعام و رقص کو دیکھنے والی نظریں رکھتے ہوں۔ مانک ٹالہ تصویر کے دوسرے رُخ کو بھول نہیں سکتے۔ یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ کہانی لکھنے کا اُن کا اپنا ایک انداز ہے تو یہ کوئی بات نہ ہوگی کیونکہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی انداز ہوتا ہی ہے۔ اُن کی چابکدستی کا اسٹائل بناتی ہے۔ وہ اپنے قاری کو ابہام اور غیر ضروری غور و فکر میں مبتلا نہیں کرتے۔ اُن کی کہانی اندھیروں کی طرف نہیں بڑھتی۔ اُن کی کہانیوں میں قاری کھلے آسمان اور کھلی فضا کا نظارا کر سکتا ہے۔ وہ اُس فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں جو کہانی اور قصّے میں ہوتا ہے۔

اس کتاب کے ناشر خود مانک ٹالہ ہیں۔ کتاب یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس میں چھپی ہے اور یقیناً اچھی چھپی ہے کیونکہ اس پریس میں خارجی ناقص طباعت کا اب تک کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ "کاتب" کا نام البتہ کتاب میں کسی جگہ نظر نہیں آیا۔ اچھی کتابت کرنے والے کاتب شاید اپنی تشہیر نہیں چاہتے۔ کاغذ کی کمیابی کے اس ماحول میں ایسا عمدہ کاغذ حاصل کر لینا' چابکدستی کی دوسری مثال ہے ——— یہ مجلّد کتاب یقیناً افسانوں کے شائقین کے ذوق کی تکمیل کرے گی۔

قیمت چھ روپے ——— صفحات ۱۸۴

ملنے کا پتہ :- مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵۲ بمبئی ۸ — ۴
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار دہلی۔
پرنسس اسٹریٹ۔ جے جے اسپتال' بمبئی ۳

(یوسف ناظم)

آئینے کے سامنے

از ——— مبشر علی صدیقی

یہ پروفیسر مبشر علی صدیقی کے مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے اُن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "اردو اور تاریخ کیسے پڑھائیں" پر اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے انھیں انعام بھی دیا تھا۔

مبشر علی صدیقی تیس پینتیس سال سے لکھ رہے ہیں اور چونکہ ان کی پوری زندگی درس و تدریس میں گذری ہے اس لئے ادب کی ترسیل کے لئے انھوں نے ہلکی پھلکی زبان اور مختصر تحریروں کو اپنی انفرادیت بنا لیا ہے۔ اُن کی ان تحریروں سے عام لوگوں اور خاص طور پر ادب کے طالب علموں کو کافی فائدہ پہنچا ہے۔

"آئینے کے سامنے" تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں اُردو نثر میں سرسیّد کی تحریر کی اہمیت، شبلی کے چند اہم مقالات۔ نذیر احمد اُردو کے پہلے ناول نگار۔ حیاتِ جاوید اور حالی۔ جذبۂ علیم شرر لکھنوی۔ اقبال اور اُس کے نقاد۔ حفیظ جالندھری کی ایک نایاب تصنیف "ہندوستان ہمارا" پر مضامین ہیں۔ دوسرے حصّے میں دیوانِ غالب کے بدایوں ایڈیشن۔ تلکشی زائن جوہر بدایونی۔ آلِ احمد سرور کی شاعری میں کشمیر کا ذکر۔ طوفان ترقی (حاتم علی بدایونی) اور نذیر آبر ہیں۔ تیسرے حصّے میں وہ تبصرے ہیں جو اُنھوں نے جگر مرادآبادی "شخصیت اور فن"، رَس (رباعیات) نسیم مغرب اور یادوں کی برات پر رسالہ "کتاب نما" دہلی میں کئے۔

پہلے حصّے کا اقبال والا مضمون ایک ادبی مکالمہ ہے جو "ادبی مقالات" میں پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر اور طالب علم کا یہ مکالمہ کافی دلچسپ ہے۔ ہر چند اقبال کی شاعری اور اُس کی تحریروں پر تحقیق و تنقید کا نیا کام بہت کافی ہو چکا ہے۔ پھر بھی صدیقی صاحب کا یہ مکالمہ بعض معروف حقائق کو اچھی طرح پیش کرتا ہے۔

سرسیّد، شبلی، نذیر احمد، حالی اور شرر پر گفتگو میں کوئی نئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہاں ان ممتاز شخصیتوں اور اُن کے کام کو اپنے اپنے انداز میں مزید پیش کیا جا سکتا ہے۔ مبشر علی صدیقی نے بھی پیش کیا ہے اور کہیں کہیں اپنی آزادانہ رائے بھی دی ہے۔ حفیظ جالندھری کی کتاب پر مضمون البتہ نہایت مختصر ہوتے ہوئے نیا ہے۔ کسی دوسرے ادیب نے اس پر نہیں لکھا ہے۔

دوسرے حصّے کے مضامین میں اُنھوں نے اپنے بدایونی ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ چند معروف و غیر معروف لوگوں اور اُن کے کام سے روشناس کرایا ہے۔

تیسرے حصّے میں تبصرے شامل ہیں اور غلو یا افراط و تفریط سے پاک۔

۱۷۶ صفحات۔ قیمت۔ چالیس روپئے۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر رسالہ رہنمائے تعلیم پھاٹک مفتی والان، بلیماران دہلی ۶

شعر اور شاعر

مرتبہ ——— ضیا فتح آبادی

اُردو میں ایک مستحسن کام چند سال سے ہو رہا ہے کہ ایک حلقے، ایک شہر یا ایک صوبہ کے چند ادبا اور شعرا کی تخلیقات اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ شائع کر کے اُردو دنیا تک پہنچایا جائے۔ ایسی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں۔

اس سلسلے میں بزمِ سیماب دہلی نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ بیس شعرا کا تذکرہ شائع کیا ہے۔ فہرستِ شعرا میں طالب چکوالی۔ آر۔ کے سہگل۔ طالب دہلوی۔ شاداں چند بسمل۔ ضیا فتح آبادی۔ اثر دہلوی۔ بشیر درد۔ کرشن مرلی۔ سرشار چو شیار پوری۔ اوم پرکاش بجاج۔ کرشن موہن۔ ڈی راج کنول۔ شباب دہلوی۔ راجپال اشک۔ منظر نسیم۔ پریم دت چاند۔ جانباز پانی پتی۔ بلاقی چند ناز۔ مرحوم دیر سیماب۔ آفتاب کیفی کے نام ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے معروف شعرا ہیں جو ادب و شعر میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور چند غیر معروف ہیں۔

حالاتِ زندگی خود نوشت ہیں اور بھرپور۔ یہ ڈھائی، تین اور چار صفحات سے کم نہیں۔ اسی طرح نمونۂ کلام بھی نہ صرف منتخب ہے بلکہ ہر شاعر کے لئے چار تا چھ صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ تمام شعرا کی تصاویر آرٹ پیپر پر نہایت عمدہ چھاپی گئی ہیں۔ جنھیں شاعر ضیا فتح آبادی، صدر بزمِ سیماب نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کی آخری سطور میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس تذکرے میں بیشتر ایسے شعرا کا ذکر ہے جو کسی نہ کسی طرح بزمِ سیماب دہلی سے متعلق یا اس کی کارگذاریوں میں شریک رہے ہیں۔ یہ تمام سوانحِ حیات علاوہ اُن کے جو خود اُنھوں نے قلم کے ذریعے ترتیب دیے۔ البتہ کلام کے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ شاعر کے ذہن و فکر کا آئینہ دار ہو۔"

سرورق، کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب ہے۔ ۲۴۰ صفحات۔ قیمت پچاس روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ بزمِ سیماب ۔ ۲-۵۱ جی ۔ ۲ ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

قومی یکجہتی نمبر ـــــ خیالات و تاثرات

مظہر امام ـــ پٹنہ

"قومی یکجہتی نمبر" بازار میں سرسری طور پر دیکھا۔ اس عظیم کارنامے پر آپ کو مبارکباد کے رسمی الفاظ کیا لکھوں۔ خاص نمبروں کی اشاعت میں "شاعر" نے پاکستان کے بڑے بڑے جغادری رسالوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کاش آپ کی محنت کی خاطر خواہ پذیرائی ہو سکے۔ ملک میں اس نمبر کے چھپنے اور اجراء کی مختصر رپورٹ مقامی روزنامہ "صدائے عام" میں پڑھی بہت ہی خوشی ہوئی۔ آپ کے کاندھوں پر جس کثیر خرچ کا بوجھ ہے اُسے یہ نمبر کیسے پورا کر سکے گا کہنا مشکل ہے۔ اس کی آٹھ دس ہزار کاپیاں تو حکومت کو یکمشت خرید لینا چاہئیں۔ مگر یہ کام کون کرے!

ضیا فتح آبادی ـــ دہلی

کل "شاعر" کا قومی یکجہتی نمبر موصول ہوا۔ "شاعر" نے اپنے خاص نمبروں کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ایک ہی موضوع پر اتنے رنگا رنگ مضامین نظم و نثر جمع کر لینا جوئے شیر لانا ہے۔ ترتیب اور پیش کش کا جو سلیقہ "شاعر" کو ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اس نمبر کی خصوصیت وہ منشور ہے جس پر تیرہ سو سے زائد ادبا و شعرا نے دستخط کئے ہیں۔ اس فہرست میں سبھی بڑے بڑے کار آمد ہیں اور یہ تو دانشوروں کی مربوط ڈائرکٹری تیار ہو گئی ہے!

عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" ـــ حیدرآباد

"قومی یکجہتی نمبر" ملا۔ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ آپ نے جس محنت سے یہ پرچہ مرتب کیا ہے وہ لائقِ صد ستائش ہے۔ آپ ہی کی لگن، محنت اور تجربے کے باعث ایسے مفید اور خوبصورت نمبرات شائع ہو سکے ہیں۔ خدا کرے آپ کی یہ محنت بار آور ثابت ہو۔

آغا رشید مرزا ـــ گلگت

"قومی یکجہتی نمبر" ملا۔ "شاعر" کی ادبی اور قومی خدمات اور خصوصی نمبروں کی روایات ایک ملک گیر شہرت اور ادبی دنیا میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم کے بعد سے ہندوستان میں کسی جریدے نے ایسے شاندار خصوصی نمبر اور ایسا اعلیٰ ادب اب تک پیش نہیں کیا۔ ان ہی خدمات کی وجہ سے اب "شاعر" نے ایک اہم ادبی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

یہ بات بڑے تعجب اور حیرت کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ قابلِ ستائش بھی کہ آپ اس بحرانی اور طوفانی دور میں بھی اپنی محنت اور عرق ریزی سے اس چراغ کو روشن کئے ہوئے ہیں اور گذشتہ نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی اپنی روایات کے مطابق شاندار رہا۔ سرورق موضوع کے لحاظ سے نہایت موزوں اور جاذبِ نظر ہے۔ "تحریکات" میں آپ نے قدیم و جدید قومیت کے تصور کے ساتھ ساتھ اس نمبر کی رُوداد بھی مختصر اور پُر اثر الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ قومی یکجہتی کے اتنے بہت سے پہلوؤں کی نشاندہی کرنا اور ان پر مضامین لکھوانا آپ کے غور و فکر کی گہرائی اور علم و عمل کی شہادت دیتا ہے۔ چنانچہ ہر مضمون یکجہتی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور اُسے استوار کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریق کار پیش کرتا ہے۔ حصۂ نظم جذبات و احساسات سے بھرپور، افسانے دلچسپ، ڈرامے پُر اثر اور ترجمے شستہ اور رواں ہیں۔

غرض یہ نمبر ایک ایسا سنگِ میل ہے جو ماضی کے حالات، حال کی کشمکش اور مستقبل کے لائحہ عمل کی نشاندہی کرتا ہوا منزل تک پہنچنے کی سمتیں متعین اور راہیں اُجاگر کرتا ہے۔

کاش آپ کی ان عظیم ادبی و قومی خدمات پر اربابِ حکومت اعلیٰ تک رسائی اور اثر و رسوخ رکھنے والے اہلِ نظر کی نگاہ بھی پڑے اور وہ عملاً ان خدمات کا اعتراف کریں۔ تاکہ علم و ادب اور قومی خدمات کے یہ سوتے خشک نہ ہونے پائیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس ـــ دہلی

"شاعر" کا قومی یکجہتی نمبر ملا۔

اتنے اہم اور مہتم بالشان موضوع پر ایسا توانا اور حیات بخش نمبر دیکھ کر سب سے پہلے تو یہ تسلی ہوئی کہ آپ تندرست ہیں ورنہ کسی بیمار میں اس کوہِ گراں کو اٹھانے کی تاب کہاں تھی۔ پھر خیال آتا ہے کہ اس موضوع پر اتنا ضخیم اور گراں قدر نمبر نکالنے میں آپ جن آزمائشوں سے گزرے ہوں گے، اگر کوئی نہایت تندرست انسان بھی ان کو جھیلتا تو بیمار ہو جاتا۔ سچ پوچھئے آپ کے اس عزم و شوق اور قومی جذبہ

کی داد نہیں دی جا سکتی جس سے کہ آپ اس مہم کو سر کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اس کے مضامین کی افادیت کے بارے میں کیا کہوں؟ ایسے مختلف زاویوں سے ہندوستانی قومیت کے بنیادی عناصر اور قومی یک جہتی کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ نمبر اس اہم موضوع پر ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ یہ خاص نمبر ہندوستان کی ہر اُس درسگاہ، کتب خانہ ادارہ اور گھر میں موجود ہو، جہاں اُردو پڑھنے والے ہیں۔ حکومت اور اُس کی سرپرستی میں بعض ادارے قومی یک جہتی کے پروپیگنڈے پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ میری دانست میں اگر وہ بیس پچیس ہزار کی رقم اس نمبر کے لئے مختص کر دیں کہ پانچ ہزار کی تعداد میں خاص ہو کر تمام اُردو داں پبلک تک پہنچ سکے تو اس رقم کا اس سے بہتر مصرف نہیں ہو گا۔

ابھی میں نے صرف عرش ملسیانی، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر گیان چند اور آغا رشید مرزا کے مضامین پڑھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوا کہ اس نمبر کے مضامین کیسی کاوش و فکر سے لکھے گئے ہیں۔ شرمندہ ہوں بلکہ پچھتا رہا ہوں کہ اس محفل میں میں موجود نہیں ہوں۔

ل۔ احمد اکبرآبادی ـــــــ آگرہ

"قومی یک جہتی نمبر" پچھلے ہفتے مل گیا تھا۔ آپ کی محنت اور جانکاہی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ابواب کی تقسیم نہایت اعلیٰ ہے۔ مضامین سب بلند پایہ ہیں۔ تاریخی، سماجی اور ادبی پس منظر پر مضامین بہت بالغ نظری کا ثبوت ہیں۔ دیگر مضامین سے پتا چلتا ہے کہ قوم میں جو یک جہتی قائم ہو سکتی تھی اُسے سیاسی لوگوں نے تباہ کیا ہے۔ جو علاج بتائے گئے ہیں، وہ نہایت معقول تجاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ اہلِ سیاست اپنی اغراض پر قومی یک جہتی کو ترجیح دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

مبشر علی صدیقی ـــــــ بدایوں

اپنے ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے خط میں آپ نے لکھا تھا۔ "تو ان باتوں سے قطع نظر بات قومی یک جہتی نمبر کی تھی، جس نے میرے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے ایک بجے تک اُسی کے کام کرنے پڑ رہے تھے۔ ہفتوں پلنگ سے ہٹنا نہیں ہوتا تھا۔ جسم شل ہو ہو جاتا تھا۔ آخر میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ میں ہی جانتا ہوں۔ قومی یک جہتی نمبر جان لیوا نکلا۔"

اور اس وقت میرے سامنے "قومی یک جہتی نمبر" ہے۔ مضامین، نظموں اور شذرات کا معیار، اُن کا انتخاب، ترتیب و تزئین اور تراجم کی دلکشی، یہ سب آپ کی محنت کا پھل ہے اور آپ کے ادبی و صحافتی ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس وقت ایک مضمون کی طرف خاص طور پر اشارہ کروں گا۔ یہ صفحہ ۱۱۱ پر آنجہانی ملک پوری کا ادبی مضمون "اُردو شاعری اور قومی یک جہتی" ہے۔ میرے خیال میں ایم۔ اے (اُردو) کے آٹھویں پرچہ کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو گا۔ فاضل مضمون نگار نے مختلف معیاری نظموں کے اقتباسات دے کر اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ حصۂ نظم بھی کافی جاندار اور وقیع ہے۔ جاں نثار اختر، وامق جونپوری اور سلام مچھلی شہری کی نظمیں ناظرین کو ضرور متاثر کریں گی۔ ۱۹۲۶ء میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے طلبا کے لئے ہندوستان کی منظوم تاریخ "ہندوستان ہمارا" لکھی تھی۔ اُس کی متعدد نظمیں قومی یک جہتی کا اچھا نمونہ ہیں۔ افسوس کہ اس خصوصی شمارہ میں اتنی اہم کتاب کے لئے کہیں گنجائش نہ نکل سکی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی قومی یک جہتی کا محکمہ اتنا ضخیم اور معیاری شمارہ شائع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ایک ایک جلد ہر سرکاری اور غیر سرکاری لائبریری میں ہونا چاہیئے۔ ایک مرتبہ پھر ایسا شاندار نمبر نکالنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اس کی رسمِ اجرا کی روداد میں نے بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے ابھی حال ہی میں سُنی تھی۔ مجھے ایک مقرر کے قول سے بالکل اتفاق ہے کہ موسیقی کے "آگرہ گھرانہ" کی طرح شعر و ادب کا بھی ایک "آگرہ گھرانہ" ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی ـــــــ گورکھپور

"شاعر" کا "قومی یک جہتی نمبر" موصول ہوا۔

آپ نے ہندوستان کے چوٹی کے محققوں، ناقدوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کی کاوشات یکجا کی ہیں۔ یہ آپ کی سعیٔ مسلسل کا ثمرہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی "قومی یک جہتی منشور" آپ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ۲۸۷ دستخطوں کا فراہم کرنا آسان کام نہیں تھا مگر آپ کی پُرخلوص کوشش نے اسے آسان بنا دیا۔

مجھے امید ہے کہ یہ "قومی یک جہتی نمبر" ہندوستان کی مسموم فضا میں تبدیلی لائے گا اور چاروں طرف مہر و وفا کی خوشبو بکھرا دے گا۔

"شاعر" کا ایک تاریخی کارنامہ

خواجہ احمد عباس ـــــــ "اسٹیم رولر" بمبئی

اُردو کے سب سے پُرانے ادبی رسالے "شاعر" نے ساڑھے چار سو صفحات کا اپنا "قومی یک جہتی نمبر" شائع کیا ہے جس میں قومی یک جہتی کے موضوع پر ۹ افسانوں،

شاعروں اور جدید شاعروں کے علاوہ کوئی دو درجن مفکروں کے علمی مضامین شائع کیے گئے ہیں جو قومی یک جہتی کے مسئلے پر سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی رُخ کو اُجاگر کرتے ہیں۔

جناب جوش ملسیانی نے قومی یک جہتی کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر نے مسلمان سلطانوں کے عہد میں ملکی یک جہتی کے کیا رجحانات تھے ان پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر رام چندر تیواری نے "ہندو مذہب میں یک جہتی کا جذبہ" پر لکھا ہے اور پروفیسر ہربنس سنگھ نے سکھ مت اور قومی یک جہتی کے بارے میں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے قومی یک جہتی اور اسلام پر مقالہ لکھا ہے۔

اُلجھے ہوئے مسئلے

اس ضخیم نمبر کی نمایاں خوبی وہ مضامین ہیں جو مختلف زبانوں کے عالموں اور ریسرچ کرنے والوں نے "قومی یک جہتی میں زبانوں کا کردار" پر لکھے ہیں۔ ان میں رلا تجاراؤ (جو آندھرا ساہتیہ اکاڈمی کے سکریٹری اور تلگو زبان کے عالم ہیں) ڈاکٹر گیان چند (جو اُردو کے بہت بڑے عالم اور نقاد ہیں) اور شکیل عظیم آبادی (جو اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور بلند پایہ جرنلسٹ ہیں)، کے مضامین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں کیونکہ یہ اُلجھے ہوئے مسئلے کو عقل اور انسان دوستی کی روشنی میں سُلجھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ایم۔ وی۔ راج گوپال کا مضمون "قومی یک جہتی میں ادب اور آرٹ کا حصہ" خوب ہے اور ڈاکٹر بپن چندر اور ڈاکٹر عابد حسین کے مضامین "قومی یک جہتی اور سیکولرزم" ایک ہی مسئلے کو دو الگ الگ زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نظموں کا حصہ رابندر ناتھ ٹیگور کی لافانی "دُعا" سے شروع ہوتا ہے جس کا نہایت موثر ترجمہ اشفاق رہبر نے کیا ہے اور اس کے بعد جاں نثار اختر کی نہایت خوبصورت اور پُراثر نظم "قومی وحدت" ہے۔ سلام مچھلی شہری مرحوم کی نظم "میں اس طرح یہ مسئلے دیکھتا ہوں" ہمیں اُن کی یاد دلاتی ہے اور بلراج کومل کا "اجنبی راہرو" ہمیں اُن راہوں سے روشناس کراتا ہے جو روشنی اور زندگی اور دوستی اور محبت کی راہیں ہیں۔

یہ نمبر جس کا اجرا پچھلے ہفتے بمبئی کے ایک جلسے میں ہوا تھا جس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی اور رسم اجرا ڈاکٹر رفیق زکریا کے ہاتھوں ہوئی تھی وہاں سارے مقررین نے "شاعر" کے ایڈیٹر اعجاز صدیقی کو دلی مبارکباد پیش کی کہ اُن کی دو سالہ محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ایک خوبصورت اور معنی خیز "نمبر" کی شکل میں نکلا ہے۔

یہ قومی یک جہتی نمبر اُردو زبان میں شائع ہوا، اس کی خوشی ہے۔ اُردو زبان تو خود "قومی یک جہتی" کی ایک روشن نشانی ہے۔

لیکن ایسا نمبر تامل زبان میں شائع ہوتا تو شاید بہتر ہوتا کہ تامل ناڈو میں ایسے تنگ نظر سیاست دانوں اور ادیبوں کی کمی نہیں ہے جو قومی یک جہتی کا راستہ چھوڑ کر اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا چاہتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ تامل کلچر اور تامل بھاشا بھی قومی یک جہتی کی پیداوار ہیں (مثال کے طور پر راج گوپال اچاریہ مرحوم نے ایک مضمون میں بتایا تھا کہ تامل زبان میں ہزاروں الفاظ ہندی، اُردو، سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں کے ہیں)

یہ نمبر مراٹھی زبان میں شائع ہوتا تو اور اچھا ہوتا کیونکہ شیو سینا کے کتنے ہی سورما بھی اپنے آپ کو قومی یک جہتی کی دھارا سے الگ سمجھتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ شیواجی مہاراج خود بھی عملی طور سے اتحاد اور قومی یک جہتی کے علمبردار تھے

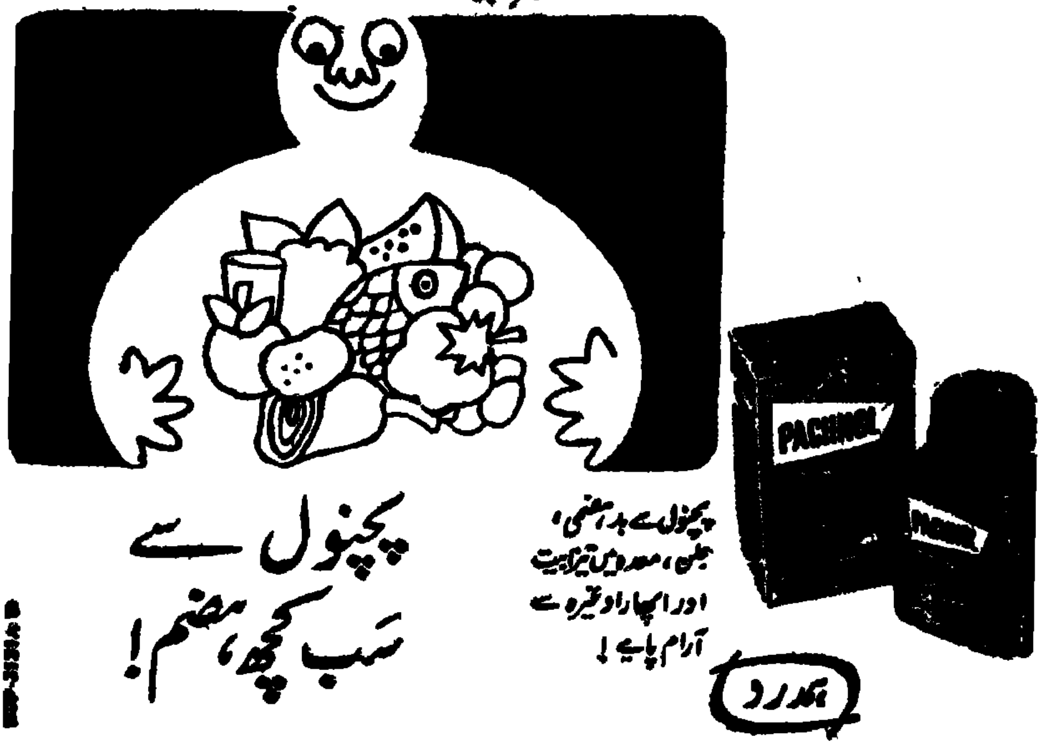
یہ نمبر بنگالی میں شائع ہوتا تو اچھا تھا کیونکہ کچھ بنگالی اپنے بنگال کو ایک الگ "ملک" سمجھتے ہیں اور بنگالی کلچر اور آرٹ کو ہندوستانی آرٹ اور کلچر سے علیحدہ اور منفرد سمجھتے ہیں۔

کاش ایسا نمبر پنجابی، آسامی، تیلگو، ملیالم بھاشاؤں میں بھی شائع ہو جاتا۔ مگر شاید یہ اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ سب سے پہلے یہ نیک خیال ایک اُردو ایڈیٹر ہی کو آیا کہ ادب کی روشنی میں ملک کو اتحاد اور یک جہتی کا راستہ دکھائے۔

بقیہ صفحہ ۵ "فکر بیتی"

گھٹا پڑا تھا اور وہاں ایک دھرم ایا، گیانی بیٹھا تپسیا کر رہا تھا۔ اور پھر گیان کے آسمان سے ایک قلم گرا اور صدا آئی: "جہاں جہاں سے بھاگے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ، اور اس قلم سے تپسیا کرو اور اس تپسیا سے گھاؤ کو اور پیڑا کو اور انگارے کو حُسن، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور یہ خدا کا حکم ہے اور یاد رکھو، خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے ...."

اور اس صدا میں مسرت تھی جو میرے مساموں سے پھول کی طرح کھِل اُٹھی اور میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ لیا جس سے یہ پھول خوشبو دینے لگے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے یہ میرے مقصودِ حیات کی خوشبو ہے۔ کعبے اور دیر کے فاصلے کو ختم کرنے والی خوشبو ہے۔ اور یہی خوشبو پھر تیرتے تیرتے میں دنیا کو یہ بتانے کا اہل ہو سکا کہ دیوتاؤں نے میرے جسم پر پھول کیوں نہیں برسائے۔ اور کہ خدا صرف ایک شرط پر ڈیفیٹسٹ دیوتا پیدا کر سکتا ہے۔ اگر بچا تو خودکشی نہ کرے بلکہ گورو صاحب کی طرح تو سرباندوں سے جنگ کرے۔ ▲


پچنول سے
سب کچھ، ہضم!
پچنول سے بد ہضمی،
جلن، معدہ میں تیزابیت
اور اپھارا وغیرہ سے
آرام پایئے!
ہمدرد
PACHNOL


سب سے زیادہ
قابلِ اعتماد
بالوں کو
سیاہ
کرنے والا
وسمول
بالوں کو سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے
ایملسی فائڈ ہیئر آئل اور
پومیڈ کی شکل میں
دنیا بھر میں لاکھوں لوگ استعمال کرتے ہیں
ہر اسٹور سے دستیاب ہو سکتا ہے
ہائیجینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲، بمبئی نمبر ۱

رفتار

علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

"شاعر" کے قومی یک جہتی نمبر کی تقریبِ اجراء

۱۷ر نومبر ۱۹۹۸ء کا دن یادگار دن تھا جب کہ شام کو پانچ بجے دلاور بھائی فاضل بھائی آڈیٹوریم بمبئی میں جناب ڈاکٹر رفیق زکریا، وزیر برائے شہری ترقیات بہبودیٔ کول، سیاحت اور اوقاف حکومت مہاراشٹر نے قومی یک جہتی نمبر کا اجراء فرمایا۔ اس شاندار تقریب کی صدارت ادیب شہیر کرشن چندر نے کی۔ بڑی تعداد میں ادیب، شاعر، صحافی، سماجی کارکن اور علم دوست اس میں شریک ہوئے۔ ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے اس تقریب کو ریکارڈ کیا اور کیمروں میں محفوظ کیا۔

تقریب کی ابتدا اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" نے اپنی استقبالیہ تقریر سے کی۔ انھوں نے اس بڑے قومی کام میں دشواریوں کے ذکر کے بعد کہا کہ قومی یک جہتی نمبر کے مضامین میں بصیرت و بصارت کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ یہ سچی اور پائیدار قومی یکجہتی پیدا کرنے میں معاون ہوں گے۔ آپ نے اس بات کی تلقین کی کہ ہندوستان کے تمام مذاہب اور فرقوں کو سورج کی روشنی اور حرارت، انسانی خون کی گردش اور گرمی کی طرح آپس میں مل جانا چاہئے۔ ہمارے دکھوں کا علاج یک جہتی اور ایک قومی وحدت بن جانے ہی میں ہے۔

اعجاز صدیقی کی تقریر کے بعد افتخار امام صدیقی نے جاں نثار اختر کی نظم "قومی وحدت" کے چند اشعار بڑے ہی دلکش ترنم میں پیش کئے۔ نظم کے بعد جناب ڈاکٹر شانتی سروپ نشاط نے عالیجناب ڈاکٹر رفیق زکریا، کرشن چندر، تقریب کے مہمانِ خصوصی سلطان ڈوسل صاحب کی گل پوشی کی۔ محترم ڈاکٹر رفیق زکریا نے اعجاز صدیقی کو ہار پہنایا۔ بعدازاں جناب خواجہ عبدالغفور نے عالیجناب نواب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر اور عالیجناب وی پی نائک، وزیرِ اعلیٰ مہاراشٹر کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔ مہاراشٹر کے ان دونوں سربراہوں نے "شاعر" اور اس کے قومی یک جہتی نمبر نیز اعجاز صاحب کی طویل خدمات کی ستائش کی۔

تقریری پروگرام میں مشہور ادیب اور فلم پروڈیوسر و ڈائرکٹر خواجہ احمد عباس نے کہا ـــــ مجھے خوشی ہوتی اگر یہ نمبر بنگالی، آسامی، تلگو، ملیالم، مرہٹی، پنجابی وغیرہ زبانوں میں بھی شائع ہوتا۔ اردو تو خود قومی یک جہتی کی روشن نشانی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کام کو اعجاز صاحب کا پاگل پن قرار دیا تھا۔ کاش ملک میں ایسے پاگل اور بھی پیدا ہوں۔

ممتاز ادیب، طنز و مزاح نگار خواجہ عبدالغفور نے فرمایا ـــــ زمانہ ایسا ہے کہ ہر طرف نئی جہتیں تراشی جا رہی ہیں۔ "شاعر" نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ ساری جہتوں کو اکٹھا کرکے "قومی یک جہتی نمبر" نکالا ہے۔ ہم سب کو لسانی، جغرافیائی اور مذہبی جہتوں کو بھول کر ایک جہت جو انسانیت کی جہت ہے اُسے اپنانا چاہئے۔

مشہور ماہرِ تعلیم سید شہاب الدین دسنوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "شاعر" کا احسان ہے کہ اس کا ایک ایسا نمبر شائع ہوا ہے جس سے قومی یکجہتی اور جذباتی یک جہتی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ترقی پسند شاعر و نقاد سردار جعفری نے فرمایا کہ جن ناسازگار حالات میں اعجاز صاحب "شاعر" کو مسلسل نکال رہے ہیں وہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ انھوں نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ قومی یک جہتی نمبر کی اشاعت میں اعجاز صاحب کو جو سہولتیں ملنا چاہئے تھیں، وہ نہیں ملیں پھر بھی انھوں نے اتنا بڑا کام کر دکھایا۔

ان تقریروں کے بعد عالیجناب ڈاکٹر رفیق زکریا نے سُرخ کاغذ اور ربن میں بندھے ہوئے قومی یک جہتی نمبر کو کھول کر اس کے اجراء کی رسم ادا کی۔ اعجاز صاحب کی طویل ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ـــــ یہ انہی کا کرشمہ ہے کہ ۴۸ سال سے باقاعدگی کے ساتھ نہ صرف رسالہ "شاعر" کو چلا رہے ہیں بلکہ مضامین کے معیار کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے قومی یک جہتی نمبر کی اشاعت پر اعجاز صاحب کو مبارکباد دی۔

آخر میں صدرِ جلسہ کرشن چندر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ موسیقی کا ایک آگرہ گھرانہ ہے۔ موسیقی کے علاوہ اردو ادب کا بھی ایک گھرانہ ہے جس کی بنیاد سیماب اکبرآبادی نے رکھی تھی۔ قومی یک جہتی، وحدت اور حب الوطنی کی جو مشعل سیماب اکبرآبادی نے جلائی تھی اسی مشعل کو آج اعجاز صدیقی فروزاں کئے ہوئے ہیں۔ کرشن چندر نے مرکزی حکومت اور مہاراشٹر گورنمنٹ پر زور دیا کہ وہ اعجاز صاحب کی خدمات کو سراہے اور انھیں انعام سے نوازے۔

مہمانِ خصوصی جناب سلطان ڈوسل، منیجنگ ٹرسٹی دلاور بھائی فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ بمبئی اور ممتاز صنعت کار جناب سلطان ناتھانی نے "شاعر" کے قومی یک جہتی نمبر کی سو سو کاپیاں خریدنے کا اعلان کیا اور یہ شاندار تقریب اعجاز صدیقی صاحب کے شکریہ پر ختم ہوئی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جامعہ ملیہ کے صدر شعبۂ اردو

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور نوجوان محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہوا ہے۔

مہاراشٹر سے تین نئے رسالوں کا اجراء

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ گزشتہ تین ماہ میں صوبۂ مہاراشٹر سے اردو کے تین علمی و ادبی اور تعلیمی رسائل کا اجراء ہوا ہے۔

"غبار خاطر" سہ ماہی رسالہ ہے جو مولانا آزاد ایجوکیشن سوسائٹی اورنگ آباد کی طرف سے ضمیر احمد کی ادارت میں نکلا ہے۔ یہ علمی ادبی اور تحقیقی مجلہ ہے ۲۴۰ صفحات ہیں اور قیمت فی کاپی پانچ روپے۔

"نشانات" مالیگاؤں سے نکلا ہے۔ یہ دو ماہی ادبی رسالہ ہے اور اس کے ایڈیٹر شکیل [illegible] بھائی ہیں ۶۴ صفحات۔ زر سالانہ دس روپے ہے اور فی پرچہ قیمت دو روپے۔

تیسرا رسالہ سہ ماہی "آموزگار" ہے جو جلگاؤں سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ خالص تعلیمی رسالہ ہے جو اردو ثانوی مدارس کے ہیڈ ماسٹروں کی ایسوسی ایشن کا ترجمان ہے۔ [illegible] صفحات [illegible] زر سالانہ دس روپے

سجاد ظہیر مرحوم، آل احمد سرور، جاں نثار اختر، رفعت سروش کو ایوارڈ

اس سال کے سوویت ایوارڈ اردو میں علی الترتیب سجاد ظہیر مرحوم، [illegible] جاں نثار اختر اور رفعت سروش کو دیئے گئے

ساہتیہ اکیڈمی کا اردو ایوارڈ

پروفیسر آل احمد سرور کو ان کی کتاب [illegible] پر دیا گیا ہے

ادارۂ "شاعر" ان تینوں انعام یافتگان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں سے درخواست

نیشنل کونسل آف انڈین رائٹرز کے زیر اہتمام اردو مضامین، افسانوں، غزلوں اور نظموں کا ایک انتہائی خوبصورت مجموعہ کتاب کی شکل میں بہت جلد شائع کیا جا رہا ہے۔ کونسل کے شعبۂ اشاعت کے انچارج جناب حسن چشتی نے تمام ادیبوں اور شاعروں سے خواہش کی ہے کہ وہ اس مجموعہ کے لئے اپنی منتخب تخلیقات، حالاتِ زندگی اور تصویر حسب ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

ان ادیب و شاعر حضرات سے جن کی تخلیقات اس کتاب میں شامل ہوں گی، توقع کی جائے گی کہ کم از کم دس کتابوں کی نکاسی کا انتظام فرما دیں تاکہ ترویج و اشاعت میں کونسل کی اعانت ہو سکے۔

نیشنل کونسل آف انڈین رائٹرز (۴) / ۱-۷-۱۵۰ ایلیٹ [illegible] سکندرآباد (اے۔ پی)

وفیات

گزشتہ چند ماہ "شاعر" کے عام شمارے شائع نہ ہو سکے۔ اور اس عرصہ میں کئی مشہور ممتاز اور قابل ذکر شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ ادارہ "شاعر" ان سب کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

حسین حسان ندوی کا ۱۳ جولائی [illegible] کو انتقال ہو گیا۔ وہ مکتبہ جامعہ سے نکلنے والے ماہنامہ "پیام تعلیم" کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے بچوں کے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ بچوں کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب پر اردو اکیڈمی نے انعام بھی دیا تھا۔

ڈاکٹر مجیب قریشی کا ۸ جولائی [illegible] کو دماغ کی رگیں پھٹ جانے کے باعث انتقال ہوا۔ مرحوم اردو فارسی کے ممتاز محقق، عالم اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے پروفیسر تھے۔ گزشتہ کئی سال سے ہندوستان کے صوفیائے کرام پر کام کر رہے تھے۔ "تذکرۂ [illegible]" کا اردو ترجمہ ان کی یادگار ہے۔

ٹھاکر پونچھی ۱۸ اگست کو سڑک کے ایک حادثہ میں زخمی ہو گئے تھے۔ ۱۹ اگست کو جموں (کشمیر) کے ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ اردو اور ڈوگری زبانوں کے مشہور افسانہ و ناول نگار تھے۔ عرصہ دراز سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ دو سال پہلے دہلی [illegible] سے جموں ریڈیو پر ان کا تبادلہ ہوا تھا جہاں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ٹھاکر پونچھی نے اردو زبان کو کئی خوبصورت ناول اور افسانے دیئے۔

بہزاد لکھنوی کی وفات [illegible] اکتوبر [illegible] کو کراچی (پاکستان)

میں ہوئی۔ ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اُردو کے مشہور نعت گو شعرا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ ریڈیو پاکستان سے روزانہ صبح نعتیہ کلام نشر کیا کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے بہزاد لکھنوی مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ ان کے ترنم سے مشاعروں کی محفلیں گونجا کرتی تھیں۔ اختلاج کے پُرانے مریض تھے۔ گلے سے گریبان تک ایک دھجی پڑی رہتی تھی اور کلام سُنانے وقت وہ اپنا ہاتھ اُس دھجی میں چلاتے رہتے تھے۔

عزیز سلونوی سلون (ضلع رائے بریلی) کے مشہور معمر شاعر تھے۔ مولانا سیماب اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ تھا اور عزیز بابا کہلاتے تھے۔ پیرانہ سالی میں بھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ بعد کینسر کے مرض میں مبتلا ہوکر ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو کانپور میلٹ اسپتال میں اُن کا انتقال ہوا۔ تجہیز و تکفین اُن کے شہر سلون میں ہوئی۔

ممتاز حسین اُردو زبان کے نہایت مشہور و ممتاز نقاد تھے۔ ۱۰ اکتوبر کو اسلام آباد پاکستان میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کی وفات سے اُردو زبان خصوصاً تنقیدی ادب کا زبردست نقصان ہوا ہے اور اس خلا کو پُر نہیں کیا جاسکتا۔ ممتاز حسین پاکستان اور ہندوستان دونوں کے مقبول و محبوب ادیب تھے۔ مرحوم نے تنقیدی ادب میں گرانقدر اضافے کیے۔ کئی کتابوں کے مصنّف تھے اور بڑا سُلجھا ہوا جدید تنقیدی اسلوب رکھتے تھے۔

قاضی ریاض الدین ریاض انصاری نے ۹ جولائی کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دماغ کی رگ پھٹ جانے کی وجہ سے وہ ۲۸ جون سے بے ہوش تھے۔ گوا لیار، مدھیہ پردیش کے نہایت ممتاز بزرگ شاعر تھے۔ نوح ناروی کے ارشد تلامذہ میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ ایم اے۔ بی ٹی تھے اور تمام عمر محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ ۷۴ سال عمر پائی۔

ملکۂ غزل اختری بیگم کا ۳۰ اکتوبر کو احمد آباد (گجرات) میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ وہ ایک پروگرام کے سلسلے میں وہاں گئی تھیں۔ اُن کی عمر ۶۰ سال تھی۔ بیگم اختر ہندوستان کی بے مثال مغنیہ تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ غزل

گانے میں اُنھیں کمال حاصل تھا۔ حکومتِ ہند نے اُنھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا۔

نواب محمد اسمٰعیل علیخاں تاج سابق والیٔ ریاست ٹونک نے ۵۰ سال کی عمر میں ۱۷ نومبر کو ٹونک ہی میں وفات پائی۔ وہ آنتوں کے کینسر میں چند ماہ سے مبتلا تھے۔ اُن کا قیام زیادہ تر جے پور میں رہتا تھا۔ وہیں اُن کا آپریشن ہوا تھا۔ جمعہ کے دن ۱۱ بجے موتی باغ ٹونک میں اُنھیں دفن کیا گیا۔ تدفین سے قبل محل میں اُن کی میّت کو آخری دیدار کے لئے رکھا گیا تھا۔ ہزاروں ہندو مسلم مرد عورتیں بچے اپنے آخری تاجدار کا دیدار کرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

مرحوم بہت اچھے شاعر اور مقرر تھے۔ والیانِ ریاست ٹونک کو ہمیشہ علم و ادب اور شعر و سخن سے گہرا لگاؤ رہا اور دل کھول کر انھوں نے سرپرستی کی۔ نواب محمد اسمٰعیل علیخاں تاج نے اس روایت کی توسیع کی۔ نواب صاحب مرحوم کو شکار سے بھی زبردست شغف تھا۔ اُنھوں نے اپنی یادگار سے نعتیہ اور غزلیہ شاعری کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔

حافظ یار محمد انور کاپٹوی کا ۱۸ نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے ساڑھے ۱۱ بجے کامٹی (ناگپور) میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال عمر پائی۔ اپنے علاقہ کے استاد شعرا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اُنھیں "نور الشعرا" کا خطاب دیا گیا تھا۔ "تجلیاتِ انور" اُن کے کلام کا مجموعہ ہے۔

عبدالحفیظ ثمر چھپراوی کا ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو پھلواری شریف (پٹنہ) میں بہ عارضۂ قلب انتقال ہوا۔ دو سال پہلے پٹنہ ہائیکورٹ کے اوتھ کمشنر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ کافی دیرینہ مشق اور اچھے شاعر تھے۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (دیکھئے صفحہ) ذریعہ نادیہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ۱۳ دسمبر کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے مشہور و ممتاز مصنّف و عالم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا ۷۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ شاہ صاحب دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم، رسالۂ "معارف" کے ایڈیٹر اور مولانا سید سلیمان ندوی کے جانشین تھے۔ علمی حلقوں میں اُن کی تصانیف اور تحریریں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

محفلِ اپنی....

"قومی یک جہتی نمبر" کے بعد

اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۳ء کی مشترک خاص اشاعت پر مشتمل یہ عام شمارہ "قومی یک جہتی نمبر" کے بعد پہلا شمارہ ہے۔ ۱۹۷۳ء ختم ہو چکا ہے لیکن اس کا حساب بیباق ہونا ہے اس لئے جلد ہی ایک اور ضخیم شمارہ شائع کیا جائے گا جو دسمبر ۱۹۷۳ء کا ہوگا۔ پھر فروری ۱۹۷۴ء میں ایک مشترک مگر بھرپور اور ضخیم شمارہ پیش کر کے "شاعر" کی اشاعتوں کو منتظم کر دیا جائے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ پورے سال بھر کوئی شمارہ کم نہ ہو۔

اب "شاعر" کے عام شمارے ۹۶ صفحات کے ہوا کریں گے پندرہ روپے سالانہ چندہ ہوگا اور ایک کاپی کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہوگی۔ ملک کی تمام زبانوں کے اخبارات و رسائل جس بحران میں مبتلا ہیں اور جس بحرانی دور سے گذر رہے ہیں اس سے بے خبر رہنا تو ممکن نہیں۔ اُردو کے ادبی رسائل کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہے۔ بہر حال ادبی رسائل کو زندہ رکھنا ضروری ہے اور ان کے لئے ادب دوستوں کو اپنا زیادہ سے زیادہ تعاون دینا چاہئے۔ ہمارے سینے اس احساس سے کسی وقت بھی خالی نہیں ہونے چاہئیں کہ اردو زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے اور اس کا ادب عظیم۔ اس عظیم ادب کو بڑھتے رہنا چاہئیں۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں۔

نئے ادارۂ تحریر کا خیر مقدم

ہمدرد ناظم کی وفات کے بعد مجلس ادارت سونی سونی ہو گئی تھی۔ قارئین "شاعر" کے لئے یہ بات مسرت کا باعث ہوگی کہ ڈاکٹر محمد حسن کے علاوہ "عزیز شاعر" کی درخواست پر کرشن چندر، ظ۔ انصاری اور پروفیسر الیاس احمد اسکر ادارۂ تحریر میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ نیا ادارۂ تحریر اپنی نگارشات، اپنے مشوروں، تجاویز اور مشوروں سے "شاعر" کو اور زیادہ بہتر بنا سکے گا۔ ہم ان حضرات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ پچاس سال کے بعد یہ پہلی اہم تبدیلی ہے۔ "شاعر" کو ایک مکمل ادبی ماہنامہ بنانے کے لئے ...

آپ کے ایجنٹ کا شہر

اگر آپ کے شہر میں ایجنٹ تک "شاعر" کا "قومی یک جہتی نمبر" نہ پہنچا ہو تو انہیں اس اہم ترین قومی دستاویز کے مطالعہ کی دعوت دیجئے۔ وہ اپنے شہر کے ایجنٹ سے اس کی ایک کاپی خریدیں یا دفتر سے براہ راست منگائیں۔ اپنے شہر کے ایجنٹوں اور کتب فروشوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے کہ ان کے یہاں "قومی یک جہتی نمبر" آیا ہے یا نہیں۔ اگر ایجنٹوں نے یہ نمبر نہ منگایا ہو تو انہیں ترغیب دیجئے کہ وہ جتنا چاہیں منگائیں۔ تاکہ آپ کے شہر کے قوم پرست اردو داں اس نمبر کو بآسانی حاصل کر سکیں۔ یہ آپ کی ایک بڑی قومی خدمت ہوگی۔